

جلد اول دوم

تالیف

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری

ناشر :
اورینٹل بک ہاؤس
اوقاف مارکیٹ، گاسی یار، حول سرینگر

حماسۂ حسینی

(جلد اوّل و دوّم)

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہریؒ

اورینٹل بک ہاؤس

اوقاف مارکیٹ، گاسی یار، حول سرینگر

براءِ ایصال ثواب
سید نثار حسین ابن سید رمضان علی
اختر النساء بنت سید علی جان
سیدہ حسنیٰ بنت اخلاق حسین

برائے ایصال ثواب
سید نثار حسین ابن رمضان علی
اختر النساء بنت علی جان
سید علی انصر ابن شبیر حسن
سیدہ حسنیٰ بنت اخلاق حسین

اسم کتاب ..... حماسۂ حسینیؑ (جلد اول، دوم)
مؤلف ..... آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری
مترجم ..... سید محمد سعید موسوی
تصحیح ..... سید رسالت حسین کوثر
ہدیہ ..... ۱۷۰ (ایک سو ستر)

اورینٹل بک ہاؤس

اوقاف مارکیٹ، گاسی یار، حول سرینگر، کشمیر

فون نمبر: 0194-2428245 موبائل نمبر: 09419055244

برائے ایصال ثواب
سید نثار حسین ابن رمضان علی
اختر النساء بنت علی جان
سید علی انصر ابن شبیر حسن
سیدہ حسنیٰ بنت اخلاق حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

سیدنا و مولانا ابو عبداللہ الحسین علیہ السلام کی ذات گرامی مسلمانانِ عالم کے لئے محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ سرزمینِ کربلا میں آپ کی عظیم الشان شہادت نے آپ کے دیوانوں کو ایسا حوصلہ عطا کیا ہے کہ طولِ تاریخ میں جب تک جبر و استبداد کے ایوانوں میں کلمۂ حق کے خلاف کوئی بھی طاغوت اگر ذرا سی بھی بات کرے گا تو حسینی دیوانے ان ایوانوں کے لرزہ طاری کردیں گے۔

کربلا کی عظیم الشان قربانی پر آج تک بہت کچھ لکھا اور کہا گیا ہے اور تا قیامِ قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ انشاء اللہ۔ یہ جو مسجدوں میں اذان کی گونج ہے، یہ جو مسلمانوں کی زباں پر کلمہ جاری ہے، یہ جو درود و سلام کی صدائیں بلند ہیں یہ سب اسی عظیم الشان قربانی کا صدقہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب "حماسۂ حسینی" حضرت آیت اللہ شہید مرتضٰی مطہری کی تقریروں کا مجموعہ ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں استاد شہید نے اس معرکہِ حق و باطل کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور طولِ تاریخ میں جہاں کہیں کوئی تاریخی سند کے بغیر کوئی بات کہی گئی ہے اسے بیان کیا ہے۔

آپ چاہتے ہیں کہ امام حسین کا عظیم مشن لوگوں کو الہام عطا کرتا رہے، اور بغیر کسی تحریف کے یہ عظیم واقعہ تاریخ میں محفوظ رہے تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں اس سے رہنمائی حاصل کرتی رہیں۔

کتاب "حماسۂ حسینی" جامعہ تعلیمات اسلامی نے ترجمہ کرکے دارالثقافۃ اسلامیہ پاکستان کو ہدیہ کی ہے کیونکہ دارالثقافہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شخصیت، آپ کے اہداف، آپ کی تعلیمات اور آپ کے سانحہ فاجعہ کے سلسلے میں بیش از بیش کوششیں کر رہا ہے۔

دعا ہے کہ خداوند منان ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور دین کیلئے ان کی اس کوشش کو اپنی بارگاہ اقدس میں شرف قبولیت عطا فرمائے۔

فہرست

جلد اوّل

صفحہ

پہلا باب: کربلا کے تاریخی واقعے میں تحریفات

پہلی مجلس: تحریف کے معنی اور اس کی قسمیں ۹
دوسری مجلس: تحریف کے اسباب ۳۴
تیسری مجلس: کربلا کے حادثے کی معنوی تحریفیں ۵۸
چوتھی مجلس: تحریفوں کے پیش نظر ہمارا فرض ۸۰

دوسرا باب: حسینی حماسہ

پہلی مجلس: کربلا کے حادثے کے دو رخ ۹۶
دوسری مجلس: حسینی تحریک، مقدس حماسہ ۱۱۴
تیسری مجلس: حسینی تحریک، اسلامی معاشرے کو انفرادیت عطا کرتی ہے ۱۳۷

تیسرا باب: **حسینی تحریک کا تبلیغی عنصر**

پہلی مجلس: تبلیغ کا مطلب ۱۵۵
دوسری مجلس: پیغام رسانی کے وسائل اور ذرائع ۱۷۵
تیسری مجلس: تبلیغ کا طریقہ ۱۹۹
چوتھی مجلس: حسینی تحریک کے تبلیغی طریقے ۲۲۱
پانچویں مجلس: حادثہ کربلا، اسلام کا عملی مجسمہ ۲۴۳
چھٹی مجلس: اہلبیت سیدالشہداء کا کردار، تحریک حسینی کی تبلیغ میں ۲۶۵
ساتویں مجلس: مبلغ کے لئے شرائط اور امام حسین علیہ السلام کے اہل بیت کی دورانِ اسیری تبلیغ کی تاثیر ۲۸۶

جلد دوّم

چوتھا باب: **حسینی تحریک میں امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر**

پہلی مجلس: حسینی تحریک کے اصلی عناصر ۳۱۱
دوسری مجلس: امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا سبب ۳۳۱
تیسری مجلس: امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے شرائط ۳۵۳
چوتھی مجلس: امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے درجے ۳۷۷

پانچویں مجلس: مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے امربالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت ۴۰۲
چھٹی مجلس: امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں ہمارا کارنامہ ۴۲۹
ساتویں مجلس: امربالمعروف اور نہی عن المنکر ۴۵۴

پانچواں باب: **عاشور کے شعار** ۴۷۵

چھٹا باب: **عاشور کے سانحے کا تجزیہ** ۴۹۰

ساتواں باب: **امام حسینؑ کی تحریک کی ماہیت** ۵۱۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱ کربلا کے تاریخی واقعے میں تحریفات

پہلی مجلس

تحریف کے معنی اور اس کی قسمیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فبما نقضهم مّيثاقهم لعنهم و جعلنا قلوبهم قسية يحرّفون الكلم عن مواضعه و نسوا حظّا مما ذكروا به (۱)

ہماری گفتگو کا موضوع کربلا کے تاریخی واقعے کی تحریفات ہیں۔ اس عظیم واقعے کے دہرانے میں بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس لئے ہم یہ گفتگو مختصر طور پر چار ابواب میں پیش کر رہے ہیں۔ پہلا باب تحریف (تبدیلی) کے معنی اور تحریف کی ان اقسام کے بارے میں ہے جو دنیا میں ہوتی رہتی ہیں، خصوصیت سے ان تحریفات کے بارے

۱۔ پس ہم نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو (گویا) ہم نے خود سخت بنا دیا کہ (ہمارے) کلمات کو ان کے اصلی معنوں سے بدل کر دوسرے معانی میں استعمال کرتے ہیں اور جن جن باتوں کی انہیں نصیحت کی گئی تھی ان میں سے ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے۔ (سورہ مائدہ ۵ آیت ۱۳)

میں جو عاشورے کے تاریخی واقعے میں ہوئی ہیں۔ دوسرا باب تحریف کے اسباب سے متعلق ہے یعنی مجموعی طور پر جو تحریف دنیاوی معاملات میں واقع ہوتی ہے وہ کس وجہ سے ہوتی ہے۔ انسان حادثات، معاملات اور کبھی کبھی شخصیتوں کے بارے میں کس لئے تحریفات کرتا ہے؟ خاص کر کے کربلا کے واقعے کو بیان کرنے اور دہرانے میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان میں کن اسباب کا دخل رہا ہے؟ تیسرے باب میں ان تبدیلیوں کی وضاحت کی گئی ہے جو اس تاریخی حادثے میں رونما ہوئی ہیں۔ چوتھا باب اس سلسلے میں عموماً ہم مسلمان علماء اور عوام کی ذمہ داریوں کے بارے میں ہے۔

گفتگو کی ابتداء تحریف کے معنی سے متعلق ہے۔ تحریف یعنی کیا؟ تحریف عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادّہ حرف ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اس ابتدائی روش اور حالت سے جو تھی یا ہونا چاہئے تھی ہٹا دینا۔ دوسرے لفظوں میں تحریف تغیّر اور تبدیلی کی ایک قسم ہے لیکن تحریف ایک ایسی چیز ہے جس میں تغیر اور تبدیلی کا کلمہ شامل نہیں ہے۔ اگر آپ ایسا کریں کہ کسی جملے، کسی خط یا کسی شعر اور کسی عبارت کا جو مطلب آپ کو سمجھانا چاہئے وہ نہ سمجھائیں بلکہ دوسرا مفہوم سمجھائیں تو لوگ کہیں گے کہ آپ نے اس عبارت میں تحریف کی ہے۔ مثلاً آپ کبھی ایک شخص سے کوئی بات کہتے ہیں۔ بعد میں وہ شخص آپ کی وہ بات دوسری جگہ بیان کر دیتا ہے پھر کوئی اور شخص آپ سے کہتا ہے کہ فلاں آپ کی کہی ہوئی یہ یہ باتیں بیان کر رہا تھا تو آپ جان لیتے ہیں کہ جو کچھ اس شخص نے دہرایا تھا وہ اس سے بہت مختلف ہے جو آپ نے کہا تھا۔ اس نے آپ کی بات میں کمی بیشی سے کام لیا ہے۔ جو باتیں آپ کے مقصد کے لئے مفید تھیں ان میں سے کچھ اس نے چھوڑ دیں اور کچھ اپنی طرف سے بڑھا دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی بات ہی بدل گئی اور اس کی صورت ہی دوسری ہو گئی۔ اس وقت آپ کہتے ہیں، اس شخص نے میری گفتگو میں تحریف کر دی ہے۔

لفظ تحریف کے معنی کی وضاحت کے لئے یہ مثالیں کافی ہیں۔ اس لفظ کی اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہم تحریف کی اقسام بیان کرتے ہیں:

تحریف کی جتنی قسمیں ہیں ان میں سب سے اہم لفظی اور معنوی تحریف ہے۔ لفظی تحریف یہ ہے کہ ظاہری بات بدل دی جائے مثلاً کسی گفتگو میں سے کوئی عبارت چھوڑ دی جائے یا اس میں کوئی اور عبارت بڑھا دی جائے یا جملے یوں آگے پیچھے کر دئے جائیں کہ ان کے معنی اور مطلب میں فرق پیدا ہو جائے یعنی گفتگو کے الفاظ میں ردوبدل کر دیا جائے۔

معنوی تحریف یہ ہے کہ آپ لفظ کو بلا کم و کاست بیان کر دیں مگر لفظ تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ البتہ آپ اس کے معنی کچھ اس طرح نکالتے ہیں کہ کہنے والے کے مقصد کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ یا اسے کچھ ایسے معنی پہناتے ہیں کہ آپ کے مقصد کے مطابق ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے تحریف کا لفظ خصوصیت کے ساتھ یہودیوں کے سلسلے میں استعمال کیا ہے اور تاریخ کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عہد تاریخ کے تحریفی ہیرو ہیں۔ نجانے یہ کیسی نسل ہے۔ جو حقائق بدل ڈالنے اور تحریف کرنے کا حیرت انگیز میلان رکھتی ہے۔ اسی لئے یہ لوگ ہمیشہ ایسے کام اپناتے ہیں جن میں حقائق بدلے جا سکیں۔ میں نے سنا ہے کہ دنیا کی بعض خبر رساں ایجنسیاں، ریڈیو اور اخبارات جو ہمیشہ اُنہی سے خبریں لیتے ہیں یہودیوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ دنیا کے واقعات کو حسب دلخواہ شکل میں پیش کر سکیں۔ قرآن ان کے بارے میں کیسی عجیب بات کہتا ہے۔ تحریف جو یہودیوں کی خصوصیت ہے قرآن میں ایک نسلی خصوصیت سمجھی گئی ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں ہے۔ افتطمعون ان یئومنوا لکم (اے مسلمانو!) کیا تم یہ لالچ کرتے ہو کہ وہ

تمہارا (سا) ایمان لائینگے ؟ یہ وہی لوگ تو ہیں جو موسیٰ کے ساتھ جاکر خدا کی باتیں سنتے تھے لیکن جب واپس آتے تھے تو اپنی قوم کو سناتے وقت ان باتوں میں تحریف کر ڈالتے تھے۔

افتطمعون ان یئومنوا لکم و قد کان فریق منهم یسمعون کلم الله ثم یحرفونه من(م) بعد ما عقلوٗه و هم یعلمون(۱)

وہ تحریف بھی کرتے تھے تو اس وجہ سے نہیں کرتے تھے کہ اسے سمجھتے نہیں تھے اور بدل دیتے تھے۔ نہیں۔ یہ ہوشیار قوم خوب سمجھتی تھی لیکن خوب سمجھنے کے باوجود وہ باتیں اور وہ الفاظ لوگوں کے سامنے دوسری طرح بیان کرتی تھی۔ یہی تحریف ہے یعنی کسی بات کو موڑ دینا، پھیر دینا، اصلی راہ سے ہٹا دینا۔ ان لوگوں نے خدا کے صحیفوں میں تحریف کی ہے۔ قرآن نے اس بارے میں بہت سے مقامات پر ان کا تحریفی لفظ بیان کیا ہے یا دوسرے طریقے سے بات کہہ دی ہے البتہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ قرآن جو تحریف بیان کرتا ہے وہ لفظی اور معنوی تحریف سے اعم (منطقی اصطلاح ہے) ہے یعنی جو تحریفات کی گئی ہیں ان میں سے بعض لفظوں میں کی گئی ہیں اور بعض لفظوں میں نہیں بلکہ معنی مطالب میں ہوئی ہیں چونکہ میں اپنے موضوع سے بہت دور ہوا جارہا ہوں اس لئے اب اس بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کرونگا۔

یہاں میں ایک قصہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ علماء میں سے ایک صاحب بیان کرتے تھے کہ ان کی جوانی کے زمانہ میں ان کا ایک مداح تہران سے مشہد آیا تھا جو کئی روز تک مسجد گوہر شاہ یا اس کے صحن میں کھڑے ہوکر شعر پڑھا کرتا تھا،

۱۔ کیا تم یہ امید کرتے ہو کہ یہودی تمہارا دین قبول کرلیں گے جبکہ ان کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو خدا کا کلام سنتا تھا پھر اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس میں تحریف کردیتا تھا اور وہ جان بوجھ کر ایسا کرتا تھا۔ سورۂ بقرہ آیت ۷۵۔

قصیدہ پڑھتا تھا، اور حافظ کی یہ مشہور غزل پڑھا کرتا تھا:

اے دل غلام شاہ جہاں باش و شاہ باش
پیوستہ در حمایت لطف الہ باش
قبر امام ہشتمؑ سلطان دین رضا
از جاں ببوس و بردر آن بارگاہ باش

یہ صاحب صرف اس غرض سے کہ ذرا اس کا مذاق اڑائیں اس کے پاس جاکر بولے: جناب! آپ یہ شعر غلط کیوں پڑھتے ہیں؟ اسے یوں پڑھا کیجئے:

قبر امام ہشتمؑ سلطان دیں رضا
از جاں ببوس و بردر آن بارگاہ باش

یعنی جب تو حرم میں پہنچے تو جس طرح گھاس کا پولا خچر کی پیٹھ پر سے زمین پر گراتے ہیں تو بھی اپنے آپکو اس طرح فوراً زمین پر گرادیا کر۔ اس کے بعد سے وہ مداح بیچارا یہ شعر اسی طرح پڑھنے لگا۔ بارگاہ کی جگہ بارکاہ کہتا تھا اور خود کو زمین پر دھڑام سے گرادیتا تھا۔ اسے کہتے ہیں تحریف۔ یہاں یہ بھی بتادوں کہ تحریف موضوع کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتی ہے۔ کسی وقت تحریف کسی معمولی اور عام سی بات میں ہوتی ہے مثلاً دو آدمی ایک دوسرے کی بات دہرانے میں تحریف کریں اور کسی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحریف کسی بڑے سماجی موضوع میں ہو جاتی ہے مثلاً شخصیتوں میں تحریف۔ ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جن کا قول و فعل لوگوں کیلئے سند ہوتا ہے اِن کی سیرت لوگوں کیلئے قابل تقلید نمونہ ہوتی ہے۔ کوئی شخص حضرت علی علیہ السلام سے ایسی بات منسوب کر دیتا ہے جو آپ نے نہیں کہی ہو یا جس سے آپ کی مراد کچھ اور رہی ہو۔ یہ بہت خطرناک تحریف ہوتی ہے۔ پیغمبرؐ اور امامؑ سے ایسی عادت اور سیرت منسوب کر دیتی ہے جو ان میں نہیں ہوتی بلکہ ان کا خلق دوسری ہی طرح کا

ہوتا ہے یا کسی ایسے بڑے حادثے میں یا کسی ایسے تاریخی حادثے میں تحریف کر دیتے ہیں جو پورے معاشرے کے لئے ایک سند اور اس کے اخلاق اور تربیت کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ بات اور بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور بہت زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے کہ ان موضوعات میں تحریف کی جائے جو معمولی نہیں ہیں چاہے یہ تحریف لفظی ہو چاہے معنوی ہو۔ کوئی شخص حافظ کے شعر میں تحریف کرتا ہے یا کتاب 'موش و گربہ' (چوہا اور بلی) میں کتربیونت کرتا ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ البتہ کسی وقیع ادبی کتاب میں ردوبدل نہیں کرنا چاہئے۔

کسی استاد نے کتاب 'موش و گربہ' کے بارے میں جو ادبی اعتبار سے بہت قیمتی کتاب ہے ایک مقالہ لکھا تھا اور یہ ثابت کیا تھا کہ لوگوں نے اس میں اس قدر تحریف کی ہے، شعر گھٹائے بڑھائے ہیں اور الفاظ تبدیل کر دیئے ہیں جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے بعد لکھا تھا کہ میری نظر میں دنیا کی کوئی قوم ایرانی قوم کے برابر بے ایمان نہیں ہے جو اپنی کتابوں میں اس قدر ناجائز خوردبرد، ردوبدل اور تحریفیں کرتی ہے۔ مثنوی مولانا روم کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ لوگوں نے مثنوی میں اس قدر شعر بڑھا دیئے ہیں کہ ان کا حساب خدا ہی جانتا ہے مثلاً اصل مثنوی میں محبت سے متعلق ایک بہت عمدہ شعر ملتا تھا۔

از محبت تلخہا شیریں شود
وز محبت مس ہا زرّیں شود

محبت وہ چیز ہے جو کڑوے کو میٹھا بنا دیتی ہے۔ محبت کیمیاوی اثر رکھتی ہے جو انسانی ہستی کے تانبے کو کندن میں تبدیل کر دیتی ہے بعد میں اور لوگ آتے گئے اور کسی تناسب اور موزونیت کا لحاظ کئے بغیر اس میں اشعار بڑھاتے چلے گئے مثلاً انہوں نے کہا "از محبت مار مورے می شود" (محبت سے سانپ چیونٹی بن جاتا ہے) یا

محبت سے چھت دیوار ہو جاتی ہے یا محبت سے خربوزہ تربوز بن جاتا ہے اور ان میں سے کسی کا اصل موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اگرچہ ایسا نہیں ہونا چاہئے پھر بھی ان تحریفوں سے معاشرے کی زندگی اور بہبود پر کوئی چوٹ نہیں پڑتی اجتماعی زندگی کی راہ میں کجی نہیں آتی البتہ ان باتوں میں جو لوگوں کے اخلاق، تربیت اور دین سے متعلق ہیں تحریف خطرناک ہوتی ہے اور جن باتوں سے انسانی زندگی کے لئے سند اور ضمانت حاصل کی جاتی ہے ان میں تحریف اور بھی قیامت خیز بن جاتی ہے۔

ہم لوگوں کے لئے کربلا کا حادثہ بہت بڑا سماجی حادثہ ہے جو ہماری تربیت، عادات اور کردار پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جس کے متعلق باتیں سننے کے لئے ہم میں سے لاکھوں انسان کسی خارجی طاقت کے دباؤ کے بغیر اپنے وقت کے لاکھوں گھنٹے صرف کرتے ہیں، اس غرض کے لئے لاکھوں روپئے خرچ کرتے ہیں۔ یہ واقعہ جس طرح پیش آیا ہے بالکل اسی طرح بلا کم و کاست بیان ہونا چاہئے۔ اگر ہماری طرف سے اس حادثے میں کم سے کم بھی دخل اور تصرف ہوگا تو یہ حادثہ بدل جائے گا اور پھر بجائے اس کے کہ ہم اس سے کچھ فائدہ حاصل کریں یقیناً نقصان اٹھائیں گے۔ اب میری گفتگو یہ ہوگی کہ عاشور کے حادثے کو بیان کرنے اور دہرانے میں ہم نے ہزاروں تحریفیں کر ڈالی ہیں۔ لفظی یعنی ظاہری اور شکلی تحریفیں بھی جو اصل واقعات سے متعلق ہیں، واقعات کی ابتدائی باتوں سے متعلق ہیں، اصل مطلب اور مقصود سے متعلق ہیں اور مطلب و مقصود کی ضمنی باتوں سے متعلق ہیں اور اس حادثے کی تشریح و تفسیر کی تحریفیں بھی۔ بدقسمتی سے اس حادثے میں لفظی تحریفیں بھی ہوئی ہیں اور معنوی تحریفیں بھی۔ کبھی تحریفیں اصل مطلب سے کچھ نہ کچھ مطابقت رکھتی ہیں اور کبھی ذرا سی بھی مطابقت نہیں رکھتیں، معاملے کو بالکل بدل ڈالتی ہیں، معاملے کو بالکل الٹا کر دیتی ہیں اور اسے ایسی شکل میں لے آتی ہیں کہ وہ

اپنی ہی ضد نظر آنے لگتا ہے۔ پھر یہ بھی نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس حادثے میں ہم لوگوں کے ہاتھوں جو تحریفیں ہوئی ہیں انھوں نے معاملے کو نیچے گرایا اور بالکل بدل ڈالا ہے۔ اس معاملے کو بالکل بے اثر اور نکما کردیا ہے اور اس سلسلے میں ذاکر، عالم اور عوام سبھی قصوروار ہیں جس کی ہم انشاء اللہ وضاحت ضرور کریں گے۔

میں بعض ایسی تحریفوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں جو ظاہری عبارت یعنی اس معاملے کی شکل میں کی گئی ہیں اور ان چیزوں کا ذکر کرتا ہوں جن کو نسبت دی گئی ہے۔ بات اتنی لمبی اور بڑی ہے کہ اس کا بیان میں آنا مشکل ہے اس قدر بڑی ہے کہ اگر ہم ان تمام جھوٹے مصائب کو جمع کرنے بیٹھیں جو لوگ پڑھتے ہیں تو شاید پانچ پانچ سو صفحوں کی کتنی ہی کتابیں تیار ہوجائیں۔ میں صرف مثال کے لئے عرض کرتا ہوں: مرحوم حاجی مرزا حسین نوری اعلی اللہ مقامہ جو مرحوم الحاج شیخ عباس قمیؒ اور مرحوم الحاج شیخ علی اکبر نہاوندی کے اور مشہد میں مرحوم الحاج شیخ محمد باقر بیر جندی جیسے جیدؒ محدّث کے استاد تھے۔ وہ ایسے محدّث تھے جو اپنے فن میں غیر معمولی قابلیت اور بہت قوی حافظہ رکھتے تھے۔ نہایت باذوق، بہت جوشیلے اور با ایمان گزرے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے بعض ان کے شایان شان نہیں تھیں اور ان کی وجہ سے ان کے زمانے کے علماء نے بھی انہیں ملامت کی تھی پھر بھی علی العموم ان کی کتابیں اچھی ہیں خصوصاً وہ کتاب جو انھوں نے ذاکری کے موضوع پر لکھی ہے اور جس کا نام "لُو لُو و مرجان" ہے۔ یہ کتاب اگر چہ چھوٹی سی ہے پھر بھی غیر معمولی طور پر اچھی ہے۔ اس کتاب میں مقرّروں کے فرائض کے متعلق باتیں کی گئی ہیں۔ اس پوری کتاب میں دو فصلیں ہیں۔ ایک اخلاص یعنی خلوص نیت کے بارے میں ہے جو ذاکر، خطیب، واعظ اور مصائب بیان کرنے والے کے لئے ایک شرط ہے یعنی جو تقریر کرتا ہے، مصائب پڑھتا ہے وہ پیسے کا لالچ نہ کرے۔ انھوں نے

اس موضوع پر اتنی اچھی گفتگو کی ہے کہ میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔ دوسری شرط سچائی ہے اس مقام پر سچ کہنے اور جھوٹ بولنے کے موضوع کی تشریح کی گئی ہے اور مختلف قسم کے جھوٹ پر ایسی عمدہ بحث کی گئی ہے کہ میرے خیال سے کسی اور کتاب میں جھوٹ اور اس کی اقسام پر اس کتاب جیسی گفتگو نہیں ہوئی ہوگی بلکہ شاید دنیا میں اس کتاب کی مثال بھی نہیں مل سکے گی۔ اس مرد بزرگ نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور علمیت کا عجب ثبوت دیا ہے۔

یہ بزرگوار اس کتاب میں ان جھوٹی باتوں کے نمونے بیان کرتے ہیں جو عام ہیں اور جنھیں کربلا کے تاریخی حادثے سے منسوب کرتے ہیں۔ جو باتیں میں کہنے والا ہوں ان میں سے زیادہ یا سب کی سب وہی ہیں جن کے خلاف مرحوم حاجی نوری نے بھی فریاد کی ہے۔ یہاں تک کہ یہ بزرگوار صاف صاف کہتے ہیں: آج حسینؑ کا سوگ منانا چاہئے لیکن ہمارے زمانے میں حسینؑ کا ایک نیا ہی غم ہے جو پہلے نہیں رہا ہے اور وہ اس جھوٹ کا پلندہ ہے جو کربلا کے حادثے کے متعلق بولا جارہا ہے اور کوئی شخص اسے روکنے والا نہیں ہے۔ حسینؑ بن علیؑ کی مصیبت پر رونا چاہئے لیکن ان تلواروں اور نیزوں پر نہیں جو اس روز آپ کے جسم شریف پر لگے تھے بلکہ جھوٹ کے اس پلندے پر رونا چاہئے۔ میں نے کتاب کے مقدمے میں بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کے ایک بزرگ عالم نے مجھے خط لکھا تھا اور ہندوستان میں جو جھوٹی روایتیں پڑھی جاتی ہیں ان کی شکایت کی تھی اور مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں کچھ کروں اور کوئی کتاب لکھوں جو اس ملک کی جھوٹی روایتوں کا قلع قمع کرسکے۔ اس کے بعد مرحوم حاجی صاحب لکھتے ہیں: یہ ہندوستانی عالم یہ سمجھتا ہے کہ ذاکر جس وقت ہندوستان جاتے ہیں اسی وقت جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ پانی تو سوت میں ہی گدلا ہے اور جھوٹے مصائب کا مرکز کربلا، نجف اور ایران یعنی شیعیت کے یہی مراکز

ہیں۔ اب میں ایسی تحریفیں نمونے کے طور پر بیان کرتا ہوں جن میں سے کچھ عاشورے پہلے کے واقعات سے تعلق رکھتی ہیں، کچھ کربلا کے سفر میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہیں، بعض ماہ محرم میں قیام کے دوران پیش آنے والے واقعات سے مربوط ہیں، بعض اہلبیتؑ کے زمانۂ اسیری سے متعلق ہیں، کچھ کربلا کے واقعات کے بعد اماموں سے تعلق رکھتی ہیں لیکن زیادہ تعداد روز عاشور سے متعلق ہے۔ اب میں ان میں سے ہر ایک کی دو دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

مجھے ایک بات پہلے کہہ دینا چاہئے کہ ان سب کی ذمہ داری عوام پر ہے یعنی آپ لوگوں پر جو مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ آپ یہ مطلق نہیں سوچتے کہ اس سلسلے میں آپ ذمہ دار ہیں بلکہ یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف مقرر اور ذاکر ہی ذمہ دار ہیں۔ لوگوں کی دو بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ایک نہی عن المنکر ہے جو سب پر واجب ہے۔ جب لوگ یہ سمجھ لیں اور جان جائیں جیسا کہ اکثر پتہ ہوتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے تو اس مجلس میں انہیں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ اس لئے کہ پھر بیٹھے رہنا حرام ہے۔ انہیں تو لڑنا چاہئے۔ دوسری ذمہ داری بانیان مجلس اور سامعین کے اس رجحان کو ختم کرنا ہے جو وہ مجلس کو کامیاب بنانے کے لئے رکھتے ہیں۔ جسے اصطلاح میں مجلس کا خوب ہونا یا مجلس میں پنس پڑنا کہتے ہیں۔ ذاکر بیچارا یہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ وہ بیان کرتا ہے اگر سچ اور درست ہوگا تو شاید مجلس کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکے گی اور پھر یہ لوگ بھی اسے نہیں بلائیں گے اس لئے وہ مجبوراً کچھ نہ کچھ بڑھا دیتا ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ اپنا یہ خیال چھوڑ دیں اور اپنی روش کے مطابق ذاکر جو مصائب پڑھتا ہے اور مجلس کو لوٹ لیتا ہے اسے اس کا شوق نہ دلائیں۔ لوٹ لیتا ہے کا کیا مطلب ہے؟ لوگوں کو لازم ہے کہ سیدھا سادہ ذکر سنیں تاکہ اچھی اچھی باتیں اور معرفت کے نکات ان کی سمجھ میں آئیں اور وہ یہ جان جائیں کہ اگر ان کی روح ایک لفظ پر بھی جھوم اٹھی یعنی

حسینؑ بن علیؑ کی روح سے ہم آہنگ ہوگئی اور اس کے نتیجے میں آنسو چاہے وہ ایک قطرہ ہی کیوں نہ ہو ان کی آنکھ سے ٹپک پڑا تو واقعی یہ بہت بڑا درجہ ہوگا لیکن جو آنسو رجوع قلب کے بغیر آنکھ سے ٹپکے گا تو وہ سمندر بھی ہوگا تو بے وقعت ہوگا۔

کہتے ہیں کہ کسی شہر کے ایک بزرگ عالم کے دل میں دین کا اتنا درد تھا کہ وہ ہمیشہ ان جھوٹی باتوں پر اعتراض کیا کرتے تھے جو منبر پر کہی جاتی تھیں اور ان کے الفاظ یہ ہوتے تھے کہ آخر یہ کیا زہر چکانی ہے جو تم منبروں پر بیٹھ کر کیا کرتے ہو؟ ایک بار ایک واعظ نے ان سے کہا کہ اگر ہم یہ باتیں نہ کریں تو پھر اپنی دکان ہی بند کر کے بیٹھ جائیں۔ ان بزرگوار نے جواب دیا یہ جھوٹی باتیں ہیں انہیں بیان نہیں کرنا چاہئے۔ اتفاق سے کچھ عرصے بعد خود ان بزرگوار نے اپنی ہی مسجد میں ایک مجلس برپا کی اور اسی واعظ کو مجلس پڑھنے کیلئے بلایا لیکن مجلس شروع کرنے سے پہلے واعظ سے کہہ دیا کہ میں نمونے کے طور پر مجلس کر رہا ہوں جس میں صرف صحیح صحیح واقعات بیان کئے جائینگے چنانچہ تمہیں یہ پابندی کرنا ہوگی کہ تم معتبر کتابوں کے علاوہ اور کسی کتاب کے واقعات بیان نہیں کروگے اور اپنے الفاظ میں کہا کہ ان زہر چکانیوں میں سے کچھ بھی نہیں سناؤگے۔ واعظ نے بھی کہا کہ چونکہ مجلس آپکی ہے اس لئے آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ پہلی رات کو خود وہ بزرگوار محراب مسجد میں قبلے کی طرف منہ کر کے بیٹھے۔ منبر محراب کے ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ واعظ نے روضہ خوانی شروع کی اور اس بات کی پابندی کی کہ صرف سچے واقعات بیان کرتا چلا جائے لیکن اس کی ہزار کوششوں کے باوجود مجلس کو جنبش نہیں ہوئی اور لوگ اسی طرح جمے بیٹھے رہے۔ بزرگوار نے جب یہ دیکھا تو پریشان ہوئے کہ یہ میری ہی مجلس ہے بعد میں لوگ کیا کہیں گے۔ عورتیں کہینگی کہ ان بزرگوار کی نیت درست نہیں تھی اسی لئے مجلس ٹھس ہوگئی۔ اگر بانی مجلس کی نیت ٹھیک ہوتی اور اس میں خلوص ہوتا تو مجلس

کامیاب رہتی۔ اب انہوں نے دیکھا کہ آبرو جا رہی ہے۔ کیا کیا جائے؟ تو خفیہ طور پر اور آنکھوں آنکھوں میں واعظ سے کہا کہ ان زہر چکانیوں میں سے قدرے بیان کر دے۔

یہ امید جو لوگ مجلس کامیاب ہونے یعنی مجلس میں پٹس پڑنے کی رکھتے ہیں خود جھوٹ بلواتے ہیں اس لئے جو بہت زیادہ باتیں گھڑی گئی ہیں وہ زبردستی رلوانے کا دیباچہ رہی ہیں یعنی محض اس غرض سے کہ بڑھا چڑھا کر لوگوں کے آنسو نکلوائے جائیں ایک گھڑت تیار کرلی گئی ورنہ اس سے اور کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں نے یہ بات بار بار سنی ہے اور آپ نے بھی ضرور سنی ہوگی۔ اور حاجی نوری نے بھی واقعات کے شروعات میں بیان کیا ہے کہ کہتے ہیں کہ ایک دن امیر المومنین حضرت علیؑ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ امام حسینؑ نے فرمایا میں پیاسا ہوں اور پانی چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کوئی میرے بیٹے کے لئے پانی لے آئے۔ سب سے پہلے جو اپنی جگہ سے اٹھا وہ ایک بچہ تھا اور وہ حضرت ابو الفضل العباسؑ تھے۔ وہ گئے اور اپنی والدہ سے ایک پیالہ پانی لے کر آئے۔ وہ جس وقت وہاں پہنچے تو اس حال سے پہنچے کہ پانی ان کے سر پر رکھا ہوا تھا اور کچھ پانی گر گیا تھا جس کا بیان نہایت طول اور تفصیل سے کیا جاتا ہے۔ جب امیر المومنینؑ نے یہ منظر دیکھا تو آپ کے آنسو جاری ہوگئے۔ لوگوں نے آقا سے پوچھا کہ آپؑ کے رونے کا کیا سبب ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا کہ مجھے ان کے واقعات یاد آگئے۔ حاجی نوری یہاں ایک بہت اچھی بات کہتے ہیں کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ علیؑ منبر پر خطبہ دے رہے تھے تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ علیؑ صرف اپنی خلافت کے زمانے میں منبر پر بیٹھ کر خطبہ ارشاد کرتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ کوفے میں تھے اور اس وقت امامؑ حسینؑ ۳۳ سال کے ادھیڑ عمر مرد تھے۔ اس کے بعد حاجی موصوف فرماتے ہیں کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ۳۳ سال کا ایک ادھیڑ عمر

شخص اس وقت جبکہ اس کا باپ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہو اور انہیں وعظ اور نصیحت کر رہا ہو یکایک خطبہ کے بیچ میں کہہ اٹھے جناب میں پیاسا ہوں پانی چاہتا ہوں؟ کوئی معمولی سا آدمی بھی ایسا کرے تو لوگ کہیں گے کہ عجب بے ادب اور نا شائستہ آدمی ہے اور پھر حضرت عباس بھی اس وقت بچے نہیں تھے۔ جوان تھے جن کی عمر کم سے کم پندرہ سال کی ہوگی۔ آپ دیکھتے ہیں لوگ کس طرح باتیں گھڑتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ امام حسینؑ کی شان کے لائق ہے؟ من گھڑت ہونے کے سوا اس کی اور کیا حیثیت یا اہمیت ہو سکتی ہے۔ یہ واقعہ امام حسینؑ کی شان بڑھاتا ہے یا گھٹاتا ہے؟ یقیناً گھٹاتا ہے کیونکہ ہم نے امام حسینؑ پر ایک اتہام لگایا ہے ہم نے ایسی بات کی ہے جس سے ہم نے امامؑ کو نہایت بے ادب لوگوں کی سطح تک گرا دیا ہے۔ جب علیؑ جیسا باپ تقریر میں مشغول ہے انہیں پیاس لگتی ہے پھر اتنی سمار بھی نہیں کہ۔ جلسہ ختم ہو جائے اور بعد میں پانی پئیں۔ وہیں اور اسی دم باپ کو مخاطب کرتے اور کہتے ہیں کہ میں پیاسا ہوں میرے لئے پانی لائیے!

تحریف اور گھڑنے کی ایک اور مثال یہ ہے کہ کوئی قاصد حضرت ابو عبداللہؑ کے پاس ایک خط لایا تھا۔ اور اس کا جواب چاہتا تھا۔ آپؑ نے اس سے فرمایا کہ تین دن بعد آکر جواب لے جانا۔ جب تین دن کے بعد اس نے پتہ لگایا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ حضرت آج سفر پر جا رہے ہیں۔ اس نے بھی کہا کہ اب آقا جا رہے ہیں تو میں بھی چل کر دیکھ لوں کہ حجاز کے بادشاہ کا جاہ و حشم کیسا ہے؟ وہ گیا تو اس نے دیکھا کہ حضرت ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور دوسری کرسیوں پر بنی ہاشم کے افراد تشریف فرما ہیں۔ اس کے بعد عماریاں آئیں جن پر حریر و دیبا کے پردے تھے۔ اس کے بعد خواتین آئیں اور نہایت احترام سے ان محملوں میں سوار کرائی گئیں۔ واقعات

اسی طرح بیان کرتے کرتے یکایک گیارہ محرم کے مصائب کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا اس دن اس قدر احترام تھا اور گیارھویں محرم کو کیا حال ہو گیا۔ حاجی نوری فرماتے ہیں۔ یہ کیسی باتیں ہیں؟ تاریخ یوں بیان کرتی ہے :امامؑ حسینؑ جس وقت باہر آئے تھے یہ آیت پڑھ رہے تھے :" فخرج منها خائفا يترقب۔"(۱) یعنی اس طرح مدینہ سے نکلنے کو موسیٰ بن عمران سے تشبیہ دی ہے جو فرعون کے خوف سے مصر چھوڑ رہے تھے :" قال عسى ربّي أن يهديني سواء السّبيل۔"(۲) ایک بہت سادہ سا قافلہ سفر کر رہا تھا۔ کیا حضرت امامؑ حسینؑ کی بڑائی اس میں ہے کہ ان کے لئے ایک سنہری کرسی بچھادی گئی؟ یا ان کے خاندان کی بڑائی اسی میں ہے کہ وہ حریر و دیبا کے پردوں والے محملوں میں سوار ہوں؟ ان کے اونٹ گھوڑے کیسے تھے؟ ان کے نوکر چاکر کیسے تھے؟

عاشور کے واقعات میں جو دنیا کا نہایت مشہور واقعہ گزرا ہے تحریف کی ایک اور مثال حضرت علی اکبر کی والدہ ماجدہ جناب لیلیٰ کا قصہ ہے جس کی گواہی کوئی تاریخ نہیں دیتی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت علی اکبر کی والدہ کا نام لیلیٰ تھا لیکن ایک مورخ نے بھی تو یہ نہیں بتایا کہ ام لیلیٰ کربلا میں موجود تھیں لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ ہمارے پاس لیلیٰ اور علی اکبر کے کتنے واقعات موجود ہیں۔ حضرت علی اکبر کے

۱۔ پوری آیت یہ ہے : فخرج منها خائفا يترقب قال رب نجني من القوم الظّٰلمين۔ یعنی موسیٰ شہر سے باہر خوفزدہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے نکلے اور کہا کہ پروردگار مجھے ظالم قوم سے محفوظ رکھنا۔ سورۂ قصص آیت ۲۱

۲۔ پوری آیت یہ ہے :ولمآ توجّه تلقآء مدين قال عسى ربّي أن يّهديني سواء السّبيل۔ اور جب مصر سے نکلے اور شہر مدائن جاتے ہوئے بیابان میں پہنچے تو آپ نے دل میں کہا امید ہے کہ خدا مجھے سیدھا راستہ دکھائیگا۔ سورۂ قصص آیت ۲۲

سرہانے حضرت ام لیلیٰؑ کے آنے کے مصائب۔ حتیٰ کہ میں نے قم کی ایک مجلس میں بھی جو آیت اللہ بروجردی کے نام سے برپا ہوئی تھی اور جس میں وہ خود موجود نہیں تھے یہی روایت سنی تھی کہ علی اکبر میدان میں گئے۔ حضرت امام حسینؑ نے ام لیلیٰ سے فرمایا کہ میں نے اپنے جدّ (رسول خداؐ) سے سنا تھا کہ بیٹے کے لئے ماں کی دعا قبول ہوتی ہے۔ جاؤ اور فلاں خالی خیمے میں بال بکھرا کر اپنے بیٹے کے لئے دعا کرو شاید خدا ہمارے اس بیٹے کو صحیح و سلامت ہم تک واپس پہنچا دے۔ اوّل تو ام لیلیٰ کربلا ہی میں نہیں تھیں جو ایسا کرتیں۔ دوسرے یہ منطق بھی حسینؑ کی منطق نہیں ہے۔ عاشورے کے دن حسینؑ کی منطق شہادت کی منطق ہے۔ جان دینے کی منطق ہے۔ تمام مؤرخوں نے لکھا ہے کہ جب کوئی ساتھی امام حسینؑ سے اجازت جنگ طلب کرتا تھا تو آپ جس طرح ممکن ہوتا کہ اس کی اجازت میں عذر کیا جا سکے وہ عذر پیش کرتے تھے لیکن علی اکبر کو اجازت دینے میں آپ نے کوئی عذر نہیں کیا "فاستآذن فی القتال اباه فاذن له" (۱) یعنی جیسے ہی علی اکبر نے اجازت چاہی آپ نے فرمایا جاؤ لیکن ایسے کیسے کیسے شعر ہیں جنہیں کبھی نہیں کہا گیا۔ ذرا یہ شعر دیکھئے :

خیز اے بابا ازا ایں صحرا رویم
تک بسوئے خیمۂ لیلا رویم

اسی موضوع سے متعلق ایک اور مثال جو نہایت عجیب ہے۔ میں نے اسی تہران میں اسی شہر کے ایک بڑے عالم کے گھر میں چند سال پہلے ایک ذاکر سے لیلیٰ کی وہ روایت سنا جو عمر بھر میں کبھی نہیں سنا تھا۔ اس نے کہا جب حضرت لیلیٰ اس خیمے میں چلی گئیں اور انھوں نے بال کھول کر یہ منت مانی کہ اگر خدا علی اکبر کو صحیح و سالم واپس

۱۔ اللہوف صفحہ ۴۷

لے آئیگا اور وہ کربلا میں شہید نہیں ہوگا تو میں کربلا سے مدینہ تک ریحان کے پھول بوؤں گی یعنی انہوں نے یہ منت مانی کہ تین سو فرسخ (۱) کے راستے میں ریحان بوئیں گی۔ اتنا کہا اور اچانک مدھم آواز میں پڑھنے لگا:

نذر علی لئن عادوا و ان رَجعوا

لازرعن طریق التفت ریحانا

یعنی میں نے منت مانی ہے کہ اگر یہ واپس آگئے تو تفت کے راستے میں ریحان کے پھول اگاؤں گی۔ اس عربی کے شعر پر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ یہ شعر کہاں سے آگیا؟ بعد میں اس کا سراغ لگایا تو معلوم ہوا کہ اس شعر میں جو تفت آیا ہے وہ کربلا نہیں ہے بلکہ یہ تفت وہ علاقہ ہے جہاں کا تعلق لیلیٰ اور مجنوں کے مشہور قصے سے ہے۔ لیلیٰ اس سرزمین میں سکونت پذیر تھی اور یہ شعر مجنوں عامری کا ہے جو اس نے لیلیٰ کے لئے کہا تھا لیکن یہ آدمی اس شعر کو علی اکبر کی والدہ لیلیٰ کے لئے پڑھتا تھا۔ ذرا سوچئے کہ کوئی عیسائی یا یہودی یا کوئی لا مذہب آدمی وہاں ہو اور یہ واقعات سنے تو کیا وہ یہ نہیں کہے گا کہ اس تاریخ میں یہ کیا خرافات ہیں! وہ لوگ جو یہ نہیں جانتے کہ یہ قصہ خود اس شخص کا گھڑا ہوا ہے کہیں گے خدا کی پناہ ان لوگوں کی خواتین کتنی ناسمجھ تھیں جو یہ نذر مانتی تھیں کہ کربلا سے مدینہ تک ریحان اگائیں گی۔ ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟

اس سے بھی بڑھ کر (حاجی نوری) کہتے ہیں کہ اسی بے انتہا گرم روز عاشور میں جس میں آپ جانتے ہیں نماز پڑھنا بھی مشکل تھا امامؑ نے نماز خوف (۲) پڑھی تھی اور جلدی جلدی پڑھی تھی۔ یہاں تک کے دو اصحاب آئے اور امامؑ کے سامنے ڈھال بن

۱۔ ایک فرسخ تقریباً ۲/۱-۳ میل کا ہوتا ہے۔ (ادارہ)

۲۔ نماز خوف وہی نماز ہے جو خوف کے عالم میں فرض کی جگہ، قصر کر کے پڑھتے ہیں۔

کر کھڑے ہوگئے تاکہ امامؑ دو رکعت نماز خوف ادا کر سکیں اور جب تک امامؑ نے دو رکعت نماز پڑھی یہ دونوں دشمن کی طرف سے لگا تار آنے والے تیروں سے چھلنی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ ان کو نماز پڑھنے کی بھی مہلت نہیں دی گئی اس کے باوجود لوگوں نے کہا ہے کہ اس وقت امامؑ نے فرمایا کہ حجلۂ عروسی (شادی کا کمرہ) سجاؤ، میں چاہتا ہوں کہ ایسے ہی میں اپنی ایک بیٹی سے قاسم کی شادی یا کم سے کم اس کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ یہ میری خواہش ہے جسے میں قبر میں نہیں لے جانا چاہتا۔

خدا کے لئے آپ یہ باتیں تو دیکھئے کہ جو بات کبھی کبھی ہم نہایت پست درجے کے آدمی سے سنتے ہیں کہ میری خواہش ہے کہ میں اپنے بیٹے کی شادی رچاؤں، بیٹی کی شادی دیکھوں اسے حسینؑ بن علیؑ جیسے عالی مرتبت انسان سے منسوب کرتے ہیں اور وہ بھی اس معرکہ قتال میں جب نماز پڑھنے کی بھی مہلت نہیں تھی۔ اور کہتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا میں اس وقت اپنی بیٹی کا اپنے بھتیجے سے عقد کرنا اور شادی کی ایک صورت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے قدیم نوحہ خوانوں سے جو بات کبھی الگ نہیں ہوتی تھی وہ نئے دولہا (نوشہ) قاسم کی شادی تھی جبکہ اس کا کسی معتبر تاریخ میں وجود نہیں ملتا۔ حاجی نوری کہتے ہیں کہ ملا حسین کاشفی پہلا شخص تھا جس نے "روضۃ الشہداء" نامی اپنی کتاب میں یہ بات لکھی ہے حالانکہ در حقیقت یہ قصہ سو فیصد غلط اور جھوٹ ہے۔ ایک شاعر کے قول کے مطابق:

بس کہ بہ بستند براو برگ ساز

گر تو ببینی نشناسیش باز

اگر سید الشہداءؑ تشریف لے آئیں اور یہ باتیں دیکھیں (وہ یقیناً روحانی دنیا میں دیکھ رہے ہیں اگر ظاہری دنیا میں بھی آجائیں) تو یہ پائیں گے کہ ہم نے ان کے ایسے ساتھیوں اور دوستوں کا حال بیان کیا ہے جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے مثلاً

کتاب "محرق القلوب" میں جس کا لکھنے والا اتفاقاً ایک بڑا عالم اور فقیہ ہے لیکن جو ان باتوں سے بے خبر ہے لکھا ہوا ہے کہ عاشور کے دن ہاشم مرقال نامی ایک صحابی زمین میں سے نکلا تھا جس کے ہاتھ میں اٹھارہ ہاتھ لمبا ایک نیزہ تھا۔ اسی طرح کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ سنان بن انس کے پاس بھی جس نے (بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق) امام حسینؑ کا سر کاٹا تھا ساٹھ ہاتھ لمبا نیزہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ ساٹھ ہاتھ جتنا تو نیزہ ہی نہیں ہوتا نہ ہوسکتا ہے تو اس نے کہا کہ خدا نے یہ نیزہ اس کے لئے بہشت سے بھیجا تھا۔ کتاب "محرق القلوب" میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہاشم بن عتبۂ مرقال اٹھارہ ہاتھ کے نیزے سمیت ظاہر ہوا تھا جبکہ یہ ہاشم بن عتبہ حضرت امیر المومنینؑ کا صحابی تھا اور بیس سال پہلے مارا گیا تھا۔ ہم امامؑ حسینؑ کے ایسے ساتھیوں کا ذکر کرتے ہیں جو تھے ہی نہیں یا زعفر جن کو حسینؑ کا دوست دار بناتے ہیں البتہ ایسے دشمنوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جو تھے ہی نہیں۔ کتاب "اسرار الشہادۃ" میں لکھا ہے کہ کربلا میں عمر ابن سعد کے لشکر کی تعداد سولہ لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی تعداد کہاں سے آگئی؟ یہ سب کوفے میں تھے کیا ایسی بات ہوسکتی ہے؟ اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ امامؑ حسینؑ نے عاشور کے دن تین لاکھ دشمن اپنے ہاتھ سے قتل کئے تھے۔ ہیروشیما میں جو بم دوسری عالمگیر جنگ میں گرایا گیا تھا اس سے ساٹھ ہزار آدمی مرے تھے۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ اگر یہ مان لیں کہ تلوار کھچا کھچ چلتی رہے اور ہر سیکنڈ میں ایک آدمی قتل ہوتا جائے تو تین لاکھ دشمنوں کو قتل کرنے کے لئے تراسی گھنٹے اور بیس منٹ کا وقت درکار ہوگا۔ بعد میں جب لوگوں نے دیکھا کہ مقتولوں کی یہ تعداد عاشور کے دن کے دورانیے سے میل نہیں کھاتی تو کہہ دیا کہ روز عاشور بھی ستر گھنٹے کا تھا۔

اسی طرح حضرت ابو الفضل العباسؑ کے بارے میں بھی کہا ہے کہ آپ نے پچیس

ہزار آدمی قتل کئے تھے۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ اگر ہر سیکنڈ میں ایک آدمی قتل ہوتا رہے تو اس تعداد کے قتل کے لئے چھ گھنٹے چھپن منٹ اور چالیس سیکنڈ درکار ہوں گے۔ چنانچہ ہم اس بزرگ شخص حاجی نوری کی بات کو باور کرتے ہیں جو کہتے ہیں: اگر کوئی آج رونا چاہے، اگر کوئی آج مصیبت کا ذکر کرنا چاہے تو اسے حضرت امام حسینؑ کی تازہ مصیبتوں پر رونا چاہئے۔ ان جھوٹی باتوں پر رونا چاہئے جو ان سے منسوب کی جارہی ہیں۔

دوسری مثال چہلم کی ہے۔ جب چہلم آتا ہے تو سب یہ روایت پڑھتے ہیں اور لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ یہی بات ہے کہ قیدی شام سے کربلا آئے اور انھوں نے وہاں جابر بن عبداللہ انصاری سے ملاقات کی اور امام زین العابدینؑ بھی جابر سے ملے۔ یہ بات صرف کتاب اللہوف میں ملتی ہے جس کے مصنف سید بن طاؤس نے بھی اپنی دوسری کتابوں میں اس کو غلط بتایا ہے کم سے کم اس کی تائید نہیں کی ہے اور کسی کتاب میں یہ بات نہیں ملتی اور نہ کوئی عقلی دلیل اس بات کی تائید کرتی ہے۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو سکتی ہے کہ اس قسم کی باتیں جو ہر سال کہی جاتی ہیں لوگوں سے ملی ہوں؟ یہ حقیقت ہے کہ جابر امام حسینؑ کے پہلے زائر ہیں اور چہلم کا موضوع بھی قبر حسینؑ کی زیارت کے علاوہ کچھ نہیں۔ موضوع اہلبیتؑ کا سوگ تازہ کرنا نہیں ہے۔ اور نا ہی اہلبیتؑ کا کربلا میں آنا ہے، اصل میں شام سے مدینہ جانیکا راستہ کربلا سے نہیں گزرتا بلکہ شام سے ہی کربلا جانے کا راستہ الگ اور مدینہ جانے کا راستہ الگ ہے۔

جو چیز انسان کے دل کو تکلیف پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ اتفاق سے تاریخی واقعات میں سے بہت کم واقعے ایسے ہونگے جو حادثہ کربلا کے برابر معتبر ذرائع سے نقل ہونے سے بے نیاز ہوں۔ میں پہلے یہ سمجھتا تھا کہ اس موضوع کے متعلق اس قدر غلط بیانیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ سچے واقعات کون سے

ہیں۔ پھر جب میں نے مطالعہ کیا تو یہ دیکھا کہ بہت پرانی تاریخوں میں تیرہ چودہ صدی پہلے حادثہ کربلا کے برابر کسی واقعے کی تاریخ معتبر نہیں ہے۔ اسلام کے معتبر مورخوں نے پہلی اور دوسری صدی ہی سے واقعات معتبر سندوں کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ یہ بیانات ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے نزدیک ہیں۔ پھر انہیں واقعات کے باعث اس تاریخ کی تفصیلات باقی رہ گئیں۔ اس حادثے کے متن کے محفوظ رہنے اور اس کے مقصد کے پہچانے جانے کا سبب یہ ہے کہ اس حادثے کے متعلق کثیر تعداد میں خطبے دیئے گئے ہیں۔ ان دنوں خطبے دینا آج کے اعلان کا درجہ رکھتا تھا۔ جس طرح آج کل خصوصاً لڑائیوں میں رسمی اعلانات بہترین چیزیں ہوتی ہیں جن سے اصل تاریخ معلوم ہوجاتی ہے اس زمانے میں خطبے بھی ایسے ہی ہوتے تھے چنانچہ خطبوں کی کافی تعداد ملتی ہے۔ اہلبیت علیہ السلام نے حادثہ کربلا سے پہلے، اس کے دوران اور اس کے بعد کوفہ میں، شام میں اور دوسرے مقامات پر خطبے ارشاد کئے ہیں اور ان خطبوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کو یہ بتادیں کہ کیا ہوا، واقعات کیا تھے اور ان کا مقصد کیا تھا اور یہ خود ایک تحریک تھی کہ واقعات دہرائے جائیں۔

واقعہ کربلا کے بارے میں سوال جواب زیادہ ہوئے ہیں اور یہ بھی تاریخ میں درج ہیں جو ہمیں واقعے کی اصلیت بتاتے ہیں۔

کربلا میں رجز بھی بہت پڑھے گئے ہیں خصوصاً حضرت امام حسینؑ نے بہت سے رجز پڑھے اور یہ رجز بھی واقعے کی اصلیت سے آگاہی بخشتے ہیں۔

واقعہ کربلا میں پہلے بھی اور اس کے بعد میں بھی خطوط کا بہت تبادلہ ہوا ہے۔ امامؑ اور کوفے والوں میں خط و کتابت بہت ہوئی ہے۔ امامؑ اور بصرے والوں کے مابین خطوط آئے گئے ہیں۔ امامؑ نے واقعہ کربلا سے پہلے معاویہ کو بھی خط لکھے ہیں۔ (اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ نے معاویہ کے بعد کسی قیام کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلیا تھا)۔ دشمنوں نے بھی آپس میں ایک دوسرے کو خطوط لکھے ہیں۔ یزید نے ابن زیاد کو، ابن زیاد نے یزید کو، ابن زیاد نے عمر سعد کو، عمر سعد نے ابن زیاد کو خطوط لکھے ہیں اور ان سب کے متن تاریخ اسلام میں محفوظ ہیں۔ اس لئے کربلا کے واقعات روشن ہیں۔ اور اوّل سے آخر تک باعث فخر بھی ہیں۔ لیکن ہم نے تاریخ کے اس حادثے کا تابناک چہرہ اس قدر دُھندلا دیا ہے اور امام حسینؑ سے اتنی بڑی خیانت کی ہے کہ اگر امامؑ حسینؑ ظاہری دنیا میں آجائیں اور دیکھیں تو کہیں گے کہ تم نے اس حادثے کا چہرہ بالکل بگاڑ دیا ہے۔ وہ امامؑ حسینؑ جس کی تصویر تم نے اپنے خیال میں بنا رکھی ہے میں نہیں ہوں۔ وہ قاسم بن حسن جس کی تصویر تم نے اپنے خیال میں بنا رکھی ہے میرا بھتیجا نہیں ہے۔ وہ علی اکبر جسے تم نے اپنے تخیل میں بسا رکھا ہے میرا وہ جوان نہیں ہے جو با معرفت تھا۔ میرے وہ اصحاب جنہیں تم نے اپنے خیالات میں قائم کیا ہے میرے اصحاب نہیں ہیں۔ تم نے ایسا قاسم گڑھا ہے جو صرف شادی کا خواہش مند تھا۔ اس کا چچا بھی اسے دولہا بنانے کی آرزو رکھتا تھا۔ تم اس قاسم کا اس قاسم سے موازنہ کرو جو تاریخ میں گزرا ہے۔ معتبر تاریخوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ شب عاشور امامؑ حسینؑ نے اپنے اصحاب کو خیمے میں عند قرب الماء یا اس کے نزدیک خیمے میں جمع کیا اور ان کے سامنے شب عاشور کا وہ مشہور و معروف خطبہ دیا جس کی تفصیل میں دہرانا نہیں چاہتا۔(۱) اس خطبے میں امام حسینؑ ان سے مختصر طور پر کہتے ہیں کہ تم آزاد ہو۔ امامؑ نہیں چاہتے کہ کوئی اپنا چہرہ واجبی دائرے میں ملاحظہ کرے اور اپنے

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۹۲، اعلام الوریٰ صفحہ ۲۳۴، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۱، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۵۷۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک خیمہ تھا جس میں خصوصیت کے ساتھ پانی کی مشکیں رکھی ہوئی تھیں اور پہلے ہی دن سے اس خیمے میں پانی لا لا کر جمع کیا جاتا تھا۔

آپ کو مجبور پائے۔ حتی کہ کوئی یہ سمجھے کہ بیعت کے حکم کے تحت اس کے لئے رہنا ضروری ہے اس لئے فرماتے ہیں میں نے تم سب کو آزاد کردیا ہے میرے سب دوستوں، رشتہ داروں، بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کو۔ دشمنوں کو میری ذات کے علاوہ کسی اور سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اندھیری رات ہے اس لئے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاؤ اور چلے جاؤ۔ دشمن بھی تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ آپ شروع میں ان لوگوں کی تعریف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ میں تم سے بہت زیادہ خوش ہوں۔ میں نے اپنے اصحاب سے بہتر کسی کے اصحاب نہیں دیکھے۔ میرے اہلبیتؑ سے بہتر کسی کے اہلبیتؑ نہیں دیکھے ہیں۔ اس کے باوجود سب ایک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ آقا! کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ہم پیغمبر کو کیا جواب دیں گے؟ وفا کہاں چلی گئی؟ انسانیت کہاں چلی گئی؟ محبت کہاں گئی؟ ہمدردی کیا ہوئی؟ اور پھر انھوں نے ایسی ایسی جذباتی باتیں کیں جس سے سچ مچ پتھر جیسا سخت اور شقی دل بھی رو پڑے۔ اور انسان میں طوفان برپا کردیئے۔ ایک کہتا ہے۔ کیا ان باتوں کے سامنے ایک جان بھی کوئی قیمت رکھتی ہے جسے کوئی آپ کی ذات پر قربان کرنا چاہے؟ کاش! میں ستر بار زندہ ہوتا اور ستر بار آپ پر قربان ہوتا!۔ دوسرا کہتا ہے ہزار بار۔ ایک اور کہتا ہے اے کاش! ایسا ممکن ہوتا کہ میں اپنی جان آپ پر قربان کرتا پھر میرا جسم پھونک کر خاکستر بنا دیتے بعد میں خاکستر کو ہوا میں اڑا دیتے اور مجھے دوبارہ زندہ کرتے اور پھر..... سب سے پہلے جس نے بات کی وہ آپ کے بھائی ابوالفضل العباسؑ تھے بعد میں تمام بنی ہاشم۔ جب یہ باتیں ہو چکیں تو امامؑ نے موضوع بدلا اور آنے والے دن کے حقائق اور واقعات بتائے۔ انہیں ان کے مارے جانے کی خبر سنائی جسے ان سب نے ایک بڑی خوش خبری کے طور پر اشتیاق سے سنا۔ اسی جوان (قاسم) نے جس پر ہم اس قدر ظلم کرتے ہیں اور شادی ہی کو اس کی آرزو سمجھتے ہیں سوال کیا۔ گویا اس

نے خود بتادیا اور ظاہر کردیا کہ اسکی آرزو کیا ہے؟ جس وقت بہت سے لوگ مجلس میں بیٹھتے ہیں تو تیرہ سال کا بچہ انکے برابر نہیں بیٹھتا بلکہ ان لوگوں کے پیچھے بیٹھتا ہے۔

تو یہ بچہ بھی اور لوگوں کے پیچھے بیٹھا ہوا بار بار اچک اچک کر دیکھتا تھا کہ دیکھوں لوگ کیا کہتے ہیں۔ جس وقت امامؑ نے فرمایا کہ تم سب مارے جاؤ گے۔ یہ بچہ بھی دل میں سوچنے لگا کہ ان سب میں میں بھی شامل ہوں گا یا نہیں؟ میں تو بچہ ہوں۔ شاید آقا کا یہ خیال ہے کہ بڑے مارے جائیں گے اور میں ابھی کم عمر ہوں اس لئے اس نے آقا سے مخاطب ہو کر پوچھ ہی لیا: "وانافی من یقتل؟" میں بھی مارا جاؤنگا یا اب آپ غور فرمائیں کہ بچے کی آرزو کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا۔ "پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دیدو"۔ میں تمہارے سوال کا جواب بعد میں دونگا۔ میں سوچتا ہوں کہ آقا نے یہ سوال خاص طور پر کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ سوال جواب سب کے سامنے ہو جائیں تاکہ لوگ آئندہ یہ نہ خیال کریں کہ اس جوان نے نادانستہ طور پر اور نہ سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو موت کے حوالے کردیا اور نہ یہ کہیں کہ اس جوان کو شادی کی آرزو تھی، اس کے لئے حجلہ بالکل تیار نہ کریں، مجرم نہ بنیں، اس لئے آقا نے فرمایا کہ پہلے میں سوال کرتا ہوں۔ "کیف الموت عندك؟" بیٹا! موت تمھارے نزدیک کیسی ہے" اس نے فوراً جواب دیا: احلی من العسل" شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ اگر آپ مجھ سے پوچھتے ہیں تو میرے نزدیک موت شہد سے بھی زیادہ شیریں ہے یعنی مجھے اس آرزو سے زیادہ اور کوئی آرزو عزیز اور پیاری نہیں لگتی۔ یہ منظر کسقدر دل ہلا دینے والا ہے۔ یہی باتیں تو ہیں جنھوں نے اس سانحے کو تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ بنا ڈالا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس سانحے کو ہمیشہ کیلئے زندہ اور تازہ رکھیں کیونکہ اب نہ کوئی حسینؑ پیدا ہوگا اور نہ کوئی قاسم بن حسنؑ۔ اسی وجہ سے اسے اتنی اہمیت اور وقعت حاصل ہوگئی ہے۔ ہم نے انہیں نہیں پہچانا۔ اگر چودہ صدیوں کے بعد انکے نام

سے ایک امامؑ بارگاہ (۱) بنا لیا تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اگر ہم پہچانتے تو حضرت قاسم کی شادی کی آرزو پر وقت صرف نہ کرتے۔ پیسہ خرچ کرنا نہیں پڑتا، امامؑ بارگاہ بنانی نہیں پڑتی، ایسی تقریریں نہ کرتے کیونکہ یہ لوگ انسانیت کا جوہر ہیں۔ "انّی جاعل فی الارض خلیفة" (۲) کا مصداق ہیں اور فرشتوں سے بالاتر ہیں۔ امامؑ نے یہ جواب سننے کے بعد فرمایا: بیٹا! تم بھی قتل ہوگے، "بعد ان تبلوببلاء" عظیم لیکن تمہارا جان دینا دوسروں سے مختلف ہوگا اور بہت بڑی مصیبت پیدا کر دیگا۔ اس لئے عاشور کے دن انہیں بہت زیادہ اصرار کے بعد میدان جنگ میں جانے کی اجازت ملی۔ چونکہ کمسن تھے اسلئے انکے جسم کیلئے موزوں زرہ نہیں تھی۔ انکے سر کیلئے موزوں خود نہیں تھا۔ انکے جسم کے مطابق ہتھیار اور جوتے نہیں تھے۔ لکھا ہے کہ ایک عمامہ سر پر تھا۔ "کانه فلقته القمر" (۳) اتنا ہی لکھا ہے کہ یہ بچہ اس قدر خوب صورت تھا کہ دشمن کو بھی کہنا پڑا کہ چاند کا ٹکڑا ہے۔

"بر فرس تندرو ہر کہ ترا دید گفت"

تجھے جس کسی نے تیز چلنے والے گھوڑے پر دیکھا وہ کہنے لگا

"برگ گل سرخ را باد کجامی برد"

ہوا سرخ گلاب کا پھول کہاں لئے جاتی ہے

راوی کہتا ہے: میں نے دیکھا کہ اس کے ایک جوتے کا بند کھلا ہوا ہے۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اس کا بایاں پیر تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیروں میں تسمہ نہیں تھا۔ لکھا ہے کہ امامؑ خیمے کی ایک جانب کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ میں اپنے گھوڑے کی لگام تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انتظار کر رہے ہیں کہ یکایک ایک

۱۔ حسینیہ ارشاد، شہر ان مراد ہے ۲۔ سورۂ بقرہ آیت ۳۰

۳۔ مناقب شہر آشوب جلد ۳ صفحہ ۱۰۶ اور ایسی ہی عبارت کے لئے دیکھئے اعلام الوری صفحہ ۲۴۲، اللہوف صفحہ ۴۸، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۳۵، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۹، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۳۱، اور تاریخ طبری صفحہ ۲۰۶

فریاد سنی۔ لکھا ہے کہ امامؑ ایک شکاری باز کی طرح گھوڑے پر سوار ہو کر جھپٹے۔ وہ فریاد قاسم بن حسنؑ کی فریاد "یا عماہ" (اے چچا جان) تھی۔ جس وقت امامؑ اس جوان کے سرہانے پہنچے ہیں تقریباً دو سو اشقیاء نے گھیر رکھا تھا۔ امامؑ نے حملہ کیا تو وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے لیکن ان میں سے ایک دشمن جو گھوڑے سے اس لئے اتر آیا تھا کہ جناب قاسم کا سر کاٹ لے اس ہلّے میں اپنے ساتھیوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں میں آکر کچل گیا۔ وہ جس کے لئے یہ کہتے ہیں کہ عاشور کے دن گھوڑوں کی ٹاپوں میں زندہ کچل گیا وہ یہی دشمن تھا۔ حضرت قاسم نہیں تھے۔ امامؑ جس وقت حضرت قاسم کے سرہانے پہنچے ہیں اس وقت دھول بہت اڑ رہی تھی اور کوئی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ صورت حال کیا ہے۔؟ جب دھول بیٹھی تو سب نے یکایک دیکھا کہ امامؑ حضرت قاسم کے سرہانے بیٹھے ہیں اور ان کا سر اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔ لوگوں نے امامؑ کا یہ جملہ سنا: "یعزالله علی عمّك ان تدعوه فلا یجیبك او یجیبك فلا ینفعك صوته" (۱) اے بھتیجے! تیرے چچا کو اس کا سخت صدمہ ہے کہ تو اسے بلائے اور وہ تجھے جواب نہ دے پائے یا جواب بھی دے تو تیرے کسی کام نہ آسکے۔ اسی حالت میں یکایک اس جوان کی روح پرواز کر گئی۔

اے خدا ہم سب کا انجام بخیر کر۔ ہم کو اسلام کے حقائق سے آگاہ کر۔

ان جہالتوں اور نادانیوں کو اپنے لطف و کرم سے ہم سے دور فرما دے۔

ہم سب کو عمل اور خلوص نیت کی توفیق عطا فرما۔

ہماری جائز حاجات پوری کر۔ ہمارے تمام مُردوں کو بخش دے اور معاف کر دے۔

لا حول و لا قوّة الاّ باللّٰه العلی العظیم

و صلّ اللّٰه علیٰ محمد و آله الطّاہرین

۱۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۷۷، اللہوف صفحہ ۳۸، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۳۵، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۹، اعلام الوری صفحہ ۲۴۳، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۳۲، تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۲۵۷

دوسری مجلس

تحریف کے اسباب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فبما نقضهم مّیثاقهم لعنهم و جعلنا قلوبهم قسیة یحرّفون الکلم عن موٰضعه و نسوٗا حظّا مما ذکروا به (۱)

ہم نے کہا ہے کہ عاشور کے واقعے میں تحریفیں ہوئی ہیں۔ لفظی تحریفیں بھی اور معنوی تحریفیں بھی اور انہیں تحریفوں نے اس بڑی تاریخی سند اور اس بڑے تربیتی سرچشمے کو بے اثر یا کم اثر بنا دیا ہے بلکہ کبھی کبھی تو اس کا اثر الٹا بھی پڑ جاتا ہے لہذا ہم سب کا یہ ایک اہم اور عام فریضہ ہے کہ اس پاک سند سے ان تحریفوں کو دور کر دیں جنہوں نے اسے آلودہ کر دیا ہے۔ آج کی رات میں تحریف کے اسباب کے متعلق گفتگو کروں گا اور اس کے بعد اس حادثے کی معنوی تحریفوں کے بارے میں گفتگو ہو گی۔

تحریف کے اسباب :

یہ اسباب دو قسم کے ہیں : ایک قسم عام ہوتی ہے یعنی مجموعی طور پر ایسے اسباب موجود ہیں جو تاریخ میں تحریف کرتے ہیں ان کے لئے کربلا کے حادثے ہی کی

۱۔ سورہ مائدہ آیت ۱۳

تحریفیں نہیں مثلاً دشمنوں کے مقاصد بجائے خود ایک ایسا سبب ہیں جو حادثے میں تحریف کر ڈالتے ہیں۔ دشمن اپنی غرض پوری کرنے اور مقاصد حاصل کرنے کے لئے تاریخ میں تبدیلیاں کرتا ہے یا تاریخ کی غلط تشریح اور تفسیر کرتا ہے اور یہ مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ میں ان کے بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا البتہ اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ حادثہ کربلا کی تحریف میں بھی ان اسباب کا دخل رہا ہے یعنی حسینی تحریک کی تحریف پر دشمن کمر بستہ ہو کر نکل آئے اور جیسا کہ دنیا کا دستور ہے کہ دشمن پاکیزہ تحریکوں کے بارے میں گڑبڑ پیدا کرنے، اور اختلاف شروع کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ اموی حکومت نے بھی بہت کوشش کی کہ حسینی تحریک کو اسی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کرے۔

چنانچہ پہلے ہی دن سے ایسے پروپیگنڈے شروع ہو گئے۔ مسلم بن عقیل جیسے ہی کوفہ پہنچتے ہیں یزید اس حکم نامے میں جس کے مطابق وہ ابن زیاد کو حاکم کوفہ مقرر کرتا ہے، لکھتا ہے : مسلم بن عقیل کوفہ پہنچ گئے ہیں اور ان کا قصد مسلمانوں میں گڑبڑ پھیلانا اور پھوٹ ڈالنا ہے۔ تو وہاں پہنچ کر ان کو کچل ڈال۔ جس وقت مسلم گرفتار کر کے ابن زیاد کی حویلی میں لائے جاتے ہیں ابن زیاد مسلم سے کہتا ہے۔ اے عقیل کے بیٹے ! تمہارے اس شہر میں آنے کا کیا سبب ہے؟ یہاں کے لوگ آرام اور اطمینان سے رہ رہے تھے، تم آئے تو تم نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ پھوٹ ڈالی اور گڑبڑ پھیلا دی۔ مسلم نے بھی جرأت سے جواب دیا :

اول تو میں اس شہر میں خود نہیں آیا۔ اس شہر کے لوگوں نے مجھے بلایا۔ بہت سے خطوط لکھے اور وہ سب خطوط موجود ہیں۔ ان میں انہوں نے لکھا ہے کہ تیرے باپ زیاد نے جتنے سال یہاں حکومت کی نیک لوگوں کو قتل کیا، بروں کو اچھوں پر مسلط کیا اور عوام پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ ان لوگوں نے ہمیں اس لئے بلایا ہے کہ

ہم ان کے لئے انصاف مہیا کریں۔ ہم عدل قائم کرنے کے لئے آئے ہیں۔ چونکہ اموی حکومت نے معنوی تحریف کی تھی اس لئے اس قسم کے بہت سارے واقعات بیان کئے ہیں لیکن اسلامی تاریخ پر اس تحریف کا اثر نہیں پڑا۔ آپ کو دنیا بھر میں کوئی ایک مؤرخ اور صاحب نظر بھی ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہے کہ حسینؑ بن علیؑ نے نعوذباللہ بے جا قیام کیا تھا۔ لوگوں میں پھوٹ ڈالنے اور ان کا ایکا ختم کرنے کے لئے آئے تھے۔ نہیں ! دشمن حادثہ کربلا میں کوئی تحریف نہ کرسکا حادثہ کربلا میں جتنی تحریف ہوئی ہے بد قسمتی سے دوستوں ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔

دوسرا سبب :

دوسرا سبب انسان کا افسانہ گھڑنے اور کہانیاں کہنے کا رجحان ہے اور یہ پوری دنیا کی تاریخ میں ملتا ہے۔ انسان میں ایک ہیرو پرستی کا جذبہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ قومی اور مذہبی شخصیتوں کے بارے میں دینی افسانے تراشتا رہتا ہے۔(۱) اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ لوگوں نے بو علی سینا اور شیخ بہائی جیسے نابغۂ روزگار لوگوں کے لئے بہت سے افسانے گھڑ ڈالے ہیں۔ بو علی سینا بلا شک و شبہ ایک نابغۂ روزگار تھے اور ان کے جسمانی اور روحانی قویٰ ایک غیر معمولی پہلو رکھتے تھے تاہم انہیں کی وجہ سے لوگوں نے ان کے متعلق داستانیں بنا ڈالیں مثلاً یہ کہ بو علی سینا نے ایک آدمی کو ایک فرسنگ کے فاصلے سے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ یہ شخص روغنی روٹی (گھی میں تلی ہوئی روٹی) کھا رہا ہے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ روٹی کھا رہا ہے اور روٹی بھی گھی میں تلی ہوئی ہے ؟ انہوں نے کہا اس لئے کہ میں روٹی کے آس

۱۔ ڈاکٹر شریعتی نے عید غدیر کی راتوں میں اس جذبے کے متعلق ایک بہت عمدہ تقریر کی تھی جس کے تحت انسان میں کہانی کہنے ،افسانہ گھڑنے، ہیرو بنانے اور ہیرو کے غیر معمولی گن گانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

پاس مکھیاں اڑتے دیکھ رہا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی روٹی تلی ہوئی ہے جو مکھیاں اس کے آس پاس چکر کاٹ رہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ افسانہ ہے۔ جو شخص ایک فرسنگ سے مکھی دیکھ سکتا ہے وہ روٹی کا روغن مکھیوں سے بھی جلدی دیکھ سکتا ہے۔

یا کہتے ہیں کہ بو علی سینا جس زمانے مین اصفہان میں پڑھتے تھے انھوں نے بتایا تھا کہ میں آدھی رات کو جب پڑھنے کے لئے اٹھتا ہوں تو کاشان کے آہنگروں کے ہتھوڑوں کی آوازیں مجھے پڑھنے نہیں دیتیں۔ لوگ گئے اور انھوں نے خود جا کر دیکھ لیا تو یہ حکم جاری کردیا کہ کاشان کے ٹھٹھیرے اور لوہار ہتھوڑے نہ چلائیں۔ بعد میں بو علی سینا نے بتایا کہ اس رات کو میں آرام سے سویا میں نے آرام سے مطالعہ کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی افسانہ ہے۔

لوگوں نے شیخ بہائی کے متعلق بھی بہت سی کہانیاں بنا ڈالی ہیں۔ اس قسم کی باتیں عاشور کے حادثے ہی سے مخصوص نہیں ہیں۔ لوگ بو علی سینا کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں کہیں۔ اس سے کسے نقصان پہنچ سکتا ہے ؟ کسی کو نہیں۔ لیکن ایسے لوگ جن کی شخصیتیں رہنما شخصیتیں ہیں جن کے قول، فعل، قیام اور تحریک عوام کے لئے سند اور حجت ہیں ان کی باتوں، شخصیتوں اور تاریخوں میں تحریف نہیں ہونی چاہئے۔ ہم شیعوں نے حضرت علیؑ کے بارے میں کتنے افسانے گھڑے ہیں ! علیؑ کے غیر معمولی انسان ہونے میں کسی کو عذر نہیں۔ ان کی شجاعت میں کسی کو شبہ نہیں۔ دوست اور دشمن سبھی مانتے ہیں کہ علیؑ کی شجاعت غیر معمولی تھی۔ علیؑ نے جس میدان جنگ میں اور جس پہلوان سے مقابلہ کیا اسے پچھاڑا لیکن کیا افسانہ سازوں نے اسی پر قناعت کی ؟ ہرگز نہیں۔ مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ علیؑ خیبر کی لڑائی میں مرحب پہلوان کے مقابلے میں گئے۔ مرحب کتنا زبردست پہلوان تھا۔ مؤرخوں نے بھی لکھا کہ علیؑ نے جیسے ہی اس پر وار کیا اس کے دو ٹکڑے ہوگئے (نہ جانے یہ دو ٹکڑے دو برابر کے

ادّھے تھے یا نہیں) لیکن اس پر لوگوں نے ایسی ایسی باتیں بنائی ہیں اور ایسے ایسے افسانے گھڑے ہیں جو مذہب کو اُکھاڑ ڈالتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جبرئیل کو حکمِ پروردگار ہوا کہ فوراً زمین پر پہنچو۔ اگر علی کی تلوار زمین پر گری تو زمین کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے اور اس گائے اور مچھلی تک جا پہنچے گی جن پر زمین ٹکی ہوئی ہے۔ اپنا پر علیؑ کی تلوار کے نیچے بچھادو۔ جبرائیل گئے اور ویسا ہی کیا۔ علیؑ نے بھی ایسا وار کیا کہ مرحب کے دو ٹکڑے ہوگئے۔وہ دونوں ٹکڑے کیا تھے کہ پورے پورے ادھے تھے، اگر انہیں ترازو میں رکھ کر تولتے تو دونوں پلڑے برابر بیٹھتے۔ علیؑ کی تلوار سے جبرائیل کے پر میں زخم آگیا۔ چالیس دن اور چالیس رات تک وہ آسمان پر نہیں جا سکے۔چالیس دن کے بعد جیسے ہی آسمان پر پہنچے اللہ نے سوال کیا کہ چالیس دن تک کہاں رہے۔؟ اے میرے پروردگار ! میں زمین پر تھا۔ تونے ہی تو میری ڈیوٹی لگائی تھی۔ جلدی کیوں نہیں پلٹے۔؟ اے خدا ! جیسے ہی علی کی تلوار گری اس نے میرا پر زخمی کردیا۔میں ان چالیس دنوں تک اس کی مرہم پٹی کرتا رہا۔ ایک اور شخص کہتا ہے کہ علیؑ کی تلوار اتنی پھرتی اور نرمی سے مرحب کا سر چیرتی ہوئی گھوڑے کی کاٹھی کے نمدے میں اتر گئی کہ علیؑ نے تلوار نکال بھی لی اور مرحب کو خبر بھی نہیں ہوئی! بولا اے علی !بس تمہارا زور اتنا ہی تھا؟ (اس نے سوچا کہ وار کاری نہیں لگا ہے) تمہاری ساری پہلوانی بس یہیں تک تھی؟ علیؑ نے کہا :ذرا ہل کے تو دکھا۔ مرحب نے جیسے ہی اپنے آپ کو ہلایا۔ آدھا جسم ایک طرف گر پڑا اور آدھا دوسری طرف !

یہ مرد بزرگ وار یعنی حاجی نوری اپنی کتاب" لُو لُو و مرجان "میں اس قسم کے افسانوں کی گھڑت پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں : حضرت ابو الفضل العباس کی شجاعت کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ انھوں نے جنگ صفین میں (جس میں ان کی شرکت کرنے کا کوئی علم نہیں ہے اور اگر انہوں نے شرکت کی بھی ہوگی تو وہ اس

وقت پندرہ سال کے ہوں گے) ایک آدمی کو ہوا میں اچھالا پھر دوسرے کو پھر تیسرے کو غرض اسی طرح اسّی(۸۰) آدمی اچھالتے چلے گئے۔ جب آخری آدمی کو اچھال چکے تو پہلا آدمی ہوا سے نیچے آیا اور آپ نے تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کردیئے پھر دوسرا گرا تو اس کے دو ٹکڑے کر دئے پھر تیسرا اور پھر چوتھا غرض اسی طرح انھوں نے اسّی آدمی تہ تیغ کر ڈالے۔

حادثہ کربلا میں جو تحریفیں ہوئی ہیں ان میں سے کچھ افسانہ سازی کے جذبے کے تحت ہوئی ہیں۔ یورپ والے کہتے ہیں کہ مشرقی ملکوں کی تاریخ میں مبالغے اور گپیں بہت ہیں اور وہ سچ بھی کہتے ہیں۔ ملا آقائے دربندی نے "اسرارالشہادۃ" میں لکھا ہے :عمر سعد کی گھوڑسوار فوج میں چھ لاکھ سوار اور پیدل فوج میں دو کروڑ سپاہی تھے۔اس طرح لشکریوں کی کل تعداد دو کروڑ چھ لاکھ تھی اور وہ سب کے سب کوفہ کے رہنے والے تھے۔ تو کیا کوفہ اتنا بڑا شہر تھا؟ کوفہ ایک نو آباد شہر تھا۔ جسے بسے ہوئے اس وقت تک پینتیس سال بھی نہیں گزرے تھے۔ کیونکہ کوفہ (حضرت) عمر بن خطاب کے زمانے میں بسایا گیا تھا۔اس کے بسانے کا حکم (حضرت) عمر نے دیا تھا۔ تاکہ ایران کے قریب اسلامی فوج کا ایک مرکز قائم ہوجائے۔ اس وقت نجانے کوفہ کی کل آبادی ایک لاکھ آدمیوں پر بھی مشتمل تھی یا نہیں۔ یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ عاشور کے دن کربلا میں دو کروڑ اور چھ لاکھ سپاہی جمع ہو جائیں اور ان میں سے تین لاکھ کو حسین ابن علیؑ تلوار کے گھاٹ اتار دیں۔ یہ بات حادثہ کربلا کی ساکھ کو بالکل ختم کردیتی ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک شخص ہرات کے بارے میں گپ اڑایا کرتا تھا اور کہتا تھا : ہرات ایک زمانے میں بہت بڑا شہر تھا۔ لوگوں نے پوچھا کتنا بڑا تھا؟ اس نے جواب دیا :ایک وقت میں وہاں اکیس ہزار کانے احمد نانبائی رہتے تھے۔ اب وہاں کتنے لوگ ہونے

چاہئیں اور ان میں سے کتنے احمد ہوں پھر کتنے احمد کانے ہوں جن میں انیس ہزار کانے احمد نابینائی ہونگے!

افسانہ سازی کے اس جذبے نے بہت کام کئے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ایک مقدس سند کو افسانہ سازوں کے اختیار میں نہ دیں۔ "فان فینا اہل البیت فی کل خلف عدو لا ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین و تاویل الجاہلین۔"(۱) یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہرات کے لئے جو چاہے جو کچھ کہے لیکن کیا یہ بات درست ہے کہ واقعہ عاشور کی تاریخ میں بھی جس کو ہم بطور معمول ہر سال ایک مکتب کی حیثیت سے زندہ اور تازہ کرتے ہیں یہ سب افسانویت داخل ہو جائے۔

تیسرا سبب:

تیسرا سبب ایک خاص سبب ہے۔ یہ دو اسباب جو میں نے عرض کیے ہیں یعنی دشمنوں کے اغراض و مقاصد اور انسان کا افسانہ سازی کا جذبہ دنیا کی تمام تاریخوں میں ملتے ہیں البتہ عاشور کے حادثے میں ایک خاص بات ہے جس نے اس قصے میں بناوٹ اور گھڑت داخل کردی ہے۔

رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ کے زمانے سے مذہبی پیشوا سخت تاکید کرتے چلے آرہے ہیں کہ حسین بن علیؑ کا نام زندہ رکھا جائے۔ حسینؑ کی مصیبت ہر سال تازہ کی جائے۔ کیوں؟ اسلام میں یہ کیا قاعدہ ہے۔ دینی پیشواؤں نے اس موضوع کا اتنا اہتمام کس لئے کیا ہے اور حسین بن علیؑ کی زیارت کی اتنی ترغیب کیوں دی جاتی ہے؟ آپ کو اس بات پر اتنا غور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ

۱۔ اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۳۲ کتاب فضل علم، بصائر الدرجات صفحہ ۱۰

اس کا سبب حضرت خاتون جنتؑ کو تسلیت یعنی پرسا دینا ہے۔ کیا یہ مذاق کی سی بات نہیں ہے کہ چودہ سو سال کے بعد بھی ابھی تک حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو پرسے کی ضرورت ہے جبکہ خود امام حسینؑ کے فرمان کے مطابق اور دین کی ضرورت کے حکم سے شہادت کے بعد امام حسینؑ اور حضرت زہراؑ دونوں ایک دوسرے کے پاس ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے؟ کیا حضرت زہراؑ کوئی بچہ ہیں جو چودہ سو سال کے بعد بھی اب تک روتی پیٹتی رہیں اور ہم جاکر انہیں تسلیت اور دلاسا دیں؟ یہی باتیں تو دین کو خراب کرتی ہیں! امامؑ حسینؑ نے اسلام کا عملی مکتب قائم کیا۔ حسینؑ اسلامی قیام کا عملی نمونہ ہیں۔ لوگوں نے چاہا کہ حسینؑ کا مکتب زندہ رہے چاہا کہ حسینؑ سال میں ایک بار انہیں میٹھی، بلند اور رزمیہ آوازوں کے ساتھ جھلک دکھائیں اور فریاد کریں "الاقرون انّ الحقّ لا یعمل به و انّ الباطل لا یتناہی عنه لیرغب المؤمن فی لقاء اللّٰہ محقا۔" (۱) انھوں نے چاہا کہ "الموت اولی من رکوب العار" (۲) موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ ہمیشہ کے لئے زندہ رہے۔ انھوں نے چاہا تھا "لا اری الموت الاّ سعادۃ و الحیاۃ مع الظّالمین الاّ برماً" (۳) (میرے نزدیک ظالموں کے ساتھ زندگی تھکا دینے والی ہے۔ موت، میری نظر میں ایک سعادت ہے۔) لوگ چاہتے تھے کہ حسینؑ کے اور فقرے بھی: "خطّ الموت علی ولد آدم

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۸۱، تحف العقول صفحہ ۱۷۶، اللہوف صفحہ ۳۳، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۵

۲۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۱۰، اللہوف صفحہ ۵۰، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۵۰، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۳۲

۳۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۸۱، اللہوف صفحہ ۳۳، تحف العقول صفحہ ۱۷۶

مخطّ القلادة علی جید الفتاة" (۱) زندہ رہے۔ "بیھات منّا الذلة"(۲) زندہ رہے۔ انھوں نے چاہا کہ ایسے مناظر زندہ رہیں کہ حسینؑ آتے ہیں۔ تیس ہزار کے لشکر کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں اور حال یہ ہے کہ سخت مصیبت اور پریشانی کے باوجود ایسی جوانمردی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو دنیا نے کبھی نہیں دیکھا۔ فرماتے ہیں "الا وان الدعی ابن الدعی قدزکزبین الثنتین بین السلته والذلة و بیھات منآ الذلّة یابی اللّٰہ ذالك لنا ورسوله والمؤمنون وحجورطابت وطھرت"(۳) انھوں نے چاہا کہ حسینؑ کا مکتب زندہ رہے۔ حسینؑ کی تربیت زندہ رہے۔ حسینؑ کی روح اس قوم پر عکس افگن رہے اور چمکے۔ ان کا نظریہ بہت واضح ہے۔

عاشور کے حادثے کو فراموش نہ ہونے دو۔ تمہاری زندگی اور انسانیت کی زندگی اور تمہارا وقار اس حادثے سے وابستہ ہے۔ اس وسیلے سے تم اسلام کو زندہ رکھ سکتے ہو۔ چنانچہ انہوں نے تمہیں رغبت دلائی ہے کہ حسینؑ کا سوگ قائم رکھو۔ اور یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ واقعی حسینؑ بن علیؑ کے سوگ کا نظریہ بالکل درست ہے۔ یہ نظریہ بہت بلند بھی ہے۔ ہم اس باب میں جتنی بھی کوشش کریں بجا ہے بشرطیکہ ہم اس کام کا مقصد پہچان لیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اسے نہیں پہچانا۔ انھوں نے سوچا کہ لوگوں کو حسینؑ کے مکتب سے واقف کرائے بغیر ہی قیام حسینؑ کے نظریہ سے واقف کرادیں۔ لوگوں کو حسینؑ کے مراتب سے واقف کرادیں۔ بس

۱۔ بحارالانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۶۶، اللہوف صفحہ ۲۷

۲۔ اللہوف صفحہ ۴۱، قتل الحسین خوارزی جلد ۲ صفحہ ۷، تاریخ شام ابن عساکر جلد ۴ صفحہ ۳۳۳، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۸۷ ملحقات احقاق الحق جلد ۱۱ صفحہ ۶۲۴، ۶۲۵، نفس المہموم صفحہ ۱۴۹، تحف العقول صفحہ ۱۷۴

۳۔ ایضاً

اسی قدر کہ مجلس میں آئیں بیٹھیں اور بغیر جانے اور سمجھے روئیں، گناہوں کا کفارہ ہے۔

مرحوم حاجی نوری نے اپنی کتاب 'لؤلؤ مرجان' میں ایک نقطہ بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے کہا امام حسینؑ کے موضوع اور ان پر رونے کا اتنا زیادہ ثواب ملتا ہے کہ جس طریقے اور وسیلے سے بھی یہ کام ہو سکے اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہئے۔ آج کل کے "مکیاولی" مکتب میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ مقصد وسیلے کو جائز بنادیتا ہے۔ یعنی مقصد اچھا ہو تو وسیلہ جو بھی ہو ہوا کرے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمارا مقصد پاک اور پاکیزہ ہے اور وہ امام حسینؑ کے مصائب پر رونا ہے۔ یہ بہت اچھا کام ہے اور رونا چاہئے۔ لیکن ہم کس وسیلے سے روئیں؟ جس وسیلے سے بھی ممکن ہو۔ مقصد پاک ہے تو وسیلہ جو بھی ہو ہوا کرے۔ اگر ہم المیہ ڈرامہ کریں تو ایک توہین آمیز ڈرامہ درست ہے یا نہیں؟ انھوں نے کہا کہ آنسو نکلیں یا نہ نکلیں؟ پس جتنے بھی آنسو جاری ہو جائیں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم سینہ بجائیں، ڈھول بجائیں، گناہ کریں، مردوں کو زنانی پوشاک پہنائیں، قاسم کی شادی رچائیں، دھوکا دیں۔ تحریف کریں۔ امام حسینؑ کی بارگاہ میں ان باتوں کی مخالفت نہیں ہے۔ امام حسینؑ کی بارگاہ اوروں کی بارگاہ سے مختلف ہے۔ اس میں جھوٹ بولنا معاف ہے۔ اپنی طرف سے گھڑت کرنا، تحریف کرنا، تصویریں بنانا، مردوں کو زنانہ لباس پہنانا معاف ہے۔ یہاں آپ جو گناہ بھی کریں معاف ہے۔ مقصد بہت پاک ہے ان خیالات کے تحت لوگوں نے اس معاملے میں ایسے ایسے جعل کئے اور ایسی ایسی تحریفیں کیں کہ انسان مبہوت رہ جاتا ہے۔

دس پندرہ سال پہلے میں اصفہان گیا تھا وہاں ایک بزرگ تھے مرحوم حاجی شیخ محمد حسن نجف آبادی اعلی اللہ مقامہ۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک

روایت جو نئی نئی ایک جگہ سنی تھی اور اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی ان کے سامنے دہرائی۔ جو شخص یہ روایت سناتا تھا وہ اتفاق سے اینجی بھی تھا۔ اس نے یہ روایت پڑھی اور لوگوں کو اس قدر رلایا جس کی کوئی حد نہیں۔ وہ ایک بوڑھی عورت کا قصہ سناتا تھا کہ وہ متوکل کے زمانے میں امامؑ حسینؑ کی زیارت کو جانا چاہتی تھی جس سے اس زمانے میں روکتے تھے اور لوگوں کے ہاتھ کاٹ ڈالتے تھے۔ اس نے یہ قصہ یہاں تک بیان کیا کہ اس عورت کو پکڑ کر لے گئے اور دریا میں ڈال دیا۔ اس وقت اس عورت نے فریاد کی اے ابو الفضل العباس ! مدد کیجئے۔ جیسے ہی وہ ڈوبنے کو ہوئی آپ کی سواری آئی اور آپ نے فرمایا۔ میرے گھوڑے کی رکاب تھام لے۔ اس نے رکاب پکڑ لی۔ آپ نے پوچھا اپنے ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتی؟ وہ بولی میرے جسم میں ہاتھ ہی نہیں ہیں۔ لوگ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

مرحوم حاجی شیخ محمد حسن نے اس قصے کی تاریخ یوں بیان کی ہے کہ ایک دن بازار کے قریب، صدر مدرسے کے نزدیک (واقعہ ان سے پہلے گزر چکا تھا اور انہوں نے معتبر لوگوں سے سن کر بیان کیا تھا) مصائب حسینؑ کی ایک مجلس تھی جو اصفہان کی ایک بڑی مجلس شمار ہوتی تھی جس میں مرحوم حاجی ملا اسماعیل خواجوی بھی جو اصفہان کے بہت بڑے عالم تھے شرکت کر رہے تھے۔ ایک مشہور واعظ کہتا تھا کہ میں آخری ذاکر تھا۔ دوسرے ذاکر آتے رہے اور لوگوں کو رلانے کے لئے اپنا اپنا ہنر دکھاتے رہے۔ جو کوئی آتا تھا وہ دوسرے سے بڑھ کر کوشش کرتا تھا اور پھر منبر سے اتر کر بیٹھ جاتا تھا تاکہ اپنے بعد کے دوسرے ذاکر کا ہنر دیکھے۔ مجلس ظہر کے وقت تک چلتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ جس کسی کے پاس جتنا ہنر تھا وہ اس نے دکھا دیا۔ لوگوں کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ اب میں نے سوچا کہ میں کیا کروں؟ وہیں اور اسی وقت میں نے یہ قصہ گھڑ ڈالا، منبر پر گیا۔ یہ قصہ بیان کیا اور سب سے بڑھ گیا۔ اسی

دن عصر کے وقت میں ایک اور مجلس میں گیا جو چار سوق میں تھی۔ میں نے دیکھا کہ مجھ سے پہلے جو ذاکر تقریر کر رہا تھا وہ یہی قصہ سنا رہا تھا رفتہ رفتہ لوگوں نے یہ قصہ کتابوں میں لکھا اور چھاپ بھی دیا۔ یہ بات کہ امامؑ حسینؑ کی بارگاہ ایک مختلف بارگاہ ہے اس لئے لوگوں کو رلانے کا ہر وسیلہ کام میں لانا چاہئے۔ ایک وہم، ایک غلط خیال، ایک غلطی اور گھڑت اور تحریف کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

یہ بزرگ یعنی حاجی نوری مرحوم جو حاج شیخ عباس قمی مرحوم کے استاد تھے اور حاج شیخ عباس پر بھی فضیلت رکھتے تھے خود حاج شیخ عباس اور دوسرے علماء کے اعتراف کے مطابق غیر معمولی عالم اور متقی انسان تھے۔ انہوں نے یہ بات اپنی کتاب میں پیش کی ہے کہ اگر یہ قول ٹھیک ہے کہ مقصد وسیلے کو جائز کر دیتا ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اسلام کا ایک مقصد مومن کے دل میں خوشی پیدا کرنا ہے یعنی انسان وہ کام کرے جس سے مؤمن خوش ہو جائے۔ میں مؤمن کو خوش کرنے کے لئے اس کے سامنے غیبت کرتا ہوں کیونکہ اسے دوسرے کی غیبت بہت اچھی لگتی ہے۔ جب لوگ کہیں گے کہ تو گناہ کما رہا ہے تو میں جواب دوں گا کہ نہیں، میرا مقصد تو پاک و پاکیزہ ہے۔ میں غیبت کر کے اس مومن خوش کر رہا ہوں۔

حاج نوری مرحوم ایک اور مثال بیان کرتے ہیں کے ایک شخص پرائی عورت کا بوسہ لیتا ہے۔ نامحرم عورت کا بوسہ لینا حرام ہے۔ ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میں نے تو مومن کا دل خوش کیا ہے۔ زنا، شراب اور اغلام کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ اب یہ شوروغوغا کیسا؟ اس میں شریعت کو بگاڑنے کی کیا بات ہے؟ یہ بات کہ لوگوں کو رلانے کے لئے ہر وسیلہ جائز ہے۔ خدا کی قسم امام حسینؑ کے قول کے خلاف ہے۔ امامؑ حسینؑ اس لئے

شہید ہوئے کہ اسلام کا مرتبہ بلند ہو۔" اشهد انّك قد اقمت الّصلوة و آتيت الزكوة و امرت بالمعروف و نهيت عن المنكر و جاهدت فى الله حقّ جهاده۔" (۱)۔ امام حسینؑ اس لئے قتل ہوئے کہ اسلامی طور طریقے، اسلامی احکامات اور اسلامی قوانین زندہ اور جاری رہیں اس لئے قتل نہیں ہوئے کہ اسلامی طور طریقوں ہی کو ٹھکرا دیں۔ ہم نے امام حسینؑ کو اسلام بگاڑنے والے کی حیثیت دے دی ہے۔ ہم نے امامؑ حسینؑ کی جو صورت پیش کی ہے وہ اسلام بگاڑنے والی ہے۔

حاجی نوری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ نجف کا ایک طالب علم یزد کا رہنے والا تھا۔ اس نے مجھ سے بیان کیا کہ جوانی میں میں کویر سے خراسان پیدل جارہا تھا۔ نیشاپور کے دیہات کے ایک گاؤں میں ایک مسجد تھی اور چونکہ میرے قیام کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی اس لئے میں مسجد میں چلا گیا۔ مسجد کا پیش نماز آیا۔ اس نے نماز پڑھائی اور پھر تقریر کی۔ اس درمیان یہ دیکھ کر مجھے بے حد تعجب ہوا کہ مسجد کا خادم فراش کچھ پتھر لے کر آیا اور پیش نماز کو دے دئے جب اس نے مصائب کو پڑھنا شروع کیا تو چراغ بجھا دئے۔ جیسے ہی چراغ گل ہوئے اس نے سامعین پر پتھر برسانے شروع کئے جس سے لوگوں میں چیخ پکار مچ گئی۔ اب جو چراغ پھر جلائے گئے تو میں نے دیکھا کہ لوگوں کے سر پھٹ گئے ہیں اور وہ روتے آنسو بہاتے مسجد سے نکل گئے۔ میں پیش نماز کے پاس پہنچا اور اس سے کہنے لگا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ اس نے جواب دیا۔ میں نے ان کی آزمائش کی تھی کیونکہ یہ کسی مصائب پر نہیں روتے۔ چونکہ امامؑ حسینؑ پر رونا اجر و ثواب کا موجب ہے اور میں نے دیکھا کہ ان کے رلانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ان کے سروں پر پتھر مارے جائیں اس لئے میں انہیں اسی طریقے سے رلاتا ہوں۔ اس کے کہنے کے مطابق مقصد وسیلے کو جائز بنا دیتا ہے مقصد حسینؑ

۱۔ مفاتیح الجنان، زیارت امام حسینؑ، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی راتوں میں

پر رونا ہے خواہ جھولیاں بھر بھر کے لوگوں کو پتھر مارے جائیں۔ چنانچہ اس معاملے میں ایک یہی خصوصی سبب رہا ہے جس سے اس میں من گھڑت باتیں اور تحریفیں داخل ہو گئی ہیں۔

انسان جس وقت تاریخ پڑھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس حادثے پر لوگوں نے کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔ خدا کی قسم حاجی نوری سچ کہتے ہیں۔ کہ آج اگر کوئی حسینؑ پر رونا چاہے تو اسے ان تحریفوں، تبدیلیوں اور ان جھوٹی باتوں پر رونا چاہئے۔

"روضۃ الشہداء" نام کی ایک مشہور و معروف کتاب ہے جس کا مصنف ملا حسین کاشفی ہے۔ حاجی نوری کہتے ہیں کہ زعفر جن اور قاسم کی شادی کا قصہ اس کتاب میں پہلی بار اس شخص نے تحریر کیا تھا۔ میں نے یہ کتاب دیکھی نہیں تھی اس لئے یہ سوچتا تھا کہ اس میں ایک دو ہی باتیں ایسی ہونگی۔ بعد میں یہ کتاب جو فارسی میں ہے اور تقریباً ۵۰۰ سال پہلے تالیف ہوئی ہے۔ (میری نظر سے گزری) (۱) ملا حسین کاشفی ایک ملا اور پڑھا لکھا آدمی تھا اس کی کتنی ہی کتابیں ہیں جن میں ایک "انوار سہیلی" نامی کتاب بھی ہے۔ اس کے حالات پڑھنے سے پتا نہیں لگتا کہ وہ شیعہ تھا یا سنی۔ بنیادی طور پر وہ طرح طرح کی صفات رکھتا تھا۔ شیعوں میں جاتا تھا تو اپنے آپ کو سو فی صدی پکا شیعہ ظاہر کرتا تھا اور جب سنیوں میں جاتا تھا تو خود کو حنفی بتاتا تھا۔ سبزوار کا رہنے والا تھا اور سبزوار شیعیت کا مرکز رہا ہے جہاں کے لوگ کٹر شیعہ اور آبادی سو فی صد شیعہ تھی جب وہ ہرات جاتا تھا (عبد الرحمٰن جامی کا بہنوئی یا ساڑھو تھا) تو وہاں سنی اور اہل تسنن کی روش پر چلنے والا بن جاتا تھا۔ واعظ بھی تھا لیکن مدت تک سبزوار میں رہا تھا۔ مصیبت کا ذکر کیا کرتا تھا۔ ۹۱۰ھ کے آس پاس اس کی وفات ہوئی ہے یعنی نویں صدی ہجری کے اواخر یا دسویں صدی ہجری کے

۱۔ تقریر کا جملہ اسی طرح نامکمل ہے

اوائل میں اس نے انتقال کیا ہے۔ اس نے پہلی کتاب جو مرثیے پر فارسی زبان میں لکھی ہے وہ یہی کتاب ہے جو آج سے پانچ سو سال پہلے تصنیف ہوئی ہے۔ اس کتاب سے پہلے لوگ ابتدائی اور اصلی مآخذ سے واقعات حاصل کرتے تھے۔ شیخ مفید رضوان اللہ علیہ نے "ارشاد" نامی کتاب لکھی ہے اور نہایت معتبر اور مستند کتاب لکھی ہے۔ ہم اگر شیخ مفید کی "ارشاد" ہی سے مواد حاصل کریں تو پھر کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اہل تسنن میں سے طبری نے لکھا ہے، ابن اثیر نے لکھا ہے، یعقوبی، ابن عساکر اور خوارزمی نے لکھا ہے۔ نجانے اس ظالم نے کیا کیا ہے۔ میں نے جس وقت یہ کتاب پڑھی تو دیکھا کہ نام بھی جعلی ہیں یعنی حسینؑ کے اصحاب میں ایسے ایسے نام لکھتا ہے جن کا مطلق کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ دشمنوں کے بھی ایسے ایسے نام بیان کرتا ہے جو سب کے سب جعلی ہیں۔ اس نے تو واقعات کو افسانہ اور کہانی بنا کر پیش کیا ہے۔

چونکہ یہ پہلی کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی اس لئے مرثیہ خوان جو پڑھے لکھے نہیں ہوتے تھے اور عربی کی کتابیں استعمال نہیں کر سکتے تھے یہی کتاب اٹھا لیتے تھے اور مجلسوں میں پڑھ دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ہم آج امامؑ حسینؑ کے سوگ کی مجالس کو روضہ خوانی کہتے ہیں۔ امامؑ حسینؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ اور امام حسن عسکریؑ کے زمانے میں روضہ خوانی کی اصطلاح رائج نہیں تھی اور بعد میں سید مرتضٰی اور خواجہ نصیرالدین طوسی کے وقت میں بھی روضہ خوانی نہیں کہتے تھے۔ آج سے پانچ سو سال پہلے سے اس کا نام روضہ خوانی پڑا۔ روضہ خوانی یعنی کتاب "روضہ الشہداء" پڑھنا یعنی وہی جھوٹی کتاب پڑھنا۔ جس وقت سے یہ کتاب لوگوں کے ہاتھ لگی ہے کسی شخص نے امام حسینؑ کی صحیح صحیح تاریخ نہیں پڑھی۔

ساٹھ ستر سال پہلے ملا آقائے دربندی مرحوم پیدا ہوا۔ اس نے

"روضۃ الشہداء" کی باتوں میں کچھ اور اضافے کئے اور سب کو اکٹھا کر کے "اسرار الشہادت" نامی ایک کتاب لکھ ڈالی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اسلام پر روئے اور گریہ کرے۔

حاجی نوری لکھتے ہیں کہ ہم حاجی شیخ عبدالحسین تہرانی کی کلاس میں تھے جو بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاتے تھے کہ حلہ کا رہنے والا ایک روضہ خواں سید آیا جس نے انہیں مقتل کی ایک کتاب دکھائی اور کہا کہ دیکھئے یہ معتبر ہے یا نہیں؟ اس کتاب کے نہ اول کے ورق تھے نہ آخر کے حرف۔ اس میں ایک جگہ یہ لکھا ہوا تھا کہ جبل عامل کا فلاں ملا صاحب معالم کا شاگرد ہے۔ حاجی شیخ عبدالحسین مرحوم نے وہ کتاب مطالعہ کرنے کے لئے لے لی۔

پہلے اس عالم کے حالات پڑھے تو معلوم ہوا کہ اس کے نام سے ایسی کوئی کتاب ہی نہیں لکھی گئی۔ پھر خود کتاب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ جھوٹ کا پٹارا ہے۔ اس سید سے بولے یہ کتاب بالکل گپ ہے۔ اس کتاب سے کوئی بات اخذ کرنا یا بیان کرنا جائز نہیں ہے اور بنیادی طور پر یہ کتاب اس عالم کی لکھی ہوئی بھی نہیں ہے۔ اس کی باتیں سب جھوٹی ہیں۔ حاجی نوری لکھتے ہیں "اسرار الشہادت" کے مصنف کے ہاتھ یہی کتاب پڑ گئی تھی جس کا مواد اس نے اول سے آخر تک سب نقل کر لیا۔

حاجی نوری ایک اور قصہ بتاتے ہیں جو بہت مایوس کن ہے۔ ایک شخص مرحوم صاحب مقامع (۱) کے پاس گیا اور بولا کہ کل رات کو میں نے ایک ڈراؤنا

۱۔ مرحوم آقا محمد علی پسر وحید بہبہانی مرحوم دونوں باپ بیٹے بزرگ انسان گزرے ہیں آقا محمد علی مرحوم کرمان شاہ چلے گئے تھے جہاں انہوں نے بہت اثر اور قوت پیدا کر لی تھی۔

خواب دیکھا۔ کیا خواب دیکھا؟ اس نے کہا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے ان دانتوں سے امامؑ حسینؑ کے بدن کا گوشت کاٹ رہا ہوں۔ یہ عالم بزرگ کانپ گئے۔ اپنا سر جھکا لیا۔ بڑی دیر تک سوچتے رہے پھر بولے۔ کیا تو مرثیہ خواں ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ فرمایا اس وقت کے بعد سے تو مرثیہ خوانی بالکل چھوڑ دے یا پھر معتبر کتابوں سے واقعات لے کر بیان کیا کر۔ تو اپنی ان جھوٹی باتوں کی بدولت امام حسینؑ کے بدن کا گوشت اپنے دانتوں سے کاٹتا ہے۔ یہ خدا کی مہربانی تھی جس نے تجھے خواب میں اس بات سے آگاہ کر دیا۔

اگر کوئی تاریخ عاشوراپڑھے تو دیکھے گا کہ وہ سب سے زیادہ زندہ اور روشن اور سب سے زیادہ معتبر اور سب سے زیادہ اصلی اور ابتدائی مواد والی تاریخ ہے۔ آخوند خراسانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ ان سنی روایات کے پیچھے دوڑتے ہیں وہ جائیں اور ایسی سچی روایات ڈھونڈیں جنہیں اب تک ایک شخص نے بھی نہیں سنا وہ خطبے جو امامؑ حسینؑ نے مکہ میں اور مجموعی طور پر حجاز میں، کربلا میں، راستے میں دئے تھے۔ وہ خطبے جو ان کے اصحاب نے دئے تھے۔ وہ سوال و جواب جو آنحضرت سے ہوئے ہیں۔ وہ خطوط جو آپ کے اور دوسروں کے درمیان لکھے گئے۔ وہ خطوط جن کا تبادلہ دشمنوں سے ہوا ہے۔ ان دوست اور دشمن لوگوں کے بیانات کے علاوہ جو اس معرکہ میں عینی شاہد تھے اور جنہوں نے یہ حادثہ بیان کیا ہے۔ ان کو پڑھیں۔ امام حسینؑ کے تین چار دوست بھی ایسے تھے جو بچ گئے تھے۔ ان میں سے عقبہ بن سمعان نامی ایک غلام بھی تھا جو مکہ سے امامؑ کے ساتھ ہو لیا تھا اور حضرت ابو عبداللہ کے لشکر کا رپوٹر تھا۔ وہ عاشور کے دن پکڑا گیا تھا اور جب اس نے کہا کہ میں غلام ہوں تو اسے چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک اور شخص کا نام حمید ابن مسلم ہے جو لشکر عمر سعد کا ایک

واقعہ نگار تھا۔ واقعے میں موجود حضرت امامؑ زین العابدینؑ کی ذات بھی تھی جنھوں نے تمام واقعات بیان کئے ہیں۔ امام حسینؑ کی تاریخ میں کہیں کوئی ابہام اور دھندلاپن نہیں ہے۔

بدقسمتی سے امام زین العابدینؑ کے بارے میں حاجی نوری ایک من گھڑت اور تحریفی قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ روز عاشورا جب امام حسینؑ کا کوئی مددگار باقی نہیں رہا تو حضرت خدا حافظ کہنے کے لئے امام زین العابدینؑ کے خیمے میں تشریف لے گئے۔ حضرت امام زین العابدینؑ نے فرمایا۔ باباجان! آپ کا اور ان لوگوں کا اب کیا حال ہے؟ (یعنی اس وقت تک امام زین العابدینؑ حالات سے بالکل بے خبر تھے) امامؑ نے فرمایا: بیٹے لڑائی چھڑ گئی۔ امام زین العابدینؑ نے پوچھا: حبیب ابن مظاہر کا کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا: قتل ہو گئے۔ پھر پوچھا: زہیر ابن قین کا کیا حال ہے؟ آپ نے فرمایا: قتل ہو گئے۔ بریر بن خضیر کا کیا حال ہے؟ فرمایا: قتل ہو گئے غرض اصحاب میں سے جس جس کا نام لیتے گئے امام حسینؑ فرماتے گئے قتل ہو گئے۔ پھر بنی ہاشم کے بارے میں پوچھا: قاسم بن حسنؑ کا کیا حال ہے؟ فرمایا: قتل ہو گئے۔ میرے بھائی علی اکبرؑ کا کیا حال ہے؟ فرمایا: قتل ہو گئے۔ چچا عباسؑ کی کیا خبر ہے؟ فرمایا: قتل ہو گئے۔ یہ سب مکالمہ جھوٹ ہے گپ ہے۔ امام زین العابدینؑ اتنے بیمار اور بے ہوش نہیں تھے جو نہ جانتے یا نہ سمجھتے کہ کیا ہو چکا ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس حالت میں بھی امامؑ اٹھے اور بولے پھوپھی جان! میری لاٹھی اور تلوار میرے لئے لا دیجئے۔ واقعۂ کربلا میں جو لوگ موجود تھے اور جنہوں نے حالات بیان کیے ہیں ان میں امامؑ زین العابدین کی ذات گرامی بھی شامل ہے۔

اس لئے ہم توبہ کریں اور واقعی ہمیں توبہ کرنا چاہئے۔ اس جرم اور بد دیانتی

کی وجہ سے جس کا ارتکاب ہم حضرت امام حسینؑ ،ان کے اصحاب، دوستوں اور ان کے اہل خاندان کے متعلق کر رہے ہیں اور ان کا اعزاز و افتخار چھین رہے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ پہلے توبہ کریں اور پھر اس مکتب کی تربیت سے فیض اٹھائیں۔

قابل اعتبار مقاتل کی کتابوں میں جس طرح لکھا ہے عباس بن علیؑ کی زندگی میں کیا کمی ہے ؟ ابو الفضلؑ کو صرف ایک فخر حاصل نہیں تھا اور وہ یہ کہ کسی کو ان سے کوئی غرض نہیں تھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ امام حسینؑ کے علاوہ ان سے کسی کو کوئی غرض نہیں تھی۔ امام حسینؑ نے بھی فرمایا تھا کہ ان لوگوں کو صرف میری ذات سے غرض ہے اگر یہ مجھے مار ڈالیں تو پھر انہیں کسی سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ جس وقت شمر بن ذی الجوشن کوفہ سے کربلا کے لئے روانہ ہونے لگا اس وقت حاضرین میں سے ایک شخص نے ابن زیاد سے بیان کیا کہ میرے بعض ننھیال والے حسینؑ بن علیؑ کے ساتھ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تو ان لوگوں کے لئے ایک معافی نامہ لکھ دے۔ ابن زیاد نے لکھ بھی دیا۔ شمر کا قبیلہ جناب ام البنین کے قبیلے سے دور کی قرابت رکھتا تھا۔ وہ یہ پیغام نویں محرم کو عصر کے وقت کربلا میں لایا یہ پلید امامؑ حسینؑ کے خیمے کے قریب پہنچا اور زور سے چلایا: "این بنو اختنا" (۱) (میرے بھانجے کہاں ہیں؟) ابوالفضل امامؑ حسینؑ کے پاس بیٹھے تھے۔ان کے بھائی بھی وہاں موجود تھے۔ جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہاں تک کہ امامؑ نے فرمایا: "اجیبوہ وان کان فاسقا" (جواب تو دے دو۔ فاسق آدمی ہی سہی۔) آقا نے اجازت دی تو جواب دیا۔ فرمایا: "ما تقول" (تو کیا کہتا ہے؟) تمہارے لئے خوش خبری لایا ہوں۔ تمہارے لئے خوشخبری لایا ہوں۔ تمہارے لئے امیر عبیداللہ ابن زیاد سے معافی لایا ہوں۔ تم آزاد ہو اگر ابھی چلے جاؤ گے تو تمہاری جان بچ جائے گی۔ آپ نے کہا خدا تجھ پر، تیرے امیر ابن زیاد پر اور اس معافی نامہ پر جو تو لایا ہے لعنت کرے۔ کیا ہم اپنے

(۱۔ مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۵۲، بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۹۱، اللہوف صفحہ ۳۷

امامؑ، اپنے بھائی کو صرف اس لئے چھوڑ دیں کہ ہم بچ جائیں ؟۔

عاشور کی رات کو جس نے سب سے پہلے حسینؑ کی حمایت کا اعلان کیا وہ آپ کے سعادت مند بھائی ابوالفضل العباسؑ تھے۔ ان حماقت آمیز مبالغوں کو چھوڑیئے جو لوگ کرتے ہیں لیکن تاریخ میں یہ تو مسلّمؑ ہے کہ ابوالفضلؑ بہت پختہ طبیعت، بہت شجاع، بہت حوصلے والے، بلند قامت اور خوب صورت تھے۔" و کان یدعی قمر بنی ہاشم"(i) (انہیں لوگوں نے قمر بنی ہاشم کا لقب دیا تھا۔) یہ حقیقت ہے۔ شجاعت انہوں نے علیؑ سے ورثے میں پائی تھی۔ ان کی ماں کا قصہ بھی سچا ہے کہ علیؑ نے اپنے بھائی عقیل سے کہا تھا کہ میرے لئے ایک بیوی تلاش کرو جو "ولدتها الفحوله"(۲) بہادروں کے یہاں پیدا ہوئی ہو۔ عقیل ام البنین کا انتخاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ وہی خاتون ہیں جیسی آپ چاہتے ہیں"لتلد لی فارساً شجاعاً" (۳) (میرا دل چاہتا ہے کہ اس بیوی سے میرے لئے ایک بہادر بیٹا پیدا ہو۔) یہاں تک سچ ہے۔ علی کی تمنا عباس کی صورت میں پوری ہوگئی۔۔۔۔۔۔

روز عاشور آتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق عباسؑ سامنے آتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں بھائی جان ! مجھے بھی اجازت دے دیجئے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اب برداشت نہیں ہوتا۔ چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد آپ پر اپنی جان فدا کردوں۔ میں نہیں جانتا کہ امامؑ نے کس مصلحت سے عباس کو یہ جواب دیا خود آنحضرت ہی بہتر جانتے تھے۔ فرمایا۔ بھائی ! جانا ہی چاہتے ہو تو جاؤ بلکہ ہو سکے تو میرے بچوں کے لئے تھوڑا سا پانی بھی لادو۔ 'سقا' یعنی بہشتی کا لقب پہلے ہی عباسؑ کو مل چکا تھا۔ کیونکہ پچھلی راتوں میں ایک یا دو بار عباس دشمنوں کی صفیں چیر کر حسینؑ کے بچوں کے لئے

۱۔ العباس تالیف عبد الرزاق الموسوی المقرم ص۸۱، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۰۸

۲۔ العباس تالیف عبد الرزاق الموسوی المقرم صفحہ ۶۹

۳۔ ابصار العین فی انصار الحسین علیہ السلام صفحہ ۲۶

پانی لے کر آئے تھے ایسا نہیں ہے کہ ان لوگوں نے تین دنوں اور تین راتوں تک پانی نہیں پیا تھا۔ نہیں۔ (بلکہ) تین راتیں اور تین دن گذرے تھے جو پانی کی ممانعت ہوئی تھی۔ لیکن اس دوران بھی ایک دو بار پانی لایا گیا۔ ایک بار شب عاشور بھی پانی آیا تھا۔ لوگوں نے غسل بھی کیا تھا۔ اپنے بدن بھی دھوئے تھے۔ ابوالفضلؑ نے فرمایا۔ سر آنکھوں پر۔ دیکھئے کتنا شاندار منظر ہے۔ کتنی عظمت کتنی شجاعت ہے، کتنی حوصلہ مندی، کتنی انسانیت ہے، کتنا شرف، کتنی معرفت اور جان نثاری ہے۔ تن تنہا ایک ہجوم پر جاپڑتے ہیں۔ جن دشمنوں نے پانی کی ناکہ بندی کر رکھی تھی ان کی تعداد چار ہزار لکھی ہے۔ نہر فرات میں اترے، گھوڑے کو پانی میں ڈالا (یہ سب لکھا ہے) سب سے پہلے وہ مشک بھرتے ہیں جو ساتھ لائے تھے اور کندھے پر لٹکا لیتے ہیں۔ پیاسے ہیں۔ ہوا گرم ہے۔ لڑے ہوئے ہیں۔ بدستور گھوڑے پر بیٹھے ہیں۔ پانی گھوڑے کے پیٹ سے لگا ہے۔ پانی میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ چلو میں پانی بھر کر ہونٹوں تک لے جاتے ہیں۔ جو دور سے دیکھ رہے تھے انہوں نے کہا ہے کہ تھوڑی دیر رکے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ پانی پئے بغیر نکل آئے۔ پانی فرات میں ڈال دیا۔ کوئی نہیں سمجھ پایا کہ ابوالفضلؑ نے اس وقت پانی کیوں نہیں پیا۔ لیکن جب باہر آئے تو رجز پڑھا اس رجز میں دوسروں کو نہیں خود کو مخاطب کیا۔ اس رجز سے لوگ سمجھے کہ پانی کیوں نہیں پیا؟

اے ابوالفضلؑ کے نفس! میں حسینؑ کے بعد زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ حسینؑ موت کا شربت پینے والے ہیں۔ حسینؑ خیموں کے پاس پیاسے کھڑے ہوں اور تو پانی پئے؟ مروت کہاں گئی؟ شرافت کہاں چلی گئی؟ محبت اور ہمدردی کو کیا ہو گیا؟ کیا حسینؑ تیرے امامؑ نہیں ہیں؟ کیا تو ان کا ماموم نہیں ہے؟ کیا تو ان کے پیچھے چلنے والا نہیں ہے؟(۱)

۱۔ ینابیع المودۃ جلد ۲ صفحہ ۱۶۰۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۴۱

میرا دین مجھے اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ میری وفاداری مجھے اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتی۔ ابوالفضلؑ نے واپسی میں اپنا راستہ بدل دیا۔ نخلستانوں میں ہو کر آئے تھے۔ پہلے سیدھی راہ سے آئے تھے۔ اب چونکہ یہ سمجھتے تھے کہ ساتھ میں ایک بیش قیمت امانت ہے اس لئے اپنا راستہ تبدیل کر دیا اور پوری پوری کوشش یہ رہی کہ پانی سلامتی کے ساتھ پہنچ جائے کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ کوئی تیر آکر مشک چھید ڈالے اور پانی بہ جائے اور منزل تک نہ پہنچ پائے۔ اسی حال میں تھے کہ دیکھا ابوالفضل کا رجز بدل گیا۔ معلوم ہوا کوئی نیا حادثہ پیش آگیا ہے فریاد کی:

"واللّٰہ ان قطعتم یمینی
انّی احامی ابداً عن دینی
وعن امام صادقٌ الیقین
نجل النّبیَ الطّاھر الامین(۱)"

خدا کی قسم اگر تم میرا دایاں ہاتھ بھی کاٹ ڈالو گے تو بھی میں حسینؑ کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد رجز بدل گیا۔

"یا نفس لا تخشی من الکفار
و ابشری برحمت الجبار
مع النبی السیّد المختار
قد قطعوا ببغیھم یسری(۲)"

اس رجز میں آپ نے یہ بتا دیا کہ آپ کا بایاں ہاتھ بھی کٹ چکا ہے۔ لکھتے ہیں کہ کسی ترکیب سے بڑی مشکل کے ساتھ آپ نے مشک کو گھمایا اور اس پر جھک

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۴۰
۲۔ ایضاً

گئے۔ میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا کہ کیا حادثہ پیش آیا کیونکہ بہت دل ہلا دینے والا ہے۔ نویں تاریخ کی شب یہ دستور ہے کہ اس عظیم ہستی کی مصیبت بیان کی جاتی ہے۔

میں یہ بھی عرض کردوں کہ حضرت عباسؑ کی والدہ گرامی ام البنینؑ کربلا کے حادثے کے وقت زندہ تھیں لیکن کربلا میں نہیں مدینہ میں تھیں۔ انہیں لوگوں نے خبر پہنچائی کہ کربلا کے حادثے میں آپ کے چاروں بیٹے شہید ہوگئے۔ یہ بزرگ خاتون جنت البقیع کے قبرستان میں آتی تھیں اور اپنے بیٹوں کو روتی تھیں۔ لکھتے ہیں کہ ان بی بی کے بین اس قدر دردناک ہوتے تھے کہ جو آجاتا تھا رونے لگتا تھا۔ یہاں تک کہ مروان بن حکم بھی جو سخت ترین دشمن تھا اپنی نوحہ سرائی میں کبھی آپ کے تمام بیٹوں کو اور کبھی ان میں سے سب سے بڑے بیٹے کو خاص طور پر یاد کر لیتا تھا۔ابوالفضل العباسؑ عمر کے لحاظ سے بھی اور روحانی اور جسمانی کمالات کے اعتبار سے بھی ان کے بیٹوں میں سب سے زیادہ قابل تھے۔ میں ان بی بی کے دو مرثیوں میں سے ایک مرثیہ جو مجھے بہت پسند ہے آپ کو سناتا ہوں۔ یہ کوکھ جلی ماں ان مرثیوں کو خود (عام طور پر عرب لوگ مرثیے بڑے دلدوز انداز میں کہتے ہیں) اس طرح پڑھتی تھی۔

"یامن رأی العبّاس کرّ علی جماهیر النقد
و وراه من ابناء حیدر کل لیث ذی لبد
انبئت انّ البنی اصیب برأسه مقطوع ید
ویلی علی شبلی آمال براسه ضرب العمد
لو کان سیفك فی یدیك کما دنی منه احد(۱)"

۱۔ منتہی الآمال جلد ۱ صفحہ ۳۸۶

اے دیکھنے والی آنکھ، اے وہ آنکھ جو کربلا میں تھی اور ان مناظر کو دیکھ رہی تھی، اے وہ شخص جس نے وہ وقت دیکھا جب میرے شیر بچے ابوالفضلؑ نے پہلے اور میرے دوسرے شیر بچوں نے اس کے پیچھے اس ذلیل جماعت پر حملہ کیا تھا۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا ہے میں نہیں جانتی سچ ہے یا جھوٹ۔ کہا ہے جس وقت میرے بچے کے ہاتھ کٹ گئے تھے میرے پیارے بیٹے کے سر پر لوہے کا گرز مارا گیا تھا کیا یہ سچ ہے؟ پھر کہتی ہیں۔ ابوالفضل! اے میرے بیٹے! میں خود سمجھتی ہوں اگر تیرے ہاتھ سلامت ہوتے تو دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو تیرے سامنے ٹھہر پاتا۔ ان لوگوں نے اتنی جسارت محض اس وجہ سے کی کہ تیرے ہاتھ بدن سے جدا ہوگئے تھے۔

لا حول ولا قوت الّا باالله العلی العظیم
وصلی الله علیٰ محمد وآله الطاہرین

تیسری مجلس

کربلا کے حادثے کی معنوی تحریفیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فبما نقضهم مّيثاقهم لعنّهم و جعلنا قلوبهم قسية يحرّفون الكلم عن موٰضعه و نسوٗا حظّا مما ذكروا به (۱)

ہم کہہ چکے ہیں کہ کربلا کی جو باعظمت تاریخ ہمیں ملی ہے اس میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے اور معنوی بھی۔ تحریف لفظی سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اس تاریخ کے جسم کو اپنی طرف سے ایسا لباس پہنادیا ہے کہ اس کا عظیم اور روشن چہرہ دھند لا گیا ہے۔ اور اس کا حسن ماند پڑ گیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے کچھ مثالیں بھی عرض کردی ہیں۔

معنوی تحریف :

بد قسمتی سے ہم نے اس تاریخی حادثے میں معنوی تحریف بھی کی ہے۔ اور معنوی تحریفِ لفظی تحریف سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس بڑے حادثے کی جو تاثیر جاتی رہی ہے اس کا سبب تحریفات لفظی نہیں تحریفات معنوی ہیں یعنی تحریفات لفظی سے تحریفات معنوی کے برے اثرات زیادہ رہے ہیں۔

۱۔ سورۂ مائدہ آیت ۱۳

تحریف معنوی کیا ہے؟ کسی ایک جملے میں توہم کوئی لفظ نہ گھٹائیں نہ بڑھائیں۔ لیکن جب ہم اس کے معنی مطلب بیان کریں تو اس طرح کریں کہ جملے کے حقیقی اور اصلی معنی کے بالکل خلاف یعنی الٹے معنی ہوجائیں۔ اس بات کی وضاحت کے لئے میں صرف ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔

جس زمانے میں مدینہ کی مسجد بنائی جارہی تھی عمار یاسر غیر معمولی طور پر خلوص سے محنت کیا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے (یہ بیانات مسلّم ہیں) کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا: یا عمّار! تقتلك الفئة الباغية(۱) (اے عمّار! تمہیں باغی اور سرکش جماعت قتل کریگی) اس کا اشارہ اِس قرآنی آیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں کے دو دھڑے ایک دوسرے سے لڑیں اور ان میں سے ایک سرکشی پر آمادہ ہو تو تمہیں چاہئے کہ تم دوسرے دھڑے کی مدد کے لئے سرکش اور باغی دھڑے کو دباؤ اور اس کی اصلاح کرو۔ پیغمبرؐ کے اس جملے سے جو آپ نے عمار یاسر کے بارے میں فرمایا تھا ان کی منزلت بڑھ گئی تھی۔ اسی لئے جنگ صفین میں جو عمار یاسر حضرت امیرالمومنینؑ کے لشکر میں موجود تھے تو اس لشکر کو بھی بزرگ اور حق پر سمجھا جانے لگا تھا لیکن جن کے ایمان کمزور تھے ان کو جب تک عمار قتل نہیں ہوگئے یہ اطمینان نہیں ہوپایا تھا کہ وہ علیؑ کے لشکر میں جو کام کر رہے ہیں وہ حق ہے یعنی معاویہ اور اس کے سپاہیوں کا قتل کردینا جائز ہے۔ جس دن عمار معاویہ کے آدمیوں کے ہاتھوں علیؑ کے لشکر میں قتل ہوگئے تو چاروں طرف شور مچ گیا کہ پیغمبرؐ کی حدیث پوری ہوئی۔ اس بات کا بہترین ثبوت کہ معاویہ اور اس کے ساتھی باطل پر ہیں یہ ہے کہ یہ عمار کے قاتل ہیں اور پیغمبر اکرمؐ پہلے ہی خبر دے چکے تھے۔

۱۔ سیرۂ حلبی جلد ۲ صفحہ ۷۷

کہ :"یا عمّار! تقتلك الفئت الباغیه"(۱) اے عمار تمہیں ایک باغی گروہ قتل کریگا اور اسکا اشارہ اس آیت کی طرف ہے : "و ان طآئفتن من المئومنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان(م) بغت احدهما علی الاخری فقاتلوا الّتي تبغی حتّی تفیٓء الیٓ امر الله"(۲)

آج یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر اور صاف ہوگئی کہ معاویہ کا لشکر باغی یعنی سرکش، ظالم اور ستمگر ہے اور حق علیؑ کے لشکر کے ساتھ ہے اس لئے قرآنی الفاظ کے مطابق علیؑ کے لشکر کے ساتھ مل کر معاویہ کے لشکر سے لڑنا چاہئے۔ اس بات نے معاویہ کی فوج میں ہلچل ڈال دی۔ معاویہ نے جو ہمیشہ ہر حیلے بہانے اور چالاکی اور مکاری سے اپنا کام نکالنے کا عادی تھا اس موقع پر ایک معنوی تحریف کرڈالی۔ کیونکہ وہ یہ تو کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ پیغمبرؐ نے عمار یاسر کے بارے میں ایسی بات نہیں کہی ہے اس لئے کہ وہاں کم سے کم تقریباً پانچ سو آدمی ایسے موجود تھے جو یہ گواہی دے رہے تھے کہ ہم نے پیغمبرؐ سے یہ جملہ سنا ہے یا ہم نے ایسے شخص سے سنا ہے جس نے پیغمبرؐ سے سنا۔ عمار کے بارے میں یہ جملہ ناقابل انکار تھا۔ شامیوں نے معاویہ پر اعتراض کیا کہ عمار کو ہم نے مارا ہے اور پیغمبرؐ نے فرمایا: "تقتلك الفئة الباغية" اس نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ تم غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ صحیح ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ عمار کو ایک باغی گروہ، ایک سرکش دستہ قتل کریگا۔ لیکن عمار کو علیؑ نے نہیں مارا۔ شامی بولے کہ ہمارے فوجیوں نے مارا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ عمار کو تو علیؑ نے قتل کیا ہے جو انہیں یہاں لائے اور ان کے قتل ہونے کے اسباب

۱۔ مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۱۹۹

۲۔ سورۂ حجرات آیت ۹

پیدا کئے۔

عمرو عاص کے دو بیٹے تھے ایک تو اسی کی طرح دنیادار اور دنیا پرست تھا اور دوسرا اسکے مقابلے میں مومن اور ایمان دار جوان تھا اور باپ سے متفق نہیں تھا۔ اس کا نام عبداللہ تھا۔ ایک صحبت میں جہاں عبداللہ بھی موجود تھا لوگوں نے یہی معنوی مغالطہ پیش کیا۔ عبداللہ نے کہا کیا بکتے ہو۔ کیسی غلط سلط باتیں کرتے ہو؟ چونکہ عمار علیؑ کے لشکر میں تھے اس لئے علیؑ نے انہیں قتل کیا؟ وہ بولے ہاں اس نے کہا تو پھر اس منطق سے سیدالشہداء حمزہ کو بھی رسول اکرمؐ نے شہید کیا کیونکہ حمزہ پیغمبر اکرمؐ کے لشکر میں تھے اور قتل ہوئے؟ معاویہ سخت ناراض ہو کر عمرو عاص سے کہنے لگا اپنے اس بے ادب لڑکے کو کیوں نہیں روکتے؟ اسے کہتے ہیں معنوی تحریف۔

جب ہم واقعات اور حادثات میں معنوی تحریف کرتے ہیں تو کس طرح کرتے ہیں؟

ایک طرف واقعات و حادثات کے اسباب و علل ہوتے ہیں اور دوسری طرف اہداف و مقاصد۔ چنانچہ کسی تاریخی حادثے کی معنوی تحریف یوں ہوتی ہے کہ یا تو ہم جیسے اس کے اسباب و علل ہیں اس سے مختلف بیان کریں۔ یا اس سے جو ہدف و مقصد پورا ہوا ہے اس کی دوسرے رنگ میں تشریح اور تفسیر کریں۔

مثال کے طور پر ایک شخص مکہ سے آیا ہے اور آپ اس کے گھر جاتے ہیں۔ آپ کا خیال یہ ہے کہ حاجی سے ملاقات کرنا مستحب ہے اس لئے آپ اس کے پاس جاتے ہیں۔ اب ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے ارے جانتے ہو، فلاں شخص فلاں شخص کے یہاں کیوں گیا تھا؟ دوسرا پوچھتا ہے کیوں گیا تھا؟ وہ کہتا ہے وہ شخص اس کے یہاں اس کی لڑکی کے لئے اپنے لڑکے کا پیام دینے گیا تھا۔ حج کی بات کا تو اس نے بہانہ بنایا تھا۔ لوگ اصل مقصد کو اس طرح بدل ڈالتے ہیں۔ اسے معنوی

تحریف کہتے ہیں۔

عاشور کے تاریخی حادثے کے بھی ایک طرف تو وجوہ اور اسباب ہیں اور دوسری طرف بلند اہداف و مقاصد۔ مسلمانوں اور حسین بن علیؑ کے شیعوں نے بھی اس حادثے میں اسی طرح تحریف کر ڈالی ہے جس طرح معاویہ بن ابو سفیان نے عمار کے بارے میں پیغمبرؐ کے جملے (تقتلك الفئة الباغية) کی تحریف کی تھی۔ حسینؑ بن علیؑ کا اپنی تحریک کے متعلق ایک خیال تھا ہم نے اس کے لئے ایک اور ہی بات تراش لی۔ حسینؑ کا ایک خاص مقصد اور منشا تھا ہم نے دوسرا ہی مقصد اور منشا گھڑ ڈالا۔

حسینؑ نے ایک غیر معمولی طور پر عظیم اور پاک تحریک شروع کی تھی۔ کسی تحریک کے تقدس کی تمام شرائط حسینؑ کی اس تحریک میں موجود ہیں جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ وہ شرطیں کون کون سی ہیں؟ اس پاک تحریک کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا مقصود ایک انسان اور ایک فرد نہ ہو بلکہ پوری کی پوری نوع انسانی ہو۔ کسی وقت کوئی شخص صرف اپنی ذات کی خاطر کوئی تحریک چلاتا ہے اور کسی وقت کوئی شخص اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ سماج کی خاطر، انسانیت کی خاطر، حقیقت کی خاطر، حق کی خاطر، توحید کی خاطر، عدالت کی خاطر، مساوات کی خاطر تحریک چلاتا ہے۔ حقیقت میں جس وقت وہ اجتماعی تحریک چلاتا ہے اس وقت وہ ایک فرد کی حیثیت نہیں بلکہ جماعت کی حیثیت رکھتا ہے وہ تمام انسانوں کے ساتھ ان کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اسی لئے جن لوگوں کی کوششیں، تدبیریں، اعمال و افعال اور تحریکیں اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ بشریت کے لئے، انسانیت و شرافت کے لئے، حق، عدالت اور مساوات کے لئے، توحید، خدا شناسی اور ایمان کی خاطر ہوتی ہیں انہیں تمام انسان

پسند کرتے اور دوست رکھتے ہیں۔ جس طرح پیغمبرؐ نے فرمایا تھا: "حسین مَنی و انا من الحسین" (۱) ہم بھی کہتے ہیں۔ حسین منا و نحن من الحسین۔ ہم یہ کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہتے ہیں کہ حسینؑ نے ہم سے ۱۳۲۸ سال (۲) پہلے ہماری خاطر بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کی خاطر قیام کیا۔ ان کا قیام مقدس تھا، پاک تھا اور ذاتی مقاصد سے ماوراء تھا۔

قیام کے مقدس ہونے کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ اس میں اعلیٰ درجے کی فہم و بصیرت شامل ہو۔ اس سے کیا مراد ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جس وقت انسانوں کا پورے کا پورا معاشرہ غافل ہوتا ہے، بے خبر ہوتا ہے، نہیں سمجھ پاتا، جاہل محض ہوتا ہے اس وقت ایک سوجھ بوجھ والا، عقل اور سمجھ رکھنے والا انسان پیدا ہوتا ہے جو ان لوگوں کا دکھ ان سے سوگنا بہتر سمجھتا ہے۔ ان لوگوں کا علاج خود ان لوگوں سے بہتر جانتا ہے۔ اس وقت جبکہ دوسرے کچھ نہیں سمجھتے اور ظاہر میں بھی کچھ نہیں دیکھ پاتے ایک ایسا باہوش اور سمجھ دار انسان پیدا ہوتا ہے اور تحریک شروع کر دیتا ہے جو بقول شخصے کچی اینٹ میں وہ باتیں دیکھ لیتا ہے جسے عام لوگ آئینے میں بھی نہیں دیکھ پاتے۔ بیس سال، تیس سال، پچاس سال گذر جاتے ہیں قوم جاگ اٹھتی ہے کہ فلاں شخص جو اُٹھا تھا، جس نے کوشش کی تھی، تحریک چلائی تھی کیسے کیسے پاک مقاصد پیش نظر رکھے تھے لیکن ہمارے باپ دادا بیس سال، تیس سال، چالیس سال، پچاس سال پہلے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکے تھے۔

مثلاً جمال الدین اسد آبادی مرحوم تقریباً ساٹھ ستر سال پہلے (متوفی ۱۳۱۰ قمری) اٹھے تھے اور انھوں نے اسلامی ممالک میں ایک اسلامی تحریک شروع کی

۱۔ ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۴۹، اعلام الوری صفحہ ۲۱۶، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۷۱، حلیۃ الابرار جلد ۱ صفحہ ۵۶۰، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۶۰، ۶۱، ملحقات احقاق الحق جلد ۱۱ صفحہ ۲۶۵ تا ۲۷۹

۲۔ یہ تقریر ۱۳۸۹ قمری مطابق فروردی ۱۳۴۸ میں کی گئی تھی

تھی۔ آج آپ ان کے حالات پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شخص نہایت غریب اور اکیلا تھا۔ مسلمان قوم کی بیماری اور اس کی دوا جانتا تھا لیکن خود قوم نہیں سمجھتی تھی۔ خود اس کی قوم ہی اس پر منہ بناتی تھی، اس کا مذاق اڑاتی تھی، اس کی حمایت نہیں کرتی تھی۔ اب جو ساٹھ ستر سال گزر چکے ہیں تو تاریخ کے زاویے واضح ہو گئے ہیں اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرد بزرگ نے اس وقت ایسی ایسی باتیں سمجھ لی تھیں جو بنیادی طور پر ننانوے فیصدی ایرانی قوم نہیں سمجھ پائی تھی۔

کم سے کم وہ دو خطوط ضرور دیکھ لیجئے جو اس بزرگ نے لکھے ہیں۔ ایک خط جو مرحوم آیت اللہ میرزا الشیرازی اعلی اللہ مقامہ کو لکھا ہے اور دوسرا جو تمام علمائے ایران کو ہم مقصدیت کے عنوان سے لکھا ہے۔ یا وہ خطوط پڑھ لیجئے جو اس بزرگ نے مشہد میں مرحوم حاجی شیخ محمد تقی بجوردی کو اصفہان میں فلاں بزرگ عالم کو اور شیراز میں فلاں بزرگ عالم کو بھیجے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس شخص نے کتنی اچھی طرح سمجھا ہے، کتنی اچھی طرح جان لیا ہے، کتنی اچھی طرح استعمار (سامراج) کو پہچانا اور اس قوم کو جھنجھوڑا ہے (اس بحواس کو نظر انداز کر دیجئے جو سامراجی ایجنٹ آج بھی کر رہے ہیں۔ اب ان باتوں میں کوئی وزن نہیں رہا) یہ تحریک مقدس ہوتی ہے کیونکہ یہ آدمی ایسے زمانے میں پیدا ہوتا ہے جب وہ ظاہری باتوں کے پیچھے ایسے ایسے حقائق دیکھ لیتا ہے جنہیں اس کے معاصرین نہ دیکھ پاتے اور نہ سمجھ پاتے ہیں۔

حسینی تحریک ایسی ہی تحریک ہے۔ آج ہم ٹھیک ٹھیک سمجھ رہے ہیں کہ یزید کیا ہے؟ حکومت یزید کیا ہے؟ معاویہ نے کیا کیا؟ امویوں کی اسکیم کیا تھی؟ لیکن اس زمانے کی مسلم قوم کے ننانوے فیصدی آدمی نہیں سمجھتے تھے خصوصاً اطلاعات کے وسائل نہ ہونے کے سبب جو آج ہیں مگر کل نہیں تھے۔ مدینہ کے لوگ نہیں

سمجھ پاتے تھے۔ جس دن حسین بن علیؑ شہید کئے گئے اس دن سمجھے کہ یزید کون شخص ہے اور یزید کی خلافت کیا چیز ہے؟ انہیں بعد میں جھٹکا لگا کہ حسین بن علیؑ کیوں مارے گئے؟ مدینے کے بڑے بڑے لوگوں کی ایک جماعت عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ نامی شخص کی سرکردگی میں شام بھیجی گئی۔ جب وہ مدینہ سے شام تک کا فاصلہ طے کر چکے، دربار یزید میں پہنچ گئے اور وہاں کافی عرصے تک رہے تب جا کر سمجھے کہ صورت حال کیا ہے؟ جب وہ مدینہ واپس آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ کیا دیکھ آئے؟ انہوں نے کہا ہم تم سے بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ جب تک ہم شام میں رہے یہی کہتے رہے کہ خدا نہ کرے ہمارے سروں پر آسمان سے پتھر برسنے لگیں۔ لوگوں نے پوچھا: کیا بات تھی؟ انہوں نے جواب دیا: ہم ایک ایسے خلیفہ کے سامنے پہنچے جو کھلم کھلا شراب پیتا تھا، جوا کھیلتا تھا، کتے، چیتے اور بندر پالتا تھا یہاں تک کہ نامحرم عورتوں سے زنا بھی کرتا تھا۔

عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کے آٹھ بیٹے تھے۔ انہوں نے اہل مدینہ سے کہہ دیا کہ چاہے تم قیام کرو یا نہ کرو میں تو قیام کرتا ہوں چاہے اپنے آٹھ بیٹوں سمیت قتل ہی کیوں نہ ہو جاؤں چنانچہ اس نے قیام حرہ (۱) میں یزید کے خلاف اپنے آٹھوں بیٹے اپنے آپ سے پہلے بھیج دیئے اور وہ شہید ہو گئے اور بعد میں وہ بہادر بھی شہید ہو گیا۔

اس سے دو تین سال پہلے جب امام حسینؑ مدینہ سے نکلے ہیں اور انہوں نے نکلتے وقت فرمایا ہے: "و علی الاسلام السلام اذ قد بلیت الامة براع مثل یزید" (۲)

۱۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۶۹

۲۔ اللہوف صفحہ ۱۱، فی رحاب ائمہ اہلبیت جلد ۳ صفحہ ۶۹

اگر یزید کو اسلامی خلافت ملی تو میں اسے اسلام کی ذلت سمجھونگا۔اگر ایسا ہوا تو اسلام پر کیا بیتے گی۔ عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کہاں تھا؟ اس دن واقف نہیں تھا۔ حسینؑ کو قتل ہونا تھا تاکہ اسلامی دنیا ہل جائے پھر عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ اور اس جیسے دوسرے سینکڑوں افراد کی مدینہ میں، کوفہ میں اور دوسرے مقامات پر آنکھیں کھل جائیں اور وہ کہہ اٹھیں کہ حسینؑ کو یہ بات کہنے کا حق پہنچتا تھا۔

تحریک کے مقدس ہونے کی تیسری شرط یہ ہے کہ تن تنہا ہو، یگانہ ہو یعنی ایک بجلی ہو جو گھپ اندھیرے میں چمک اٹھے۔ خاموشیوں میں ایک آواز ہو، مکمل جمود میں ایک حرکت ہو یعنی ایسے حالات میں جب گھٹن کا مکمل راج ہو۔لوگوں کو گلے سے آواز نکالنے کی ہمت نہ ہو، بالکل اندھیرا، قطعی مایوسی، مطلق ناامیدی، اور گہرا سناٹا ہو اچانک ایک شخص اٹھ کھڑا ہو اور خاموشی توڑ دے، جمود کو ختم کردیئے تحرک پیدا کردیتا ہے، بجلی بن جائے اور اندھیرے میں چمک اٹھے۔ دوسرے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔کیا حسینی تحریک ایسی ہی تھی یا نہیں تھی؟ بے شک ایسی ہی تھی۔

امامؑ حسینؑ نے ایسی ہی تحریک شروع کی۔ ان کی اس تحریک کا کیا مقصد تھا؟ائمہ اطہار کا اس بات پر اصرار کیوں تھا کہ حسینؑ کا سوگ جاری رہے؟ امام حسینؑ نے تحریک کیوں شروع کی؟ہمیں کیا ضرورت ہے جو ہم اپنی طرف سے اس کی وجہ بیان کریں؟ حسین بن علیؑ نے خود اس کی وجہ بیان کی ہے :"انّی لم اخرج اشرا و لا بطراً و لا مفسداً و لا ظالماً انّما خرجت لطلب الاصلاح فی امّة جدّی"(۱)

۱۔ مقتل الحسین صفحہ ۱۵۶، مقتل العواصم صفحہ ۵۴، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۸۹، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۱ صفحہ ۱۸۸، لمعۃ من بلاغۃ الحسین صفحہ ۶۴، نفس المہموم صفحہ ۴۵

وہ نہایت صاف الفاظ میں فرماتے ہیں۔ہماری دنیا بگڑ چکی ہے۔ میرے جد کی قوم خراب ہوچکی ہے۔ میں نے اصلاح کے لئے قیام کیا ہے۔ میں اصلاح طلب انسان ہوں۔"ارید ان امر بالمعروف و انهی عن المنکر و اسیر بسیرة جدّی و ابی"(۱) میرا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ امام حسینؑ نے اپنی تحریک کا مقصد واضح کردیا ہے۔"الا ترون انّ الحقّ لا یعمل به و انّ الباطل لا یتناهیٰ عنه لیرغب المئومن فی لقاء اللّٰه محقاً"(۲) امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے امر بالمعروف کے لئے تحریک اٹھائی ہے تاکہ دین کو زندہ کروں اور خرابیوں سے لڑوں۔ میری تحریک ایک اسلامی تحریک ہے۔ ہم نے ایک اور ہی بات کہی۔ہم نے بہت عجیب و غریب اور ماہرانہ قسم کی دو معنوی تحریفیں کر ڈالیں۔ (میں نہیں جانتا کہ انہیں ماہرانہ کہوں یا جاہلانہ)۔ ہم نے ایک طرف یہ کہا کہ حسین بن علیؑ نے اس لئے قیام کیا کہ مارے جائیں تاکہ قوم کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے۔ اب اگر پوچھا جائے کہ یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟ کیا خود امامؑ نے ایسا کہا ہے؟ پیغمبرؐ نے کہا ہے؟ ہم کہتے ہیں ان باتوں سے کیا سروکار ہے؟ امام حسینؑ اس لئے قتل ہوئے کہ ہمارے گناہ بخشے جائیں۔ہم نہیں جانتے کہ ہم نے یہ بات عیسائیوں کے یہاں سے لی ہے یا نہیں؟ مسلمان قوم نہیں سمجھتی کہ اس نے خلاف اسلام بہت سی باتیں عیسائیوں کے یہاں سے لے لی ہیں۔

عیسائیوں کے عقائد کا ایک اصول حضرت عیسیٰؑ کا سولی پانا ہے تاکہ توڑ بن جائے۔ حضرت عیسیٰؑ کا لقب انقادی (توڑ) ہے۔ عیسائیت کی رو سے یہ عیسائی عقیدے کا ایک جزو ہے کہ عیسیٰؑ نے اس لئے سولی پائی کہ وہ قوم کے گناہوں کا کفارہ بن

۱۔ مقتل الحسین صفحہ ۱۵۶ وغیرہ مطابق صفحہ گذشتہ
۲۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۸۱، تحف العقول صفحہ ۱۷۶، اللہوف صفحہ ۳۳، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۵

جائیں۔ یعنی عیسائی اپنے گناہ حضرت عیسیٰؑ کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ ہم نے مطلق یہ نہیں سوچا کہ یہ بات تو عیسائی دنیا کی ہے۔ اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتی، حضرت امامؑ حسینؑ کی بات سے میل نہیں کھاتی۔ خدا کی قسم یہ حضرت امام حسین علیہ السلام پر تہمت اور بہتان ہے۔ واللہ اگر کوئی رمضان کے مہینے مین روزہ دار ہو اور حسین بن علیؑ سے یہ بات منسوب کرے اور کہے کہ حسینؑ ایسے ہی کام کے لئے تھے اور (یہ بات) ان سے نقل کرے تو اس کا روزہ باطل ہوجائے۔ یہ حسینؑ پر جھوٹ ہے۔ حسینؑ نے گناہ سے لڑنے کے لئے قیام کیا تھا۔ اس کے برعکس ہم نے کہہ دیا کہ انہوں نے اس لئے قیام کیا کہ گنہگاروں کی محافظت کریں۔ ہم نے کہہ دیا کہ حسینؑ نے ضمانت دی، گویا ایک بیمہ کمپنی کی بنیاد رکھ دی۔ بیمہ کیسا؟ گناہ کا بیمہ۔ آپ نے گویا فرمایا کہ میں نے تمہارے گناہ کا بیمہ کردیا۔ اس کے بدلے میں میں کیا لونگا۔؟ آنسو! تم میرے لئے آنسو بہاؤ میں اس کے عوض تمہارے گناہوں کی تلافی کردوں گا۔ تم چاہے کوئی ہو، ابن زیاد ہو، عمر سعد ہو۔ دنیا میں ایک ابن زیاد کم تھا۔ دنیا میں ایک عمر سعد کم تھا۔ دنیا میں ایک سنان بن انس کم تھا۔ دنیا میں ایک خولی کم تھا۔ امام حسینؑ نے چاہا کہ دنیا میں خولی زیادہ ہوجائیں، دنیا میں عمر سعد زیادہ ہوجائیں۔ آپ نے فرمایا اے لوگو! تم سے جتنا برا بنا جاسکے بن جاؤ میں تمہارا ضامن ہوں۔

حادثۂ کربلا کی تشریح اور توجیہ سے دوسری معنوی تحریف یہ ہوئی ہے کہ لوگ کہتے ہیں: تم جانتے ہو امام حسینؑ نے تحریک کیوں اٹھائی اور کیوں قتل ہوئے؟ ہم پوچھتے ہیں کیوں؟ کہتے ہیں: یہ صرف انہیں کے لئے ایک خصوصی حکم تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ جاؤ اور قتل ہوجاؤ۔ ہم سے تم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یعنی ان کا یہ عمل ہمارے لئے قابل پیروی نہیں ہے۔ یہ اسلام کے احکامات سے جو مجموعی اور عمومی احکامات ہیں، تعلق نہیں رکھتا۔ ہماری اور امامؑ کی بات میں کتنا فرق ہے؟ امام حسینؑ نے بلند آواز سے فرمایا تھا کہ میرے قیام کے اسباب و وجوہ ایسے مسائل ہیں جو

اسلام کے مجموعی اصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔

کسی خاص حکم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خصوصی حکم وہاں دیا جاتا ہے جہاں عمومی احکامات کافی نہ ہوں، کام نہ دیتے ہوں۔ امام حسینؑ نے بالکل صاف الفاظ میں فرمایا تھا: اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو کسی مومن کو (امامؑ کے لئے بھی نہیں فرمایا) یہ اجازت نہیں دیتا کہ ظلم، ستم، فتنے اور گناہ سے بے پرواہ رہے۔ امام حسینؑ نے ایک مکتب قائم کیا یعنی اسلام کا عملی مکتب۔ ان کا مکتب یہی اسلام کا مکتب ہے۔ اسلام کے مکتب نے بیان کیا۔ حسینؑ نے عمل کیا۔ ہم نے اس حادثے کو مکتب ہونے سے خارج کردیا۔ جب یہ حادثہ مکتب ہونے سے خارج ہوگیا تو پھر قابل پیروی نہیں رہا۔ جب قابل پیروی نہیں رہا تو پھر حسینؑ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا یعنی کربلا کے حادثے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اس طرح ہم نے حادثہ کربلا کو اسکی افادیت سے محروم کردیا۔ کیا دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی اور خیانت ہوسکتی ہے؟ یہ ہے وہ تحریف معنوی جو حادثہ عاشور میں ہوئی ہے اور جو لفظی تحریف سے سوگنا خطرناک ہے۔

ائمہ اطہارؑ نے کیوں کہا (بلکہ پیغمبرؐ سے بھی روایت ہے) کہ یہ تحریک زندہ رہنا چاہئے۔ لوگ اسے بھول نہ جائیں۔ لوگ امام حسینؑ کیلئے روتے رہیں۔ اس حکم سے ان کا کیا مقصد تھا؟ ہم نے اس اصلی مقصد کو مسخ کر ڈالا۔ ہم نے کہہ دیا کہ یہ بات صرف حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی تسلی کی خاطر کہی گئی ہے۔ اگرچہ وہ بہشت میں اپنے فرزند ارجمند کے ساتھ ہیں اس بات کیلئے برابر بیتاب رہتی ہیں کہ ہم کہیں لوگ کچھ روتے رہیں تاکہ ان کے دل کو تسلی ہوتی رہے۔ کیا حضرت خاتون جنت کی اس سے بھی بڑھ کر آپ کوئی توہین کرسکتے ہیں؟ کچھ دوسروں نے یہ کہہ دیا کہ امام حسینؑ کربلا میں ظالموں کے ہاتھوں بے قصور قتل ہوئے۔ یہ بڑی اندوہناک بات

ہے۔ میں بھی مانتا ہوں کہ حسینؑ بے قصور مارے گئے۔ لیکن بس اسی قدر؟ صرف یہی؟ ایک شخص کچھ ظالموں کے ہاتھوں بے تقصیر مارا گیا؟ کسی دن دنیا میں ہزاروں بے قصور آدمی قصور واروں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں کسی دن ہزاروں آدمی دنیا میں ضائع ہو جاتے ہیں اور یہ بات المناک بھی ہے لیکن کیا اس ضائع اور قتل ہونے کی کوئی ایسی قدرو قیمت ہے جو سالہا سال اور دس بیس تیس صدیاں گزرتی رہیں اور ہم بیٹھے بیٹھے غم مناتے رہیں کہ افسوس حسین بن علیؑ قتل ہوئے۔ ان کا خون ضائع گیا۔ حسین بن علیؑ بے قصور مارے گئے۔ ظالموں کے ہاتھوں مارے گئے۔ لیکن یہ کس نے کہہ دیا کہ حسین بن علیؑ ضائع گئے؟ حسین بن علیؑ کا خون رائیگاں گیا؟ اگر دنیا میں تم کوئی ایسا آدمی پاؤ گے جس نے اپنے خون کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں جانے دیا تو وہ حسین بن علیؑ ہیں۔ اگر دنیا میں تمہیں کوئی ایسا آدمی ملے گا جس نے اپنی شخصیت کا ایک ذرہ بھی رائگاں نہیں ہونے دیا تو وہ حسین بن علیؑ ہیں۔ انہوں نے اپنے خون کے ایک ایک قطرے کی اس قدر قیمت لگائی تھی کہ بیان میں نہیں آسکتی۔

اگر دنیا کی اس دولت کا جو ان کی خاطر صرف ہوتی ہے ہم قیامت تک کا حساب لگائیں تو انسان ان کے خون کے ہر قطرے کی خاطر اربوں کھربوں روپے خرچ کر دے گا۔ جس شخص کے قتل ہونے کا یہ نتیجہ نکلا ہو کہ اس کا نام ظالموں کے محل کی بنیاد ہمیشہ کے لئے متزلزل کردے، کیا وہ شخص ضائع ہو گیا؟ کیا اس کا خون رائگاں بہہ گیا؟ کیا ہم اس بات پر افسوس کریں کہ حسین بن علیؑ ضائع ہو گئے؟ اے نادان! تو ضائع ہو گیا۔ میں اور تو دونوں بے مصرف ہیں۔ ہماری عمریں بے مصرف ہیں۔ اپنا غم منا۔ اپنے اوپر افسوس کر۔ تو حسین بن علیؑ کی توہین کرتا ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ وہ ضائع ہو گئے۔ حسین بن علیؑ وہ شخص ہیں کہ "انّ لك درجة عندالله لن

تنالها الآ بالشهادة"(۱) کیا حسین بن علیؑ جو شہادت کی آرزو کرتے تھے اپنے ضائع ہونے کی آرزو کرتے تھے؟ جن بزرگواروں نے یہ سفارش کی ہے کہ حسین بن علیؑ کا سوگ قائم رکھا جائے انہوں نے اس لئے سفارش کی ہے کہ حسین بن علیؑ کا مقدس مقصد تھا، حسین بن علیؑ نے ایک مکتب قائم کیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا مکتب قائم اور جاری رہے۔ دنیا میں آپ اور کسی مکتب کی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتے جو حسینی مکتب کی نظیر ہو۔ جب آپ حسین بن علیؑ کا نمونہ ڈھونڈ لیں تب کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہر سال ان کی ہی یاد کیوں تازہ کریں؟ جب آپ دنیا میں انسانوں کی فکر اور ان کی خدمت کی خاطر اس توحید، ایمانی جلوے، خدا شناسی کے جلوے، دوسری دنیا پر کامل ایمان، رضا و تسلیم، صبر، مردانگی، قلبی اطمینان، ثبات و استقلال، عزت نفس، اور شخصی عظمت آزادی کی خواہش اور آزادی طلب کی (جس کا کوئی بدل نہیں کوئی نظیر نہیں) کوئی مثال پیش کر سکیں۔ جو حسین بن علیؑ کے دل میں عاشور کے حادثے میں اس آفت اور عظیم مصیبت میں پیدا ہوئی اس وقت کہہ سکتے ہیں کہ ہم حسین بن علیؑ ہی کا نام کیوں زندہ رکھیں؟ ان کے نام اور تحریک کو زندہ رکھنا صرف اس لئے ہے کہ حسین بن علیؑ کی روح ہماری تمہاری روح پر بھی اپنا عکس ڈالتی رہے۔ وہ آنسو جو ہم ان کے لئے بہاتے ہیں اگر ہماری روح کی مطابقت کے باعث بہتا ہے تو گویا وہ ایک چھوٹی سی پرواز ہے جو ہماری روح حسینی روح کے ساتھ کرتی ہے۔ اگر ان کی ہمت، غیرت، حریت، ایمان، پرہیزگاری اور توحید کا حقیر سا جزو بھی ہم میں جھلک اٹھے اور پھر ایسا آنسو ہماری آنکھ سے بہنے لگے تو وہ آنسو بہت بیش قیمت ہوگا۔ اگر کہیں کہ مکھی کے پر کے برابر ایسے آنسو کا بھی مول پوری دنیا کے برابر ہوگا تو آپ کو یقین کر

۱۔ نفایس الاخبار ص ۲۱ منقول از لن شہر آشوب

لینا چاہئے۔ البتہ وہ آنسو نہ ہو جو حسینؑ کا مقصد ضائع جانے کے لئے بہایا جائے بلکہ وہ آنسو جو حسینؑ کی عظمت کے لئے ہو، حسینؑ کی شخصیت کے لئے ہو۔ وہ آنسو جو حسین بن علیؑ کے ساتھ مطابقت اور ان کی پیروی کرنے کی خاطر بہایا جائے اگرچہ مکھی کے پر کے برابر بھی ہو تو مول میں ایک دنیا کے برابر ہوگا۔

انہوں نے چاہا کہ لوگ اس مکتب عملی کو برابر دیکھتے رہیں اور اس پر غور کرتے رہیں کہ پیغمبرؐ کا خاندان سچائی کی سند اور خود پیغمبرؐ پر گواہ ہے۔ اگر لوگ یہ کہیں کہ فلاں مسلمان نے کسی لڑائی میں جو مثلاً روم یا ایران میں لڑی گئی اپنے پختہ ایمان اور بڑی دلیری کا ثبوت دیا تو یہ بات پیغمبرؐ کی حقانیت کی ایسی دلیل نہیں ہو سکتی جتنا ان کا یہ کہنا کہ فرزند پیغمبرؐ نے ایسا کیا کیونکہ ہمیشہ ایک شخص کے خاندان کے متعلق ہر غیر شخص کی بد گمانیاں زیادہ ہوتی ہیں لیکن یہ بات کہ ہم پیغمبرؐ کے خاندان میں حد درجہ صفائے قلب اور ایمان پاتے ہیں پیغمبرؐ کی سچائی پر بہترین گواہ ہے۔ کوئی شخص نہ علیؑ کی طرح پیغمبرؐ کے ساتھ رہا ہے نہ بڑا ہوا ہے۔ کوئی شخص علیؑ کی طرح نہ پیغمبرؐ پر ایمان رکھتا ہے نہ ان کا فدائی رہا۔ خود یہ بات پیغمبرؐ کی سچائی پر پہلی دلیل ہے۔ حسینؑ پیغمبرؐ کے فرزند ہیں۔ وہ جس وقت پیغمبرؐ کی تعلیمات پر اپنے ایمان کا مظاہرہ کرتے ہیں تو پیغمبرؐ کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ پیغمبرؐ جھلکنے لگتے ہیں۔ وہ باتیں جنہیں انسان برابر زبان پر لاتا رہتا ہے لیکن جن پر عمل کم کرتا ہے حسینؑ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ انسان کی روح اس قدر ناقابل شکست کیسے ہو جاتی ہے؟ سبحان اللہ! انسان کی رسائی کہاں تک ہے۔ اس انسان کی روح کتنی ناقابل شکست ہوگی جس کا بدن پارہ پارہ ہو جاتا ہے، جس کے جوان آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں، جس کی پیاس کی حد نہیں رہتی، جو آسمان کو بھی دیکھتا ہے تو تاریک نظر آتا ہے، جو سمجھتا

ہے کہ اس کا خاندان قیدی بننے والا ہے۔ جو کچھ پاس تھا لٹ چکا ہے لیکن جس کے پاس صرف ایک چیز باقی ہے اور وہ اس کی روح ہے۔ اسکی روح مطلق ہار نہیں مانتی۔

آپ سانحۂ کربلا جیسا انسانی خوبیوں کا قابل دید منظر کوئی اور دکھا دیجئے تاکہ ہم کربلا کے بجائے اسی کو یاد کریں اور اس حادثے کو زندہ رکھیں، ایسا حادثہ جس میں بہتر (۷۲) افراد کی جماعت نے روحانی اعتبار سے تیس ہزار کی جماعت کو شکست دے دی ہو۔ کس طرح شکست دی؟ اول اس طرح کہ وہ اقلیت میں تھے اور ان کا قتل ہو جانا یقینی تھا اس قلت کے باوجود ان کا ایک آدمی بھی دشمن سے جاکر نہیں ملا، لیکن ان کے لشکر میں سے کچھ ان سے آکر مل گئے۔ جن میں ان کا سردار حر بن یزید ریاحی اور دوسرے تیس آدمی شامل تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ روحانی اعتبار سے یہ جیت گئے اور وہ ہار گئے۔ عمر سعد نے کربلا میں کچھ ایسے کام کئے ہیں جو خود اس کی روحانی شکست کا ثبوت ہیں۔ کربلا میں عمر سعد کے لشکریوں نے ایک کے مقابلے ایک کی لڑائی سے گریز کیا۔ پہلے تو تیار ہوگئے اور اس زمانے کے معمول کے مطابق جنگ مغلوب یا تیر اندازی ہونے سے پہلے (ایک کے مقابلے میں ایک کی لڑائی) ایک قسم کی زور آزمائی ہوتی رہی۔ ایک شخص اس جانب سے جاتا ہے ایک آدمی اس طرف سے آتا ہے۔ جن چند لوگوں نے اصحاب حسینؑ سے جنگ کی ان کی شکست نے اصحاب کو اس قدر روحانی طاقت دے دی کہ عمر سعد نے حکم جاری کر دیا کہ ایک ایک کر کے نہ لڑیں۔

ابا عبداللہؑ کس وقت میدان میں تشریف لائے؟ (ذرا سوچئے) عاشور کے دن عصر کا وقت ہے۔ ابھی ظہر کے وقت تک کچھ اصحاب زندہ تھے جنہوں نے نماز بھی پڑھی تھی۔ صبح سے عصر تک محنت کر چکے ہیں۔ اپنے ہر صحابی کی لاش خود اٹھا کر لائے ہیں اور شہداء کے خیمے میں رکھتے رہے ہیں۔ خود ہی اپنے اصحاب کے سرہانے

پہنچے ہیں، اپنے اہلبیتؑ کو خود ہی تسلی دیتے رہے ہیں۔ ان تمام مصائب کا مقابلہ کرنے کے باوجود میدان جنگ میں جب وارد ہوئے تو حسینؑ نے کسی کو مہلت نہیں دی اور نہ کسی کی مجال ہوئی یہاں تک کہ عمر سعد کو چلانا پڑا: تمہاری مائیں تمہارے سوگ میں بیٹھیں۔ تم کس سے لڑرہے ہو؟ "ھذا ابن قتّال العرب"(۱) یہ عرب کے سب سے بڑے قتل کرنے والے کا بیٹا ہے، علی بن ابی طالب کا پسر ہے۔ "واللّٰہ نفس ابیہ بین جنبیہ"(۲) خدا کی قسم اس کے جسم میں اس کے باپ علیؑ کی روح موجود ہے۔ یہ ہار کی علامت تھی یا نہیں؟ تیس ہزار آدمیوں نے ایک ایک کرکے ایک ایسے شخص سے لڑائی لڑی جو تن تنہا ہے، بھوک اور پیاس کے ساتھ رنج والم اٹھانے کے باوجود دشمن ان کے مقابلہ میں عار حزیمت اٹھاتے ہوئے پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف حسینؑ کی تلوار سے شکست کھائی بلکہ وہ آپ کی منطق سے بھی ہار چکے تھے۔

امامؑ حسینؑ نے عاشور کے دن لڑائی شروع ہونے سے پہلے دو تین بار تقریر کی تھی۔ واقعی وہ تقریریں بھی عجیب ہیں۔ اہل سخن جانتے ہیں کہ عام حالات میں ممکن نہیں ہے کہ انسان کوئی ایسی عمدہ بات کہے جو نہایت ہی اونچے درجے کی ہو جس کو سن کر انسان کی روح جھوم اٹھے۔ خصوصاً اگر کوئی بات مرثیے کی قسم سے تعلق رکھتی ہو تو انسان کا دل بہت پگھلا ہوا ہونا چاہئے۔ جس سے وہ عمدہ مرثیہ کہہ سکے۔ اگر غزل کہنا چاہے تو عشق کے جذبات سے لبریز ہو تاکہ اچھی غزل کہہ سکے۔ اگر رزمیہ کہنا چاہے تو اس کے دل میں شدید رزمیہ جذبات ہونے چاہئیں جس سے وہ ایک رزمیہ بات کہہ سکے۔ امامؑ حسینؑ نے بہت سی تقریریں کی ہیں ان میں

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۵۰ ، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۱۰، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۴۶

۲۔ بحارالانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۹۰، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۰

کلی ایک تقریر خاص طور پر وہ ہے جو آپ روز عاشور کرتے ہیں اور جو تمام تقریروں سے زیادہ مفصل ہے۔ امامؑ لشکر سے خطاب کرنے کے لئے گھوڑے سے اتر پڑے اور چونکہ کھڑے ہونے کے لئے ایک بلند جگہ چاہتے تھے تاکہ آواز دور دور تک پہنچ سکے آپ ایک اونٹ پر سوار ہوگئے۔ اور بلند آواز میں فرمانے لگے: "تبّا لکم ایّتہا الجماعۃ و ترحاً حین استصر ختمونا والھین فاصرخناکم موجفین" پھر امام حسین علیہ السلام (دشمن کی طرف) بڑھے اور فرمایا "اے کوفیو! برا ہوا تمہارا اور ہلاکت و مصیبت و بربادیہو تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئے تو جو تلواریں ہماری مدد کے لئے بلند ہونے والی تھیں انہیں تلواروں کو تم نے ہمارے اوپر کھینچ لیا اور دشمنوں کے ساتھ ہوکر (ہمارے خلاف) جنگ کی آگ بھڑکائی۔ حالانکہ دشمنوں نے تمہارے ساتھ کوئی انصاف کا برتاؤ نہیں کیا اور نہ ہماری طرف سے تمہارے خلاف کوئی برائی ظاہر ہوئی۔ کیوں نہ تمہارے لئے بربادی و ہلاکت ہو۔ تم نے ہم کو ناپسند کیا، ہمیں چھوڑ دیا حالانکہ ہماری تلواریں ہمارے نیاموں میں تھیں، ہمارے دل تمہاری طرف سے مطمئن تھے اور ہماری رائے تمہارے متعلق بدلی نہ تھی۔ تم ٹڈیوں اور پروانوں کی طرح ہماری بیعت پر ٹوٹ پڑے پھر تم نے اس بیعت کو توڑ ڈالا اور اپنی بیوقوفی اور گمراہی کی وجہ سے امت کے سرکش گروہ و شیاطین اور کتاب خدا کے چھوڑنے والوں کے ساتھ بن گئے۔ تم نے ہم کو چھوڑ دیا اور آج ہم سے جنگ کرنے آئے ہو، آگاہ ہوجاؤ، ظالمین پر خدا کی لعنت ہے۔ (مناقب جلد ۴ صفحہ ۹۸)"(۱) جو سچ مچ علیؑ کے خطبات کا نمونہ ہے اور اگر ہم علیؑ کے خطبے ایک طرف رکھ دیں تو پھر دنیا میں ایسا کوئی اور پرجوش خطبہ نہیں ملے گا۔ آپ نے تین بار پڑھا۔ عمر سعد کو اپنے

۱۔ اللہوف صفحہ ۴۱، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۱۰، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۸۶، تحف العقول صفحہ ۱۷۳

لشکریوں کی طرف سے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ ایسا نہ ہو حسینؑ کی تقریر ان پر کارگر ہو جائے۔ کچھ دیر بعد امامؑ حسینؑ نے گفتگو شروع کی۔ چونکہ دشمن کی روح ہار چکی تھی عمر سعد نے حکم دیا کہ شور مچاؤ اور گال بجاؤ تاکہ حسینؑ کی آواز کوئی نہ سن سکے۔ کیا یہ ہار کی علامت نہیں ہے؟ کیا یہ امامؑ حسینؑ کی جیت کی علامت نہیں ہے؟

اگر انسان ایمان دار ہو، خدا کو ایک مانتا ہو، خدا سے تعلق رکھتا ہو، دوسری دنیا پر ایمان رکھتا ہو تو تن تنہا بیس، تیس ہزار لوگوں کو روحانی اعتبار سے ہرا سکتا ہے۔ کیا ہم اس سے سبق حاصل نہیں کر سکتے؟ ان کی مثال کہاں سے لاؤ گے؟ دنیا میں کہاں سے ایسا شخص لاؤ گے جس کے حالات حسینؑ کے سے ہوں اور جو حسینؑ کی سی تقریر کے دو کلمے ہی کہہ سکے؟ کوفہ کے دروازے پر کی ہوئی زینبؑ کی تقریر کے دو کلمے سنا سکے؟ اگر یہ کہا گیا کہ اس سوگ کو زندہ رکھو! اس کی تجدید کرتے رہو! تو یہ صرف اس لئے کہا گیا ہے کہ اس نکتے کو سمجھ لیں اور پہچان لیں۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ ہم حسینؑ کی بزرگی سمجھ لیں۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ ہم جو آنسو بھی بہائیں وہ حسینؑ کی معرفت حاصل کر کے بہائیں۔ حسینؑ کی معرفت، ہمارے درجات اللہ کی درگاہ میں بلند کرتی ہے۔ ہمیں انسانیت کا درفع مقام بخشتی ہے۔ ہمیں مردِ حُر بناتی ہے۔ ہمیں اہل حق اور اہل حقیقت بناتی ہے۔ اہل عدالت بناتی ہے، ایک سچا مسلمان بناتی ہے۔ حسینؑ کا مکتب انسان بنانے والا مکتب ہے یہ گنہگار بنانے والا مکتب نہیں ہے۔ حسینؑ نیک عمل کے ضامن ہیں۔ گنہگاری کے ضامن نہیں ہیں۔

لکھا ہے کہ عاشور کی صبح کو جیسے ہی امام حسین علیہ السلام اپنے اصحاب کے ساتھ نماز پڑھ چکے تو پلٹ کر ان سے فرمانے لگے: اے میرے ساتھیو! تیار ہو جاؤ۔ موت ایک پل ہے جو تمہیں ایک دنیا سے دوسری دنیا تک پہنچا دیتا ہے، ایک بہت تکلیف دہ دنیا سے بہت بلند شریف اور لطیف دنیا کو لے جاتا ہے۔ یہ تو آپ کی گفتگو

تھی۔ اب آپ کا عمل دیکھئے۔ یہ حسین بن علیؑ کا بیان نہیں ہے۔ یہ بات وقائع نگار نے کہی ہے۔ عمر سعد کے وقائع نگار ہلال بن نافع نے بھی یہ بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے مجھے حسین بن علیؑ پر حیرت ہوتی ہے کہ جیسے جیسے ان کی شہادت قریب آتی جاتی ہے اور ان کی مصیبت بڑھتی جاتی ہے ان کا چہرہ اور روشن ہوتا جاتا ہے اس انسان کی طرح جس کے وصل کا وقت قریب آتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جو قاتل لعین آپ کے سرہانے آپ کو شہید کرنے کے لئے پہنچا اس پر آپ کے نور جمال کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ حسینؑ کو قتل کرنا بھول گیا اور بول اٹھا "لقد شغلنی نور وجه و جمال هيبته عن الفكرة فی قتله"(۱) لکھا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے معرکہ کے لئے ایسی جگہ مقرر کر لی تھی جو حرم کے خیموں کے قریب تھی اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ آپ جانتے تھے کہ دشمن بہت بزدل اور درندہ صفت ہیں اور اتنی غیرت نہیں رکھتے جو کم سے کم یہ سوچیں کہ ہماری جنگ تو حسینؑ سے ہے اس لئے خیموں کو نہ چھیڑیں۔ حسینؑ چاہتے تھے کہ جب تک جان میں جان ہے، جب تک گردن کی رگ پھڑک رہی ہے کوئی اہلبیتؑ کے خیموں کو نہ چھیڑے۔ حملہ کرتے تھے، دشمن ان کے سامنے سے بھاگ جاتے تھے لیکن آپ ان کا زیادہ پیچھا نہیں کرتے تھے اور پلٹ آتے تھے تاکہ حرم کے خیموں پر کوئی حملہ نہ کرے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ جب تک آپ زندہ ہیں اہلبیتؑ کو معلوم رہے لہذا آپ نے ایک ایسی جگہ کو مرکز بنا لیا تھا جہاں سے اہلبیتؑ تک آپ کی آواز پہنچ جاتی تھی۔ جس وقت آپ حملے سے پلٹتے تھے تو اسی جگہ کھڑے ہو کر بلند آواز سے فرماتے تھے: "لا حول ولا قوة الاّ بالله العلی العظیم۔" جب حسینؑ کی آواز بلند ہوتی تھی تو اہلبیتؑ کے دل کو اطمینان ہو جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ آقا ابھی زندہ ہیں۔ امامؑ نے اہلبیتؑ سے

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۵۷، اللہوف صفحہ ۵۳

فرمادیا تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں تم خیمے سے باہر نہ آنا (آپ ان باتوں پر یقین نہ کیجئے گا کہ اہلبیتؑ برابر باہر کی طرف دوڑتے رہتے تھے۔ ہرگز نہیں۔ آقا کا حکم تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں تم لوگ خیموں میں رہنا)۔ کمزوری کی بات تمہارے منہ سے نہ نکلنے پائے ورنہ تمہارا ثواب ضائع ہوجائے گا۔اطمینان رکھو تمہارا انجام اچھا ہوگا۔ تمہیں نجات حاصل ہوگی۔ خدا تمہارے دشمنوں پر جلد عذاب نازل کریگا۔ ان لوگوں کو اجازت نہیں تھی کہ باہر آئیں اور وہ باہر آتے بھی نہیں تھے۔ حسین بن علیؑ کی غیرت اسکی اجازت نہیں دیتی تھی۔ خود ان کی غیرت اور عفت بھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ باہر آئیں اس لئے جیسے ہی امامؑ کی آواز سنتے تھے :"لا حول ولا قوۃ الّا باللّٰہ العلی العظیم" تو ان کے دل کو اطمینان ہوجاتا تھا۔ چونکہ امامؑ آخری رخصت کے بعد بھی دو ایک بار آئے تھے اور خبر گیری کرگئے تھے یہی وجہ تھی کہ امامؑ کے اہلبیتؑ آپ کے آنے کا اب بھی انتظار کررہے تھے۔ اس زمانے میں عربی گھوڑوں کو میدان جنگ کے لئے سدھایا جاتا تھا کیونکہ گھوڑا سدھایا جانے والا جانور ہے، جس وقت اس کا سوار قتل ہوجاتا تھا تو وہ کچھ خاص قسم کا رد عمل ظاہر کر دیتا تھا۔ حضرت امام حسینؑ کے اہلبیتؑ خیمے میں منتظر ہیں کہ شاید امامؑ کی آواز سن پائیں اور ایک بار اور آقاؑ کی زیارت کر لیں کہ اچانک حسینؑ کے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی۔ اہل حرم خیمے کے دروازے پر آئے۔ انھوں نے سمجھا کہ آقا آئے ہیں لیکن دیکھا کہ صرف خالی گھوڑا آیا ہے اور اس کی زین الٹی ہوئی ہے۔ اس وقت امامؑ حسینؑ کی اولاد اور رشتہ داروں نے وا حسیناہ ! وا محمداہ!کی فریاد بلند کی اور گھوڑے کے گرد کھڑے ہوگئے۔ (بین کرنا انسانی فطرت ہے۔ انسان جب اپنے دل کا دکھ کہنا چاہتا ہے تو بین کی شکل میں کہتا ہے۔ آسمان سے خطاب کرتا ہے۔ حیوان کو مخاطب کرتا ہے دوسرے انسان کو سناتا ہے) حضرت امام حسین علیہ السلام کے خاندان کا ہر فرد کسی نہ کسی

طرح بین کرنے لگا۔ آقاؑ ان لوگوں سے فرماگئے تھے کہ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں رونے کی اجازت نہیں ہے البتہ جب میں مرجاؤں تو تم رولینا۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسی حالت میں رونا شروع کردیا۔

لکھا ہے کہ حسین بن علیؑ کی ایک بیٹی تھی جس کا نام سکینہ خاتون تھا اور جسے آپ بہت پیار کرتے تھے۔ وہ بعد میں بہت بڑی ادیبہ اور عالمہ ہوئی ہیں جن کا تمام علماء اور ادباء ادب اور احترام کرتے تھے۔ امام حسین علیہ السلام ان کو بہت چاہتے تھے اور وہ بھی آقا سے بہت محبت کرتی تھیں۔ لکھا ہے کہ یہ بچّی بین میں ایسے ایسے جملے کہتی تھی کہ سب کے دل تڑپ تڑپ جاتے تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ اس بچّی نے گھوڑے کو مخاطب کرکے کہا:"یا جواد ابی ھل سقی ابی ام قتل عطشانا؟" (اے میرے باپ کے گھوڑے ! ظالموں نے میرے بابا کو پانی بھی پلایا یا پیاسا ہی قتل کر ڈالا؟) یہ کس وقت ہوا؟ یہ اس وقت ہوا جب امام حسینؑ گھوڑے کی پشت سے زمین پر گر پڑے تھے۔

وصلّی اللّٰہ علی محمّد و آلہ الطاہرین

لا حول ولا قوۃ الّا باللّٰہ العلی العظیم

چوتھی مجلس

تحریفوں کے پیش نظر ہمارا فرض

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"فبما نقضهم مّيثاقهم لعنهم و جعلنا قلوبهم قسية يحرّفون الكلم عن مواضعه و نسوا حظّا مما ذكروا به" (۱)

پچھلی تین راتوں میں ہماری گفتگو عاشور کے تاریخی واقعے کی تحریفوں کے بارے میں رہی ہے جسے ہم نے چار حصوں میں بانٹ دیا ہے:

۱۔ مجموعی طور پر تحریف کے معنی اور اس کی اقسام کے متعلق

۲۔ ان تحریفوں کے بارے میں جو خصوصیت کے ساتھ عاشور کے تاریخی واقعے میں ہوئی ہیں اور ان تحریفوں کی مثالیں

۳۔ تحریف کے اسباب۔ وہ اسباب و وجوہ جن سے بالعموم تحریف ہوتی ہے اور وہ خصوصی اسباب جو اس تاریخی حادثے میں داخل ہوئے ہیں۔

۴۔ ان تحریفوں کے پیش نظر ہم لوگوں کے، قوم کے، علماء کے اور عوام الناس کے فرائض۔

ان چار حصوں میں سے پہلے تین حصوں پر ہم نے پچھلی راتوں میں گفتگو کی ہے۔ آج کی رات ہم خدا کے فضل سے چوتھے حصے کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

قطعی اور یقینی طور پر اس بہت بڑے تاریخی حادثے میں رفتہ رفتہ اس لمبے

۱۔ سورۂ مائدہ آیت ۱۳

عرصے میں کتنی ہی تحریفیں ہوئی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس مقام پر ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان تحریفوں کے خلاف جنگ کریں بلکہ بہتر الفاظ میں اگر ہم اپنی تعریف کرنا چاہیں اور اپنے احترام کے بارے میں بات کرنا چاہیں تو ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ ہم ان تحریفوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں، لیکن اس سے پہلے کہ میں قوم کے عالموں اور عام لوگوں (عوام الناس) کے اس فریضے اور اس پیغام بری (رسالت) کے بارے میں کچھ عرض کروں تمہید کے طور پر دوسری دو باتیں بیان کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ ہم ماضی پر نظر ڈالیں اور یہ حجت کریں کہ ان تحریفوں کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ ان تحریفوں کے ذمہ دار خاص خاص لوگ اور علماء ہیں یا عوام کی جماعت؟ آج کا فرض کیا ہے اور وہ فرض کس پر عائد ہوتا ہے؟ یہ ایک بات ہے۔ ماضی میں کون کون قصوروار اور ذمہ دار تھے۔ یہ دوسری بات ہے۔ (عام طور پر اس قسم کے معاملات کی ذمہ داری علماء عوام پر ڈال دیتے ہیں اور عوام علماء کے سر پر عائد کردیتے ہیں۔ علماء کہتے ہیں کہ عوام الناس کا قصور ہے، لوگوں کی جہالت کا قصور ہے۔ لوگ اس قدر جاہل، نادان، نالائق اور ناشائستہ ہوتے ہیں کہ ان مہمل باتوں کے بھی سزاوار ہوتے ہیں۔ حقائق سننے کے لائق نہیں ہوتے۔

میں نے مرحوم آیت اللہ صدر اعلی اللہ مقامہ سے سنا ہے کہ تاج نیشاپوری اپنی تقریر میں فضول باتیں بیان کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ایک روز اعتراض کیا کہ آپ یہ کیا باتیں کرتے ہیں آخر اتنا بڑا مجمع ہوتا ہے آپ کام کی باتیں کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ لوگ اس کے اہل نہیں ہیں۔ پھر انہوں نے ایک دلیل دے کر اپنی یہ بات ثابت کردی!۔

خواص کے مقابلے میں عوام کی بھی ایک دلیل ہے اور وہ اس دلیل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے دم سے

نہیں۔ علماء مچھلی کے سر کی طرح ہوتے ہیں اور ہم عوام مچھلی کی دم۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کوتاہی اور اس ذمہ داری میں خواص اور عوام دونوں برابر کے شریک ہیں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ان مسائل کی ذمہ داری عوام پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اس قسم کے مسائل میں یہ عوام الناس ہی ہیں جو حقائق کو دباتے اور خرافات پھیلاتے ہیں۔

ایک مشہور حدیث ہے جسے علماء نے معتبر قرار دیا ہے کہ ایک شخص امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کے سلسلے میں کہ "و منهم امیّون لا یعلمون الکتاب الاّ امانیَ "(۱) (یہاں خدا عام یہودیوں پر اعتراض کرتا ہے۔ باوجودیکہ خدا عوام کو بے پڑھا لکھا اور ان پڑھ کہتا ہے۔ قرآن میں انہیں عوام پر اعتراض کرتا ہے اور انہیں ذمہ دار بھی ٹھہراتا ہے۔) وہ شخص سوال کرتا ہے کہ آقا! یہ تو ٹھیک ہے کہ یہودیوں کے علماء ذمہ دار تھے لیکن یہ ان کے عوام کی کون سی ذمہ داری ہے؟ ان لوگوں کا تو عوام ہونا ہی ان کا عذر ہے (حدیث لمبی ہے)۔ امامؑ نے فرمایا: یہ بات نہیں ہے۔ بعض مسئلوں کے لئے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انہیں صرف پڑھے لکھے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ان پڑھ نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ عوام ذمہ دار نہیں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے تعلیم نہیں پائی ہے اگر چہ کبھی کبھی یہ عوام کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ تعلیم کیوں حاصل نہیں کرتے۔ ایک دلیل یہ بھی ہے پھر بھی جہاں عوام کی ذمہ داری نہیں ہے وہ ایسے مسائل ہیں جن کے لئے تعلیم، کتابوں اور معلم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب استاد کو دیکھا نہیں، مدرسہ دیکھا نہیں، کتاب پڑھی نہیں پھر ذمہ دار کیوں ہو؟ لیکن بعض مسائل ایسے بھی ہوتے ہیں کہ آدمی اپنی عقل سلیم کی مدد سے انہیں سمجھ سکتا ہے اور مدرسے، کتاب اور استاد کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اس کے لئے فطری عقل ہی کافی ہوتی ہے۔ میرے الفاظ میں

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۷۸

ڈپلومہ رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی، چھٹی جماعت پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ عقل رکھنا ہی کافی ہوتا ہے۔ عقل کی درستگی ہی کافی ہوتی ہے۔ پھر امامؑ نے مثال دی اور فرمایا: ایک عالم لوگوں کو زہد اور تقویٰ کی تلقین کیا کرتا ہے لیکن خود زہد اور تقویٰ کے خلاف کام کرتا ہے۔ توبہ کرتا ہے لیکن توبہ کرنے والے خود توبہ کم کرتے ہیں اور عوام دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے کہے کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: کیا یہ سمجھنے کے لئے کہ ایسا آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اس کی پیروی کی جائے کسی استاد سے سبق پڑھنے اور جماعت پاس کرنے کی ضرورت ہے؟ یہودی عوام ان لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور اپنی عقل سے سمجھ لیتے تھے "واضطرّوا بمعارف قلوبهم"(۱) اپنی فطری سمجھ سے شناخت کر لیتے تھے کہ ایسے لوگوں کی پیروی نہیں کرنا چاہئے۔ پھر بھی پیروی کرتے تھے تو پھر ذمہ دار بھی ہیں۔

کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک مشہور قول کے مطابق سفید اور سیاہ حروف پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، عربی پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، فارسی جاننے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اور نحو (گرامر) کی ضرورت نہیں ہے۔ فقہ اور اصول شریعت کی ضرورت نہیں ہے۔ منطق اور فلسفے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف عقل سلیم کی ضرورت ہے اور عقل سلیم سب کے پاس ہے۔ لوگوں کی فطرت خود پہچان لیتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کا ایک تاریخی جملہ ہے جو سب سے اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ وہ نہایت فطری ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے: " انّما الاعمال بالنیات و انّما لکل امری ما نوی"(۲) عمل کا تعلق نیت سے ہے اور ہر انسان کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔

اگر کسی نے آکر یہ خواب بیان کیا، کہ فلاں شخص ایک اضطراری واقعے کی

۱۔ احتجاج طبرسی جلد ۲ صفحہ ۴۵۷
۲۔ بحارالانوار جلد ۷۰ صفحہ ۲۲۵، جامع الصیغہ جلد ۱ صفحہ ۳

بدولت، بے خبری کی حالت میں، ایسے کام کے باعث جس کے لئے اس کا ذرا سا بھی ارادہ نہیں تھا بلکہ اس کا ارادہ جس کے خلاف تھا اسے عالم بالا میں لے گئے اور اس کے تمام گناہ بخش دیئے گئے۔ کیا ہمیں یہ بات مان لینا چاہئے؟ کیا اس کیلئے ہمیں کتاب پڑھنا ضروری ہے؟ کیا ہمیں عربی جاننا چاہئے؟ سفید اور سیاہ پڑھا ہوا ہونا چاہئے؟ انسان کو گناہ سے صرف توبہ پاک کرتی ہے۔ خدا کی طرف واپسی پاک کرتی ہے" انّ الحسنات یذھبن السیئات"(۱) صرف نیک کام ہی برے کام کے اثر کو دور کرتا ہے لیکن وہ کام جس کے لئے انسان کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ خدا نے ہمیں جو فطرت عطا کی ہے ہم اس سے مطلق کام نہیں لیتے۔

کسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک لٹیرے کو جو رہزنی کرتا اور لوگوں کو قتل کیا کرتا تھا یہ خبر ملی کہ زائروں کا ایک قافلہ کربلا جارہا ہے۔ وہ آگر ایک ناکے پر اس لئے گھات میں بیٹھ گیا کہ امام حسینؑ کے زائروں کا راستہ روکے اور ان کا مال لوٹ لے اور ضروری ہو تو انہیں مار بھی ڈالے۔ وہ قافلے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اچانک بیٹھے بیٹھے راستے پر اسے نیند آگئی۔ قافلہ آکر چلا بھی گیا لیکن وہ نہیں جاگ پایا۔ اسی عالم میں اس نے خواب میں قیامت کا منظر دیکھا کہ فرشتے اسے جہنم کو لئے جارہے ہیں۔ جہنم کو کیوں لئے جارہے ہیں اس لئے کہ اس کے اعمال نامے میں کوئی چھوٹا سا بھی نیک کام نہیں ہے۔ جو کچھ ہے گناہ ہے۔ جو کچھ ہے جرم ہے۔ اسے جہنم کے کنارے تک لے گئے لیکن جہنم نے اسے قبول نہیں کیا تو وہ واپس آگیا۔ کیوں قبول نہیں کیا؟ کیونکہ یہ شخص اس وقت راستے کے کنارے سوگیا تھا جس وقت زائروں کا قافلہ گذر رہا تھا اور اس کے جسم اور لباس پر زائروں کے راستے کی دھول پڑ گئی تھی۔ اس کا خود کوئی ارادہ نہیں تھا بلکہ خود تو زائروں کے قتل کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ ان کا مال مارنے کا ارادہ

۱۔ سورۂ ہود آیت ۱۱۴

کیے ہوئے ہے۔ پھر بھی پیغمبرؐ کے قول کے برعکس کہ :" انّما الاعمال بالنیات و انّما لکل امری ما نوی ۔"اس غیر ارادی فعل نے اس کے تمام گناہ مٹا ڈالے :

"فانّ النّار لیس تمسّ جسماً
علیه غبار زوّار الحسین"

شاعر کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ امام حسینؑ کے نظریئے کی رو سے درست نہیں ہے۔

دوسری بات جو مجھے اس پیغامبری اور فریضے کے بیان سے پہلے عرض کرنا چاہئے وہ خطرات ہیں جو ان تحریفوں میں موجود ہیں۔ ہم مختصر سی گفتگو تحریف کے خطرے کے متعلق کرتے ہیں۔ عاشور کے تاریخی واقعے کی طرح طرح کی تحریفیں ہمیں مل گئی ہیں۔ ہم نے تحریف کے اسباب بھی پہچان لئے ہیں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ آخر تحریف میں کیا برائی ہے؟ کیا نقصان ہے؟ کیا خطرہ ہے؟ تحریف میں غیر معمولی طور پر خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ تحریف ایک ایسی بالواسطہ چوٹ ہے جو براہ راست چوٹ سے زیادہ سخت اور مؤثر ہوتی ہے۔ جس کتاب میں تحریف ہوتی ہے (تحریف لفظی ہو یا تحریف معنوی) اگر وہ ہدایت کی کتاب ہے تو گمراہی کی کتاب بن جاتی ہے۔ اگر نیکی کی کتاب ہے تو سنگدلی کی کتاب بن جاتی ہے۔ اگر انسان کو اونچا اٹھانے والی کتاب ہوتی ہے تو تحریف کے باعث نیچے لے آتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر اس کی حقیقت کو بالکل بدل دیتی ہے۔ اس کی صرف خاصیت ہی زائل نہیں کرتی یعنی اسے صرف بے اثر ہی نہیں کرتی بلکہ اس کو الٹا اثر بخش دیتی ہے۔

ہر چیز کے ساتھ اسی کے لحاظ سے آفت ہوتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں :"افت الدین ثلاثة: فقیه فاجر، امامٌ ظالم، مجتهد جاهل"(۱)(تین چیزیں

۱۔ جامع الصغیر جلد ۱ صفحہ ۴

دین کے لئے آفت ہوتی ہیں:

۱۔ برا عمل کرنے والا، فاسق اور فاجر عالم۔ ۲۔ ظالم سردار اور پیشوا ۳۔ جاہل مجتہد) پیغمبر اکرمؐ ان کو دین کے لئے آفتیں قرار دیتے ہیں۔ جس طرح جمادات، نباتات اور حیوانات سے مخصوص کچھ آفتیں ہوتی ہیں اسی طرح کچھ آفتیں انسانوں کے جسم سے بھی مخصوص ہوتی ہیں۔ دین، آئین اور مسلک بھی ان کی خصوصی آفتیں ہوتی ہیں۔ تحریف جو ان تین گروہوں میں سے جو پیغمبر اسلامؐ نے بیان فرمائے ہیں دو گروہوں یعنی بد عمل اور فاسق عالم اور جاہل مجتہد کے وسیلے سے پیدا ہوتی ہے دین کے لئے ایک آفت ہے۔ یہ دین کو ختم کردیتی ہے۔ تحریف کو لوگ حقیقت سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں لیکن وہ چونکہ موضوع کو بدل دیتی ہے اس لئے لوگوں کے سامنے اس کا نتیجہ بالکل الٹا نکلتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی اتنی عظیم شخصیت ہم میں سے بعض لوگوں کی نظر میں ایک ایسی شخصیت ہے جس میں عجیب و غریب تحریف ہوئی ہے۔ بعض لوگ حضرت علیؑ کو صرف پہلوان سمجھتے ہیں اور بس! کبھی بہت غرض مند لوگوں کے ذریعے سے حضرت علیؑ کی ایسی تصویریں نشر ہوتی ہیں جن میں سانپ کی زبان جیسی ایک دو دھاری تلوار آپ کے ہاتھ میں ہے اور ان کے بازوں اور چہرہ کو بھی کچھ ایسا بنایا ہے اور ان پر ایسے نقوش بنائے ہیں جو نہ معلوم کہاں سے ہاتھ لگے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؑ اور پیغمبر اسلامؐ کا کوئی فوٹو یا بت دنیا میں نہیں ہے لیکن لوگ ایسے ایسے چہرے بنا دیتے ہیں کہ انسان کو یقین نہیں آتا کہ یہ وہی انصاف پرور حضرت علیؑ ہیں۔ یہ وہی حضرت علیؑ ہیں جو راتوں کو خوف خدا سے رویا کرتے ہیں کیونکہ کسی عابد، کسی تہجد گزار اور کسی ایسے شخص کی تصویر جو راتوں کو استغفار کرتا رہا

ہو کسی حکیم، کسی قاضی یا کسی ادیب کی تصویر سے مختلف ہوتی ہے۔

دوسری بات جو ہم ایرانیوں سے مخصوص ہے یہ ہے کہ ہم چوتھے امامؑ کو عابد بیمار کہتے ہیں۔ ہم فارسی زبان کے علاوہ اور کسی زبان میں امام زین العابدینؑ کے نام کے ساتھ لفظ 'بیمار' نہیں پاتے۔ (ہمارے وہ ذاکرین اور شعراء جو فارسی ادب سے متاثر ہوئے انھوں نے بھی یہی لفظ اپنی تقریروں اور مرثیوں میں بکثرت استعمال کیا ہے۔) عربی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے۔ آپ کے القاب زیادہ ہیں۔ سجّاد آپ کا ایک لقب ہے۔ ذو الثفنات بھی ایک لقب ہے۔

کیا آپ دنیا کی کوئی ایسی کتاب دکھا سکتے ہیں جس میں عربی زبان کا کوئی ایسا لقب امامؑ کو دیا گیا ہو جو (بیمار) علیل کے معنی میں استعمال ہوتا ہو؟ امامؑ زین العابدینؑ صرف عاشور کے سانحے کے وقت بیمار تھے (شاید خدا کا یہ حکم اس لئے رہا ہو کہ امامؑ زندہ رہیں اور اسی طرح امام حسینؑ کی نسل محفوظ ہو جائے) اور وہی بیماری اس نسل کی نجات کا سبب ہوگئی۔ دشمنوں نے کئی بار ارادہ کیا کہ امامؑ کو مار ڈالیں، لیکن ان کی بیماری اتنی شدید تھی کہ وہ کہتے تھے "انّہ لما بہ" (۱) انہیں کیوں قتل کریں؟ وہ تو خود ہی مر رہے ہیں۔ دنیا میں کون ہے جو اپنی زندگی میں کبھی بیمار نہ پڑا ہو؟ ان چند دن کے علاوہ کبھی آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے لکھا ہو کہ امامؑ زین العابدینؑ بیمار تھے؟ لیکن ہم نے امامؑ زین العابدینؑ کی تصویر کشی ایک ایسے بیمار انسان کی صورت میں کی ہے جسے بخار چڑھا ہو، جس کا رنگ پیلا پڑ چکا ہو، جس کے ہاتھ میں سہارے کے لئے ہمیشہ ایک لاٹھی رہتی ہو، جسکی کمر جھکی ہوئی ہو اور جو راستہ چلنے میں آہیں بھرتا جاتا ہو۔

اسی جھوٹ اسی تحریف کے باعث بہت سے لوگ آہیں بھرتے ہیں، روتے

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۶۱، اعلام الوری صفحہ ۲۴۶، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۴۲

ہیں اور اپنے آپ کو بالکل موت کے نزدیک ظاہر کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کا احترام کریں اور کہیں کہ آپ کو دیکھئے بالکل زین العابدینؑ کی طرح بیمار ہیں۔ یہ تحریف ہے امام زین العابدینؑ جسم اور مزاج کے لحاظ سے امام حسین علیہ السلام اور امام محمد باقر علیہ السلام سے کسی طرح مختلف نہیں تھے۔ امامؑ سانحۂ کربلا کے چالیس سال بعد تک زندہ رہے۔ سب کی طرح صحیح و سلامت تھے۔ امام صادق علیہ السلام سے بھی مختلف نہیں تھے پھر ہم امام زین العابدینؑ کو بیمار کیوں کہیں؟(۱)

امامت کے معنی مثالی نمونہ بنا ہیں۔ امامؑ کے وجود کا نظریہ یہ ہے کہ ایک انسان تمام انسانوں سے بالاتر ہو جسطرح پیغمبر اسلامؐ "بشر مثلکم یوحی الیّ"(۲) تھے تاکہ لوگ آپ کی اعلیٰ مثالوں کی پیروی اور تقلید کریں لیکن جس وقت ان شخصیتوں کا چہرہ بہت زیادہ دھندلا گیا، بگڑ گیا۔ ان کی تصویر بدل گئی تو پھر یہ پیروی اور تقلید کے لائق نہیں رہ جاتے یعنی ان خیالی شخصیتوں کی پیروی مفید ہونے کے بجائے

۱۔ خدا مرحوم آیتی رضوان اللہ علیہ پر رحمت نازل کرے۔ وہ ایک بیش قیمت موتی تھے جنہیں ہم نے کھو دیا۔ ان بزرگ نے پانچ چھ سال پہلے دین انجمن کے ایک ماہانہ جلسے میں تبلیغ کی راہ و رسم سے متعلق گفتگو کی تھی جو گفتار ماہ کی دوسری جلد میں چھپ گئی ہے۔ اس میں انہوں نے یہی موضوع پیش کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ کیا بات ہے جو ہم امام زین العابدینؑ کو بیمار بتایا کرتے ہیں؟ ہم نے امام کو ایک ایسا لقب دے دیا ہے جو سنے وہ یہ خیال کرے کہ امام عمر بھر بیمار رہے ہیں پھر انہوں نے ایک دلچسپ قصہ سنایا کہ کچھ دن پہلے میں ایک رسالہ پڑھ رہا تھا جس میں مقالہ نگار نے حکومت اور حکومت کے کارندوں کی حالت پر اعتراض کیا تھا کہ حکومت کے اکثر و بیشتر کارندے اور عہدہ دار نالائق ہیں یا ناپاک ہیں نالائق ہیں تو ناپاک ہیں اور پاک ہیں تو ان میں۔

۲۔ امام زین العابدین بیمار جبکہ ہم کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو حضرت عباس ہوں اور مستعد یعنی شر مستعد تھا لیکن ناپاک تھا، امام زین العابدین بیمار پاک انسان تھے مگر بد قسمتی سے مستور نہیں تھے۔ (نعوذباللہ) لیاقت نہیں رکھتے تھے۔ حضرت عباس پاک بھی تھے اور مستعد بھی۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہی ایک چھوٹا سا واقعہ کس قدر انحراف (کجی) پیدا کر رہا ہے۔

سورۂ کہف آیت ۱، سورۂ فصلت آیت

الٹا اثر دکھانے لگتی ہے۔ تو ہم نے مختصر طور پر یہ سمجھ لیا کہ تحریف کا خطرہ کتنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ واقعی تحریف ایک بالواسطہ چوٹ ہوتی ہے، یہ پیٹھ میں چھرا گھونپتی ہے۔

دنیا میں یہودیوں کی نسل تحریف کی ہیرو ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ان کے برابر کسی نے تحریف نہیں کی اور اسی دلیل کی رو سے کسی نے بھی یہودیوں کے برابر انسانیت کو نقصان نہیں پہنچایا، حقائق نہیں بدلے اور بدایجاد نہیں کیں۔

پیغامبری اور ہمارا فریضہ :

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں ہماری بہت بھاری ذمہ داری ہے جس سانحے میں تحریف ہو چکی ہو اس سے لوگوں کی خدمت نہیں کی جا سکتی۔ ماضی میں بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ ماضی میں اگر اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا تھا تو نقصان بھی کم ہوتا تھا لیکن اس زمانے میں اس کا نقصان بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ ہمارا اور آپ کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں اور غور کریں کہ ہماری تاریخ میں کون کون سی تحریفیں ہوئی ہیں۔ کون کون سی تحریفیں ہمارے بزرگ شخصیتوں کی نقاشی میں ہوئی ہیں اور کون کون سی تحریفیں قرآن میں ہوئی ہیں؟ لیکن قرآن کی تحریف لفظی تحریف نہیں ہے یعنی قرآن میں سے نہ ایک لفظ کم ہوا ہے نا ہی ایک لفظ بڑھا ہے۔ قرآن کی معنوی تحریف کا خطرہ اس کی لفظی تحریف کے خطرے ہی کے برابر ہے۔ قرآن کی معنوی تحریف کسے کہتے ہیں؟ یعنی غلط تفسیر، غلط توجیہ، قرآن کی غلط تفسیر بیان کرنے، غلط توجیہ کرنا۔ صرف اتنا ہی نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہماری تاریخوں میں جو ہمارے لئے سبق آموز ہو سکتی ہیں اور ہمارے اخلاقی سند ہیں، ہماری اجتماعی تربیت کے لئے سند ہیں جیسے عاشور کا تاریخی سانحہ جس میں کیا کیا تحریفیں ہوئی ہیں۔ ہمیں ان تحریفوں کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

قوم کے عالموں اور عام لوگوں کے فریضے :

قوم کے علماء کے فرائض کیا ہیں؟ عوام کے فرائض کون کون سے ہیں؟

قوم کے عالموں کے متعلق میں ایک عمومی بات کہتا ہوں : عالم کی کمزوری اس میں ہے کہ یہ ہمیشہ لوگوں کے عیب اور کمزوریاں اپنے سامنے رکھتا ہے۔ لوگوں میں روحانی، اخلاقی اور اجتماعی کمزوریاں ایک قسم کی بیماری ہوتی ہیں۔ جسمانی بیماریوں میں انسان اپنے آپ کو بیمار محسوس کرتا ہے اور خود علاج کی فکر کرتا ہے لیکن روحانی بیماریوں میں دشواری یہ ہوتی ہے کہ بیمار لوگ اپنے آپ کو بیمار نہیں سمجھتے بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی روحانی بیماری کو بھی صحت اور سلامتی ہی تصور کرتے ہیں اور اس سے پیار کرتے ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ اپنی کمزوریوں کو تسلیم کریں۔ وہ انہیں اپنی خوبیاں سمجھتے ہیں۔ اب یہ صرف عالم ہوتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ سماجی اور معاشرتی کمزوریاں کون کون سی ہیں۔

جن عالموں کے سامنے سماجی اور معاشرتی کمزوریاں ہوتی ہیں اُن کے دو گروہ ہوتے ہیں : ۱۔ ایک تو لوگوں کی کمزوریاں دور کرتا ہے۔ اسے مصلح کہتے ہیں یعنی لوگوں کی اصلاح کرنے والا۔ زیادہ تر لوگ ایسے عالم یا مصلح سے خوش نہیں ہوتے۔ ۲۔ دوسرا لوگوں کی کمزوریاں دور کرنے (اصلاح) کو مشکل اور دشوار کام سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے لوگوں کی کمزوریاں دور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ الٹا نقصان ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کو فقیہ فاجر کہتے ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کے فرمانے کے مطابق دین کی تین آفتوں میں سے ایک ہے۔

ہم تمام مسئلوں پر گفتگو نہیں کریں گے بلکہ صرف واقعہ عاشور پر بات چیت کریں گے۔ امام حسین علیہ السلام کی عزاداری کے سلسلے میں عام لوگوں کی دو کمزوریاں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ عام طور پر بانیان مجالس جو مسجدوں میں مجلس برپا کرتے

ہیں اور جو اپنے اپنے گھروں میں مجلسیں منعقد کرتے ہیں سب کے سب میرے تجربے کی حد تک (جس میں کوئی استثناء نہیں) یہ چاہتے ہیں کہ ان کی مجلس میں لوگوں کی کثیر تعداد جمع ہو۔ اگر مجمع کثیر ہوا تو خوش ہو جاتے ہیں اور جو مجمع نہ ہوا تو خوش نہیں ہوتے۔ یہ کمزوری ہے۔ یہ مجلسیں اس لئے نہیں ہوتیں کہ جم غفیر اکٹھا ہو لیکن ہم یہی چاہتے ہیں کہ پریڈ دیکھیں۔ تو کیا ہم واقعی پریڈ کرانا چاہتے ہیں؟ مقصد تو حقائق سے واقف ہونا ہے۔ تحریفات سے لڑنا ہے۔ یہ ایک کمزوری ہے جس کو ایک ذاکر مقابلہ کر کے دور کرے یا تاج نیشاپوری کی طرح اس کمزوری سے فائدہ اٹھائے۔ اگر وہ اس کمزوری کو دور کرنا چاہتا ہے تو بانی مجلس اور سامعین مجلس کے مقصد کے خلاف جاتا ہے جنہیں باہم ملنا جلنا اور شوروغل مچانا اچھا لگتا ہے اور اگر وہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو صرف یہ سوچتا ہے کہ کیا کروں جس سے لوگ زیادہ تعداد میں جمع ہو سکیں۔ یہاں پہنچ کر عالم ایک دوراہے پر آکھڑا ہوتا ہے کہ اب جو یہ احمق جمع ہیں اور یہ کمزوری رکھتے ہیں تو میں ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاؤں یا اس کمزوری کے باوجود کوشش کر کے سچ کی پیروی کروں؟

عزاداری کی مجلسوں کا دوسرا کمزور پہلو جو زیادہ تر عوام الناس سے متعلق ہے اور خوش قسمتی سے کم ہو گیا ہے شوروواویلا ہونے کا مسئلہ ہے۔ ذاکر کو تقریر کے آخر میں مصائب ضرور بیان کرنا چاہیں اور اس بیان مصائب میں لوگ نہ صرف روئیں کیونکہ صرف آنسو بہانا منظور نہیں ہے بلکہ مجلس تہ وبالا ہو جائے اور شوروواویلا مچ جائے۔ میں نہیں کہتا کہ مجلس تہ و بالا نہ ہو لیکن میں کہتا ہوں کہ اسے مقصد نہ بنایا جائے۔ جب سیدھے سچے طریقے سے حقائق اور واقعات بیان کر کے سچائی اور خلوص سے آنسو بہنے لگیں، شور و واویلا بھی مچ جائے، مجلس کا مآل کار بھی حاصل ہو جائے اور جھوٹی روایتیں بیان نہ ہوں، کوئی من گھڑت نہ ہو، کوئی تحریف نہ ہو، امام حسینؑ

کے لئے ایسے اصحاب نہ بنائیں جو تاریخ میں نہیں ملتے اور جنہیں خود امام حسینؑ بھی نہیں پہچانتے کیونکہ ان کا وجود ہی نہیں تھا، امام حسینؑ کے ان بیٹوں کا ذکر بھی نہ ہو جن کا دنیا میں کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا اور امام حسینؑ کے ایسے دشمنوں کا بھی ذکر نہ ہو جو مطلق وجود نہیں رکھتے تھے تو بہت خوب ہے۔ جب حقیقت اور صداقت نہ ہو تو کیا ہمیں یہ چاہئے کہ ہم امامؑ حسینؑ سے لڑیں، دشمنی کریں، بہتان لگائیں اور جھوٹ بولیں۔

یہ عوام کا کمزور پہلو ہے۔ کیا عوام کے اس کمزور پہلو سے فائدہ اٹھانا چاہئے کیا اس پہلو کا استحصال کرنا مناسب ہے؟ کیا تاج نیشاپوری کی طرح یہ کہنا چاہئے کہ چونکہ یہ لوگ نادان ہیں میں ان کی نادانی سے فائدہ اٹھاتا ہوں؟ نہیں!

علماء کی سب سے بڑی پیغامبری اور ذمہ داری لوگوں کی کمزوریوں کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔ یہی بات پیغمبر اکرمؐ نے فرمائی ہے: "اذا ظهرت البدع فی امتی فلیظهر العالم علمه و الاّ لعنته لعنة اللّٰه"(۱) جس وقت بدعتیں اور جھوٹ ظاہر ہونگے، جس وقت وہ باتیں ظاہر ہونگی جو دین میں نہیں ہیں، ایسے مسائل پیدا ہونگے جو میں نے بیان نہیں کئے۔ اس وقت دانشوروں کا فرض ہے کہ حقائق بیان کریں چاہے لوگوں کو ان کی یہ بات پسند نہ آئے۔ جو شخص حقائق کو چھپائے گا اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ اس سے بھی بڑھ کر قرآن مجید نے فرمایا ہے: "انّ الذین یکتمون مآ انزلنا من البیّنت و الهدی من (م) بعد ما بیّنّٰه للنّاس فی الکتٰب اولٰئك یلعنهم اللّٰه و یلعنهم الّا عنون "(۲)

جو جاننے والے وہ حقائق جانتے ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں لیکن وہ انہیں

۱۔ سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۶۳، اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۴

۲۔ سورۂ بقرہ آیت ۵۹

چھپاتے ہیں، پوشیدہ رکھتے ہیں، ظاہر نہیں کرتے ان پر خدا کی لعنت ہو اور ہر لعنت کرنے والے کی لعنت ہو۔ خاتم النبوت کے دور میں عالموں کا فرض تحریف کے خلاف جدوجہد کرنا ہے' خوش قسمتی سے اس کام کا وسیلہ دستیاب ہے۔ عالموں میں ایسے لوگ موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں جنہوں نے کمزوریوں کو دور کیا اور دور کر رہے ہیں۔ کتاب "لُو لُو و مرجان" جو عاشور کے سانحے کے موضوع پر لکھی گئی ہے جس کا میں پچھلی تین راتوں میں نام لیتا رہا ہوں حاجی نوری مرحوم (رضوان اللہ علیہ) نے لکھی ہے یہ صریحاً وہی قیام اور نہایت مقدس فریضہ ہے جو ان بزرگ نے انجام دیا اور جو اس حدیث کے پہلے جزو کا مصداق ہے: "اذا ظهرت البدع فی امتی فلیظهر العالم علمه"۔

اس سلسلے میں یہ عالموں کا فریضہ ہے کہ حقائق کو کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں چاہے لوگوں کو یہ بات ناپسند ہی کیوں نہ ہو۔ عالموں کا فریضہ ہے کہ جھوٹ کے خلاف لڑیں۔ حقائق کو مسخ کرنے والوں کی پول کھولیں۔ فقہا کے نزدیک باب غیبت میں ایک بحث ہے جہاں بعض استثنائی حالات میں غیبت کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ بڑے بڑے علماء اس کا ارتکاب کرتے اور اسے واجب سمجھتے ہیں۔ وہ راوی کی جرح (تنقید) ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ ایک شخص پیغمبرؐ یا امامؑ کی حدیث نقل کرے تو کیا آپ کو یہ لازم ہے کہ اسے فوراً قبول کر لیں؟ نہیں!۔ بلکہ اس شخص کی تحقیق کرنا چاہئے کہ وہ کیسا آدمی ہے، سچا ہے یا جھوٹا؟ اگر اُس شخص کی زندگی میں آپ نے کوئی کمزوری پائی ہے اگر کوئی عیب، نقص، جھوٹ، گناہ ثابت ہوا تو پھر نہ صرف آپ مناسب مواقع پر اور کتابوں میں اس شخص کو رسوا کریں۔ اس کا نام جرح ہے۔ اگرچہ یہ غیبت ہے، بدگوئی ہے اور غیبت اور بدگوئی نہ مردے کی جائز ہے نہ زندہ کی لیکن چونکہ یہ حقائق کی تحریف ہے، حقائق کو مسخ کیا گیا ہے۔ اس لئے

آپ کو اسے رسوا کرنا چاہئے۔ حقائق کو مسخ کرنے والے کو رسوا کرنا جائز ہے۔

اس سلسلے میں ہو سکتا ہے کہ کوئی عالم بزرگ بھی ہو جیسے ملا حسین کاشفی جو بڑا ملاّ گزرا ہے لیکن اس کی کتاب "روضۃ الشہداء" جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اُس نے دوست دشمن سب کے اعمال کی تحریف کی ہے بلکہ ابن زیاد اور عمر ابن سعد کے اعمال کی بھی تحریف کی۔ اس نے لکھا ہے کہ ابن زیاد نے عمر ابن سعد کو تقریباً پچیس کلو سونا دیا تب وہ کربلا آیا اور اس نے اس کام میں ہاتھ ڈالا۔ جو کوئی سنے گا وہ کہے گا کہ عمر ابن سعد کا بھی زیادہ قصور نہیں تھا۔ جس کس کو پچیس کلو سونا دینگے وہ یہ کام کر دیگا۔ ملاّ آقا دربندی کے بارے میں لوگوں کا اتفاق ہے کہ وہ اچھے آدمی گزرے ہیں۔ حاجی نوری مرحوم بھی جو ان کی کتاب پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور نکتہ چینی بھی صحیح کرتے ہیں کہ وہ اچھے آدمی گزرے ہیں وہ امام حسین علیہ السلام کے بارے میں واقعی بہت مخلص تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ جب امامؑ حسین علیہ السلام کا نام سنتے تھے ان کے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ وہ فقہ اور اصول سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنے آپ کو اول درجے کے فقیہوں میں شمار کرتے تھے لیکن ایسا نہیں تھا! اُن کا شمار کم سے کم درجہ دوم اور سوم کے فقیہوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے خزائن کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو فقہ کے ایک دورے پر مشتمل ہے اور وہ چھپ چکی ہے۔ جواہر کے مصنف کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے جواہر کے مصنف سے پوچھا۔ تمہاری کتاب کا کیا نام ہے؟ انہوں نے جواب دیا جواہر۔ ان کی کتاب کا نام خزائن تھا تو بولے تمہارے جواہر جیسے تو میرے خزائن میں بہت ہیں لیکن کتاب جواہر اب تک دس بار چھپ چکی ہے اور کوئی فقیہ ایسا نہیں ہوگا جس نے اس سے کام نہ لیا ہو۔ کوئی فقیہ ایسا نہیں ہے جو اپنے آپ کو اس کتاب کا محتاج نہ پاتا ہو لیکن کتاب خزائن جو ایک بار چھپی تھی اس کے بعد اس کی کسی ایک چھاپ کا بھی سراغ نہیں مل سکا۔ اس کی قیمت

ایک ہزار صفحات کی ضخامت کے باوجود اس کی کاغذ کی قیمت سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ صاحب اگرچہ عالم ہیں لیکن انہوں نے "اسرار الشہادۃ" لکھ کر کربلا کے سانحے کو بالکل بدل ڈالا ہے، الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ بے اثر کر دیا ہے۔ ان کی کتاب میں جھوٹ کی بھرمار ہے۔ کیا اب ہمیں محض اس وجہ سے کہ وہ عالم تھے، متقی تھے، امامؑ حسینؑ سے مخلص تھے ان کے بارے میں سکوت اختیار کر لینا چاہئے؟ کیا حاجی نوری کو ان کی کتاب اسرار الشہادت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرنا چاہئے؟! جرح کرنا چاہئے کیونکہ یہ عالم کا فریضہ ہے ہم خداوند عالم سے توفیق چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے دلوں کی حق اور حقیقت کی طرف رہبری فرمائے۔

خدا ہمارے ان گناہوں کو معاف فرمائے جو ہم سے تحریف یا تحریف کے علاوہ کسی اور طریقے سے سرزد ہوئے ہیں۔

ہمیں توفیق دے کہ اس سلسلے میں ہم پر عائد اس پیغامبری اور فریضے کو بخوبی انجام دیں۔

۲ حسینی حماسہ

پہلی مجلس

کربلا کے حادثے کے دو رخ

بسم اللّٰہ الر حمن الرحیم

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم: "یا قوم ان کان کبر علیکم مقامی و تذکیری بایت اللّٰہ فعلی اللّٰہ توکّلت فاجمعوا امرکم وشرکائکم ثمّ لایکن امرکم علیکم غمّۃ ثم اقضوا الیّ و لا تنظرون"(۱)

ہماری گفتگو کا موضوع حسینی حماسہ ہے۔ میں سب سے پہلے لفظ حماسہ کی جو فارسی زبان میں زیادہ استعمال ہوتا ہے آپ کی خاطر وضاحت کردوں۔

لفظ حماسہ کے معنی شدت اور سختی کے ہیں۔ کبھی یہ لفظ شجاعت اور حمیّت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ شعر کے عالم شعروں کے مجموعوں کا شعر کی اقسام اور مقاصد کے لحاظ سے الگ الگ نام رکھ دیتے ہیں۔ بعض نظموں کو غنائی، بعض کو حماسی

۱۔ اے میری قوم اگر میرا ٹھہرنا اور خدا کی آیتوں کا چرچا کرنا تم پر شاق وگراں گزرتا ہے تو میں صرف خدا ہی پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ پس تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنا کام ٹھیک کرلو تمہاری بات تم (میں سے کسی) پر مخفی نہ رہے پھر (جو تمہارا جی چاہے) میرے ساتھ کر گزرو اور مجھے (دم مارنے کی بھی) مہلت نہ دو۔ سورۂ یونس آیت ۷۱

(رزمیہ) بعض کو وعظی اور نصیحتی، بعض کو رثائی اور بعض کو مدحی کہتے ہیں۔ حافظ کی غزلیات اور دیوان، سعدی کی غزلیات، شمس تبریزی کا دیوان غنائی مجموعے ہیں یعنی ان کا ہدف عرفان الہٰی ہے لیکن کم سے کم نشیب کے لحاظ سے ان کی زبان عاشقانہ ہے۔ محبوب کے حسن اور کج ادائی کی باتیں ہیں۔ جدائی کے دکھ، شب ہجر کے طول اور وصل کے دنوں کے مختصر ہونے کے تذکرے ہیں۔

فکر بہ آنست کہ گل شد یارش
گل در اندیشہ کہ چوں عشوہ کند درکارش
دلربائی ہمہ آں نیست کہ عاشق بکشند
خواجہ آنست کہ باشد غم خدمتگارش

یہ غنائی شعر ہیں اگر چہ آخر میں ایک بہت مزیدار اور بلند پایہ عرفانی معنی تک رسائی ہوجاتی ہے۔ حافظ کا یہی طور ہے۔ آخر میں یہ شعر کہتا ہے:

صوفی سر خوش از این دست کہ کج کردکلاہ
بدو جام وگر آشفتہ شود دستارش

غنائی شعر زیادہ ہیں۔

شعر رثائی یا مرثیہ دین کے بزرگوں، دنیا کے دوسرے بڑے لوگوں اور ان لوگوں کے لئے جو خیر وبرکت کا موجب رہے ہیں کہا گیا ہے۔ یہ شعر کی دوسری قسم ہے۔ جب برامکہ پر زوال آیا تو جو شعراء ان کے یہاں سے فیض یاب ہوتے رہے تھے انہوں نے ان کے رثا میں قصیدے لکھے۔ خود اسی حافظ کا جوان بیٹا مر جاتا ہے تو اپنی اسی مخصوص زبان میں اس کا مرثیہ کہتا ہے۔

بلبلے خون جگر خورد و گلے حاصل کرد
باد غیرت بہ صدش حال پریشاں دل کرد
طوطے ای رابہ ہوا ے شکرے دل خوش بود
ناگہش سیل فنا نقش امل باطل کرد
آہ و فریاد کہ از چشم حسود مہ و مہر
در لحد ماہ کمال ابروے من منزل کرد

رثائی اشعار زیادہ ہیں۔ تعریف خاص طور پر خوشامد اور چاپلوسی سرے سے غائب۔

حماسی اشعار کی قسم ایک اور ہی ہوتی ہے جو صرف ایک مخصوص لہجہ قبول کرتی ہے۔ شعر حماسی وہ شعر ہوتا ہے جس سے غیرت، شجاعت اور مردانگی کی بو آتی ہے۔ یہ ایسا شعر ہوتا ہے جو روح کو تحریک دیتا ہے اور اسے جوش میں لے آتا ہے مثلاً:

تن مردہ و گریۂ دوستاں — بہ از زندہ و طعنۂ دشمنان
مرا عار آید ازیں زندگی — کہ سالار باشم کنم بندگی

یہ تقسیم کچھ اشعار سے ہی خصوصیت نہیں رکھتی بلکہ نثر کا بھی یہی ڈھنگ ہے۔ ہمارے یہاں حماسی (رزمیہ) نثریں ہیں، غنائی نثریں ہیں، رثائی نثریں ہیں، طرح طرح کی نثریں ہیں۔

صفین کی لڑائی میں حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کی فوجوں میں پہلی مڈبھیڑ ہوتی ہے تو حضرت علیؑ لڑائی میں پہل کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور اس بات کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے مشکلات اور اختلافات کو دور

کریں بلکہ معاویہ اور اس کے حمایتیوں کو بات چیت کر کے راہ پر لے آئیں۔ لیکن ایک وقت آپ کو یہ خبر ملتی ہے کہ اس نے پہل کر دی ہے اور جس مقام سے فرات کا پانی بھرا جاتا ہے اس پر پہرہ بٹھا دیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام باہمی گفت و شنید کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پیغام بھیجتے ہیں کہ ابھی لڑائی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ مذاکرہ کریں بلکہ مذاکرے سے یہ مسئلہ حل بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ بات دوسرے فریق نے منظور نہیں کی اب اس کی وجہ سے یا تو حضرت علیؑ کے اصحاب پیاس سے مجبور ہو جائیں یا پھر وہ لڑائی لڑیں جو دشمن نے شروع کر دی ہے۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت علیؑ اپنی سپاہ کے سامنے اس بات پر ناخوش اور برہم کھڑے ہیں۔ چند سطروں کا ایک مختصر سا خطبہ دیتے اور فرماتے ہیں: "قد استطعمو کم القتال۔"(۱) یہ لوگ لڑائی کے بھوکے ہیں اور تم سے غذا مانگتے ہیں لیکن تلوار کی کاٹ کی غذا "فاقرّوا علیٰ مذلّة و تأخیر محلّة او روّوا لسیّوف من الدّماء تروّوا من الماء"(۲) اے میرے سپاہیو میں نہیں کہتا کہ تم جاؤ اور لڑو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ جاؤ اور ان دو طریقوں میں سے ایک کا انتخاب کرو: یا ذلت اختیار کر لو کہ وہ پانی بند کر دیں اور تم دیکھتے رہو یا یہ کہ تم اپنی ان تلواروں کی پیاس ان نا معقولوں کے خون سے بجھاؤ تاکہ تم خود بھی سیراب ہو سکو۔

"فالموت فی حیاتکم مقهورین والحیاة فی موتکم قاهرین" زندگی یہ ہے کہ تم مر جاؤ لیکن باوقار اور باعزت رہو اور مرنا یہ ہے کہ تم زندہ رہو لیکن سر پر دھولیں کھاتے رہو۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی ایسی باتوں سے وہ جوش دلایا کہ دو گھنٹے کے اندر اندر دشمن کو فرات کے گھاٹ سے اتنی دور تک مار کر بھگایا کہ پھر

(۱۔۲۔ نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ ۵۱ صفحہ ۱۳۸)

دشمن پیاس کے مارے ہانپنے لگا لیکن حضرت علیؑ نے اپنے سپاہیوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ تم انہیں روزانہ اجازت دے دیا کرو کہ آئیں اور پانی لے جائیں۔ لشکریوں نے کہا کہ انہوں نے تو ہمیں پانی ہی نہیں دیا تھا۔ ہم بھی انہیں پانی نہیں دیں گے لیکن حضرت علیؑ نے فرمایا: نہیں! یہ غیر انسانی فعل ہے۔ پانی کو استعمال کرنے کا ہر جاندار کو حق ہے اس لئے پانی مت بند کرو۔

تو معلوم ہوا کہ بات حماسی یعنی رزمیہ بات بھی ہوتی ہے جس میں غیرت، شجاعت اور مردانگی کی خوبو، ڈٹ جانے اور مقابلہ کرنے کی کیفیت ہو۔ جب شعر یا نثر میں یہ خصوصیات پائی جائیں تو اسے حماسی (رزمیہ) کہیں گے۔

یہی قسمیں سرگزشتوں، سانحوں اور تاریخوں کی بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں غنائی سانحے بھی ہیں، واعظی اور نصیحتی سانحے بھی ہیں، رثائی سانحے بھی ہیں اور حماسی (رزمیہ) سانحے بھی ہیں۔ ایک سرگزشت پوری کی پوری صرف غنائی ہے۔ وہ غنا کی بو دیتی ہے۔ عشق ہے۔ آپ شاید رسالے بھی کم و بیش پڑھتے رہتے ہیں ان میں سچا قصہ ہو یا افسانہ یا حقیقت اور افسانے کا آمیزہ سب غنائی داستان ہوتی ہے اب یہ غنائی داستان اس قوم کے کانوں میں پڑ رہی ہے۔ کیا چیز اندر آ رہی ہے میں نہیں جانتا۔(۱) رثائی داستانیں جنہیں اصطلاح میں المیہ (ٹریجڈی) کہتے ہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ روزناموں کے وہ صفحات پڑھیں جن پر حادثات کی خبریں ہوتی ہیں تو آپ اسی قسم کے واقعات دیکھیں گے۔ سبق آموز داستانیں وہ بھی داستانیں ہوتی ہیں جن میں نصیحتیں ہوتی ہیں۔(۲) وہ بھی سبق آموز داستانیں ہیں۔ خود شخصیتوں کی بھی یہی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کی شخصیت حماسی (رزمیہ) ہوتی ہے اور ان کی روح

۱۔ پہلوی دور کے رسالوں کی طرف اشارہ ہے

۲۔ 'داستان راستان' ہر دو جلد مصنف استاد شہید

رزمیہ ہے۔ بعض کی روح تمنائی ہوتی ہے۔ بعض کی روح بنیادی طور پر رثائی ہوتی ہے، آہ و فریاد ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کی روحوں کی شکلیں نصیحتوں، ہدایتوں اور وعظوں کی شکل ہوتی ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر حماسہ کے معنی سمجھ گئے ہیں اس لئے حسینی حماسہ کے متعلق گفتگو کر سکتے ہیں۔

حضرت حسین بن علیؑ کا سانحہ حماسی ہے یا نہیں؟ حضرت حسین بن علیؑ کی شخصیت حماسی ہے یا نہیں؟ ہمیں حسین بن علیؑ کی شخصیت کو پہچان لینا چاہئے جو ہمارے لئے ایک انسانی شخصیت ہے جس کے نام پر ہم ہر سال وقت صرف کرتے ہیں، روپیہ خرچ کرتے ہیں اور کتنے ہی دن تک کام نہیں کرتے۔ ان خصوصیات کی رو سے آپؑ کی شخصیت حماسی ہے یا نہیں؟ کیا ہم امام حسینؑ اور ان کی سرگزشت کو حماسی سمجھیں یا المیہ یا مصیبت، رثا اور ضائع (بے مصرف) سمجھیں؟

یہاں ہمیں تھوڑی سی وضاحت کر دینی چاہئے:

جن رزمی شخصیتوں کے لئے رزمیہ نظمیں کہی گئی ہیں ان کے نسلی اور قومی پہلو ہوتے ہیں۔ یہ بات رستم اور اسفندیار جیسی افسانوی شخصیتوں یا ایران کی تاریخ کے جلال الدین خوارزم شاہ کی سی حقیقی شخصیتوں کے بارے میں عام ہے۔ عام طور پر ایک قوم کے حقیقی اور افسانوی ہیرو چونکہ اس قوم سے منسوب ہوتے ہیں اس لئے افراد قوم کے جذبات ابھارتے ہیں۔ بنیادی طور پر پہلوان کو پسند کرنا اور ہیرو کے گن گانا انسان کے خمیر میں ہے خاص کر جب ہیرو اس انسان سے کوئی تعلق بھی رکھتا ہو جو اس پر فخر کرنا چاہتا ہے۔ کشتی کے ان پہلوانوں کے حق میں جو کامیاب ہو جاتے ہیں لوگ واقعی اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں یا جس ہیرو نے کوئی بہت

دشمن پیاس کے مارے ہانپنے لگا لیکن حضرت علیؑ نے اپنے سپاہیوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ تم انہیں روزانہ اجازت دے دیا کرو کہ آئیں اور پانی لے جائیں۔ لشکریوں نے کہا کہ انہوں نے تو ہمیں پانی ہی نہیں دیا تھا۔ ہم بھی انہیں پانی نہیں دیں گے لیکن حضرت علیؑ نے فرمایا: نہیں! یہ غیر انسانی فعل ہے۔ پانی کو استعمال کرنے کا ہر جاندار کو حق ہے اس لئے پانی مت بند کرو۔

تو معلوم ہوا کہ بات حماسی یعنی رزمیہ بات بھی ہوتی ہے جس میں غیرت، شجاعت اور مردانگی کی خوبو، ڈٹ جانے اور مقابلہ کرنے کی کیفیت ہو۔ جب شعر یا نثر میں یہ خصوصیات پائی جائیں تو اسے حماسی (رزمیہ) کہیں گے۔

یہی قسمیں سرگزشتوں، سانحوں اور تاریخوں کی بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں غنائی سانحے بھی ہیں، واعظی اور نصیحتی سانحے بھی ہیں، رثائی سانحے بھی ہیں اور حماسی (رزمیہ) سانحے بھی ہیں۔ ایک سرگزشت پوری کی پوری صرف غنائی ہے۔ وہ غنا کی بو دیتی ہے۔ عشق ہے۔ آپ شاید رسالے بھی کم و بیش پڑھتے رہتے ہیں ان میں سچا قصہ ہو یا افسانہ یا حقیقت اور افسانے کا آمیزہ سب غنائی داستان ہوتی ہے اب یہ غنائی داستان اس قوم کے کانوں میں پڑ رہی ہے۔ کیا چیز اندر آ رہی ہے میں نہیں جانتا۔(۱) رثائی داستانیں جنہیں اصطلاح میں المیہ (ٹریجڈی) کہتے ہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ روزناموں کے وہ صفحات پڑھیں جن پر حادثات کی خبریں ہوتی ہیں تو آپ اسی قسم کے واقعات دیکھیں گے۔ سبق آموز داستانیں وہ بھی داستانیں ہوتی ہیں جن میں نصیحتیں ہوتی ہیں۔(۲) وہ بھی سبق آموز داستانیں ہیں۔ خود شخصیتوں کی بھی یہی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کی شخصیت حماسی (رزمیہ) ہوتی ہے اور ان کی روح

۱۔ پہلوی دور کے رسالوں کی طرف اشارہ ہے

۲۔ 'داستان راستان' ہر دو جلد مصنف استاد شہید

رزمیہ ہے۔ بعض کی روح تمنائی ہوتی ہے۔ بعض کی روح بنیادی طور پر رثائی ہوتی ہے، آہ و فریاد ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کی روحوں کی شکلیں نصیحتوں، ہدایتوں اور وعظوں کی شکل ہوتی ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر حماسہ کے معنی سمجھ گئے ہیں اس لئے حسینی حماسہ کے متعلق گفتگو کر سکتے ہیں۔

حضرت حسین بن علیؑ کا سانحہ حماسی ہے یا نہیں؟ حضرت حسین بن علیؑ کی شخصیت حماسی ہے یا نہیں؟ ہمیں حسین بن علیؑ کی شخصیت کو پہچان لینا چاہئے جو ہمارے لئے ایک انسانی شخصیت ہے جس کے نام پر ہم ہر سال وقت صرف کرتے ہیں، روپیہ خرچ کرتے ہیں اور کتنے ہی دن تک کام نہیں کرتے۔ ان خصوصیات کی رو سے آپؑ کی شخصیت حماسی ہے یا نہیں؟ کیا ہم امام حسینؑ اور ان کی سرگزشت کو حماسی سمجھیں یا المیہ یا مصیبت، رثا اور ضائع (بے مصرف) سمجھیں؟

یہاں ہمیں تھوڑی سی وضاحت کر دینی چاہئے:

جن رزمی شخصیتوں کے لئے رزمیہ نظمیں کہی گئی ہیں ان کے نسلی اور قومی پہلو ہوتے ہیں۔ یہ بات رستم اور اسفندیار جیسی افسانوی شخصیتوں یا ایران کی تاریخ کے جلال الدین خوارزم شاہ کی سی حقیقی شخصیتوں کے بارے میں عام ہے۔ عام طور پر ایک قوم کے حقیقی اور افسانوی ہیرو چونکہ اس قوم سے منسوب ہوتے ہیں اس لئے افراد قوم کے جذبات ابھارتے ہیں۔ بنیادی طور پر پہلوان کو پسند کرنا اور ہیرو کے گن گانا انسان کے خمیر میں ہے خاص کر جب ہیرو اس انسان سے کوئی تعلق بھی رکھتا ہو جو اس پر فخر کرنا چاہتا ہے۔ کشتی کے ان پہلوانوں کے حق میں جو کامیاب ہو جاتے ہیں لوگ واقعی اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں یا جس ہیرو نے کوئی بہت

بھاری وزن اٹھالیا ہو اور ریکارڈ توڑ دیا ہو مثلاً عالمی ریکارڈ سے تین کلو گرام زیادہ وزن اٹھالیا ہو اس پر لوگ کتنے ہی پھول نچھاور کرتے ہیں یا اس پہلوان کے حق میں جس نے کشتی لڑی ہو اور اپنے حریف کو کسی ترکیب سے فنی شکست دے دی ہو پر خلوص جذبات ظاہر کرتے ہیں۔

یہ سب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہیرو دوستی اور ہیرو پرستی انسانی خمیر میں ہے اور اس سلسلے میں وہ دوسرے ہیرو نہیں اپنی ہی قوم و ملت کے ہیرو کے گن گاتا ہے۔ بین الاقوامی کشتیوں میں ہر قوم کے لوگ جو ان مقامات پر موجود ہوتے ہیں اور وہ بھی جو صرف ریڈیو سے سنتے اور ٹیلی وژن پر دیکھتے ہیں سب کے سب اپنے اپنے ہی ہم وطنوں کے لئے جذباتی کشش رکھتے ہیں جو اپنے وطن اور قوم کے لئے اعزاز و افتخار کماتے ہیں۔ ہم جس وقت رستم، اسفندیار اور افراسیاب کی داستانیں اور اسی قسم کی چیزیں پڑھتے ہیں تو چونکہ یہ کہتے ہیں کہ افراسیاب ماوراء النہر کے علاقے اور ایک غیر قوم کا فرد تھا اور رستم ایرانی قوم سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا ہمارا دل از خود یہ چاہنے لگتا ہے کہ جیت رستم ہی کی ہو اور افسانہ نگار نے بھی داستانوں اور افسانوں کو اس طرح تشکیل دیا ہے کہ ہماری دلی خواہش کے مطابق ہو جائیں یعنی ہمیشہ دوسرا فریق مغلوب اور محکوم ہو اور یہ فریق غلبہ پائے اور جیت جائے۔ یہ رزمیے قومی رزمیے ہیں یعنی ایک مقررہ قوم اور نسل اور ایک مقررہ پانی اور مٹی سے مخصوص ہیں۔

لیکن امامؑ حسینؑ کے معاملے میں بات اس سے مختلف ہے۔ امامؑ حسینؑ ایک رزمی شخصیت تو ہیں لیکن ایسی نہیں جیسی جلال الدین خوارزم شاہ کی ہے اور نہ رستم جیسی افسانوی ہے۔ امام حسینؑ کی شخصیت حماسی ہے لیکن انسانیت کا رزمیہ، بشریت کا رزمیہ ہے، قومیت کا رزمیہ نہیں ہے۔ امام حسینؑ کی بات، امام حسینؑ کا عمل، امام

حسینؑ کا سانحہ، امام حسینؑ کی روح، غرض امام حسینؑ کی ہر چیز جوش ہے، جذبہ ہے، سبق ہے، قوت آفرین ہے لیکن کس قسم کی قوت آفرین؟ کس قسم کا سبق؟ کیا اس لحاظ سے جیسے کوئی کسی خاص قوم سے منسوب ہوتا ہے؟ یا اس لحاظ سے کہ مشرقی ہے؟ یا اس پہلو سے جیسے کوئی عرب ہے اور غیر عرب ہے؟ یا بعض ایرانیوں کے قول کے مطابق اس اعتبار سے کہ آپ کی بیوی ایرانی ہے؟

بنیادی طور پر امامؑ حسینؑ کے وجود میں اس قسم کا کوئی رزمیہ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ امامؑ حسینؑ کے نہ پہچانے جانے کی وجہ بھی یہی ہے۔ چونکہ ان کا حماسہ (رزمیہ) اس قسم کے رزمیوں سے مختلف اور بلند تر ہے انہیں کم ہی لوگ پہچان سکتے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اصلیت کیا ہے۔ آپ سخت رزمی ہونے کے لحاظ سے اور رزمیے کی بلندی اور رفعت کے لحاظ سے اوروں سے بالکل مختلف تھے۔ قومی اور ملی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے حضرت امامؑ حسینؑ بن علیؑ کی شخصیت جیسی دنیا کی کوئی ایک بھی رزمی شخصیت پیش نہیں کر سکیں گے۔ امام حسینؑ انسانیت کا ترانہ ہیں۔ انسانیت کا نغمہ ہیں۔ اس وجہ سے اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ میں یہ بات جرأت کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کو دنیا میں حضرت حسین بن علیؑ کا سا رزمیہ نہیں مل سکتا چاہے اس کی قدرت اور قوت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور چاہے اس کی بلندی اور رفعت اور اس کے انسانی ہونے کے نقطۂ نظر سے ڈھونڈتے رہئے بدقسمتی سے ہم لوگ اس رزمیے کو پہچان نہیں پائے ہیں اس کی قدر و قیمت اور وقار و شرف کو سمجھ نہیں پائے ہیں۔

عاشور کے سانحے اور کربلا کی تاریخ کے دو صفحے ہیں۔ ایک صفحہ سفید اور نورانی ہے اور ایک صفحہ کالا اور تاریک۔ دونوں صفحوں کی مثال نہیں ملتی اور اگر ملتی

بھی ہوگی تو بہت کم۔ اس کا سیاہ اور تاریک صفحہ اس لحاظ سے تاریک اور سیاہ ہے کہ ہم کو اس میں صرف بے مثال جرم و گناہ نظر آتا ہے۔

ایک بار حساب لگایا تو میں نے اس جرم و گناہ کی پستی اور گراوٹ کی بظاہر تقریباً اکیس قسمیں پائیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ دنیا میں کوئی ایسا جرم بھی ہو سکتا ہے جس کی اتنی قسمیں ہو سکیں۔ البتہ صلیبی جنگوں کی تاریخ میں پوری اقوام کے جرائم نہایت حیرت انگیز ملتے ہیں۔ چنانچہ اب میں یہ کہنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا کہ کربلا کا سانحہ جرائم کی کثرت کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا کیونکہ میرا دھیان ایک تو صلیبی جنگوں میں جرائم کی طرف جاتا ہے جن کا عیسائیوں نے ارتکاب کیا تھا اور دوسرے ان جرائم کی طرف جو ہر یورپی قوم نے اسلامی اندلس میں کیے تھے۔ وہ بھی بہت حیرت انگیز تھے۔ آیت اللہ مرحوم کی کتاب تاریخ اندلس پڑھئے جسے یونیورسٹی نے چھاپ دیا ہے۔ یہ کتاب نہایت تحقیقی اور سبق آموز ہے۔

اس کتاب میں لکھا ہے: یورپیوں نے ایک لاکھ عورتوں، مردوں اور بچوں کو اجازت دے دی کہ وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ جب یہ لوگ چل دیئے تو یورپی پچھتائے یا شاید انہیں جانے کی اجازت دے کر شروع ہی سے دھوکا دیا تھا۔ بہر حال ان تمام ایک لاکھ نفوس کو قتل کر کے ان کے سر قلم کر لئے۔ مشرق کا انسان ارتکاب جرم میں مغربی باشندے کی برابری نہیں کر سکتا۔ آپ مشرق کی پوری تاریخ دیکھ جایئے آپ کو دو جرائم حکومت بنی امیہ میں بھی نہیں ملیں گے۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو پھونک ڈالنا اور دوسرے عورتوں کا قتل عام کرنا، لیکن مغرب کی سر زمین میں یہ دونوں قسم کے جرائم بکثرت دیکھنے میں آتے ہیں۔ عورتوں کا قتل عام مغرب کی تاریخ کا ایک عام واقعہ ہے۔ اب بھی آپ یقین نہ کیجئے گا کہ ان میں انسانی

روح موجود ہے۔ جو کچھ ویت نام میں ہو رہا ہے وہ صلیبی جنگوں اور سپانوی جنگوں کی ذہنیت کا تسلسل ہے۔ یہ فعل کہ کچھ لاکھ جیتے جاگتے انسانوں کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا جائے چاہے وہ لوگ قاتل ہی کیوں نہ ہوں مشرق کے رہنے والے نہیں کر سکتے۔ اہل مشرق سے ایسا جرم سرزد نہیں ہو سکتا اس کا ارتکاب صرف بیسویں صدی عیسوی کے اہل مغرب ہی کر سکتے ہیں۔

یہ جرم صرف مغرب والوں ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ صحرائے سینا میں ہزاروں سربازوں کو روٹی پانی نہیں دیتے تاکہ وہ بھوک سے مر جائیں کیونکہ انہیں قید میں رکھنے پر غذا دینا پڑے گی۔ اہل مشرق اس قسم کا جرم نہیں کر سکتے۔ فلسطینی یہودی مغربی یہودی سے سوگنا شریف ہوتا ہے۔ اگر فلسطین کے لوگ اسی فلسطینی قوم کے یہودی ہوتے تو یہ جرائم سرزد نہیں ہوتے۔ یہ جرائم سب مغربی یہودی کے جرائم ہیں۔ بہر حال میں یہ کہنے کی تو جرأت نہیں کر سکتا کہ کربلا سا گھناؤنا جرم دنیا میں سرزد ہی نہیں ہوا ہے البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مشرق کی سرزمین میں سرزد نہیں ہوا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے کربلا کا سانحہ ایک جرم اور ایک المیہ ہے، ایک مصیبت ہے، ایک مرثیہ ہے۔ ہم جب اس صفحے پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں بے گناہوں کا قتل دیکھتے ہیں، جوانوں کا قتل دیکھتے ہیں، دودھ پیتے بچے کا قتل دیکھتے ہیں، گھوڑوں کی ٹاپوں میں لاشوں کی پامالی دیکھتے ہیں، ایک انسان کو پانی نہ پلانا دیکھتے ہیں، عورتوں اور بچوں کو کوڑے کھاتا دیکھتے ہیں، قیدی کو بے کجاوہ اونٹ پر سوار کراتے دیکھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اس حادثے کا ہیرو کون ہے؟ ظاہر ہے کہ جس وقت ہم اس حادثے کے جرم کے پہلو پر نگاہ ڈالتے ہیں تو جو شخص مظلوم نظر آتا ہے وہ ہیرو نہیں ہے، وہ

بے بس مظلوم ہے، اس حادثے کا ہیرو اس نقطۂ نظر سے یزید بن معاویہ ہے، عبیداللہ بن زیاد ہے، عمر ابن سعد ہے، شمر ابن ذی الجوشن ہے، خولی ہے اور کچھ لوگ ہیں۔ اسی لئے جب ہم اس تاریخ کے سیاہ صفحے کا مطالعہ کرتے ہیں تو صرف انسان کا جرم اور مرثیہ ہی دیکھتے ہیں۔اب اگر ہم شعر کہنا چاہیں تو کیا کہیں؟ مرثیہ کہیں کیونکہ مرثیہ کے سوااور کوئی بات بھی نہیں ہے جو ہم کہہ سکیں۔ ہمیں یہ کہنا چاہئے:

زآن تشنگاں ہنوز بہ عیّوق می رسد
فریاد العطش زبیابان کربلا(۱)

تو کیا عاشور کی تاریخ میں صرف یہی صفحہ ہے؟ کیا فقط مرثیہ ہے؟ فقط مصیبت ہے اور دوسری کوئی چیز نہیں ہے؟ ہماری غلطی یہی ہے۔ اس تاریخ کا ایک اور صفحہ ہے اور اس صفحے کا ہیرو معاویہ کا بیٹا نہیں ہے، زیاد کا بیٹا نہیں ہے، سعد کا پسر نہیں ہے، شمر نہیں ہے۔ اس میں ہیرو امام حسینؑ ہیں۔ اس صفحے میں کوئی جرم نہیں ہے۔ المیہ نہیں ہے بلکہ حماسہ ہے، فخر اور روشنی ہے، حقیقت اور انسانیت کا جلوہ ہے، حق پرستی کی چمک دمک ہے۔ اس صفحے کو جب ہم دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بشریت کو اپنے آپ پر ناز کرنے کا حق ہے لیکن جب ہم سیاہ صفحے پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسانیت کا سر جھکا ہوا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس آیت کا مصداق پاتی ہے جو کہتی ہے: "قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفك الدماء و نحن نسبّح بحمدك و نقدّس لك." (۲) یعنی جبرائیل امین ہی اس خدائی اعلان کے مقابلے

۱۔ دیوان محتشم

۲۔ فرشتوں نے پوچھا اے پروردگار! کیا تو ایسے کو مقرر کرنے والا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے حالانکہ ہم خود تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں؟ سورۂ بقرہ آیت ۳۰

میں جس میں خدا نے فرمایا تھا: "انّی جاعل فی الارض خلیفة" (۱) سوال نہیں کرتے لیکن فرشتوں کی جماعت جو انسانیت کا صرف سیاہ صفحہ دیکھ رہی تھی اور دوسرا صفحہ نہیں دیکھ رہی تھی خدا سے یہ سوال کر بیٹھی کہ کیا تو زمین پر ایسے لوگوں کو مقرر کرنا چاہتا ہے جو فساد برپا کریں اور خون بہائیں؟! اور خدا نے ان کے جواب میں فرمایا تھا: "انّی اعلم ما لا تعلمون" (۲) جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

ایک صفحہ ایسا صفحہ ہے جس پر فرشتہ اعتراض کرتا ہے تو انسان سر جھکا لیتا ہے اور دوسرا صفحہ ایسا ہے جس پر بشریت ناز کرتی ہے۔ ہم کربلا کے سانحے کا اس کے کالے صفحے کے نقطۂ نظر ہی سے کیوں مطالعہ کریں؟ ہمیشہ کربلا کے جرائم ہی کیوں گناتے جائیں؟ ہم ہمیشہ امام حسین بن علیؑ کا مطالعہ اس پہلو سے کیوں کرتے رہیں جو قاتلوں کے جرائم سے متعلق ہے؟ ہم امام حسین بن علیؑ کے نام سے ان نعروں کو کیوں نسبت دیں اور کیوں لکھیں جو عاشور کے تاریک صفحے سے حاصل کئے جائیں؟ ہم اس قصے کے روشن صفحے کا مطالعہ کم کیوں کرتے ہیں جبکہ اس داستان کا حماسی پہلو اس کے جریمہ پہلو سے سو گنا بھاری ہے اور اس کی چمک دمک اس کی تاریکی سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں یہ ماننا چاہئے کہ حسین بن علیؑ کے ایک جانی دشمن ہم بھی ہیں جو اس تاریخ کا صرف ایک ہی صفحہ پڑھتے ہیں اور دوسرا صفحہ نہیں پڑھتے۔ امامؑ حسینؑ کے وہ لوگ بھی قاتل ہیں جنہوں نے اس تاریخ کے مقصد میں تحریف اور تبدیلی کردی ہے اور کر رہے ہیں۔

امامؑ حسینؑ کو دشمنوں نے ایک دن قتل کرڈالا اور ان کا سر ان کے تن سے جدا بھی کر دیا لیکن امام حسینؑ فقط ایک جسم ہی نہیں ہیں امام حسینؑ ہماری تمہاری

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۳۰

۲۔ سورۂ بقرہ آیت ۳۰

طرح نہیں ہیں۔ امام حسینؑ کی ذات ایک مکتب ہے جو آپؑ کی موت کے بعد اور زیادہ زندہ ہو جاتا ہے۔ بنی امیہ کی حکومت سمجھی تھی کہ حسینؑ کو قتل کر دیا اور بات ختم ہو گئی لیکن یہ بات بڑی دیر بعد سمجھ میں آئی کہ مردہ حسینؑ ان کے لئے زندہ حسینؑ سے زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک ہے۔ امام حسینؑ کی قبر روحانیوں کا کعبہ ہے۔ حضرت زینبؑ نے بھی یزید سے یہی کہا تھا، تو نے غلطی کی "فکد کیدك واسع سعیك ناصب جهدك فوالله لا تمحو ذكرنا ولا تميت وحينا" (۱) تو اپنی اسکیم پر عمل کر لے لیکن اطمینان رکھ تو میرے بھائی کو قتل کر کے مٹا نہیں سکتا میرے بھائی کی زندگی کا انداز ہی دوسرا تھا وہ مرا نہیں ہے اور بھی زندہ ہو گیا ہے۔ اس وقت آج کے سے مرثیہ گو نہیں تھے۔ 'کمیت' مرثیہ گو تھا۔ 'دعبل خزاعی' مرثیہ گو تھا وہی دعبل خزاعی جس نے کہا تھا کہ میں پچاس سال سے اپنی صلیب اپنے کاندھے پر اٹھائے پھر رہا ہوں۔ وہ ایسا مرثیہ کہتا تھا کہ اموی اور عباسی سلاطین کے تخت ہلا دیتا تھا۔

وہ محتشم نہیں تھا۔ ہمارے شاعروں نے امامؑ حسینؑ کی شہادت کا ذمہ دار آسمان کو ٹھہرایا ہے۔ 'کمیت' اس قسم کا شاعر نہیں تھا۔ وہ ایک قصیدہ کہتا تھا تو دنیا لرز جاتی تھی۔ لیکن حضرت حسینؑ کی تاریخ کے ساتھ، حسینؑ کے نام کے ساتھ اور حسینؑ کے مرثیے کے ساتھ لوگوں نے کیا کیا نہیں کیا۔ ہمارے لئے قبر امام حسینؑ بھی ایک مصیبت بن چکی ہے۔ لوگوں نے ارادہ کیا کہ آپ کی قبر برباد کر دی جائے۔ قبر ڈھا دی گئی، اس کے تمام نشانات مٹا ڈالے۔ زمین کی اونچائی نیچائی دور کر کے زمین ہموار کر دی گئی۔ قبر کی جگہ اس طرح پانی بھر دیا گیا کہ کسی کو پتا نہ چل پائے کہ امامؑ حسینؑ کی قبر کس مقام پر واقع ہے۔ لیکن کیا ایسا ہو گیا؟ لوگ وہاں اور زیادہ پہنچنے لگے!

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۱۳۵، اللہوف صفحہ ۷۷

خود متوکل کے یہاں ناچنے گانے والیوں کی ایک سردار (۱) ملازم تھی۔ ایک بار متوکل کو اس سے کوئی کام پڑ گیا۔ اسے بلوایا۔ لوگوں نے بتایا کہ نہیں ہے۔ پوچھا کہاں گئی ہے؟ کہا سفر پر گئی ہے۔ جب کچھ عرصے کے بعد پلٹی تو متوکل نے اس سے پوچھا۔ کہاں چلی گئی تھی؟ اس نے جواب دیا کہ مکے کی زیارت کو گئی تھی۔ متوکل بولا یہ مکے کی زیارت کا وقت تو نہیں ہے۔ نہ بقر عید کا مہینہ ہے کہ حج ہو اور نہ ماہ رجب ہے کہ عمرہ ہو۔ اس نے اصرار کیا کہ سچ سچ بتا کہاں گئی تھی؟ آخر کار اسے معلوم ہو گیا کہ یہ عورت حسین بن علیؑ کی زیارت کو گئی تھی۔ متوکل آگ بگولا ہو گیا لیکن سمجھ گیا کہ حسینؑ کا نام بھلایا نہیں جا سکتا۔

میں نہیں جانتا کہ کس قاتل یا کن قاتلوں نے حضرت امام حسینؑ پر دوسری شکل میں وار کیا کہ حسین بن علیؑ کے مقصد میں ہی تحریف کر ڈالی اور وہی خرافات جو عیسائی حضرت مسیحؑ کے بارے میں کہتے ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ کے متعلق بھی کہہ اٹھے کہ امام حسینؑ نے اس لئے جان دی کہ امت کے گناہوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیں۔ یعنی ہم گناہ کریں اور چین سے رہیں۔ امامؑ حسینؑ اس لئے قتل ہوئے کہ اس وقت تک گنہگار کم تھے تو زیادہ ہو جائیں۔ لہٰذا اس تحریف کے بعد سوائے اسکے اور کوئی صورت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ ہم اس سانحے کا سیاہ اور تاریک صفحہ ہی پڑھتے رہیں۔ صرف رثا اور مرثیہ ہی دیکھتے رہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تاریک صفحہ نہ دیکھا جائے۔ دیکھا جائے ضرور دیکھا جائے بلکہ خوب پڑھا بھی جائے البتہ یہ مرثیہ حماسہ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ امام حسینؑ بن علیؑ کا سوگ ہمیشہ زندہ رہنا چاہئے بالکل درست ہے اور خود پیغمبر اسلامؐ کی سفارش

۱۔ ناچنے گانے والیوں کی سردار جو رقص و سرور کے تمام انتظامات کرتی تھی

ہے اور ائمہ اطہارؑ نے بھی اس کی وصیت کی ہے۔ یہ سوگ اور مصیبت بھلائی نہیں چاہئے۔ یہ ذکر یہ یادگار محو و فراموش نہیں ہونی چاہئے اور لوگوں کو امامؑ حسینؑ کی مصیبت پر ہمیشہ آنسو بہاتے رہنا چاہئے لیکن ایک ہیرو کے سوگ میں آنسو بہانے چاہئیں۔ تو پہلے امام حسینؑ کا آپ کے سامنے ہیرو ہونا طے کیا جائے اور پھر آپ ہیرو کے غم میں روئیں۔ ورنہ ایک ضائع ہوجانے والے بیچارے، مجبور اور مظلوم پر رونا کیا؟اس کے لئے پوری قوم کا رونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہیرو کے سوگ میں روئیے تاکہ آپ ہیرو کے جذبات پیدا کر سکیں تاکہ ہیرو کی روح کا ایک عکس آپ کی روح پر پڑے اور آپ میں بھی کسی حد تک حق اور حقیقت کے بارے میں غیرت و حمیت پیدا ہو سکے۔ آپ بھی انصاف طلب ہو سکیں۔ آپ بھی ظلم اور ظالم سے جنگ کریں۔ آپ بھی آزادی کے طلب گار ہوں۔ آزادی کے احترام کے قائل ہوں۔ آپ کو بھی یہ خیال آئے کہ عزت نفس کیا چیز ہوتی ہے؟ شرافت اور انسانیت کیا ہوتی ہے؟کرامت یعنی بزرگی اور عظمت کسے کہتے ہیں؟ جب ہم حسینی تاریخ کا روشن صفحہ پڑھ لیں گے تب بھی ان کے سوگ کے پہلو سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ ورنہ بیکار ہوگا۔ ہم یوں سوچتے ہیں کہ حسین بن علیؑ اُس دنیا میں یہ اُمید رکھتے ہیں کہ لوگ اُن کے ساتھ ہمدردی کریں یا نعوذ باللہ حضرت فاطمہؑ زہرا چودہ سو سال کے بعد بھی پروردگار کی رحمت کے قرب میں یہ آس لگائے بیٹھی ہیں کہ چار ٹوٹے پھوٹے شکستہ و درماندہ آدمی ان کے لئے روئیں تاکہ ان کے دل کو تسلّی اور دلاسا دے سکیں۔

چند سال پہلے میں نے ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ مصنف نے حضرت امام حسینؑ بن علیؑ اور حضرت عیسیٰ کا موازنہ کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کا عمل مسلمانوں (شیعوں) کے عمل سے بہتر اور افضل ہے کیونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ کی

شہادت کے دن مرثیے پڑھتے اور روتے ہیں۔ ان لوگوں کا عمل ان لوگوں کے عمل سے اس لئے افضل ہے کہ وہ شہادت کو حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کی ناکامی نہیں کامیابی سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ کامیابی سمجھتے ہیں اس لئے خوشی مناتے ہیں۔ لیکن مسلمان شہادت کو ہزیمت جانتے ہیں اور چونکہ ہزیمت جانتے ہیں روتے پیٹتے ہیں لہٰذا وہ قوم مبارک ہے جو شہادت کو کامیابی سمجھتی ہیں اور جشن مناتی ہے اور اس قوم پر افسوس ہے جو شہادت کو شکست گردانتی ہے اور اس کی خاطر مرثیہ خوانی کرتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مسیحی دنیا جو اس شہادت کی خوشی مناتی ہے اس کی تہ میں وہ فضول عقیدہ کار فرما ہے جس کی رو سے حضرت عیسیٰؑ اس لئے مارے گئے ہیں کہ ہمارے گناہوں کا بوجھ اپنے ذمے لے لیں۔ اب چونکہ وہ اپنے خیال خام میں ہلکے پھلکے اور گناہوں سے پاک و صاف ہو چکے ہیں لہٰذا جشن مناتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اپنے خیال کے مطابق اپنا بوجھ ہلکا ہونے کی خوشی مناتے ہیں۔ اور یہ محض فضول سی بات ہے۔ دوسرے اسلام اور مسیحیّت کا وہ فرق ہے جس میں تحریف ہوگئی ہے کہ اسلام ایک اجتماعی دین ہے اور مسیحیّت ایک ایسا دین ہے جس میں سب کچھ اخلاقی نصائح ہیں۔ دوسری طرف یہ بات ہے کہ کسی سانحے پر ہم کبھی ایک فرد کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں اور کبھی اجتماعی حیثیت سے۔ اسلام کے مطابق امام حسین بن علیؑ کی شہادت ایک فرد کے نقطۂ نظر سے کامیاب تھی۔ حضرت حسین بن علیؑ کے لئے یہ شہادت ہار تھی یا جیت؟ ہر مسلمان کہے گا جیت تھی اور خود حضرت نے پہلے ہی دن فرمادیا تھا: "خَطّ الموت علی ولد آدم مخّط القلادة علیٰ جید الفتاة وما اولهني الیٰ اسلا فی اشتیاق یعقوب الیٰ یوسف" (۱) ایک انسان کی نظر

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۲۹، نہج البلاغہ فیض الاسلام صفحہ ۸۷۵۔ یہ حضرت علی علیہ السلام کا وہ قول جو آپ نے زندگی کے خاتمے کے نزدیک وصیت اور سفارش کے طور پر فرمایا تھا۔

سے اور خود شہید کی نظر سے شہادت کامیابی ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ مسیحی ہی کہیں تقریباً تیرہ سو پچاس سال پہلے خود اسلام کے پیشواؤں نے بھی یہ بات کہی ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے سر پر جس وقت تلوار لگتی ہے اور ابرو تک اُتر آتی ہے اس وقت آپ فرماتے ہیں: "والله ما فجأني من الموت وارد كرهته او طالع انكرته وما كنت الّا كقارب ورد و طالب وجد۔"(۱) خدا کی قسم! یہ ناگہانی موت جو مجھے آئی ہے اور یہ ناگہانی وار جو میں نے کھایا ہے مجھے بالکل ناگوار نہیں ہے۔ میں تو اس پر فخر کرتا ہوں اور اس دن کی تمنا رکھتا تھا۔ خدا کی قسم! میری مثال اس عاشق کی سی ہے جو اپنے معشوق کے پاس پہنچ گیا ہو۔ بقول شاعر:

دیدار یار غائب، دانی چہ ذوق دارد
ابرے کہ دربیابان بر تشنہ ای ببارد

اس چوٹ کھانے کی حالت میں میری مثال ان لوگوں کی سی ہے جو اندھیری رات میں پانی ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور اچانک پانی تک پہنچ جاتے ہیں۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
اندر میان ظلمت شب، آب حیاتم دادند

یہ بات تو ہوئی ایک شخص اور ایک فرد کے نقطۂ نظر سے لیکن اسلام کا اور پہلو بھی ہے۔ وہ معاملات کا ہمیشہ صرف شخصی پہلو ہی سے مطالعہ نہیں کرتا بلکہ اجتماعی پہلو سے بھی مطالعہ کرتا ہے۔ اجتماعی پہلو سے نیز اس زاویہ سے کہ جن لوگوں نے اس کا ارتکاب کیا ہے اسلامی معاشرے میں ایک زوال کا مظہر تھا اس لئے اسے برابر یاد رکھنا چاہئے تاکہ لوگ پھر ایسے گھناؤنے فعل کا ارتکاب نہ کریں۔ یہ وہی

۱۔ بحارالانوار جلد ۴۴ ص ۳۶۶، الہوف ص ۲۵، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ ص ۵، کشف الغمہ جلد ۲ ص ۲۹

افسوس اور پچھتاوا ہے جو ایک قوم کہتی ہے: ہم مسلمانوں نے ایسا کام کیا ہے؟ ان لوگوں پر لعنت ہو جنہوں نے ایسا کام کیا تھا۔ ہم اب پھر ایسا کام نہ کریں۔ دوسرے یہ موضوع اسلامی اور انسانی جذبات کے تزکیے اور صفائی کے لئے بھی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم اسے صحیح طریقے سے سمجھیں۔ آج وہ دن نہیں ہے کہ آدمی پانی میں سر چھپالے۔ ہمیں اپنے مذہبی طور و طریقوں میں اصلاح کرنی چاہئے۔ اپنے مذہب میں نہیں بلکہ اپنے کاموں میں، اپنی غلطیوں اور غلط فہمیوں میں جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا محتشم کاشانی بھی مذہب کا کوئی رکن ہے؟(۱)

۱۔ بدقسمتی سے آیت اللہ مطہری شہید کا بقیہ بیان ٹیپ میں محفوظ نہیں ہوپایا۔

دوسری مجلس

حسینی تحریک، مقدس حماسہ

اعوذُ باللّٰہ من الشیطان الرّجیم

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

"یا قوم ان کان کبُر علیکم مقامی و تذکیری بآیات اللّٰہ فعلی اللّٰہ توکّلتُ فاجمعوا امرکم و شر کا ئکم ثّم لا یکن امرُکم علیکم غمّۃً ثّم اقضوا الّی ولا تنظرون"(۱)

ہم کہہ چکے ہیں کہ رزمیہ بات یا نظم یا شعر یا نثر وہ ہوتی ہے جو عقیدے کے لئے جنگ آزمائی، مقابلے، قیام اور بچاؤ کی خاطر انسانی روح میں جوش اور ولولہ پیدا کردیتی ہے اور حماسی شخصیت اسے کہتے ہیں جس کی روح میں یہ لہر اٹھتی ہے اور جو عظمت، غیرت، حمیت، شجاعت، حقوق کے بچاؤ اور انصاف طلبی کے مچلتے جذبوں سے سرشار ذہنیت رکھتی ہے اور پھر ہم نے کہا تھا کہ عاشور کی تاریخ میں دو صفحے ہیں۔ان میں سے ایک سیاہ اور تاریک ہے۔ جو انسانی جرم کا آئینہ دار ہے۔ بہت بڑے جرم کا۔ یہ ایک بے حد و حساب جرم اور ظلم کی داستان ہے اس لئے ہمارے اس جرم

۱۔ اے میری قوم !اگر میرا ٹھرنا اور خدا کی آیتوں کا چرچا کرنا تم پر شاق و گراں گزرتا ہے تو میں صرف خدا ہی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ پس تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنا کام کرلو پھر تمہاری بات تم (میں سے کسی) پر مخفی نہ رہے پھر (جو تمہارا جی چاہے) میرے ساتھ کر گزرو اور مجھے (دم مارنے کی بھی) مہلت نہ دو۔ سورۂ یونس آیت ۷۱

کی داستان کے کتنے ہی ہیرو ہیں جو جرم و گناہ کے ہیرو ہیں۔ معاویہ کا جنا، زیاد کا بیٹا، سعد کا پسر، اور کچھ دوسرے لوگ جرم کی اس داستان کے ہیرو ہیں لیکن جرم کی یہ داستان پوری نہیں ہے، یعنی ہماری داستان میں ایک نہیں دو صفحے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ مجرموں کی جماعت نے پاک اور بے گناہ لوگوں کی ایک جماعت پر ظلم کردیا۔ ہاں داستانیں ہیں جو صرف ظالمانہ اور جریمہ ہیں۔ ان میں ایک صفحے سے زیادہ نہیں ہے اور وہ بھی جرائم سے بھرا ہوا ہے۔

مثلاً مسلم بن عقیل کے بیٹوں کا قصہ جرم و گناہ کی ایک داستان ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔دو نابالغ بچے، جو بے گناہ ہیں، جن کا باپ قتل کردیا گیا ہے،ایک اجنبی شہر میں ایک قاتل کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں اور وہ انہیں دولت کی لالچ میں نہایت وحشیانہ طریقے سے قتل کردیتا ہے۔ جب ہم یہ تاریخ پڑھتے ہیں تو ایک طرف تو جرم و گناہ دیکھتے ہیں اور دوسری طرف دو معصوم،نابالغ اجنبی لڑکے جن پر ظلم ہوتا ہے جو کچھ کہہ بھی نہیں پائے، جو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ یہ بچے کم و بیش دس بارہ سال کے رہے ہونگے۔ یہ صرف ایک جرم کی داستان ہے اور ان دونوں بچوں کے لحاظ سے سوگ ہے، مصیبت ہے، مظلومیت ہے لیکن کربلا کی داستان اس طرح کی نہیں ہے۔ اس داستان کے دو صفحے ہیں دوسرا صفحہ زیادہ قابل مطالعہ ہے۔ یہ صفحہ پہلے کے مقابلہ میں مثبت پہلو رکھتا ہے۔ ایک زور دار عملی صورت رکھتا ہے۔ انسانیت، بزرگی، بلندی اور بشریت نیز عظمت کی آماجگاہ ہے۔ انسانیت کی سر بلندیوں اور فیاضیوں کی نمائش گاہ ہے۔ مکمل حماسہ ہے جس میں بزرگی، شجاعت، سچائی کی طلب اور حقانیت کی لگن موجیں مار رہی ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری داستان کے ہیرو پسر معاویہ۔پسر زیاد، پسر سعد اور دوسرے لوگ نہیں ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اس

داستان کے ہیرو حسین بن علیؑ ہیں، عباس بن علیؑ ہیں، حضرت علیؑ کی بیٹی جناب زینبؑ ہیں۔ اعلیٰ درجے کے جاں نثار مردوں کی ایک جماعت ہے جن کی امام حسینؑ بھی تعریف کرتے ہیں جو کبھی کوئی غلط یا مبالغہ آمیز بات نہیں کرتے۔

امامؑ حسین علیہ السلام نے شب عاشور اپنے اصحاب کی تعریف کی۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ کل بے گناہ اور مجبور لوگوں کی ایک جماعت قتل کی جائے گی اور تم لوگوں کی زندگیاں ختم ہو جائیں گی بلکہ ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"فانّی لا اعلمُ اصحا باً اوفی ولا خیراًمن اصحابی" (۱) دنیا میں میں نے اپنے اصحاب سے بہتر کسی کے اصحاب نہیں پائے یعنی میں تم کو بدر کے ان اصحاب پر بھی ترجیح دیتا ہوں جو پیغمبرؐ کے ساتھ تھے۔ اپنے والد بزرگوار حضرت علیؑ کے اصحاب پر ترجیح دیتا ہوں۔ نبیوں کے ان اصحاب پر جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ "و کایّن مّن نبّي قاتل معه ربّیّون کثیر فما وهنوا لما اصابهم فی سبیل اللّٰه وما ضعفوا وما استکانوا واللّٰه یحّب الصابرین" (۲) ترجیح دیتا ہوں۔ یعنی میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم سب کے سب ہیرو ہو۔ آپ کی گفتگو یوں شروع ہوتی ہے۔: "شاباش شاباش اے ہیرو کی جماعت" اس کی بنا پر اب میں سمجھا کہ اس داستان کے دو صفحے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے دوسرے صفحے کا بھی مطالعہ

۱۔ بحارالانوار جلد ۴۴، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۱، اعلام الوریٰ صفحہ ۲۳۴، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۵۸، تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹ کامل ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۲۴، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۱ صفحہ ۲۴۷

۲۔ اور (مسلمانو کچھ تم ہی نہیں) ایسے پیغمبر بہت سے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ بہتیرے اللہ والوں نے (راہ خدا میں) جہاد کیا اور پھر ان کو خدا کی راہ میں جو مصیبت پڑی نہ تو انہوں نے ہمت ہاری اور نہ بودا پن کیا اور نہ (دشمن کے سامنے) گڑگڑائے اور ثابت قدم رہنے والوں سے خدا الفت رکھتا ہے۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۴۶

کریں اور یہ مان لیں کہ ہم نے ماضی میں یہ غلطی کی ہے کہ اس داستان کا صرف ایک زاویہ سے مطالعہ کیا ہے اور غالباً داستان کے دوسرے رخ کو سرے ہی سے چھوڑ گئے ہیں یعنی ہم پسر معاویہ، پسر زیاد، اور پسر سعد کے مجرمانہ کارنامے ہی دکھاتے چلے آرہے ہیں۔

میں ان ماتمی دستوں کے احترام کا قائل ہوں۔ کیونکہ یہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان احساسات کا جو سو فیصدی فطری ہیں اور جو عقیدے اور ایمان سے بیدار ہوتے ہیں۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ اگر کسی قوم میں اس قوم کے بڑے ہیروز کے لئے عقیدے اور ایمان سے پیدا ہونے والے فطری جذبات موجود ہوں تو وہ کتنے قابل قدر ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ان کو ختم نہیں کرنا چاہئے۔ ان کے خلاف جدو جہد بھی نہیں کرنی چاہئے۔ صرف ان کی اصلاح کرنی چاہئے۔ نہایت عظیم جذبات صرف عقیدے اور ایمان کی قوت سے جنم لیتے ہیں ان کو سنوارنا اور درست کرنا چاہئے۔ کیا آپ اربوں کھربوں روپے خرچ کر کے بھی قوم میں ایسے جذبات بیدار کر سکتے ہیں!

یہ شخص جو اپنی جیب سے دولت خرچ کرتا ہے، خود کو ہر کام روک دیتا ہے، زنجیر اٹھاتا ہے۔ اپنی پیٹھ لہو لہان کر لیتا ہے اور اس کے آنسو بھی برابر بہتے رہتے ہیں بہت قدر و محبت رکھتا ہے۔ اس سے لڑنا نہیں چاہئے۔ اور نہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ وحشیانہ کام ہے۔ تاریخ کے بڑے ہیروز کے حق میں جذبات کا اظہار وحشی پن نہیں ہوتا۔ اس کی غلطی صرف یہ ہے کہ وہ جس وقت جذبات کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ اس شکل میں اظہار کرتا ہے کہ جیسے مجرموں کو ہیرو بنا کر دکھانے والا اور مظلومیت کا اظہار کرنے والا ایک ہی شخص ہے۔ جس سے وہ محبت کرتا ہے اور جسے وہ دوست رکھتا

ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ جو بھی نمائش کرنا چاہتا ہے اس طرح کرے کہ حسینی حماسہ کا آئینہ دار بن جائے تاریخ عاشور کے روشن پہلو کا نمائش گر بن جائے۔ امام حسین بن علیؑ کی روح کا درد دکھانے والا بن جائے۔ خوش قسمتی سے یہ بیداری کم وبیش پیدا ہو چکی ہے۔ اور کبھی کبھی انسان آنکھوں سے دیکھ بھی لیتا ہے۔ کہ بعض دستوں نے اس بات کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا ہے کہ کیا کر رہے ہیں اور کیا کرنا چاہئے؟

بڑے آدمی کی روح رزمیہ کی مالک ہوتی ہے چاہے اس نے صرف اپنی ذات کے لئے کام کیا ہو یا ایک قوم کے لئے یا بشریت اور انسانیت کے لئے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو یا انسانیت سے بھی بلند ہو کر سوچے۔ اور اپنے آپ کو دنیا والوں کے ان عمومی مقاصد کا خدمت گذار سمجھے جسے اس لحاظ سے رضائے الٰہی کا نام دیتے ہیں کہ خدا نے یہ خلقت پیدا کر کے اس کے لئے ایک راستہ اور ایک عمومی مقصد طے کر دیا ہے۔ یہی راستہ رضائے الٰہی کا راستہ ہے۔

بڑا آدمی وہ ہے جس کی روح میں حماسہ موجود ہو۔ اس کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ اگر نادر شاہ افشار کی روح میں حماسہ نہ ہوتا تو وہ ایران سے افغانوں کو نہیں نکال سکتا تھا اور نہ ہندوستان فتح کر سکتا تھا۔ یہ تو خود ایک حماسہ ہے لیکن یہ کہ بعد میں جو مالیخولیا میں مبتلا ہو گیا اور خود اپنی ہی قوم کی جان کا دشمن بن گیا تو یہ بات دوسری ہے۔

سکندر کی روح میں ضرور ایک رزمیہ اور ایک لہر موجود تھی۔ اسی طرح شاہ اسماعیل اور نپولین میں بھی۔ سکندر، نادر شاہ اور شاہ اسماعیل بھی ایک بڑے ارادے والے ہیں۔ ایک بڑی ہمت والے ہیں۔ ایک بڑا رزمیہ ہیں لیکن مقدس رزمیہ نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنی ہی شخصیت کو وسعت دینا چاہتا ہے۔ ہر شے

کو اپنی ہی شخصیت میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ تمام قوموں اور سلطنتوں کو اپنی ہی مملکت میں جذب کر لینا چاہتا ہے۔ لہٰذا ایک قوم کے نقطۂ نظر سے ان میں سے ہر ایک قومی ہیرو ہے لیکن دوسری قوم کے نقطۂ نظر سے مجرم ہے۔ سکندر یونانیوں کا ہیرو ہے اور ایرانیوں کے لئے مجرم۔ وہ یونانیوں کے لئے ہیرو ہے کیونکہ اس نے یونان کو عظمت بخشی کیونکہ اس نے دوسری قوتوں، حکومتوں اور عظمتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور دوسری مملکتوں میں یونانی پرچم لہرا دیا لیکن وہ کسی مغلوب قوم کے نقطۂ نظر سے ہیرو نہیں ہو سکتا۔ نپولین فرانسیسیوں کے لئے ہیرو ہے تو کیا روس یا انگلستان کے لئے بھی ہیرو ہے؟ ہرگز نہیں! یہ لوگ رزمیہ ہیں یعنی خود غرض قسم کا ایک رزمیہ۔ ایک بڑا رزمیہ ہے یعنی ایک بڑا خود غرض ہے، ایک بڑا خود پرست ہے۔ ایک بڑا جاہ طلب ہے (چھوٹے چھوٹے جاہ طلبوں کے مقابلے میں بڑے بڑے جاہ طلب بھی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔) لیکن یہ رزمیے مقدس حماسہ شمار نہیں ہوتے۔

مقدس حماسہ میں کچھ اور خصوصیات ہوتی ہیں جو میں عرض کرتا ہوں۔ ایسی خصوصیات جن کی رو سے کوئی نپولین اور سکندر مقدس رزمیہ نہیں ہو سکتے۔ مقدس حماسہ وہ شخص ہوتا ہے جس کی روح میں خود اپنے ہی لئے لہر نہیں اٹھتی۔ اپنی نسل کے لئے لہر نہیں اٹھتی، اپنی قوم کے لئے لہر نہیں اٹھتی، اپنے براعظم یا اپنی مملکت کے لئے لہر نہیں اٹھتی۔

بنیادی طور پر جس چیز کو وہ دیکھ نہیں پاتا، جس پر اس کی نظر نہیں پڑتی وہ اس کی ذات یا شخصیت ہوتی ہے وہ صرف حق اور حقیقت کو دیکھتا ہے اور اگر ہم اسے بہت چھوٹا کر کے بھی کہنا چاہیں تو ہم کو کہنا چاہئے کہ وہ بشریت کو دیکھتا ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت رزمیہ آیت ہے:

"قُل یا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمة سواء بنینا و بینکم الّا نعبُد الّا اللّٰہ ولانشرک بہ شیئاً ولایتّخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللّٰہ"(۱) اے اہل کتاب اے لوگو! جو مذہب کا دعویٰ رکھتے ہو آؤ باہم ایک بات طے کرلیں۔ آؤ ہم اپنے آپ کو بھول جائیں اور صرف اپنے عقیدے کو دیکھیں۔ آؤ ایک عقیدے کی خاطر اپنے آپ کو فراموش کردیں۔ آؤ ایک بات کو اپنا نظریہ بنالیں۔" الّانعبد الّا اللّٰہ" اللہ کے سوا کسی موجود کو عبادت کے لائق نہ سمجھیں۔ "ولا یتّخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللّٰہ" آؤ فائدہ اٹھانا چھوڑ دیں۔ کورانہ عبادت چھوڑ دیں۔ آدم پرستی چھوڑ دیں۔ انسانوں کے درمیان عدل و مساوات قائم کریں۔ نہ میری قوم نہ تیری قوم ہم ساتھ مل جائیں اور ایک اور قوم کے باپ کو بیچ میں لے آئیں۔ یہ باتیں نہیں ہیں۔ تو ایک پہلو جس سے یہ رزمیہ مقدس بنتا ہے اس کا مقصد پاک اور پاکیزہ ہو۔ روشن سورج کی طرح ہو جو سب انسانوں اور سب مخلوقات پر چمکتا ہے۔

اس قسم کے قیاموں اور تحریکوں کے تقدس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خاص حالات میں جب کسی شخص کو گمان بھی نہیں ہوتا وجود میں آجاتی ہے یعنی بہت ہی گھپ اندھیرے میں اچانک ایک شعلہ سا لپک جاتا ہے۔ گہری تاریکی میں ایک چنگاری یا دیئے کی سی لَو یا سخت ظلم و ستم میں انصاف کی ایک فریاد اٹھتی ہے۔ سکون میں ایک حرکت سی ہو جاتی ہے جبکہ ہر شئے ٹھہری ہوئی اور ڈری سہمی ہوئی ہوتی ہے۔ موت کے سے سناٹے میں جیسے ایک چیخ سنائی دے۔

مثلاً نمرود پیدا ہو جاتا ہے کہ ایک شخص کو باقی نہیں چھوڑے گا اور اسی دورمین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مقدس تحریک اٹھتی ہے۔ "انّ ابراھیم کان

۱۔ (اے رسول) تم (ان سے) کہو اے اہل کتاب تم ایسی (ٹھکانے کی) بات پر تو آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بنائیں اور خدا کے سوا ہم میں سے کوئی کسی کو اپنا پروردگار نہ بنائے۔ سورۂ آل عمران آیت ۶۴

قانتا"(۱) یا فرعون پیدا ہوتا ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: "انّ فرعون علا فی الارض جعل اھلھا شیعاً یّستضعفُ طائفةً منّھم یذبّح ابنائھم و یستحی نسائھم" (۲) اسی زمانے میں موسیٰ پیدا ہوتے ہیں۔ یا خاتم الانبیاءؐ کی بعثت کے زمانے میں جب پوری دنیا تاریکی، خاموشی اور فتنہ و فساد میں ڈوبی ہوئی تھی یکایک "قولوا لا الہ الّا اللّٰہ تفلحوا" کی آواز بلند ہو جاتی ہے۔

بنی امیہ کی حکومت ہے۔ تمام قوتیں اپنے فائدے کے لئے استعمال ہو رہی ہیں یہاں تک کہ مذہب کی قوت بھی۔ اس طریقے سے کہ ایسے محدّث ملازم رکھ لئے گئے ہیں جو خدا سے غافل ہیں ان کو رقمیں دی جاتی ہیں تاکہ حکومت کے فائدے کی حدیثیں گھڑ لیں۔ کہتے ہیں کہ ایک اموی عالم نے کہا تھا: "انّ الحسین قُتل بسیف جدّہ"(۳) حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے اور اس سے مراد یہ تھی کہ حسین اپنے جد کے دین کے حکم سے قتل ہوئے۔ لیکن میں کہتا ہوں یہ بات ایک اور معنی میں بھی ٹھیک ہے اور وہ یہ کہ بنی امیہ کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اسلام سے اسقدر ناجائز فائدہ اٹھائیں، اپنے کام میں لائیں اور اذہان کو اس طرح تبدیل کردیں کہ لوگوں کی ایک جماعت خدا سے غافل ہو کر جہاد اور اسلام کی خدمت کے نام سے حسینؑ سے لڑنے آجائیں۔ "و کلّ یتقربون الی اللّٰہ بدمہ"(۴) حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس کام کے شکرانے میں کتنی ہی مسجدیں

۱۔ سورۂ نحل آیت ۱۲۰

۲۔ بے شک فرعون نے (مصر کی) سرزمین میں بہت سر اٹھایا تھا اور اس نے وہاں کے رہنے والوں کو کئی گروہ کردیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو عاجز کر رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرا دیتا تھا اور ان کی عورتوں (بیٹیوں) کو چھوڑ دیتا تھا۔ سورۂ قصص آیت ۴۔

۳۔ مقتل الحسین مقرم صفحہ ۶، عواصم صفحہ ۲۳۲

۴۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۲۹۸

بنائی گئیں۔ ذرا غور تو کیجئے کتنا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

ان حالات میں شعلۂ حسینی جیسا ایک شعلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان حالات کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ایک جملہ بھی لکھنا چاہتا مثلاً وہ کہتا کہ میں نے پیغمبرؐ سے حضرت علیؑ کے بارے میں یہ سنا ہے یا میں حضرت علیؑ سے فلاں قصہ یا فلاں خطبہ نقل کرنا چاہتا ہوں تو لوگ اس کمرے میں جاتے جہاں صندوق رکھے جاتے تھے۔ پھر دروازہ اندر سے بند کر دیتے تھے۔ اس کے بعد جو شخص جملہ نقل کرنا چاہتا تھا اسے سخت قسمیں دی جاتی تھیں کہ اس شرط پر جملہ نقل کر رہا ہوں کہ تم اور کسی کو نقل نہیں کرو گے بجز اس شخص کے جو تمہارے اندازے کے مطابق قابل اعتماد ہو اور تم اسے بھی ایسی ہی قسم دو گے کہ وہ کسی نا قابل اعتبار شخص کو نقل نہ کرائے۔

حسینی تحریک کے تقدس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں رُشد اور فکری ارتقاء کی گہری سوجھ بوجھ ہے۔ یعنی یہ قیام اور رزمیہ اس لحاظ سے مقدس ہو جاتا ہے کہ قیام کرنے والا جو کچھ دیکھ لیتا ہے اسے دوسرا دیکھ نہیں پاتا۔ مثل مشہور ہے۔ جسے دوسرے آئینے میں بھی نہیں دیکھ پاتے وہ اسے کچی اینٹ میں بھی دیکھ لیتا ہے۔ اپنے کام کا نتیجہ دیکھ لیتا ہے۔ اس کی منطق سماج کے لوگوں کی منطق سے مافوق ہوتی ہے۔ ابن عباسؓ، ابن حنفیہ، ابن عمر اور بہت سے لوگوں نے نہایت خلوص نیت سے حسین بن علیؑ کو کربلا جانے سے منع کیا تھا۔ وہ اپنے منطق کی رو سے اس بات کا حق رکھتے تھے۔ یعنی منع کرنے میں حق بجانب تھے لیکن وہ اپنی سطح سے دیکھ رہے تھے۔ امامؑ جو دیکھ رہے تھے انہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ وہ حسین بن علیؑ کے برابر پُر خطر حالات کا احساس کر پا رہے تھے اور نہ یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس نہضت کا آگے چل کر کتنا بڑا اور اہم نتیجہ نکلے گا۔ لیکن حسین بن علیؑ کو بالکل واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ آپ نے کتنی

ہی بار کہا تھا: خدا کی قسم! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے اور خدا کی قسم میرے قتل ہو جانے کے ساتھ ہی ان کے اطوار بالکل الٹ پلٹ جائیں گے۔ یہ تھی اس عظیم ہستی کی ثاقب نظری۔ حسین بن علیؑ ایک عظیم مقدس روح ہیں۔ بنیادی طور پر جب روح بڑی ہوتی ہے تو بدن کو تکلیف ہو جاتی ہے۔ اور جیسے ہی روح گھٹی بدن کو راحت اور قرار حاصل جاتا ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک حساب ہے۔ ابن عباسؓ اور دوسرے لوگ منع کرتے رہیں تو کیا امامؑ حسینؑ کی روح اجازت دیتی ہے۔ عرب کے مشہور شاعر متنبّی نے بہت عمدہ شعر کہا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"و اذا کانت النّفوس کباراً
تعبت فی مرادها الاجسام(۱)"

وہ کہتا ہے کہ جب روح عظیم ہو جائے تو جسم کو اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ روح کا اتباع کرے۔ تکلیف اٹھائے اور ملول ہو لیکن صغیر روح جسمانی خواہشات کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جسم جس بات کا اسے حکم دیتا ہے وہ بجا لاتی ہے۔ صغیر روح جسم کی خاطر ایک چھوٹے سے لقمے کے پیچھے بھی جاتی ہے چاہے بھیک مانگنے اور خوشامد کرنے ہی کا طریقہ کیوں نہ ہو۔ صغیر روح مقام و منصب کے پیچھے دوڑتی ہے چاہے عزت رہن رکھ کے ہی کیوں نہ ہو۔ صغیر روح اس کے لئے ذلت اور توہین برداشت کر لیتی ہے کہ اس کے گھر میں قالین یا فرنیچر ہو جائے۔ آرام ہو جائے۔ میٹھی نیند کا انتظام ہو جائے لیکن عظیم روح جسم کو جو کی روٹی کھلاتی ہے۔ پھر اسے اور بھی بلند کر دیتی ہے اور کہتی ہے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر عبادت کیا کر۔ جس وقت عظیم روح اپنے فریضے میں چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی بھی دیکھتی ہے تو جسم سے کہتی ہے اس سر کو اس تنور پر رکھ تاکہ تجھے اس کی گرمی کا اندازہ ہو اور تو پھر

۱۔ دیوان متنبّی جزو دوم صفحہ ۲۶۷ مطبوعہ دار البیان بغداد

یتیموں اور بیواؤں کے امور میں کوتاہی نہیں کرے گا۔(۱)

عظیم روح اللہ سے طلب کرتی ہے وہ الٰہی اہداف اور عظیم انسانیت کے اہداف کی خاطر قتل ہوجائے۔ سر میں تلوار اتر جائے تو خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔(۲) روح جب عظیم ہوجاتی ہے تو صاحب روح کو روز عاشور جسم پر تین سو زخم پر تعرض نہیں ہوتا۔ وہ جسم جو گھوڑوں کی ٹاپوں میں پامال ہوجاتا ہے وہ روح کی عظمت کا تاوان ادا کرتا ہے۔ ایک رزمیے کا جرمانہ بھرتا ہے۔ حق پرستی کا تاوان بھگتتا ہے۔ شہید روح کا صدقہ دیتا ہے۔

"و اذا کانت النّفوس کبارأ
تعبت فی مرادھا الاجسام"

جس وقت روح عظیم ہوجاتی ہے جسم سے کہتی ہے میں اس خون سے قیمت ادا کرنا چاہتی ہوں۔ شہید کسے کہتے ہیں؟ ایک دم میں کتنے انسان مارے جاتے ہیں۔ مثلاً ہوائی جہاز گر پڑتا ہے اور کئی افراد مرجاتے ہیں۔ انہیں شہید کیوں نہیں کہتے؟ شہید کے لفظ کے گرد تقدس نے گھیرا کیوں ڈال رکھا ہے؟ کیونکہ شہید وہ شخص ہوتا ہے جس کی روح عظیم ہوتی ہے۔ وہ روح جو مقدس ہدف رکھتی ہے۔ شہید وہ شخص ہوتا ہے جو عقیدے کی خاطر مارا جائے۔ وہ شخص ہوتا ہے جس نے اپنے لئے کوئی کام نہیں کیا۔ وہ شخص ہے جس نے حق، حقیقت اور فضیلت کی راہ میں قدم رکھا ہے۔ شہید اپنے خون سے قیمت چکاتا ہے جس طرح ایک شخص اپنی دولت سے قیمت ادا کرتا ہے اور بینکوں میں اپنی دولت جمع کرنے کے بجائے اسے کسی نیک کام میں صرف کردیتا ہے جس کے ایک ایک روپے کی قیمت معنوی اعتبار سے لاکھوں روپے ہوتی

۱۔ حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے مشہور قصے کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ حضرت علی علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی پیشانی زخمی ہوجانے پر آپ نے آواز دی فزت برب الکعبہ۔ کعبے کے خدا کی قسم میں نے نجات پائی۔

ہے، اپنی دولت کسی رفاہ عامہ کے ادارے میں علم، مذہب یا اخلاق کے فائدے کے لئے لگا دیتا ہے اور اس عمل سے وہ قیمت ادا کرتا ہے۔ دوسرا اپنی سوچ بچار سے قیمت چکاتا ہے۔ اپنے آپ کو تکلیف دے کر کوئی فائدہ بخش اور علمی نوعیت کی کتاب تصنیف کردیتا ہے۔ ایک اور شخص اپنے فنی ذوق سے کام لیتا ہے اور انسان کے لئے کوئی صنعت کھڑی کردیتا ہے۔

ایک اور شخص اپنے خون سے قیمت چکاتا ہے۔ انسانیت کی بھلائی کے لئے اپنی جان نثار کرتا ہے۔ کس کس نے زیادہ خدمت کی ہے؟ شاید آپ یہ خیال کریں کہ عالموں، موجدوں، نئی دریافت کرنے والوں اور دولت مندوں نے انسان کی زیادہ خدمت کی۔ نہیں! شہیدوں کے برابر کسی نے بھی انسانیت کی خدمت نہیں کی۔ کیونکہ یہی لوگ ہیں جو دوسروں کے لئے راستہ کھولتے ہیں اور انسان کو آزادی کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو انسان کے لئے انصاف کا ماحول قائم کرتے ہیں تاکہ عالم اپنے علمی کام میں مصروف رہے، ایجاد کرنے والا (موجد) اطمینان سے اپنی ایجاد کے کام میں لگا رہے۔ سوداگر سوداگری کرتا رہے۔ طالب علم پڑھتا رہے اور ہر شخص اپنا اپنا کام کرتا رہے۔ وہی ہے جو دوسروں کے لئے ایک ماحول پیدا کرتا ہے۔ اس کی مثال چراغ اور مجلی کی سی ہے۔ اگر چراغ یا مجلی نہ ہو تو ہم تم کیا کام کرسکتے ہیں؟

قرآن کریم پیغمبر اسلامؐ کو چراغ سے تشبیہ دیتا ہے۔ چراغ اس لئے درکار ہوتا ہے کہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور ہر شخص اپنے اپنے کام میں مشغول رہ سکے۔ خدا بخشے ہمارے زمانے کے شاعر پروین اعتصامی نے کتنی عمدہ بات کہی ہے۔ وہ شاہد اور شمع کی زبان سے کہتا ہے: ایک معشوقہ، ایک محبوبہ، ایک حسینہ ساری رات یہاں تک کہ صبح ہوگئی شمع کے پاس بیٹھی اپنا ہنر دکھاتی رہی، پھول پروتی رہی، کاریگری کرتی رہی۔

جب اپنے کاموں سے فارغ ہوئی تو شمع سے مخاطب ہو کر بولی : تو نہیں جانتی کہ میں نے کل رات کو کیا کیا کام کر ڈالے۔

شاہدے گفت بہ شمع کا مشب — درودیوار مزین کردم
دیشب از شوق نہ خفتم یک دم — دو ختم جامہ و برتن کر دم
کس نہ دانست چہ سحر آمیزی — بہ پرند ازنخ و سوزن کردم
تو بگرد ہنر من نرسی — زانکہ من بزل سروتن کردم

یعنی میں نے اپنے جسم و جان کے لئے اپنا ہنر صرف کیا۔ شمع نے بھی اس کو جواب دیا:

شمع خندید کہ بس تیرہ شدم — تازتا یکیت ایمن کردم
پئے پیوند گہرہائے تو بس — گہراشک بہ دامن کردم

تو کہتی ہے کہ میں نے صبح تک موتی پروئے لیکن یہ میرے آنسو کے موتی تھے جو صبح تک ٹپکتے رہے تب جا کر تو ان موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر اپنے گلے میں ڈال سکی۔

خرمن عمر من ارسوختہ شد — حاصل شوق تو حزمن کردم

میں وہ ذات ہوں جو صبح تک جلتی اور چمکتی رہی جس کی بدولت تو اپنی مراد اور مقصد کو پہنچی۔ پھر کہتی ہے :

کارہاے کہ شمردی بر من — تونہ کردی ہمہ رامن کردم

ابن سینا نے کتاب "قانون" نہیں لکھی محمد بن زکریا نے "الحاوی" نہیں لکھی، سعدی نے گلستاں اور بوستاں میں اپنا شوق پورا نہیں کیا۔ اسی طرح مولوی نے شہداء کی روشنی کی بدولت ان لوگوں کی بدولت جنہوں نے اسلام کے عظیم تمدن کی بنیاد رکھی ، انسانیت کی راہ کی رکاوٹیں دور کیں۔ ان لوگوں کی بدولت جو تاریکیوں

میں شعلوں کی طرح چمکے اور اپنی جانیں فدا کر گئے۔ ان کی بدولت جن کا وجود سراسر الٰہی حماسہ تھا۔ جن کا پورا وجود حق خواہی اور حق پرستی تھا۔ ان کی بدولت جنہوں نے دنیا میں توحید کا پرچم لہرایا اور جھنڈا گاڑ دیا۔ جنہوں نے عدالت کی منادی کی۔ جنہوں نے حریت اور آزادی کی آواز بلند کی۔ ہم تم جو یہاں بیٹھے ہیں ان کے خون کے قطروں کے مقروض ہیں،ان کے حماسوں کے مقروض ہیں۔ حسین بن علیؑ کا وجود سراسر حماسہ تھا۔

ماہرین نفسیات خصوصاً سوانح عمریاں لکھنے والے لکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مختلف ذہنوں کے لئے ایک کلیدی نقطہ دریافت کرلیں۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص کی ذات کا ایک مقررہ کلیدی نقطہ ہوتا ہے۔ اگر وہ معلوم ہو جائے تو آپ اس کی پوری زندگی کی تشریح اور توجیہ کر سکتے ہیں لیکن لوگوں کا یہ کلیدی نقطہ حاصل کرنا بہت دشوار ہوتا ہے خصوصاً بڑی شخصیتوں کا۔ مصر کے دانشمند مفکر عباسؒ محمود عقاد نے عبقریۃ الامامؑ نامی ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں وہ اظہار خیال کرتا ہے کہ : میں نے حضرت علیؑ کی شخصیت کا محور فروسیت میں پایا۔ حضرت علیؑ کی ایک ایسی شخصیت ہے جس کی پوری زندگی میں خواہ لڑائی کے میدان میں ہو، گھر کی چار دیواری میں ہو، محراب عبادت میں ہو، حکومت کے تخت پر ہو غرض ہر جگہ مردانگی کا جوہر ملتا ہے۔ فروسیت کے معنی ہیں مردانگی اور مردانگی شجاعت سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حضرت علیؑ کی شخصیت کا محور مردانگی ہے۔ اس سے سات سو سال پہلے مولانا روم نے بھی اس نکتے کا سراغ لگایا تھا کہ حضرت علیؑ میں شجاعت سے بالاتر کسی چیز کا وجود ہے۔

اس مشہور قصے میں جب حضرت علیؑ نے دشمن کو پچھاڑ کر چاہا کہ اسے قتل کر ڈالیں تو اس شخص نے حضرت علیؑ کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

حضرت علیؑ نے اسے نہیں مارا بلکہ چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بعد میں چاہا کہ اس کا سر قلم کریں تو۔ اس شخص نے پوچھا: تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہیں قتل کیا؟ آپ نے جواب دیا: چونکہ مجھے غصہ آگیا تھا میں نے نہیں چاہا کہ اپنے غصے کے زیر اثر ہاتھ چلاؤں بلکہ یہ چاہا کہ تجھے خدا کی خوشنودی اور خلقت خدا کے کلی مقاصد کی خاطر قتل کروں۔ مولانا روم نے یہ قصہ بہت خوبی سے نظم کیا ہے۔ اس نظم کے ان دو شعروں سے بہتر شعر حضرت علیؑ کی مدح میں میرے خیال سے نہیں کہے جاسکے۔ وہ کہتے ہیں:

تو ترازوے احد خو بودہ ای
بل زبانۂ ہر ترازو بودہ ای
در شجاعت شیر ربانیستی
در مروّت خود کہ داند کیستی

دوسرے شعر میں جو میرے پیش نظر ہے کہتے ہیں:

آپ شجاعت میں اسداللہ ہیں لیکن مروت اور مردانگی میں شجاعت سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ آپ کی کوئی تعریف نہیں کرسکتا۔ آپ تعریف سے بالا تر ہیں۔ یہ مصری شخص بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے عقیدے کی رو سے حضرت علیؑ کی شخصیت کی کلید مروّت ہے۔ مروئت ہے، فروسیت ہے۔

اس بات کا دعویٰ کہ کوئی یہ کہے میں نے علیؑ، حضرت حسین بن علیؑ جیسی شخصیت کی کلید معلوم کر لیا ہے انصاف کی رو سے فضول اور لغو دعویٰ ہے۔ مجھے ایسی بات کہنے کی تو جرأت نہیں ہے لیکن اتنا دعویٰ ضرور کرسکتا ہوں جہاں تک میں نے امامؑ حسینؑ کو پہچانا ہے، ان کی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، ان کا کلام جمع کیا ہے،

جو بد قسمتی سے بہت کم میرے ہاتھ لگا ہے۔ (۱) اور جہاں تک میں نے عاشور کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے جو خوش قسمتی سے بہت مستحکم ہے اور میں نے امام حسینؑ کے خطبات، نصائح، اور نعرے اکٹھے کئے ہیں میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ میرے خیال سے حسینؑ کی شخصیت کا کلیدی نقطہ حماسہ ہے، شور ہے، بزرگی ہے، سختی ہے، شدت ہے، قیام ہے، حق پرستی ہے۔

حسین بن علیؑ کی جو باتیں نقل کی گئی ہیں وہ کمیاب ہیں لیکن جتنی بھی ہیں اسی روح کی نشان دہی کرتی ہیں۔ حسین بن علیؑ سے لوگوں نے پوچھا۔ آپ نے اپنے کانوں سے پیغمبر خداؐ کی جو باتیں سنی ہیں وہ ہم سے بیان کر دیجئے۔ دیکھئے! پیغمبر اکرمؐ کی باتوں سے امام حسینؑ کا انتخاب کیسا ہے آپ اسی سے ان کی شخصیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

امام حسینؑ نے فرمایا: میں نے جو کچھ پیغمبر اکرمؐ سے سنا ہے وہ یہ ہے:

"انّ اللّٰہ تعالیٰ یحبُّ معالی الامور واشرافھا ویکرہ سفسافھا"(۲) خدا بڑے اور بلند کام پسند کرتا ہے اور پست چیزیں ناپسند کرتا ہے۔ بلندی اور بزرگی کو دیکھئے کہ جب آپ پیغمبر اکرمؐ کی باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں تو اسی بلندی سی متعلق باتیں منتخب کرتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتے ہیں۔ امام حسینؑ کے کچھ اشعار بھی ہمارے ہاتھ لگے ہیں جن میں پھر یہی روح جلوہ گر ہے:

"سبقت العالمین الی المعانی بحسن خلیقتہ و علوھمّہ
ولاح بحکمتی نورالھدیٰ فی لیال فی الضلا لتہ مد لھمۃ

۱۔ اس بات کی وجہ کہ امام حسین علیہ السلام کا بہت کم کلام مجھے مل سکا ہے یہ ہے کہ بنی امیہ کا عہد حضرت علیؑ اور حضرت علیؑ کی اولاد کے لئے گھٹن اور سنسر شپ کا زمانہ تھا۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان لوگوں سے مل سکے۔ یا ان کی باتیں نقل کر سکے۔

۲۔ جامع الصغیر جلد ۱ صفحہ ۷۵

یرید الجاحدون لیطفئون ویابی اللّٰہ الا ان یتمة "(۱)

امام حسینؑ کی باتیں جو ہم تک پہنچی ہیں وہ بہت کم اور کچھ اس قسم کی ہیں کہ ان کا عاشور کے سانحے سے بھی کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ اس سے پہلے کی ہیں اور ان کا عاشور سے واسطہ نہیں ہے۔ ایک اور قول یہ ہے: "موت فی عزّ خیرمن حیاة فی ذل"۔ (عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے)۔ ایک اور جملہ جو آپؑ سے نقل کیا گیا ہے یہ ہے: "انّ جمیع ما طلعت علیه الشمسُ فی مشارق الارض و مغاربها بحرها و برّها و سهلها و جبلها عند ولی مّن اولیاء اللّٰہ و اهل المعرفة بحقّ اللّٰہ کفیئی الظّلال"(۲) یہاں آپ یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ جو شخص الٰہی حماسہ ہے اس میں اور دوسروں میں کیا فرق ہوتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ وہ تمام اشیاء جن پر سورج چمکتا ہے، تمام دنیا اور جو کچھ اس میں ہے، اس کے سمندر، خشکی، پہاڑ، میدان اس شخص کے نزدیک جس نے اپنے اللہ کی عظمت کو سمجھ لیا اور خدا کی درگاہ میں خود کو سپرد کر دیا، ایک سائے کی طرح ہے۔ پھر کہتے ہیں: "الّا حرُیدع هذه اللّماظته لاهلها" (۳) کیا کوئی ایسا آزاد مرد پیدا نہیں ہوتا جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو؟ دنیا و مافیہا اس شخص کے لئے جو اپنے آپ کو اس کا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اس کا لالچ کرتا ہے اور اسے اپنے کام کا مقصد سمجھتا ہے لُماظہ کی طرح ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ لماظہ کیا چیز ہے؟ انسان جب کھانا کھاتا ہے تو اس کے دانتوں میں کوئی چیز مثلاً گوشت کا ریشہ پھنس جاتا ہے جسے وہ خلال سے نکال دیتا ہے اسے لماظہ کہتے ہیں۔ حضرت حسینؑ کے نظریئے کے مطابق یزید، یزید کی سلطنت، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے لماظہ ہے۔ پھر فرماتے ہیں: اے لوگو! دنیا میں خدا کے سوا اور کوئی چیز ایسی

۱۔ بحارالانوار جلد ۴۴ صفحہ ۱۹۴

۲-۳۔ لمعہ من بلاغة الحسین صفحہ ۹۵ منقول از نفس المہموم حاج شیخ عباس قمی

نہیں ہے جس کی اتنی قیمت ہو کہ تم اس کے لئے اپنی جان اور ذات بھی بیچ دو۔ اپنے آپ کو نہ بیچو، آزاد رہو، خود فروش نہ ہو۔

دوسرا جملہ: "النّاسُ عبیدالدنیا" لوگوں کی غلامی کی تحقیریوں کرتے ہیں کہ لوگوں میں عیب یہ ہے کہ وہ دنیا کے غلام ہیں۔ غلام صفت ہیں۔ اپنی خواہشات کے غلام ہیں۔ اسی لئے دین جو آزادی کی روح ہے اور انسان کو غیر خدا سے آزاد کراتا اور حقیقت کا بندہ بناتا ہے ان کی روحوں کی گہرائیوں میں نہیں اتر پایا ہے۔ "والدّین لعق علیٰ السنتهم یحوطونه ما درّت معائشهم فاذا محّصوا بالبلاء قلّ الدّیانون" (۱)

خلیفہ عثمان، حضرت ابوذر غفاریؓ کو جلاوطن کر کے اعلان کر دیتے ہیں کہ کوئی بھی اس شخص کی مشایعت نہ کرے کیونکہ یہ حکومت کی نظر میں مجرم ہے لیکن حضرت علیؑ خلیفہ کے اس حکم کی پروا نہیں کرتے اور حضرت حسن اور حسین علیہما السلام کے ساتھ ان کی مشایعت کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کچھ جملے کہتا ہے۔ حضرت حسین بن علیؑ بھی ایک جملہ کہتے ہیں جس میں ان کی روح کا عکس نظر آتا ہے۔ حضرت ابوذرؓ حضرت علیؑ کے شیعہ ہیں اور عمر میں حضرت علیؑ کے برابر ہیں بلکہ شاید حضرت علیؑ سے بھی کچھ بڑے ہوں گے اس لئے امام حسینؑ ان کو چچا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ چچا جان! آپ کو میری نصیحت یہ ہے: "اسئلُ اللّٰہ الصّبر والّنصر واستعذ به من الجشع والجزع" (۲) چچاجان! خدا سے صبر اور نصرت طلب کیجئے۔ حرص بے صبری سے اللہ کی پناہ مانگئے۔ چچاجان! آپ کے لئے میری وصیت یہی ہے کہ آپ ظلم اور دباؤ کے مقابلے میں

۱۔ تحف العقول صفحہ ۲۵۰، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۳۱، مقتل الحسین خوارزمی صفحہ ۲۳۷، فی رحاب ائمہ اہل البیت جلد ۳ صفحہ ۱۰۱

۲۔ الغدیر جلد ۸ صفحہ ۳۰۲

کمزوری نہ دیکھایئے۔ یہ کیسی ذہنیت ہے کہ آپ کی تمام باتوں میں وہ روح جلوہ گر ہے جس سے ہم غافل ہیں۔ آپ نے پہلی بات یہ کہی: "خطّ الموتُ علیٰ ولد آدم مخط القلادة علیٰ جید الفتاة وما اولهنی الیٰ اسلافی اشتیاق یعقوب الیٰ یوسف"(۱) کربلا جاتے ہیں بعض لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ نہ جایئے۔ خطرہ ہے اور امام حسینؑ جواب میں یہ شعر پڑھتے ہیں:

"سا مضی وما بالموت عار علی الفتي
اذا ما نویٰ حقاً و جاہد مسلماً۔
و واسی الّرجال الصالحین بنفسه
و فارق مثبوراً و خالف مجرماً
اُقدّمُ نفسی لا ارید بقا ئها
لتلقیٰ خمئیساً فی الهیاج عر مرماً
فان عشتُ لم اندم و ان متّ لم الم
کفیٰ بك ذلا ً ان تّعیش و ترغما"(۲)

مجھ سے یہ نہ کہو کہ نہ جا! میں ضرور جاؤں گا۔ تم کہتے ہو کہ میں قتل ہو جاؤں گا تو کیا کسی بہادر کے لئے مر جانا شرم کی بات ہے؟ مرنا اس وقت باعث شرم ہوتا ہے جب انسان کا نصب العین پست اور حقیر ہو اور وہ یہ چاہے کہ ملکیت اور حکمرانی کے لئے مارا جائے کیونکہ ایسے شخص کے لئے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اپنی مراد کو نہیں پہنچا لیکن اس شخص کے لئے باعث شرم نہیں ہے جو کلمۂ حق کہنے کے

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۶۶، الملہوف صفحہ ۲۵، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۵، نفس المہموم صفحہ ۱۰۰، ملحقات احقاق الحق جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۸، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۲۹

۲۔ فی رحاب ائمہ اہل البیت جلد ۳ صفحہ ۹۷، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۶۹، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۱۷، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۲۳۸، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۲۵، اعلام الوری صفحہ ۲۳۰

باعث اور حق کی راہ میں مارا جائے کیونکہ ایسی راہ میں قدم رکھتا ہے جس پر خدا کے صالح اور شائستہ بندے چلتے آرہے ہیں۔

پس جب وہ ایسی راہ میں قدم رکھتا ہے جہاں یزید جیسے بدبخت، شقی اور گنہگار شخص کی مخالفت کرتا ہے تو اسے قتل ہو جانے دو۔ ! تم کہتے ہو میں مارا جاؤں گا تو ان دو صورتوں میں سے ایک صورت ہوگی یا میں زندہ رہوں یا میں مارا جاؤں۔ "فان عشتُ لم اندم" اگر زندہ رہے تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ تم کیوں زندہ رہے؟ "و ان متُّ لم الم" اور اگر اس راہ میں مارا گیا تو دنیا میں کوئی بھی مجھے ملامت نہیں کریگا اگر وہ یہ جان لے گا کہ میں نے کون سی راہ اختیار کی ہے۔ "کفیٰ بك ذلاً تعیش و ترغماً" تمہاری بدبختی اور ذلت کے لئے یہی کافی ہے کہ تم زندہ رہو۔ اور تمہاری ناک کو خاک پر رگڑا جائے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ یہ حماسہ ہے۔ راستے میں بھی خطبہ پڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں: "الا ترون انّ الحق لا یعملُ بهٖ وانّ الباطل لا یتنا عنهُ"(۱) پھر اس کے آخر میں فرماتے ہیں: "انیّ لا اری الموت الّا سعادةً ولا الحیوة مع الظالمین الّا برماً"(۲) میں مرنے کو اپنے لئے سعادت جانتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو موجب ملامت سمجھتا ہوں۔

اگر میں امامؑ حسین علیہ السلام کی تمام باتیں بیان کروں تو بہت طول ہو جائے اس لئے میں شبِ عاشورا کی بات کرتا ہوں اور ایک ایسے نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہوں جس پر عموماً بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

جو انسان اور جو تاریخی شخصیت ایسے حالات میں گھر جاتی ہے جیسے حسین بن علیؑ شب عاشور گھرے ہوئے تھے یعنی ایسے حالات میں جبکہ دشمن پر ظاہری غلبہ

۱-۲ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۸۱، تحف العقول صفحہ ۱۷۶، الملہوف صفحہ ۳۳، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۳۲، تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۲۲۹، تاریخ ابن عساکر جلد ۴ صفحہ ۳۳۳، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۳۲

پانے کی تمام راہیں بند ہو چکی ہوں اور اسے اس بات کا قطعی یقین ہو گیا ہو کہ اب وہ اور اس کے ساتھی دشمن کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے وہ زبان سے شکایت کر اٹھتی ہے اور تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے۔ لوگ ایسے جملے کہنے لگتے ہیں: اس دنیا پر لعنت ہے۔ افسوس یہ ہے کہ قدرت نے میری مدد نہیں کی۔ کہتے ہیں کہ جس وقت نپولین ماسکو میں ایسے ہی حادثے سے دوچار ہوا تو اس نے کہا: افسوس قدرت نے چند گھنٹے تک میری مخالفت کی۔ پھر وہ ہاتھ مل کر کہتا ہے: اے دنیا تیرا منہ کالا ہو جائے کہ تو نے میری یہ حالت کر دی۔

لیکن حسین بن علیؑ اپنے دوستوں کو یوں جمع کرتے ہیں جیسے ہر کامیاب شخص سے زیادہ ان میں زندگی کا جوش بھر گیا ہو اور فرماتے ہیں: "اثني على الله احسن الثناء و احمده على السرّآء والضراء.اللهمّ انّی احمدك على ان اكرمتنا بالنبوة و علّمتنا القرآن و فقهتنا فی الدين."(۱) گویا تمام ماحول ان کے لئے سازگار ہے اور واقعی سازگار بھی تھا۔ یہ حالات ایسے شخص کے لئے ناموافق ہیں جس کا مقصد دنیاوی حکومت ہو۔ لیکن اس شخص کے لئے جو حکومت بلکہ ہر چیز کو حق اور حقیقت کی خاطر چاہتا ہو اور یہ دیکھتا ہو کہ اس نے اپنی ہی راہ میں قدم رکھا ہے ماحول سازگار ہے وہ خدا کے شکر و سپاس کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ امامؑ حسین علیہ السلام کا روز عاشور کا ایک نعرہ یہ ہے:

"الموت اَولیٰ من ركوب العار
والعار اَولیٰ من دخول النار"(۲)

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۹۲، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۱ صفحہ ۲۴۶، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۵۷، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۱، اعلام الوری صفحہ ۲۳۴

۲۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۵۰، مناقب شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۶۸، ۱۱۰، اللہوف صفحہ ۵۰، کشف الغمہ جلد ۲، صفحہ ۳۶

آخری لمحے تک آپ کا عمل، آپ کی حرکات، آپ کی سکنات، آپ کی باتیں سب کی سب حق، حق پرستی اور حماسہ کی ایک لہر ہے۔ نو محرم کا دن گزرنے کے بعد رات کو جب آپ کے سامنے آخری بار یہ تجویز رکھتے ہیں کہ قتل ہو جاؤ یا اطاعت کر لو تو آپ فرماتے ہیں: " و الله لا اعطيكم بيدی اعطآء الذليل ولا افرّ فرار العبيد"(۱)

خدا کی قسم میں ہرگز نہ تمہاری اطاعت کی ذلت اختیار کرونگا اور نہ غلاموں کی طرح بھاگوں گا میں اس وقت تک مردانہ وار مقابلہ کرتا رہوں گا جب تک کہ میں قتل نہ ہو جاؤں۔ ان آخری گھڑیوں میں بھی امام حسین علیہ السلام وہی ہیں۔ آپ ہرگز یقین نہ کیجئے کہ امام حسینؑ نے یہ جملہ کہا ہوگا: " اسقونی شربة من الماء فقد نشطت كبدی." میں نے یہ جملہ کہیں نہیں دیکھا۔ امام حسینؑ اس قسم کی درخواست نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ دشمن کے لشکر کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بلند آواز سے فرماتے ہیں: "الا و انّ الدّعیّ بن الدّعی قد ركز بين اثنين بين السّلّة والذّلّة و هيهات منّا الذّلّة يأبى الله ذالك لنا و رسوله و المؤمنون و حجور طابت و طهرت"(۲)

اے کوفہ والو! اس ناہنجار ابن ناہنجار، اس ولد الزنا ابن ولد الزنا، تمہارا امیر، تمہارے حاکم مطلق نے، اس نے جس کے حکم سے تم یہاں آئے ہو مجھ سے کہلوایا ہے کہ میں دو کاموں میں سے ایک کام اختیار کر لوں یا لڑوں یا ذلیل ہو جاؤں۔ کیا میں ذلت اختیار کروں؟ میں ہرگز ذلت برداشت نہیں کروں گا۔ میں تلوار کے

۱۔ ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۵، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۸۰

۲۔ اللہوف صفحہ ۴۷، قتل الحسین خوارزمی صفحہ ۷۶، تاریخ شام ابن عساکر جلد ۴ صفحہ ۳۳۳، نفس المہموم صفحہ ۱۴۹، ملحقات احقاق الحق جلد ۱۱، صفحہ ۶۲۴، ۶۲۰، قتل الحسین مقرم صفحہ ۲۸۷، تحف العقول صفحہ ۱۷۴۔

سامنے ڈٹ جاؤں گا لیکن اپنی روح کو ذلیل نہیں ہونے دونگا۔ میں نے جس خدا کی خوشنودی کے لئے قدم اٹھایا ہے وہ اس کے لئے رضامند نہیں ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ ایسا نہ کر۔ جس پیغمبرؐ کی سنت پر عمل کرتا ہوں وہ کہتا ہے ایسا مت کر۔ جن کی آغوش میں پل کر بڑا ہوا ہوں، حضرت علیؑ کی گود جن کے زانوں پر میں بیٹھا ہوں مجھ سے کہتی ہے اپنے آپ کو ذلیل نہ کر!

یہ ایک حماسہ ہے لیکن شخصی یا قولی رزمیہ نہیں ہے۔ اس میں انانیت نہیں ہے۔ اس میں غرور نہیں ہے، خدا پرستی ہے۔ عاشور کے دن امام حسینؑ آخر تک مقابلہ کرتے ہیں پھر وہ وقت آتا ہے جب آپ کے بدن کی قوت بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ ایک تیر انداز زہر میں بجھا ہوا تیر کمان میں جوڑ کر امام حسینؑ کی جانب پھینکتا ہے جو آپؑ کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے اور آپؑ بے اختیار زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اس وقت کیا فرماتے ہیں؟! کیا اس وقت بھی اطاعت کی ذلت اختیار کرتے ہیں؟ کیا کوئی خواہش کرتے ہیں نہیں بلکہ لڑائی کا یہ دور گزر جانے کے بعد پھر اسی قبلے کی طرف منہ کرتے ہیں جس سے کبھی منہ نہیں پھیرا تھا اور فرماتے ہیں: "رضاً بقضائك و تسليماً لامرك و لا معبود سواك يا غياث المستغيثين"(۱) یہ ہے خدائی حماسہ، یہ انسانی حماسہ۔

و لا حول و لا قوة الا باالله العلى العظيم

و صلى الله على محمد و آله الطاهرين

۱۔ تقام زخار صفحہ ۴۶۳، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۵۷

تیسری مجلس

حسینی تحریک، اسلامی معاشرے کو انفرادیت عطا کرتی ہے

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

"يا ايّها الذين آمنوا استجيبوا لله ولرسول اذا دعاكم لما يحييكم"(۱)

یہ بات ہم بار بار کہتے ہیں کہ حسین بن علیؑ نے جو جان نثاری دکھائی اس سے انہوں نے اسلام کو دوبارہ زندگی بخشی اور اسلام کے درخت کو اپنے خون سے سینچا۔ "اشهد انّك قد اقمت الصلوة و آتيت الزكوة و امرت بالمعروف و نهيت عن المنكر و جاهدت فى الله حق جهاده" (۲) میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، نیک کاموں کا حکم دیا اور برائیوں سے منع کیا، اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جہاد کا حق ادا کر دیا۔

۱۔ اے ایمان والو جب خدا اور رسول تم کو ایمان لانے کو کہیں تو تم مان لو تاکہ تم کو حیات ابدی حاصل ہو جائے۔ سورہ انفال آیت ۲۴

۲۔ مفاتیح الجنان۔ زیارت امام حسین علیہ السلام (عید فطر اور عید قربان میں)

ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ضروری ہے کہ حسین بن علیؑ کی شہادت اور اسلام کے قوت پکڑنے اور اصول اور فروع دین کے زندہ ہونے میں کیا رابطہ ہے؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ صرف خون بہانے سے ہی ان باتوں کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس بنا پر حسین بن علیؑ کے قیام، تحریک اور شہادت اور ان آثار کے درمیان جو ہم بیان کرتے ہیں، جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اور جن کی حقیقت کی تاریخ بھی گواہی دیتی ہے کیا رابطہ ہے؟ یہ رابطہ ہم صرف اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب پچھلی دو تقریروں میں بیان کئے ہوئے پورے موضوع پر غور کریں۔

اگر حسین بن علیؑ کی شہادت صرف ایک الم انگیز واقعہ ہوتا، اگر صرف ایک مصیبت ہوتی، صرف خون ناحق بہایا گیا ہوتا، دوسرے لفظوں میں صرف ایک شخصیت ضائع ہوئی چاہے وہ شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو تو اس سے ایسے نتائج نہ نکلتے۔ حسین بن علی علیہ السلام کی شہادت کے یہ نتائج صرف اس لئے بر آمد ہوئے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے امام حسین علیہ السلام کی تحریک ایک بہت بڑا اسلامی اور الٰہی حماسہ تھی۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ داستان اور یہ تاریخ چند ظالموں اور گنہگاروں کی ایک جماعت کی طرف سے ایک مصیبت، ایک گناہ اور ایک شقاوت تھی بلکہ یہ اس شخص کی جانب سے ایک بہت ہی بڑی شجاعت اور مردانگی کا مظاہرہ تھی جس پر مظالم ڈھائے گئے تھے۔

حسین بن علیؑ کی شہادت نے اسلامی دنیا میں ایک نئی روح پھونکی اور جیسا کہ ہم نے اپنی پہلی تقریر میں کہا ہے کہ کسی بات یا تاریخ یا حماسی شخصیت کا اثر اور خاصیت یہ ہوتی ہے کہ روح میں وجود کی لہر ڈال دیتی ہے۔ حمیت اور غیرت پیدا کر دیتی ہے، مردانگی اور شدت کو جنم دیتی ہے۔ جسموں میں خون کو حرکت اور جوش دیتی ہے۔ جسموں سے سستی اور کاہلی دور کر دیتی ہے اور انہیں چست اور چاق و چوبند

دیتی ہے۔ بیشتر خون بہت سے مقامات پر ایسا بہایا جاتا ہے جو صرف خون ریزی ہی پہلو رکھتا ہے اس لئے اس کے نتیجے میں لوگ صرف ڈر جاتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ عوام اور قوم کی قوت گھٹ جاتی ہے اور سینوں میں سانسیں گھٹ جاتی ہیں۔

لیکن دنیا میں ایسی شہادتیں بھی ہوئی ہیں جو اپنے پیچھے معاشرے کے لئے روشنی اور پاکیزگی چھوڑ گئی ہیں۔ آپ نے ایک فرد کی حیثیت سے اس بات کو جانچا پرکھا ہوگا کہ بعض اعمال انسان کے دل کو منکدر کر دیتے ہیں لیکن دوسرے اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے انسان کا دل روشن، صاف اور پاک ہو جاتا ہے۔ یہی حال معاشرے کا ہے۔ بعض اجتماعی مظاہر معاشرے کی روح کو تاریک اور منکدر کر دیتے ہیں، معاشرے میں خوف اور رعب بٹھا دیتے ہیں۔ اجتماعی اور کلی غلامی اور قید میں پھنسا دیتے ہیں لیکن اجتماعی مظاہر کا ایک سلسلہ ایسا بھی ہے جو معاشرے کو صفائی اور روشنی بخشتا ہے، اجتماعی خوف دور کر دیتا ہے، غلامی اور گرفتاری کا احساس ختم کر دیتا ہے اور اسے حوصلہ اور دلیری بخشتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد ایسی ہی حالت پیدا ہو گئی، اسلام پر رونق آگئی۔ معاشرے پر یہ اثر اس وجہ سے پڑا کہ امام حسین علیہ السلام نے اپنے دلیرانہ اور شجاعانہ اعمال سے مسلمان کی روح کو زندہ کر دیا۔ اسلامی معاشرے کی روح پر غلامی اور جبر و قید کے جو جذبات و احساسات حضرت عثمان کے دور کے آخری حصے سے لیکر معاویہ کے پورے عہد میں مسلط اور غالب ہوئے تھے انہیں کمزور کیا، خوف دور کر دیا، غلامی کا احساس زایل کیا اور دوسرے لفظوں میں اسلامی معاشرے کو تشخص عطا کیا۔ انہوں نے سماج کی نبض پر وہاں انگلی رکھ دی جہاں بعد میں سماج نے خود اپنے تشخص کا احساس کر لیا۔ تشخص کے احساس کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے۔

ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا ضروری ہے کہ حسین بن علیؑ کی شہادت اور اسلام کے قوت پکڑنے اور اصول اور فروع دین کے زندہ ہونے میں کیا رابطہ ہے؟ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ صرف خون بہانے سے ہی ان باتوں کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس بنا پر حسین بن علیؑ کے قیام، تحریک اور شہادت اور ان آثار کے درمیان جو ہم بیان کرتے ہیں، جن کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اور جن کی حقیقت کی تاریخ بھی گواہی دیتی ہے کیا رابطہ ہے؟ یہ رابطہ ہم صرف اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب پچھلی دو تقریروں میں بیان کئے ہوئے پورے موضوع پر غور کریں۔

اگر حسین بن علیؑ کی شہادت صرف ایک الم انگیز واقعہ ہوتا، اگر صرف ایک مصیبت ہوتی، صرف خون ناحق بہایا گیا ہوتا، دوسرے لفظوں میں صرف ایک شخصیت ضائع ہوئی چاہے وہ شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو تو اس سے ایسے نتائج نہ نکلتے۔ حسین بن علی علیہ السلام کی شہادت کے یہ نتائج صرف اس لئے برآمد ہوئے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے امام حسین علیہ السلام کی تحریک ایک بہت بڑا اسلامی اور الٰہی حماسہ تھی۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ داستان اور یہ تاریخ چند ظالموں اور گنہگاروں کی ایک جماعت کی طرف سے ایک مصیبت، ایک گناہ اور ایک شقاوت تھی بلکہ یہ اس شخص کی جانب سے ایک بہت ہی بڑی شجاعت اور مردانگی کا مظاہرہ تھی جس پر مظالم ڈھائے گئے تھے۔

حسین بن علیؑ کی شہادت نے اسلامی دنیا میں ایک نئی روح پھونکی اور جیسا کہ ہم نے اپنی پہلی تقریر میں کہا ہے کہ کسی بات یا تاریخ یا حماسی شخصیت کا اثر اور خاصیت یہ ہوتی ہے کہ روح میں وجود کی لہر ڈال دیتی ہے۔ حمیت اور غیرت پیدا کر دیتی ہے، مردانگی اور شدت کو جنم دیتی ہے۔ جسموں میں خون کو حرکت اور جوش دیتی ہے۔ جسموں سے سستی اور کاہلی دور کر دیتی ہے اور انہیں چست اور چاق و چوبند

بنا دیتی ہے۔ بیشتر خون بہت سے مقامات پر ایسا بہایا جاتا ہے جو صرف خون ریزی ہی کا پہلو رکھتا ہے اس لئے اس کے نتیجے میں لوگ صرف ڈر جاتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ عوام اور قوم کی قوت گھٹ جاتی ہے اور سینوں میں سانسیں گھٹ جاتی ہیں۔

لیکن دنیا میں ایسی شہادتیں بھی ہوئی ہیں جو اپنے پیچھے معاشرے کے لئے روشنی اور پاکیزگی چھوڑ گئی ہیں۔ آپ نے ایک فرد کی حیثیت سے اس بات کو جانچا پرکھا ہوگا کہ بعض اعمال انسان کے دل کو منکدر کر دیتے ہیں لیکن دوسرے اعمال ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے انسان کا دل روشن، صاف اور پاک ہو جاتا ہے۔ یہی حال معاشرے کا ہے۔ بعض اجتماعی مظاہر معاشرے کی روح کو تاریک اور منکدر کر دیتے ہیں، معاشرے میں خوف اور رعب بٹھا دیتے ہیں۔ اجتماعی اور کلی غلامی اور قید میں پھنسا دیتے ہیں لیکن اجتماعی مظاہر کا ایک سلسلہ ایسا بھی ہے جو معاشرے کو صفائی اور روشنی بخشتا ہے، اجتماعی خوف دور کر دیتا ہے، غلامی اور گرفتاری کا احساس ختم کر دیتا ہے اور اسے حوصلہ اور دلیری بخشتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد ایسی ہی حالت پیدا ہو گئی، اسلام پر رونق آگئی۔ معاشرے پر یہ اثر اس وجہ سے پڑا کہ امام حسین علیہ السلام نے اپنے دلیرانہ اور شجاعانہ اعمال سے مسلمان کی روح کو زندہ کر دیا۔ اسلامی معاشرے کی روح پر غلامی اور جبر و قید کے جو جذبات و احساسات حضرت عثمان کے دور کے آخری حصے سے لیکر معاویہ کے پورے عہد میں مسلط اور غالب ہوئے تھے انہیں کمزور کیا، خوف دور کر دیا، غلامی کا احساس زایل کیا اور دوسرے لفظوں میں اسلامی معاشرے کو تشخص عطا کیا۔ انہوں نے سماج کی نبض پر وہاں انگلی رکھ دی جہاں بعد میں سماج نے خود اپنے تشخص کا احساس کر لیا۔ تشخص کے احساس کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے۔

سماج کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اندر تشخص کا احساس کرے۔ اپنے میلان کا احساس کرے۔ اپنا ایک آئیڈیل رکھے اور دوسرے سماجوں سے بے نیاز اور مستغنی ہو جائے۔ سماج اپنے بارے میں اس طرح سوچے کہ خود اپنے لئے زندگی کا ایک مستقل فلسفہ اور نظریہ قرار دے لے اور زندگی کے اس مستقل فلسفے اور نظریے پر خود ہی فخر و مباہات کرے۔ بنیادی طور پر سماج میں رزمیئے کی حفاظت اس طرح ہو سکتی ہے کہ سماج اپنا فلسفۂ حیات رکھتا ہو، اس فلسفے پر اس کا ایمان اور اعتقاد ہو اور پھر اس کو دوسرے فلسفوں سے برتر، بہتر اور بلند تر سمجھے اور اس پر فخر کرے۔ اس سماج کے حال پر افسوس ہے جس کا یہ احساس جاتا رہے۔ یہ ایک اجتماعی بیماری ہے اور اس خودی سے مختلف اخلاق ہے جو بُرا ہے اور جو نفس پرستی اور شہوت پرستی ہے۔

اگر کسی سماج نے اپنے اس مزاج ہی کو ہاتھ سے جانے دیا اور یہ احساس نہیں کیا کہ وہ خود ایک مستقل فلسفہ رکھتا ہے جس پر اسے تکیہ کرنا چاہئے اور اس کا اپنی زندگی کے مستقل فلسفے پر ایمان نہیں ہے تو وہ سب کچھ کھو بیٹھے گا اور اگر اسکے پاس صرف یہی ایک چیز ہو اور دوسری تمام چیزیں اس سے چھین بھی لیں پھر بھی وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائیگا۔ یعنی وہ بے مثال قوت جو ایک قوم کو دوسری قوم اور ایک فرد کو دوسرے فرد میں جذب ہونے سے روکتی ہے اپنے مزاج اور تشخص کا یہی احساس ہے۔

جرمنوں کی یہ بات مشہور ہے کہ ہم نے دوسری عالمی جنگ میں سوائے ایک چیز کے جو ہماری شخصیت تھی باقی ہر چیز کھو دی اور چونکہ ہم نے اپنی شخصیت (تشخص) نہیں کھوئی سب چیزیں واپس حاصل کرلیں اور ان کی یہ بات سچ بھی ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس سب کچھ ہو لیکن وہ اپنا تشخص کھو بیٹھے تو پھر اس کے پاس کچھ نہیں رہے گا اور وہ ضرور بالضرور دوسری اقوام میں جذب ہو جائے گی اس خود باختگی

(خود کو لٹا بیٹھنے) کی حالت پر سخت افسوس ہے جس میں بد قسمتی سے ہمارا معاشرہ نظر آتا ہے۔

میں نے علامہ اقبال کی تقریروں میں پڑھا کہ مسولینی نے کہا ہے: انسان کے پاس لوہا ہونا چاہئے جس سے روٹی مل سکے یعنی اگر روزی حاصل کرنا چاہتے ہو تو قوت پیدا کرو۔ لیکن اقبال کہتا ہے: یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر آپ روٹی چاہتے ہیں تو لوہا بن جایئے، یہ نہیں کہ لوہا رکھئے بلکہ لوہا بن جائے یعنی آپ کی شخصیت فولاد کی طرح مضبوط اور توانا ہونا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ شخصیت کے مالک ہو۔ طاقت کا وسیلہ کیوں ڈھونڈو، ہتھیاروں کا وسیلہ کیوں تلاش کرو۔ یہ کیوں کہتے ہو کہ روٹی چاہتے ہو تو ہتھیار رکھو؟ کہو کہ اگر کچھ رکھنا چاہتے ہو تو خود فولاد بن جاؤ، خود لوہا بن جاؤ، خود اپنی شخصیت رکھو، خود اپنے اندر سختی رکھو، خود اپنا ایک مزاج رکھو۔ جب کسی مجبور اور بدبخت قوم کا ایمان اپنے فلسفہ زندگی کو ہاتھ سے جانے دے اور وہ دوسری قوم سے مرعوب ہو جائے تو وہ تمام مسئلوں میں اسی طرح سوچنے لگتی ہے جس طرح دوسرے سوچتے ہیں اور پھر مسائل کا فیصلہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے مطلق نہیں کر سکتی۔ وہ ہر بات اس لئے قبول کریگی کہ یہ فیشن ہے یا اس صدی کی ریت ہے یا امریکی اور یورپی جامعہ میں رائج ہے اور کوئی دوسری منطق اس کے پاس نہیں ہوگی۔

ایک جدت پسند ایرانی کی ایک کتاب میں جو بری نہیں ہے میں نے پڑھا تھا کہ جس زمانے میں میں لندن میں تھا ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا اور یہ تھا کہ ماسکو میں مقیم ایک کسی پچھلے بڑے انگلستان کے سفیر کی بیٹی جو یقیناً انگلستان کی بہت معتبر شخصیت تھی ایک کالے پر لٹو ہو گئی اور اس نے کالی چمڑی کے باوجود اس سے بیاہ رچا لیا۔ اس پر انگلستان میں بہت شور و غوغا مچا کہ ایک گوری لڑکی نے جو انگلستان کی ایک بڑی شخصیت کی بیٹی تھی ایک کالے سے کیوں شادی کر لی؟ یہ بات مدتوں

موضوع سخن بنی رہی تو ایک اخبار نے لکھا کہ یہ بات اتنے شوروغل کے لائق نہیں ہے۔ دنیا مساوات کی طرف جا رہی ہے اور آج کی دنیا مختلف نسلوں میں برابری کی قائل ہے۔ اس کے علاوہ اسلام نے جو دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب ہے چودہ سو سال پہلے کالے گورے کا فرق ختم کر دیا تھا۔ اس کتاب میں لکھا تھا کہ ایک محفل میں جہاں انگریزوں کی ایک جماعت موجود تھی کچھ ایرانی جوان بھی تھے۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ فلاں اخبار نے یہ لکھا ہے اور اسلام سے سند لی ہے کہ اسلام نے چودہ صدی قبل کالوں کی حمایت کی تھی اور ان کو گوروں کے برابر بتایا ہے۔ ایک انگریز بولا ایک گندے مذہب کو ایک گندے شخص کی حمایت کرنی چاہئے۔ پھر لکھا تھا کہ دو ایرانی جوان اس محفل میں تھے۔ بہت افسردہ ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم ایسے دین پر کیوں چلیں جو شرمندگی کا سبب ہو اور پھر انہوں نے اس محفل کا یہ واقعہ بیان کیا کہ ہم اس محفل میں تھے اور لوگوں نے یہ کہا کہ گندے مذہب کو ہی کسی گندی نسل کی حمایت کرنا چاہئے۔ ان دونوں جوانوں نے کہا تھا کہ واقعی اسلام یہ فرق کیوں نہیں سمجھتا کہ گورے اور کالے میں فرق ہوتا ہے۔

اسے کہتے ہیں شخصیت کھو بیٹھنا۔ یہ لوگ چونکہ ایسے ماحول میں تھے جس میں اس طرح سوچتے ہیں تو بجائے اس کے کہ استقلال کے ساتھ سوچیں، اس بات کے کہنے والے کا منہ بند کریں اور کہیں کہ تیری بات بالکل لغو اور بیہودہ ہے۔ کیا رنگ کا فرق لوگوں کی فضیلت میں فرق کا سبب بن سکتا ہے اس طرح افسردہ ہو جاتے ہیں اور اپنی شخصیت کھو بیٹھتے ہیں کیونکہ وہ کہتا ہے کہ جب انگریز یوں سوچتا ہے تو یہی بات لازمی طور پر درست ہو گی۔

ہم ایرانیوں میں ایک خوبی ہے اور ایک عیب۔ خوبی یہ ہے کہ ہم حقیقت کے خلاف تعصب کم رکھتے ہیں بلکہ شاید ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم بے تعصب

ہیں یعنی اگر ہمارے سامنے حقائق آ جائیں اور ہم انہیں سمجھ لیں تو شاید ہر قوم کے مقابلہ میں ان حقائق کو جلد تسلیم کر لیں گے لیکن ہماری ایرانی قوم میں ایک عیب بھی بہت بڑا ہے کہ ہم حقائق کے سامنے جتنی جلد جھک جاتے ہیں حماسوں اور اپنی تشخص کے مالکوں کا زیادہ ساتھ بھی نہیں دیتے اور ذرا سی بات پر بہت جلد انہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمارے برابر اپنے شعائر سے بے پرواہ کوئی اور قوم نہیں ہو سکتی۔ آپ نے ہندوستانیوں، جاپانیوں اور عربوں کو دیکھا ہوگا وہ بھی ہماری ہی طرح شرق والے ہیں لیکن اس لحاظ سے ہماری طرح نہیں ہیں۔ ہم اجنبی لفظوں اور عادتوں کو جس قدر تسلیم کر لیتے ہیں اور کوئی قوم تسلیم نہیں کرتی۔ علوم کی تاریخ کی کتابوں میں دی ہوئی تصویروں پر نظر ڈالیئے تو ہندوستان کے چوٹی کے دانش مند اور علماء اپنی ہی پگڑی اور لباس میں ملیں گے۔

نہرو جیسا قدآور اور بڑا سیاستدان اپنی ہندوستانی لباس میں ہی ہر جگہ جاتا تھا۔ لباس کی بلندی یا کوتاہی یا سفیدی یا سیاہی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ البتہ بات صرف اتنی سی ہے کہ جو عالم اپنے سر پر پگڑی رکھتا ہے یا نہرو جو اپنے سفید اور ڈھیلے پاجامے اور مخصوص شیروانی میں ہر جگہ جاتا ہے دنیا کے تمام لوگوں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی ہی رہوں گا، البتہ علم اور صنعت کے معاملے میں تنگ نظر نہیں ہوں کیونکہ علم اور صنعت کسی ایک ملک سے مخصوص نہیں ہیں۔ میں بڑے بڑے فلسفیانہ اور دینی عقائد کے بارے میں بھی تعصب نہیں رکھتا۔ البتہ قومی رسم و رواج کے معاملے میں جب ہر شخص اپنے رسم و رواج کا پابند ہے تو میں دوسری قوم کا طریقہ کیوں اپناؤں؟ لیکن اگر انگریز ایک جینو باندھتا ہے تو ہم (ایرانی) دو جینو باندھیں گے حالانکہ وہ اپنے شعار کے مطابق یہ کام کرتا ہے۔ ہمارے جامعہ میں یہ حساب کتاب نہیں ہے۔

ہر روز ایک نعرہ بلند ہوتا ہے اور چند دن کے بعد موجودہ رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ یہ طرز کام نہیں دیتا اس لئے ہمیں لاطینی طرز اختیار کر لینا چاہئے اور اپنے الفاظ لاطینی حروف میں لکھنے چاہئیں۔ اب اس تبدیلی کے نتیجے میں ہمارے علم، تہذیب، تمدن اور تشخص اور ملی حماسہ پر کیا بیتے گی اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ہمارے یہاں اتنی اچھی اچھی کتابیں ہیں جن کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کیا دنیا میں کہیں مولانا روم کی مثنوی جیسی کتاب ملتی ہے؟ کیا دنیا میں سعدی کی کتاب کا جواب موجود ہے؟ یہ کتابیں اسی رسم الخط کے قالب میں کہی اور لکھی گئی ہیں۔ اگر آپ اس انداز کو جو س، ص اور ث میں اور ز، ض اور ظ میں فرق کرتی ہے منسوخ کر دیں گے تو گویا اس قالب کو ہی ختم کر دیں گے۔ پھر اگلے سو سال تک مثنوی مطلق نہیں پڑھی جا سکے گی۔ معلوم نہیں ہم لوگوں نے یہ ڈھنگ کیوں اختیار کر لیا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے عرب کے لوگوں کو کیا دیا؟ ایک ایسا شخص جو حقیقت میں مفلس اور یتیم تھا اور قوم اور قبیلہ جس کا دشمن تھا، ان کو دے بھی کیا سکتا تھا۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ انہوں نے انہیں انتہائی پستی سے اٹھا کر عزت کی بلندیوں پر پہنچا دیا؟ انہوں نے انہیں وہ ایمان دیا جس ایمان نے انہیں تشخص عطا کی۔ یکایک اس عرب میں جو گوہ کھاتا تھا، اونٹنی کا دودھ پیتا تھا، لٹیرا تھا، بیٹی کو زندہ دفن کر دیتا تھا، یہ احساس پیدا ہو گیا کہ مجھے دنیا کو غیر اللہ کی عبادت، اطاعت اور غلامی سے نجات دلانا چاہئے۔ اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ وہ ماضی کے حالات کا اعتراف کرے بلکہ وہ یہ کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا کہ میں ماضی میں بہت حقیر تھا۔ اسی طرح سوچا کرتا تھا۔ میری قوم کا کوئی روشن ماضی نہیں تھا لیکن آج میں اس طرح سوچتا ہوں۔ میرے خیالات آپ سے زیادہ بلند ہیں۔ اسے کہتے ہیں شخصیت

(تشخص)۔ کیا کوئی اور کلمہ ایسا ہے جو کلمہ لا الہ الا اللہ سے بڑھ کر انسانی روح کو حماسہ اور تشخص بخشے؟ اللہ کے علاوہ کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی عبادت کی جائے، جس کی اطاعت کی جائے اور جس کی پرستش کی جائے۔ ایک آسمانی کرہ، ایک جانور، ایک پتھر، ایک درخت اس قابل کہاں ہو سکتا ہے کہ انسان اس کے آگے اس کی تعظیم میں سر جھکائے۔ میں غیر اللہ کے آگے تعظیم میں سر نہیں جھکاؤں گا۔ میں انصاف کا حمایتی ہوں، مین حق اور احسان کا حامی ہوں۔ میں فضیلت اور بزرگی کا طرفدار ہوں۔ اسے کہتے ہیں شخصیت۔

امویوں نے یہ کام کیا کہ اسلامی شخصیت کو مسلمانوں کے درمیان سے نکال بھگایا۔ کوفہ اسلامی فوج کا مرکز تھا اور اگر امامؑ حسینؑ کوفہ نہ جاتے تو آج دنیا کے تمام مورخین ان پر ملامت کرتے اور کہتے کہ عراق نے جو اسلامی فوج کا مرکز تھا آپ کو بلایا تھا، اٹھارہ ہزار لوگوں نے آپ کے نمائندہ کی بیعت کی تھی اور آپ کو بارہ ہزار خطوط روانہ کئے تھے۔ وہاں آپ کیوں نہیں گئے؟ کیا عراق سے بھی بہتر اور بالاتر جگہ ہو سکتی تھی؟ اصل میں کوفہ وہ شہر ہے جو آغاز اسلام میں لڑی جانے والی لڑائیوں کے بعد حضرت عمرؓ کے حکم سے اسلامی فوج کے ذریعے بسایا گیا۔ اس وقت اہل کوفہ اور عراق سے زیادہ بہادر اور جنگجو آدمی نہیں ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہی لوگ جن میں اٹھارہ ہزار بیعت کرنے والے تھے اور بارہ ہزار خطوط لکھے تھے جیسے ہی پسر زیاد نظر آیا سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیوں؟ کیونکہ زیاد بن ابیہ نے کوفہ میں برسوں حکومت کی تھی۔ اس نے اتنی آنکھیں نکلوائی تھیں، اتنے ہاتھ پاؤں کٹوائے تھے، اتنے پیٹ پھڑوائے تھے اور اتنے لوگوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا تھا کہ ان لوگوں کو اپنی شخصیت کا احساس ہی بالکل جاتا رہا تھا، لہذا انہوں نے جب سنا کہ پسر زیاد آ گیا ہے تو بیوی اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر مسلم بن عقیل کے سامنے سے گھسیٹ کر

لے گئی۔ ماں نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر، بہن نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اور باپ نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر مسلم سے الگ کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ کوفہ کے لوگ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے شیعہ تھے اور امام حسینؑ کو ان کے شیعوں نے ہی قتل کیا ہے۔ لہذا اس زمانے میں لوگ یہ بھی کہتے تھے: "قلوبهم معه و سيوفهم عليه"(۱) کیونکہ امویوں نے مسلمان قوم کی شخصیت کچل ڈالی تھی جس کے بعد کوئی شخص اپنے اندر اسلامی جذبہ نہیں پاتا تھا۔

لیکن اسی کوفہ نے تین سال کے بعد انقلاب برپا کر دیا اور اسی کوفہ سے پانچ ہزار توبہ کرنے والے انسان اٹھ کھڑے ہوئے۔ حسین بن علیؑ کی قبر پر گئے اور وہاں انہوں نے عزاداری کی، روئے اور خدا کی درگاہ میں اپنے کئے ہوئے قصور سے توبہ کی اور کہنے لگے: جب تک خون حسینؑ کا بدلہ نہیں لیں گے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے، یا بدلہ لیں گے یا مارے جائیں گے۔ انہوں نے اسی بات پر عمل کیا اور کربلا کے قاتلوں کو قتل کیا۔ اس تحریک کی ابتدا عاشور کے وقت سے اور بارہ محرم کی تاریخ سے ہوئی۔ یہ کام کس نے کیا؟ حسین بن علیؑ نے۔ کسی قوم کو تشخص عطا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے عشق اور آئیڈیل دے دیا جائے اور اگر اس کے پاس عشق اور آئیڈیل ہوگا تو چہرے پر اٹے ہوئے گرد و غبار بھی دور کر دے گی اور دوبارہ زندہ ہو جائے گی۔ حسین ابن علیؑ اپنی باتوں اور تقریروں میں چونکہ نیکی کا حکم اور بدی کی ممانعت کرتے ہیں ان کی گفتگو یہ ہے: " و على الاسلام السلام اذ قد بليت الامّته براع مثل يزيد"(۲)

۱۔ مقتل المقرم صفحہ ۲۰۳، تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۲۱۸، کامل ابن اثیر جلد ۶ صفحہ ۱۶، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۱۸، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۲ صفحہ ۱۹۵، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۳۲، - ان کے دل ان (امام حسین علیہ السلام) کے ساتھ تھے اور ان کی تلواریں ان کے خلاف تھیں۔

۲۔ اللہوف صفحہ ۱۱، فی رحاب ائمہ اہل البیت جلد ۳ صفحہ ۴۷، جب قوم یزید جیسے شخص کی سرپرستی اور چوپانی میں آگئی تو اسے اسلام کو خدا حافظ کہہ دینا چاہیئے۔

"انّی لم اخرج اشراً و لا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً و انّما خرجت لطلب الاصلاح فی امّته جدّی"(۱) بیس تیس سال کے بعد جب یہ باتیں بھلائی جا چکی تھیں حسین ابن علیؑ ایک مصلح اور ایک اصلاح طلب شخص کے نام سے جسے مسلمان قوم کی اصلاح کرنی چاہئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے لوگوں کو عشق اور آئیڈیل عطا کیا۔ کسی قوم کے حماسہ (شخصیت) کے زندہ ہونے کا پہلا مرحلہ یہی ہوتا ہے۔ قوم کی شخصیت ایسی ہوتی ہے جس میں استغناء اور بے نیازی کا جذبہ پایا جائے۔ یہ وہ سبق ہیں جو حسین ابن علیؑ کے قیام (اٹھ کھڑے ہونے) سے سیکھنا چاہئیں۔ آپ نے لوگوں کو استغناء اور بے نیازی کا جذبہ عطا کیا۔ جس دن آپ مکہ سے سفر کرنے کو ہیں آپ اپنے قیام کو ذرا سا بھی مشروط نہیں کرتے۔ اور یوں فرماتے ہیں۔ "خطّ الموت على ولد آدم"(۲) اور تقریر کے آخر میں فرماتے ہیں: "فمن كان فينا باذلاًمهجته موطناً على لقاء الله نفسه فليرحل معنا فانّني راحل مصبحاًانشاء الله تعالى."(۳)

(جو کوئی جان دینے اور ہمارے لئے اپنا خون دل ہمارے طریقہ پر بہانے کو تیار ہے اور جس نے خدا سے ملاقات کا تہیہ کر لیا ہے کل صبح میرے ساتھ چلے کیوں کہ میں انشاء اللہ تعالی صبح جا رہا ہوں) اس کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں ہے۔ دنیا میں اس استغناء کی مثال نہیں ملتی۔

۱۔ مقتل الحسین مقرم صفحہ ۱۵۶، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۸۹، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۱ صفحہ ۱۸۸، لمعہ من بلاغہ الحسین صفحہ ۶۴، مقتل العواصم صفحہ ۵۴، نفس المہموم صفحہ ۴۵، ملحقات احقاق الحق جلد ۱۱ صفحہ ۷۰۲، میں نے جاہ طلبی اور کسی منصب کے حصول کے لئے خروج نہیں کیا ہے بلکہ میں صرف اس کے لئے نکلا ہوں کہ اپنے جد کی قوم کی خرابیاں دور کر دوں۔

۲-۳ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۶۶، اللہوف صفحہ ۲۵، نفس المہموم صفحہ ۱۰۰، مقتل خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۵، ملحقات احقاق الحق جلد ۱۱ صفحہ ۵۹۸، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۲۹

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ عاشور کی رات ہے، اپنے اصحاب اور اہل بیتؑ کو اکٹھا کرتے ہیں۔ پہلے ان کی تعریف کر کے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ پھر ان سے فرماتے ہیں: تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں تم سب کا ممنون اور شکر گزار ہوں لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ دشمنوں کو تم سے کوئی غرض یا تعلق نہیں ہے۔ اگر تم جانا بھی چاہو گے تو وہ تمہیں روکیں گے نہیں۔ چونکہ تم نے میری بیعت کی ہے میں نے تمہارے کندھوں پر سے اپنی بیعت کا بوجھ اٹھا لیا ہے اور اب تم میری بیعت کے بھی پابند نہیں ہو۔ جو جانا چاہتا ہے وہ آزاد ہے۔ حسین ابن علی علیہ السلام اپنے اہل بیتؑ اور اصحاب سے بھی، جن کے بارے میں کہہ چکے ہیں کہ ان سے بہتر اور باوفا لوگ میں نے نہیں دیکھے، اس قدر استغناء ظاہر کرتے ہیں اور ہرگز ہرگز اس قسم کی باتیں نہیں کرتے کہ مجھے اکیلا نہ چھوڑو، میں پردیسی ہوں، مظلوم ہوں، بے سہارا ہوں، لیکن دین خدا کی طرف سے عائد فریضہ ختم نہیں کرتے۔ اس لئے جن لوگوں سے اتمام حجت کر رہے تھے اگر ان میں رہنے کی خواہش نہ پاتے تو ان سے ضرور کہتے کہ اس منظر سے دور چلے جاؤ۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم عذاب الہی میں گرفتار ہو جاؤ۔ کیونکہ اگر میں کسی سے مدد چاہوں اور وہ میری مدد طلبی کی آواز سن کر بھی میری مدد نہ کرے تو خدا اسے جہنم کے عذاب میں مبتلا کریگا۔ استغناء کا یہ سبق کوئی چھوٹا سبق نہیں تھا۔ یہی استغنا تھا جس نے بعد میں استغناء کی ذہنیت کو جنم دیا اور پھر کتنے ہی قیام اور تحریکیں وجود میں آئیں۔

حسین بن علیؑ نے لوگوں کو غیرت کا سبق دیا۔ لوگوں کو تحمل اور بردباری کا سبق دیا۔ لوگوں کو مصیبتیں اور سختیاں جھیلنے کا سبق دیا۔ یہ مسلمان قوم کے لئے بہت بڑے سبق تھے۔ پس جو لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ حسین ابن علیؑ نے کیا کیا اور کیسے ہوا جو دین اسلام زندہ ہو گیا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ حسین ابن علیؑ نے اس میں تازہ

روح پھونکی، خونوں میں جوش پیدا کیا، غیرتوں کو ابھارا، لوگوں کو عشق اور آئیڈیل عطا کیا، لوگوں میں استغناء کا جذبہ بیدار کیا، لوگوں کو صبر، تحمل، بردباری اور مقابلہ اور مصیبتوں کے مقابلے میں ثابت قدمی کا سبق دیا، ان کا خوف دور کیا۔ وہی لوگ جو اس قدر ڈرتے تھے بہادر اور دلیر لوگوں کی جماعت میں تبدیل ہو گئے۔

یہ ایک مشہور واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ: نادر شاہ نے اپنی ایک لڑائی میں ایک سپاہی کو غیر معمولی طور پر دلیر اور بہادر پایا اور اس کی دلیری اور شجاعت پر تعجب کیا۔ ایک دن اسے طلب کیا اور کہا کہ تو جو اس قدر شجاع اور دلیر ہے اس دن کہاں تھا جب افغانوں نے حملہ کر کے اصفہان میں غارت گری کی تھی؟ وہ بولا میں اصفہان میں ہی تھا۔ اس نے کہا تو اصفہان میں تھا۔ پھر بھی افغانی چڑھ آئے اور انہوں نے قتل و غارت گری کی؟ وہ بولا ہاں میں تھا۔ نادر نے پوچھا پھر اس روز تیری بہادری کہاں چلی گئی تھی؟ وہ بولا اس دن نادر نہیں تھا۔ مجھ میں آج جو بہادری ہے وہ نادر کی روح کی بدولت ہے، میں جب آپ کو دیکھتا ہوں میری غیرت کو جوش آتا ہے اور میں بہادر اور دلیر ہو جاتا ہوں۔

میں جو اصرار کرتا ہوں کہ حسینی حماسہ اور کربلا اور عاشور کے سانحے کو زیادہ تر اسی پہلو سے دیکھنا چاہئے کہ یہ اپنے اندر بڑے اسباق لئے ہوئے ہے، جو یہ قیام ہمیں سکھا سکتا ہے۔ میں مرثیے اور سوگ کا مخالف نہیں ہوں لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ سوگ اور مرثیہ اس شکل میں ہو کہ ساتھ ساتھ ہمارے وجود میں امام حسینؑ کی قہرمانی کے حس کو متحرک اور زندہ کرے۔ امام حسینؑ ایک بڑی اجتماعی پھانس ہیں۔ اس زمانے میں بھی حسین بن علیؑ ایک بڑی پھانس تھے۔ جو شخص ظلم کے مقابلے پر کھڑا ہونا چاہتا تھا اس کا نعرہ "یا لثارات الحسین" (۱) ہوتا تھا۔ آج بھی حسین ابن علیؑ

۱۔ مسند الامام الرضا جلد اول صفحہ ۱۴۸، عیون الاخبار الرضا جلد ۱ صفحہ ۲۹۹

ایک بڑی پھانس ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے چبھن، نماز قائم کرنے کے لئے، اسلام کو زندہ کرنے کے لئے، اس کے لئے کہ ہمارے وجود میں اسلام کے عالی جذبات اور احساسات زندہ ہو جائیں۔

اگرچہ اس بارے میں مجھے اور بھی باتیں عرض کرنا ہیں لیکن میں اپنے معروضات اسی مقام پر ختم کرتا ہوں اور اس آیت کی طرف پلٹتا ہوں جو میں نے ابتدا میں تلاوت کی تھی۔ یہ عجیب آیت ہے۔: "یا ایها الذین آمنوا استجیبوا للّٰه و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم."(۱)

اے لوگو! پیغمبرؐ کی یہ دعوت قبول کرو۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں زندہ کریں۔ قوم کی زندگی زیادہ دولت رکھنے میں نہیں ہے۔ علم میں بھی نہیں ہے۔ علم بھی اکیلا کافی نہیں ہوتا جو قوم کو زندہ رکھ سکے بلکہ قوم کی زندگی اس میں ہے کہ وہ قوم اپنے اندر تشخص محسوس کرے۔ دنیا کی بہت سی قومیں شخصیت نہیں رکھتیں اور بہت سی جاہل قوموں نے اپنا تشخص برقرار رکھا ہے۔ اگر الجزائری قوم ڈیڑھ سو سال کی لڑائی کے بعد فرانس کے سامراج کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر سکی اور اپنے آپ کو قائم رکھ سکی ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قوم کا ایک تشخص تھا۔ اپنے مزاج کا ایک احساس تھا۔ اگر مشرق بعید میں دوسری قوم(۲) دنیا کی سب سے قوی قوم سے لڑ سکتی ہے تو کیوں لڑ سکتی ہے؟ کیا اس کے افراد کی تعداد یا اس کی دولت لڑ سکتی ہے؟ !ہرگز نہیں! اس قوم کی شخصیت اور مزاج کا احساس لڑتا ہے۔ وہ کہتی ہے۔ میں تجھے اپنا آقا تسلیم نہیں کر سکتی۔ میں زندہ رہوں تو اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اور کوئی مجھ پر حکومت نہ کرے۔ ورنہ میں باقی ہی نہ رہوں، مٹ جاؤں۔

۱۔ سورۂ انفال آیت ۲۴

۲۔ قوم ویت نام مراد ہے

حسینی حماسہ میں جس نے سب سے زیادہ یہ سبق سیکھا اور جس کی پاکیزہ روح پر حسینی عکس سب سے زیادہ پڑا وہ آپ کی عظیم بہن حضرت زینب سلام اللہ علیہا تھیں۔ درحقیقت یہ عجیب موضوع ہے۔ حضرت زینبؑ کی اس عظمت کے باوجود جو انہیں پہلے سے حاصل تھی اور جو انہوں نے حضرت زہراؑ کے آغوش اور حضرت علیؑ کی تربیت سے حاصل کی تھی۔ سانحۂ کربلا کے بعد کی زینب سانحۂ کربلا کے پہلے کی زینب سے مختلف ہیں۔ یعنی کربلا کے بعد کی زینب کہیں بڑی شخصیت اور عظمت کی مالک ہیں۔

ہم عاشور کی شب میں دیکھتے ہیں کہ ایک دو بار تو حضرت زینبؑ اپنے گریہ پر قابو نہیں پا سکیں۔ ایک بار تو اتنا روتی ہیں کہ امام حسینؑ کے دامن پر ہی بے ہوش ہو جاتی ہیں اور امام حسینؑ اپنی باتوں سے جناب زینبؑ کو تسلی اور دلاسا دیتے ہیں۔ "لا یذ ہبنّ حلمك الشیطان"(۱) میری پیاری بہن! ایسا نہ ہو کہ تم پر شیطانی وسوسے غالب آجائیں اور تمہاری برداشت ختم کر دیں۔ تمہارا صبر اور تحمل ختم کر دیں۔ جس وقت امامؑ حسینؑ جناب زینبؑ سے فرماتے ہیں کہ تم ایسا کیوں کرتی ہو۔ کیا تم نے میرے جد کی موت نہیں دیکھی؟ میرے جد مجھ سے بہتر تھے، میرے والد مجھ سے بہتر تھے، اسی طرح میرے بھائی اور میری والدہ گرامی مجھ سے بہتر تھیں۔ تو جناب زینبؑ امامؑ حسینؑ سے یوں کہتی ہیں: بھیا! جب وہ سب چلے گئے تھے تو آپ میری آخری پناہ گاہ تھے۔ اب آپ کے جانے کے بعد میری کوئی پناہ گاہ نہیں رہے گی لیکن جیسے ہی عاشور کا دن ڈھلتا ہے جناب زینبؑ امام حسینؑ کو ایک طاقتور روحانیت کے ساتھ توانا اور پورے پروگرام پر عامل دیکھتی ہیں تو حضرت زینبؑ اس قدر بدل جاتی ہے کہ پھر ان کے سامنے کسی کی ادنیٰ ترین شخصیت بھی باقی

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۱۳۳۔ مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۶۲، اللہوف صفحہ ۷۶

نہیں رہتی۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا۔ ہم بارہ آدمی تھے اور ہم بارہ کے بارہ آدمیوں کو ایک ہی زنجیر میں باندھ دیا تھا جس کا ایک سرا میرے بازو میں اور دوسرا سرا میری پھوپھی زینبؑ کے بازو میں بندھا تھا۔

کہتے ہیں کہ شام میں قیدی صفر کی دوسری تاریخ کو پہنچے ہیں۔ اس حساب سے جناب زینبؑ کی قید کو بائیس دن گذر چکے ہیں۔ انہوں نے بائیس دن کی مسلسل تکلیف اٹھائی ہے۔ اس حالت میں ان کو یزید بن معاویہ کے دربار میں لے جاتے ہیں۔ یزید کا کاخ اخضر یعنی سبز محل جو معاویہ نے شام میں بنوایا تھا اتنا شاندار تھا کہ ہر شخص اس دربار، اس ٹھاٹ باٹ، رعب اور دبدبے کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتا تھا۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ لوگ سات بڑے بڑے ہال سے گذر کر اس آخری ہال تک پہنچ پاتے تھے۔ جس میں یزید ایک سجے ہوئے اور جڑاؤ تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور تمام امرأ و رؤسأ اور غیر ملکوں کے بڑے بڑے ایلچی بھی سونے یا چاندی کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان قیدیوں کو ایسے حالات اور ماحول میں وہاں لے جاتے ہیں۔ قیدی، دکھیا اور دکھ کی ماری جناب زینب کی روح میں اس وقت ایسا طوفان اٹھا اور انہوں نے لوگوں میں وہ ہیجان پیدا کر دیا کہ یزید جو فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا اس کی سٹی گم ہو گئی اور زیر لب ابن زبعری کے اشعار گنگنا رہا تھا اور اس موقع پر جو اسے نصیب ہوا تھا فخر کر رہا تھا کہ جناب زینب کی آواز بلند ہوتی ہے :

"اظننت یا یزید حیث اخذت علینا اقطار الارض و افاق السماء فاصبحنا نساق کما تساق الاساری انّ بنا علی اللّٰہ هواناً و بك علیه کرامته"(۱)

۱۔ اے یزید کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو نے زمین کی وسعتیں اور آسمان کی چاروں سمتیں ہم پر تنگ کر دی ہیں اور یہ تیرے لئے خدا کی طرف سے ایک عطیہ اور ہمارے لئے ذلت و خواری ہے۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۱۳۳۔ مقتل الحسین مقرم صفحہ ۴۶۲، اللہوف صفحہ ۷۶

اے یزید! تو نے اپنے دماغ میں یہ ہوا بھر لی ہے "شمخت بانفك"(۱) : تو سوچتا ہے کہ آج جو تو نے ہمیں قید کر لیا ہے اور تو نے ہم پر زمین کی تمام وسعتیں تنگ کر دی ہیں۔ ہم تیرے نوکروں کے قبضے میں ہیں تو گویا تیرے لئے یہ خدا کی طرف سے ایک نعمت اور بخشش ہے؟ خدا کی قسم تو اس وقت میری نظر میں بہت ہی چھوٹا، حقیر اور بہت کمینہ ہے اور میں تیری ذرہ برابر شخصیت کی بھی قائل نہیں ہوں۔ آپ لوگ سمجھ لیجئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان اور روحانی شخصیت کے علاوہ اپنی ہر چیز لٹا دی ہے۔ اس وقت آپ یہ امید نہ کریں کہ جناب زینبؑ کی شخصیت کی مانند کوئی اور شخصیت ایسا حماسہ پیدا کر دیگی اور شام میں ہل چل مچا دے گی؟ اسی طرح کی ہل چل جیسا کہ انقلاب وجود میں لاتا ہے۔

یزید مجبور ہو گیا کہ اسی ملک شام میں وہ اپنا رویہ بدل ڈالے اور قیدیوں کو عزت کے ساتھ مدینہ بھیج دے۔ پھر اس عمل اور اس سانحے سے اپنی لاتعلقی ظاہر کرے اور کہے خدا ابن زیاد پر لعنت کرے، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنے آپ ایسی حرکت کی۔ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ زینبؑ نے یہ کام کیا کہ اپنے آخری جملوں میں یوں فرمایا: " یا یزید کد کیدك واسع سعیك ناصب جهدك فواللّٰہ لا تمحو ذکرنا ولا تمیت وحینا"(۲) زینب سلام اللہ علیہا اس شخص سے خطاب کرتی ہیں جسے لوگ ہزار خوف اور لرزشوں کے ساتھ "یا امیر المومنین" کہتے ہیں کہ : اے یزید! میں تجھ سے کہتی ہوں کہ تو جو چال چلنا چاہے چل اور جو کام کرنا چاہے کر لے لیکن یقین رکھ کہ اگر تو یہ چاہے کہ ہمارا نام دنیا سے مٹا دے تو ہمارا نام مٹنے

۱۔ اے یزید کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو نے زمین کی وسعتیں اور آسمان کی چاروں سمتیں ہم پر تنگ کر دی ہیں اور یہ تیرے لئے خدا کی طرف سے ایک عطیہ اور ہمارے لئے ذلت و خواری ہے۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۱۳۳۔ مقتل الحسین مقرم صفحہ ۴۶۲، اللہوف صفحہ ۷۶

۲۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۱۳۵، اللہوف صفحہ ۷۷

والا نہیں ہے جو مٹنے اور فنا ہونے والا ہے وہ تو ہے۔

حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے اس دربار میں وہ خطبہ دیا کہ یزید خاموش ہو گیا اور اس لعین اور شقی کا سارا وجود ایک دم غصہ میں آگیا اس نے جناب زینبؑ کا دل جلانے اور زبان بند کرانے کے لئے اور اس لئے کہ جناب زینبؑ بے چین ہو جائیں نہایت بزدلی کا کام کیا اور اپنی بید کی چھڑی سے لاعبداللہ کے ہونٹوں اور دندان کو چھیڑا۔

لا حول و لا قوّۃ الاّ باللّٰہ العلی العظیم

و صل اللّٰہ علیٰ محمد و آلہ الطّاھرین

۳ حسینی تحریک کا تبلیغی عنصر

پہلی مجلس

تبلیغ کا مطلب

اعوذُ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

"الّذین یبلّغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احداً الّا اللہ وکفیٰ باللہ حسیباً"(۱)

جس طرح انسان کی گفتگو، پھیلاؤ یا پیچیدگی کے لحاظ سے یعنی اس لحاظ سے کہ پرجوش، سادہ اور ایک معنی رکھنے والی ہو۔ یا کئی کئی معنی، پہلو اور ظاہر و باطن رکھنے والی ہو، مختلف قسم کی ہوتی ہے، اسی طرح انسانی نہضت اور حرکات کی بھی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ ہماری گفتگو عموماً دو قسم کی ہوتی ہے۔ وہ بات چیت جس کے ایک معنی ہوتے ہیں اور وہ بات جو پہلو دار ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی آیتیں اس کی بہترین

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

مثال ہیں۔ قرآن مجید کی آیات دو قسموں میں تقسیم ہیں۔ آیات محکمات اور آیات متشابہات۔ آیات محکمات وہ آیات ہیں جو لفظ اور عبارت کے لحاظ سے صرف ایک معنی رکھتی ہیں یعنی ان کی عبارتوں سے ایک معنی مطلب سے زیادہ مراد نہیں لے سکتے۔ لیکن آیات متشابہات وہ آیات ہیں جن سے بیک وقت کئی کئی معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ البتہ اس غرض سے کہ ملتے جلتے معنوں میں کوئی غلطی نہ ہو ہم آیات محکمات کو معیار بناتے ہیں کیونکہ آیات محکمات ہی "ام الکتاب" ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ انسانی نہضت اور حرکات کا بھی یہی حال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی تحریک کے ایک معنی اور ایک ہی مقصد ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ متشابہ ہو یعنی اس کے بیک وقت کئی کئی مقاصد اور مختلف اہداف ہوں اگرچہ ان سب مقاصد اور اہداف کا مرکز ایک بنیادی اور اصلی ہدف ہو۔ ایک تحریک میں بیک وقت کئی کئی پہلو اور کئی کئی رخ پہلو ہو سکتے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کی تحریک میں کئی مقاصد اور کئی پہلو ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تحریک کی مختلف تعبیریں اور تفسیریں کی گئی ہیں۔ اس میں کئی متوازی عناصر داخل ہیں۔ جب ہم بعض عوامل اور عناصر کے لحاظ سے اس تحریک پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں ایک جابر حکومت اور حاکم وقت کے نا درست تقاضوں کے مقابلے میں انکار اور بغاوت معلوم ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ تحریک ایک انکار، نفی اور انحراف ہے۔ وہ پہلو یہ ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں معاویہ کے مرنے اور یزید کے جانشین ہونے کے بعد اور ان تمام سازشوں اور اسکیموں کے بعد جو اس کام کے لئے عمل میں لائی گئیں، یزید نے یہ ضروری جانا کہ دنیائے اسلام کی چند بڑی بڑی ہستیوں سے جن میں سر فہرست حسین بن علی علیہ السلام تھے اور جو اس

سے بہت زیادہ باز پرس کر سکتے تھے بیعت لے لے۔ تاکہ اس بیعت سے عوام خاموش ہو جائیں۔ اور حقیقت میں حسین ابن علی علیہ السلام سے اپنے حق میں ضمانت اور تحریری گارنٹی لے لے۔

معاویہ کی موت کے فوراً بعد یزید نے شام سے حاکم مدینہ "ولید بن عتبہ بن ابی سفیان" کے نام جو اس کا چچیرا بھائی تھا ایک خط لکھا اس میں معاویہ کے مرنے اور باپ کی جگہ اپنے بیٹھنے کی اطلاع دی۔ ایک الگ خط میں چند لوگوں کے نام لکھے جن میں سر فہرست حسین بن علیؑ کا نام تھا کہ ان سے یزید کیلئے بیعت ضرور حاصل کی جائے۔ امامؑ حسین علیہ السلام بیعت کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے (اس کا واقعہ آپ نے بھی بار بار سنا ہوگا) وہ چند دن تک مدینے میں ٹھہرے اور چونکہ یہ جانتے تھے کہ یہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں اپنے اہل بیت اور خاندان کو لیکر بیت الحرام کے لئے مکہ کو روانہ ہو گئے۔ ماہ رجب کی آخری دہائی تھی جب معاویہ کے مرنے کی خبر مدینہ پہنچی اور امام حسین علیہ السلام سے بیعت کا تقاضا کیا گیا۔

شاید ۲۷ رجب کے آس پاس امام حسین علیہ السلام مکہ کو روانہ ہوئے اور شعبان کی تیسری تاریخ کو جو آپ کا یوم پیدائش بھی ہے مکے میں داخل ہوئے، ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ تک مکہ میں قیام کیا۔ بہر حال آپ بیعت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کیلئے کسی طرح تیار نہیں ہوئے۔ یہ (انکاری جواب) آپ کا ایک بیان ہے ایسا بیان جو اس تحریک کو ایک مخصوص ماہیت عطا کرتا ہے اور وہ ماہیت حاکم وقت کی جابرانہ قوت کے سامنے عدم قبول اور انکار کی ہے۔

اس تحریک میں جو ایک اور عنصر دخل رکھتا ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر ہے جس کی قطعی وضاحت خود حسین ابن علی علیہ السلام نے اپنے کلمات میں کر دی ہے جن میں بہت سی دلیلیں اور ثبوت بھی موجود ہیں۔ یعنی فرض کیجئے وہ

لوگ آپ سے بیعت طلب نہ بھی کرتے تب بھی آپ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔

ایک اور عنصر اتمام حجت کا عنصر ہے۔اس وقت اسلامی دنیا کے تین بڑے بڑے اور طاقتور مراکز موجود تھے۔ مدینہ جو پیغمبر اکرمؐ کا دارالہجرت تھا، شام جو دارالخلافت تھا اور کوفہ جو اس سے پہلے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ مزید برآں کوفہ ایک جدید شہر تھا جو مسلمان فوجیوں کی بدولت حضرت عمر بن الخطاب کے عہد میں آباد ہوا تھا اور لوگ اسے اسلام کی چھاؤنی سمجھتے تھے اور اس لحاظ سے وہ شام کی برابری کرتا تھا۔ یہ اطلاع پانے کے بعد کہ امام حسین علیہ السلام یزید کی بیعت کرنے پر قطعی آمادہ نہیں ہیں (کوفہ کے لوگوں کی جانب سے یعنی دنیائے اسلام کی چھاونی سے) تقریباً اٹھارہ ہزار خطوط پہنچتے ہیں جن میں وہ امام حسین علیہ السلام کو بتاتے ہیں کہ اگر آپ کوفہ آجائیں تو ہم لوگ آپ کا ساتھ دیں گے۔ یہاں امام حسین علیہ السلام اپنے آپ کو تاریخ کے دوراہے پر پاتے ہیں۔اگر ان لوگوں کے بلاوے کا جواب نہیں دیتے تو تاریخ کو جواب دہ ہونگے اور مستقبل کی تاریخ یہ فیصلہ کریگی کہ حالات غیر معمولی طور پر سازگار تھے لیکن امام حسینؑ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکے یا ڈر گئے وغیرہ وغیرہ۔ امام حسین علیہ السلام اتمام حجت کے لئے ان کے بلاوے کا جواب دیتے ہیں جنہوں نے آپؑ کی طرف ہاتھ پھیلایا تھا جس کی تفصیل ہم بار بار سن چکے ہیں۔ اس مقام پر اس تحریک کی ماہیت، شکل اور رنگ ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔

اس حرکت کا ایک اور پہلو، تبلیغی پہلو بھی ہے یعنی یہ تحریک اگر چہ امربالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، اگر چہ اتمام حجت ہے (اور اگر چہ حاکم وقت کی جابرانہ قوت کے سامنے نہ جھکنا بھی ہے) ایک تبلیغ اور پیغام رسانی بھی ہے۔ اسلام کو

پہچنوانا اور اس کا تعارف کرانا بھی ہے۔

ہم اپنی گفتگو شروع کرنے کے لئے تبلیغ کے معنی کی ذرا وضاحت کرلیں اور خصوصیت کے ساتھ اس کا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق بھی بیان کردیں تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنصر کے علاوہ تبلیغی عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ کلمہ تبلیغ قرآن مجید میں اکثر استعمال ہوا ہے۔ قرآن کریم میں خدا کے پیغمبروں کو رسالات الٰہی کے مبلغان کہا گیا ہے لیکن یہ بات صرف پیغمبروں تک محدود نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بھی تبلیغ ہے۔ مثلاً قرآن پیغمبروں کی زبان سے نقل کرتا ہے کہ: "یا قوم لقد ابلغتکم رسالة ربّی ونصحتُ لکم ولٰکن لا تحبّون الناصحین" (۱) یا پیغمبروں کے بارے میں کہتا ہے: "ما علی الرّسول الّا البلاغ"(۲) غرض یہ ہے کہ لفظ "بلاغ"، "تبلیغ"، "یبلغون" اور اس مادے سے مشتق ہونے والے اور دوسرے الفاظ بھی قرآن مجید میں بہت استعمال ہوئے ہیں۔ اس لفظ کے معنی کیا ہیں؟ بد قسمتی سے آج کل کے استعمال میں اس لفظ کے معنی منحوس تحریر یعنی نفرت اور نحوست کے معنی ہوگئے ہیں جس طرح آج ہماری فارسی زبانوں میں تبلیغ نے (یعنی سچ اور جھوٹ کام کرنا اور دراصل دھوکے بازی اور لوگوں کا مال مارنا) دھوکا دہی کا مفہوم اختیار کرلیا ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص کسی موضوع کے بارے میں کچھ کہتا ہے اور یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے تو کہہ دیتا ہے جناب یہ سب تبلیغات ہیں، سب جھوٹ اور فریب کاری ہے۔ اسی لئے ہم کبھی یہ دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ دینی معاملات میں اس کلمے کو استعمال کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ لیکن میں نے یہی بات ایک اور جلسے میں اپنے ساتھیوں سے

۱۔ سورۂ اعراف آیت ۷۹

۲۔ سورۂ مائدہ آیت ۹۹

کہی کہ اگر کوئی کلمہ صحیح معنی رکھتا ہے وہ صحیح معنی قرآن مجید اور نہج البلاغہ کے استعمالات میں آئے ہیں تو ہمیں اس جرم کے باعث کہ اس کے معنی میں تحریف ہوگئی ہے اس کلمے کو سزا نہیں دینی چاہئے، بلکہ ہمیں ہمیشہ لوگوں کو اس کے صحیح معنی بتانے چاہئیں۔

"تبلیغ" معنی کے لحاظ سے وصول اور ایصال کے قریب ہے۔ عربی زبان میں بہت سے موقعوں پر کچھ ایسی لطیف اور ظریف باتیں ہوتی ہیں جو ہم اپنی فارسی زبان میں، باوجویکہ وہ بہت میٹھی اور وسیع ہے، نہیں پاتے۔ عربی زبان میں لفظ "ایصال" بھی ہے اور لفظ "ابلاغ" بھی۔ ایصال کے معنی کیا ہیں؟ مثلا ہم یہ کہیں کہ میں نے کپڑا "ایصال" کردیا یعنی پہنچادیا، تو فارسی میں ابلاغ کے معنی کیا ہیں؟ اگر ہم کہیں کہ میں نے فلاں چیز کو ابلاغ کردیا اور پھر کہیں کہ پہنچادیا۔ فارسی میں دونوں موقعوں پر لفظ پہنچنا اور لفظ "پہچانا" استعمال ہوگا لیکن عربی زبان میں "ایصال" کو "ابلاغ" کی جگہ استعمال نہیں کر سکتے اور "ابلاغ" کو "ایصال" کی جگہ نہیں بول سکتے۔ "ایصال" عام طور پر کسی چیز کو کسی شخص تک یا کسی مقام تک پہنچانے کے لئے ہوتا ہے یعنی جسمانی اور مادی موقعوں پر کام آتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اور شخص کو کوئی پیکٹ پہنچانا چاہتا ہے تو اس کے لئے لفظ "ایصال" کام میں لائیں گے یا جب کوئی آپ کے سامنے کوئی امانت رکھتا ہے (مادی امانت) اور آپ یہ امانت اس تک پہنچادیتے ہیں تو یہاں کہیں گے کہ امانت اس کے مالک کو ایصال کردی۔

لیکن ابلاغ کوئی خیال یا کوئی پیغام پہنچانے کے موقعے پر بولا جاتا ہے۔ یعنی کسی شخص کے خیال، روح، ضمیر یا دل تک کوئی چیز پہنچانے کے موقع پر کام آتا ہے۔ اس لئے ابلاغ کسی مادی یا جسمانی امر پر مشتمل نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ امر یقیناً معنوی یا روحانی ہو سکتا ہے۔ ایک خیال اور ایک احساس ہوسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام طور پر

ابلاغ کو پیاموں، سلاموں وغیرہ کے متعلق بولتے ہیں۔ کہتے ہیں: پیام کا ابلاغ کردیا۔ سلام کا ابلاغ کردیا، جب پیام یعنی خیال کا ابلاغ کرتا ہے تو کوئی پیغام دوسروں تک پہنچاتا ہے اور جب سلام کا ابلاغ کرتا ہے، جذبات کا ابلاغ کرتا ہے، عشق کا ابلاغ کرتا ہے۔ ان باتوں کے موقع پر لفظ تبلیغ اور "ابلاغ" بولتے ہیں۔ اور قرآن کریم نے اس لفظ کو رسالات کے متعلق جن کا مطلب پیغامات ہے استعمال کیا ہے۔

چنانچہ تبلیغ کا مطلب ہوا ایک شخص کا پیام دوسرے شخص کو پہنچانا۔ پیامبر اور پیغامبر کا لفظ جو فارسی زبان میں آیا ہے لفظ "رسول" کا ترجمہ ہے جس کے معنی ہیں رسالت کا ابلاغ کرنے والا۔ لفظ "رسالت" ان لفظوں میں شامل ہے جنہوں نے اپنے اندر خوبی پیدا کرلی ہے البتہ ہم فارسی زبان والے (اور ایک حد تک عربی زبان والے) ان چیزوں کو رسالہ کہتے ہیں جو قرآن میں دیئے ہوئے "رسالت" کے مفہوم سے مختلف ہیں۔ عموماً چھوٹے چھوٹے کتابچوں اور چھوٹی چھوٹی تصنیفات (یا تحریروں) کو جن کی ضخامت ایک کتاب کے برابر نہیں ہوتی رسالہ کہتے ہیں۔ حالانکہ رسالے کے موضوع کا کسی پیام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً فرض کیجئے ایک شخص کسی لفظ کے مادّے کے بارے میں، فارسی زبان کے یا عربی زبان کے کسی قاعدے کے بارے میں کوئی کتابچہ لکھتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے حالانکہ یہ نام اس موضوع (مثلاً لفظ کے مادّے) سے میل نہیں کھاتا۔

"رسالہ" اس جگہ کام آتا ہے جہاں پیام کا استعمال ہو لیکن جس شخص نے کوئی علمی یا ادبی مسئلہ حل کیا ہے تو اس نے کسی کو کوئی پیام نہیں دیا ہے۔ اس موقع پر اس لفظ کا استعمال مناسب نہیں ہے۔ لیکن فارسی میں "رسالت" کو آخری کلمے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلا یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص اپنی یونیورسٹی میں کوئی "رسالت" رکھتا ہے یعنی آج اس شخص کے بارے میں جو یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنی

یونیورسٹی کے متعلق یا اپنی یونیورسٹی میں کوئی فریضہ انجام دینا چاہتا ہے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک رسالت رکھتا ہے اور یہ معنی اور وہ معنی جو قرآن میں کلمہ "رسالت" کے لئے گئے ہیں ایک نہ بھی ہوں باہم بہت قریب ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ مفہوم قرآن کے مفہوم "رسالت" سے بہت قریب ہے قرآن فرماتا ہے: "الّذین یبلّغون رسالات اللّٰہ و یخشونہ ولا یخشون احداً الّا اللّٰہ"(۱) جو لوگ خدا کے پیغامات لوگوں تک پہنچاتے ہیں وہ خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے۔ یہ پیغام پہنچانے والے کی عظمت کی شرط ہے اگر بعد میں بھی توفیق ہوئی تو ہم انشاء اللہ اس کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ 'ابلاغ' یا 'تبلیغ' پیغام کا پہنچانا ہے تو ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تبلیغ جو قرآن میں آیا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی قرآن میں آچکے ہیں دو الگ تھلگ مسئلے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک دوسرے سے تعلق ضرور رکھتے ہیں لیکن دو جدا مسئلے ہیں۔

تبلیغ شناسا کروانے (پہچان کرانے) اور اچھی طرح پہنچا دینے کا مرحلہ ہے۔ چنانچہ یہ شناخت کا مرحلہ ہے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اجراء اور عمل کے مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تبلیغ خود عام مسلمانوں کا ایک عمومی فریضہ ہے جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک عام فریضہ ہے۔ تبلیغ کے نقطۂ نظر سے ہر مسلمان پر فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی جگہ اسلام کا پیام لئے ہوئے ہے لیکن جو فریضہ ہر مسلمان پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں عائد ہوتا ہے کہ وہ محسوس کرے کہ وہ خود اس پیغام کا جاری کرنے والا اور جاری کرنے والی قوت کا ایک حصہ ہے۔ جو اس کو معاشرے میں عمل

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

اور تحقیق کے مرحلہ تک پہنچائے اور اسے عینیت (حقیقت) کا لباس پہنا دے۔ یہی وجہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک مطلب ہے اور تبلیغ کا مطلب دوسرا ہے۔ اس لحاظ سے میں عرض کرتا ہوں کہ حسینی تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پہلو۔ پرت اور سمت کے علاوہ دوسرے پہلو، پرت اور سمت بھی رکھتی ہے اور وہ تبلیغ ہے۔ اس کثیر المعنی، تہ در تہ اور پرت دار تحریک نے یہ کام انجام دیا ہے کہ اسلام کی ماہیت اور اصلیت کو جیسی بھی وہ ہے اس نے شناسا کروایا ہے۔ اسلام کا پیغام انسانی دنیا میں شناسا اور واضح کیا اور کس قدر بلاغت کے ساتھ۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا ہے سخن دو قسم کی ہوتی ہے پختہ اور صاف بات اور مبہم بات۔ آپ جانتے ہوں گے کہ دوسرے اعتبار سے سخن کی پھر دو قسمیں ہو جاتی ہیں بلیغ اور غیر بلیغ۔

علمائے اسلام عبارت کے ایک ٹکڑے کو فصیح و بلیغ کہتے ہیں۔ کیسی بات کو سخن بلیغ کہتے ہیں؟ اس بات کو جو کہنے والے کے مقصد و منشا کو حسن اور خوبی کے ساتھ مخاطب کے خیال، روح اور جذبے تک پہنچا سکے۔ وہ بات جس سے کہنے والے کا مدعا واقعی پہچانا جا سکے۔ تحریک کا بھی اسی طور ہے۔ تحریک بلیغ بھی ہو سکتی ہے۔ اور تحریک غیر بلیغ بھی ہو سکتی ہے۔

بلیغ تحریک کسی پیام کا دلوں، خیالوں اور جذبوں تک ابلاغ کرنا چاہتی ہے تو ابلاغ کر دیتی ہے اور خوبی ابلاغ کر دیتی ہے۔ اس پہلو پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ تحریک حسینی سے زیادہ بلیغ، زیادہ رساں (پہنچنے والی) اور زیادہ رسانندہ (پہنچانے والی) دنیا میں اور کوئی تحریک نظر نہیں آتی۔ یہ ایسی تحریک ہے کہ اگر آپ اسے ایک طرف سے دیکھیں تو یہ مکانی اعتبار سے پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے اور دوسری طرف سے یعنی زمانی اعتبار سے چودہ صدیوں کے بعد بھی اس کی پیغام رسانی

کی قوت اور اثر اندازی کی قوت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ بڑھ گئی ہے۔ یہ تحریک غیر معمولی طور پر توانا ہے۔

اب ہم تبلیغ کے بارے میں کچھ گفتگو کرلیں جس سے امام حسین علیہ السلام کی تحریک کے تبلیغی عناصر کی صحیح صحیح پہچان کر سکیں اور انہیں بیان کر سکیں۔ ہم تبلیغ کے معنی و مفہوم سمجھ چکے ہیں اور یہ بھی جان چکے ہیں کہ قرآن مجید نے لفظ تبلیغ پر زور دیا ہے۔ نہج البلاغہ کا ایک مشہور جملہ ہے جو انبیاءؑ کے تقرر کے فلسفے کے متعلق ہے: "فبعث فیهم رسلهٗ و واتر الیهم ابنیائه لیستأدوهم میثاق فطرته و یذکّرو هم منسیّ نعمته و یحتجواعلیهم با لتبلیغ" (۱) یعنی خدا نے ایک کے بعد ایک پیغمبرؐ بھیجا۔ کس لئے؟ اول اس لئے کہ: خدا نے آدمیوں کی فطرت میں ایک تکوینی پیمان رکھ دیا ہے (وہ دین کہنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جو انسان پر لاد دیا گیا ہو بلکہ انسانی فطرت کی آواز کا جواب ہے۔ خدا نے جو عہد کیا ہے وہ کاغذ پر نہیں ہے، لفظوں میں نہیں کہا گیا ہے، آواز میں نہیں ہے، بیعت کے ساتھ نہیں ہے بلکہ تقدیر کے قلم سے ہے اور انسانوں کے خمیر اور رجع کی گہرائی میں ہے) وہ کہتا ہے پیغمبر آتے ہیں کہ لوگوں سے کہیں۔ اے لوگو! تم نے اپنی فطرت میں اپنے خدا سے جو پیمان باندھا ہے ہم تم سے صرف اسکی وفا چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔" و یذکّرو هم منسیّ نعمته" (۲) پیغمبر یاد دلانے والے ہیں۔ "و یحتجوّا علیهم بالتبلیغ" (۳) اور اس غرض سے کہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیں اور اس طرح لوگوں پر اتمام حجت کریں۔

"و یُثیروا لهم د فائن العقول" (۴) (کیسے عجیب جملے ہیں!) فرماتے ہیں: لوگوں کی سمجھ میں، لوگوں کے خیال میں، لوگوں کی روح میں، لوگوں کی باطنی

۱-۲-۳-۴۔ نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ اول حصہ ۳۶ صفحہ ۳۳

گہرائیوں میں خزانے دفن ہیں۔ لوگوں کی عقلوں میں عقلی خزانے موجود ہیں لیکن ان خزانوں پر گرد و غبار کی تہ جم گئی ہے جن سے یہ پوشیدہ ہوگئے ہیں۔ پیغمبرؐ اس لئے آئے ہیں کہ خاک کی تہوں کو دور کریں اور یہ خزانہ جو خود انسانوں کے اندر موجود ہے انہیں دکھائیں۔ ہر شخص کی روح میں ایک خزانہ موجود ہے لیکن وہ اس سے بے خبر ہے۔ پیغمبرؐ اس لئے آتے ہیں کہ وہ خزانہ دکھائیں تاکہ ہر شخص نہایت ذوق و شوق اور جذبے اور ولولے کے ساتھ اپنے اس خزانے کو باہر لانے پر آمادہ ہو جائے۔

اللہ کے پیغمبر سب کے سب اس بیان کے مطابق جو میں نے پیش کیا مبلغ ہیں۔ لیکن سب پیغمبر مشرع یعنی صاحب شریعت قانون دینے والے نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے خدا کے پیغمبر دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں: وہ پیغمبر جو مشرع بھی ہیں اور مبلغ بھی اور وہ پیغمبر جو صرف مبلغ ہیں۔ قانون ساز پیغمبر کی تعداد بہت کم ہے کل پانچ ہونگے۔ نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لیکن تمام پیغمبر خدا کے پیغامات پہنچانے والے ہیں، اسی طرح نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آچکے ہیں ہر پیغمبر انسان کے لئے قانون نہیں لایا۔ جو لوگ قانون لائے ہیں ان کی تعداد محدود ہے۔ تمام پیغمبر وہ پیغام پہنچانے والے رہے ہیں جو مشرع (صاحب شریعت) پیغمبر لائے ہیں اور انہیں تبلیغی پیغمبرؐ کہنا چاہئے۔ جس طرح پیغمبر آخرالزماں اور خاتم انبیاءؐ کے بعد کوئی مُشرع (قانون ساز) پیغمبر نہیں آئے گا اسی طرح آپ کے بعد کوئی تبلیغی (مبلغ) پیغمبر بھی نہیں آئے گا۔ لیکن مبلغ تو ہونا چاہئے۔ پھر وہ کس طرح؟ چونکہ خاتمیت کا زمانہ انسان کے کمال اور بلوغ کا زمانہ ہے اس لئے اس زمانے میں وہ کام جو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروںؑ (پانچ اولوالعزم پیغمبروں کو چھوڑ کے) انجام دیتے رہے (اور حقیقت میں خدا خود ہی انجام دیتا تھا یعنی اس کام کے لئے پیغمبرؐ مقرر کر دیتا تھا)

یعنی تبلیغ کا کام اب عام آدمیوں کو انجام دینا چاہئے، غیر از پیغمبر انجام دیں، علماء اور غیر علماء انجام دیں۔ چنانچہ اسلام کے سچے مبلغ، پیغمبر کے پیغامبر ہیں، جو پیغمبر کا پیام لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

لیکن کسی پیغام کی (موفقیت) کامیابی کی شرط کیا ہے؟ کوئی پیغام کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے؟ کیا اسلام خود کامیاب پیام رہا ہے؟ اگر رہا ہے تو اسلام کی موفقیت کامیابی کا راز کس میں ہے؟ کسی پیام کی کامیابی کے لئے چار باتیں ضروری ہیں۔ اگر یہ چاروں باتیں ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں تو اس پیام کی کامیابی یقینی ہے اور اگر یہ چاروں جمع نہ ہوں تو پھر مختلف شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

پیغام کی کامیابی کی پہلی شرط اس کا عقلی ہونا اور قوت و توانائی پر مشتمل ہونا ہے یعنی خود وہ پیام انسان کیلئے کیا لایا ہے، کہاں تک انسانی ضروریات کے مطابق ہے، کہاں تک انسانی ضروریات پوری کرتا ہے۔ انسان کی سینکڑوں ضروریات ہوتی ہیں۔ خیالی، جذباتی، عملی، اجتماعی، اور مادی ضروریات۔ پیغام نہ صرف انسانی ضروریات کی ضد میں نہ ہو بلکہ انکے مطابق اور موافق ہونا چاہئے۔ پیام اول نمبر کا منطقی ہونا چاہئے یعنی انسانی عقل وشعور کے موافق ہو اور اس وضع کا ہو کہ انسانی عقل اسے اپنی طرف کھینچے، یعنی قبول کر لے۔ اگر کوئی پیام عقل اور منطق کی ضد ہو تو اگرچہ وہ جذباتی ہو، تھوڑے عرصے کیلئے ممکن ہے قائم بھی رہے، لیکن ہمیشہ کیلئے باقی نہیں رہ سکے گا۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم ہمیشہ عقل اور سوچ بچار کی بات کرتا رہتا ہے۔ قرآن نے ہرگز عقل اور منطق کو ترک نہیں کیا ہے بلکہ ہمیشہ عقل اور منطق سے خود بھی کام لیا ہے اور لوگوں کو بھی عقل و منطق کرنے اور تعقل کی دعوت دی ہے۔

اسی طرح پیام کے غنی اور توانا ہونے کیلئے اس کا انسانی احساسات سے منطبق رکھنا ضروری ہے انسان عقلی اور فکری بھٹی کے علاوہ احساسات کی بھٹی

بھی رکھتا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ احساسات کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی اور انسان کے بلند اور نازک احساسات کی ایک حد تک تسکین، زندگی کی اور انسان کی عملی اور واقعی ضروریات کے ساتھ ہم آہنگی، پیام کے غنی ہونے کی شرائط میں شامل ہے۔ اگر کوئی پیام انسان کی فطری ضروریات کے خلاف ہوگا تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ایک حدیث ہے جس سے ہم فقہ میں بھی سند لیتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "الاسلام یعلوولا یعلی علیه" (۱) یعنی اسلام علو اور برتری پیدا کرتا ہے۔ غلبہ پیدا کرتا ہے اور کوئی شے اسلام پر فتح نہیں پاسکتی اور نہ غلبہ حاصل کر سکتی ہے۔ یہ حدیث ان حدیثوں میں سے ہے جن کو علماء اسلام کے ہر گروہ نے ایک ہی زاویۂ نظر سے دیکھا اور جن سے ایک ہی قسم کا نتیجہ اخذ کیا ہے اور واقعی یہ پیغمبرؐ اکرم کا ایک تشابہ جملہ ہے اس لحاظ سے کہ یہ پیغمبر اکرمؐ کے "جوامع الکلم" میں شمار ہوتا ہے یعنی ایک لفظ کئی کئی معنی رکھتا ہے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ: علماء فقہ نے جو ہر بات کو فقہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اسلام کے اجتماعی ضابطوں میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس کے نتیجے میں کوئی غیر مسلم کسی مسلمان پر برتری حاصل کر سکے اور اسلام ایسا قانون جاری بھی نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر کیا اسلامی معاشرے میں کوئی ایک ذمی (یہودی، مسیحی، یا پارسی) یہ مقام حاصل کر سکتا ہے کہ وہ حاکم بن جائے اور مسلمان محکوم یعنی وہ کسی مسلمان کو اپنے اختیار کے تحت رکھ سکے؟ فقیہ لوگ کہتے ہیں: "الاسلام یعلوو لا یعلی علیه" یعنی اسلام کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہنا چاہئے۔ اسلام اپنا ہاتھ نیچے رکھنا منظور نہیں کرتا اور اس اصل و حقیقت سے احکام حاصل کرتے ہیں۔

متکلمین نے مسائل پر دوسرے پہلو سے نظر ڈالی ہے اور اس حدیث پر کلام

۱۔ نہج الفصاحت صفحہ ۲۱۴ حدیث ۱۰۵۶

کے زاویۂ نظر سے غور کیا ہے (متکلم کا تعلق منطق، استدلال اور بحث و مباحثے سے ہوتا ہے) وہ کہتے ہیں: "الاسلام یعلو ولا یعلی علیه" یعنی اسلام کی منطق ہر منطق سے برتر ہے۔ چونکہ منطق اور استدلال ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں اس لئے احتجاج اور استدلال کے میدان اور منطق کی سرزمین میں اسلام کی منطق ہر منطق پر برتری اور غلبہ رکھتی ہے۔ اس حدیث کا یہ ایک اور زاویہ نظر اور پہلو ہے۔ جن لوگوں نے اس حدیث کو اجتماعی زاویہ نظر سے دیکھا ہے وہ اس مسئلے کو ایک اور شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "الاسلام یعلو ولا یعلی علیه" یعنی عمل کے دوران اسلام کو برتری حاصل ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اسلام کا قانون ہر قانون کے مقابلے میں انسانی ضروریات سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے اسی لئے عملی طور پر وہ اپنا راستہ بہتر بناتا ہے۔

انسان جب مسیحیوں کے تبلیغی اداروں پر نظر ڈالتا ہے اور ان کے پھیلاؤ، قوت، رسائل، ہتھیار، کارکن، بڑا بجٹ، ہتھکنڈے ساز و سامان اور تبلیغی تنظیمیں دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ کیا اسلام مسیحیت کے ایسے تبلیغی نظام کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ واقعی یہ عجیب بات ہے۔ جب ہم اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تبلیغی انتظام کے اعتبار سے ہم واقعی صفر ہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب تبلیغات اور مبلغین کے لحاظ سے اسلام کے برابر کمزور نہیں ہے یہاں تک کہ جب ہم یہود پر نظر ڈالتے ہیں جو تعداد میں بہت کم ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بھی کم سے کم تحریف کے اسباب سے تو کافی لیس ہیں۔ ان کا کوئی ایسا مثبت پہلو نہیں ہے جس سے یہ لوگوں کو یہودیت کی طرف بلا سکیں لیکن ان کی تخریب کاری کا پہلو بڑھا ہوا ہے یعنی دوسروں کے مکتب کو خراب کرنا۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک یہودی اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کرتا ہے کسی ایک اسلامی شعبے میں تعلیم حاصل کرتا ہے صرف اس لئے کہ

کسی یونیورسٹی کی اسلامی کرسی سنبھال لے اور وہاں بیٹھ کر اپنا کام کرے یا کوئی کتاب لکھے اور اس کتاب میں اپنے خیال نشر کرے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ (یہ بات میں نے باخبر لوگوں سے بارہا سنی ہے) دنیا بھر میں اسلام شناسی کی نوے فیصدی سے زیادہ کرسیوں پر یہودی براجمان ہیں؟ دنیا کے اسلام شناس یہودی ہیں؟! دیکھئے یہ لوگ نقصان پہنچانے کی کتنی طاقت رکھتے ہیں؟! وہ ہے مسیحیت اور یہ ہے یہودیت! آپ نے جن لوگوں کا نام چھوڑ دیا ہے۔ وہ بھٹکا ہوا سیاسی فرقہ ہے جو ہمارے ملک میں ہی موجود ہے۔ اس چھوٹے سے گروہ کو دیکھئے کہ ان کا تبلیغی نظام کتنا طاقتور ہے!

اس کے ساتھ ساتھ چند سال پہلے میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا (اخبار لوموند سے منقول تھا) کہ آخری چند سال کے اندر دنیا کے چودہ ملین آدمی مسلمان ہوگئے ہیں۔ کس کی تبلیغ سے؟ کوئی مبلغ تو تھا نہیں شاید ان کے پاس زیادہ سے زیادہ ایک ریڈیو یا ٹرانزسٹر رہا ہوگا جس سے بعض اوقات وہ عرب ملکوں کے پروگرام سن لیتے ہونگے۔ ایک باخبر انسان سے جو یورپ سے آیا ہوا تھا اس کے متعلق میری گفتگو ہوئی۔ یہ شخص جو برسوں تک یورپ میں تھا اور اس وقت بھی یورپ میں تھا کہنے لگا: میں نے فلاں مقام کے عیسائی سے بات کی تھی اس نے کہا تھا کہ لوموند کو دھوکا ہوا ہے آخری برسوں میں پچیس ملین لوگ مسلمان ہوئے ہیں اور بولا افریقہ میں دو قوتیں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں اسلام اور کمیونزم (اشتراکیت) اور عیسائیت چاہے جتنی کوشش کرے اس کی ترقی قابل توجہ نہیں ہے حالانکہ اس کا تبلیغی نظام طاقتور اور وسیع اور اسلام کا تبلیغی نظام کمزور ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں کے مشتملات میں فرق ہے۔ اس کے مشتملات توانا اور منطقی ہیں اور اس کے مشمولات جذباتی ہیں۔ جذباتی نقطۂ نظر سے بہت توانا ہیں۔ اس کے مشمولات عملی ہیں۔ اور عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے مشمولات اوپر سے تھوپے ہوئے ہیں۔ اسلام کی پہلی بات

جیسے پیاسے کے گلے میں پانی مزیدار لگتا ہے۔ عقل کہتی ہے اور اسلام عقل سے خدا اور توحید کو ثابت کرتا ہے لیکن مسیحیت کی پہلی بات یہ ہے کہ عقل کو ایک طرف رکھ دو اور پھر کہو تثلیث!

یہ دن محرم کے ہیں اور ہم نے یہ گفتگو اس لئے شروع کی ہے کہ امام حسینؑ کا پیام لوگوں تک پہنچائیں اور پھر بتائیں کہ امامؑ حسینؑ کی تحریک اسلام کی پیغام رساں کس طرح تھی۔ امامؑ حسینؑ سے کس طرح ممکن ہوا کہ انہوں نے اپنی تحریک کے ذریعے اسلام کا پیام دنیا اور دنیا والوں تک پہنچایا۔

آٹھ ذی الحجہ کو جب بڑے جوش و خروش سے حجاج مکہ میں داخل ہو رہے تھے اور حجاج جس دن منیٰ اور عرفات کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔ امام حسینؑ نے مکہ چھوڑا اور وہ مشہور و معروف خطبۂ غرا ارشاد فرمایا جو سید بن طاؤس سے نقل کیا جاتا ہے۔ منزل پر منزل طے کرتے ہوئے آپ عراق کی سرحد کے قریب پہنچ گئے۔ اب کوفہ کی کیا خبریں ہیں۔ اور وہاں کیا گزر رہی ہے یہ خدا ہی جانتا ہے۔ وہاں جناب مسلم کا عجیب اور الم انگیز سانحہ رونما ہو چکا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کو راستے میں ایک شخص نظر آیا جو کوفہ کی طرف سے آ رہا تھا۔ (عرب کی سرزمین میں ایسے راستے نہیں ہوتے کہ مسافر ایک دوسرے کے پاس سے ہو کر گزریں۔ غیر آباد علاقہ ہوتا ہے اور لوگ مخالف سمت بھی سفر کرتے تھے۔ فاصلے درمیان میں دے کر ایک دوسرے کو پار کرتے تھے) آپ اسے یہ جتانے کے لئے کہ مجھے تجھ سے کام ہے کچھ دیر تک رکے۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص امام حسینؑ کو پہچانتا تھا اور دوسری طرف سے المناک خبر لایا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر میں امام حسینؑ کے پاس جاؤں گا تو وہ پوچھیں گے کہ کوفہ کی کیا خبر ہے؟ تو انہیں بری خبر سنانا پڑیگی۔ وہ انہیں بری خبر سنانا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنا راستہ بدلا اور دوسری طرف چلا گیا۔ بنی اسد کے قبیلے کے دو شخص جو مکہ میں

تھے اور جنہوں نے اعمال حج میں شرکت کی تھی۔ جب حج مکمل کر چکے تو چونکہ حضرت امامؑ حسینؑ کی مدد کا ارادہ رکھتے تھے اس لئے تیزی کے ساتھ حضرت کے پیچھے روانہ ہو گئے تاکہ جلد از جلد آپ کے قافلے سے جا ملیں۔

یہ لوگ تقریباً ایک منزل پیچھے تھے جس وقت ان کی اس شخص سے ملاقات ہوئی جو کوفہ سے آیا تھا۔ جب ایک دوسرے کے قریب آئے تو عرب کی رسم کے مطابق ایک دوسرے کا حسب و نسب پوچھنے لگے۔ یعنی سلام اور جواب سلام کے بعد ان دونوں شخصوں نے اس شخص سے پوچھا کہ تمہارا نسب کیا ہے۔ تم کس قبیلے کے ہو؟ اس نے جواب دیا میں بنی اسد کے قبیلے سے ہوں۔ انہوں نے کہا: عجب اتفاق ہے ہم بھی بنی اسد سے تعلق رکھتے ہیں اب بتاؤ تمہارے والد کا کیا نام ہے؟ دادا کا کیا نام ہے؟ اس نے جوابات دئے۔ انہوں نے بھی اپنے باپ دادا کے نام پتہ بتائے آخر ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ پھر مدینہ سے آنے والے ان دونوں شخصوں نے اس سے کوفہ کی خبر پوچھی تو اس نے بتایا کہ درحقیقت کوفہ کی حالت بہت خراب ہے۔ امام حسینؑ نے جو مکہ سے کوفہ جا رہے تھے جب مجھے دیکھا تو تھوڑی دیر رکے۔ میں بھی سمجھ گیا کہ یہ کوفہ کی خبر پوچھنا چاہتے ہیں اور میں حضرت کو بری خبر سنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کوفہ کے تمام حالات ان دونوں کو بتا دیئے۔

یہ دونوں شخص چلتے چلتے حضرت سے آ ملے۔ جب پہلی منزل پر پہنچے تو کچھ بھی نہیں بولے۔ انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت امام حسینؑ ایک منزل پر اتر پڑے۔ ان لوگوں کو اس کوفہ سے آنے والے شخص کی ملاقات کو تقریباً ایک دن اور ایک رات کا عرصہ گزر چکا تھا۔ حضرت خیمے کے سامنے بیٹھے تھے اور کچھ اصحاب آپؑ کے ساتھ تھے۔ یہ دونوں شخص آئے اور انہوں نے عرض کیا یا ابا عبد اللہؑ! ہم ایک خبر لائے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو اسی مجلس میں آپ کے سامنے عرض کر دیں۔ یا آپ

چاہیں تو تنہائی میں عرض کریں؟ آپ نے فرمایا۔ میں اپنے اصحاب سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ جو کچھ ہو میرے اصحاب کے سامنے کہہ دو۔ !ان دونوں میں سے ایک شخص نے کہا: یابن رسول اللہؐ! ہماری اس شخص سے ملاقات ہوئی ہے جو کل آپ کے قریب سے گزرا تھا لیکن نہیں رکا تھا۔ وہ بھروسے کا آدمی تھا۔ ہم اسے پہچانتے ہیں۔ وہ بھی ہمارے قبیلہ بنی اسد سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم نے اس سے دریافت کیا کہ کوفہ کی کیا خبر ہے؟ وہ بری خبر لایا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے کوفہ سے نکلنے سے پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ حضرت مسلم اور حضرت ہانی رضی اللہ عنہما شہید کر دیئے گئے تھے اور پاؤں میں رسی باندھ کر ان کی لاشوں کو کوفہ کے کوچہ و بازار میں گھسیٹتے پھر رہے تھے۔ امامؑ حسین علیہ السلام نے جب مسلم کی موت کی خبر سنی تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن آپ نے فوراً یہ آیت پڑھی: "من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدو الله عليه فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر وما بدّلوا تبديلا"(۱)

اس موقع پر لبا عبداللہ یہ نہیں کہتے کہ کوفہ پر قبضہ ہوگیا، مسلم مارے گئے، ہانی مارے گئے، پس ہمارا کام تمام ہوگیا، ہم ہار گئے، یہیں سے پلٹ چلیں۔ جملہ کہا بھی تو ایسا جس کا مطلب ہی اور ہے۔ قرآن کی یہ آیت جو میں نے ابھی پڑھی بظاہر احزاب کی لڑائی کے متعلق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض مومنوں نے خدا سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا اور اس کی راہ میں شہید ہوگئے۔ اور بعض ابھی انتظار میں ہیں کہ ان کی جانبازی کی نوبت کب آتی ہے۔ آپ نے فرمایا: مسلم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا اب ہماری باری ہے۔

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۲۳

کاروان شہید رفت از پیش
و ان ما رفتہ گیر وی اندیش

انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی اب ہماری باری ہے۔ اس وقت آپ کے اصحاب نے اپنے دل کی بات امامؑ کی خدمت میں پیش کی اور شجاعت و شہامت کے ساتھ اپنے موقف کا اعلان کیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت امام حسینؑ سے راستہ میں آکر مل گئے۔ کچھ عرب بدو جو آپ سے راستہ میں مل گئے تھے کہ آپ کے پاس زر و دولت ہے، یہ خبر سننے کے بعد اُٹھے اور چل دیئے۔ (دوسری تمام تحریکات کی مانند)

"لم يبق معهُ الّا اهل بيته وصفوته" صرف آپ کے اہلبیت اور منتخب اصحاب رہ گئے جن کی تعداد بہت کم تھی۔ (خود کربلا میں کچھ لوگ جو پہلے بھٹک کر عمر ابن سعد کے لشکر میں چلے گئے تھے ایک ایک کر کے ہوشیار ہوتے گئے اور سید الشہداء سے آکر ملتے گئے)۔ شاید بیس آدمیوں سے زیادہ حضرت امامؑ حسین علیہ السلام کے ساتھ نہیں تھے۔ اس حالت میں حضرت مسلم اور ہانی کی شہادت کی ہلا دینے والی خبر حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو ملی۔ لسان الغیب کا مصنف کہتا ہے: کچھ مورخوں نے لکھا ہے کہ امام حسین علیہ السلام اپنے اصحاب سے کچھ نہیں چھپاتے تھے۔ یہ خبر سننے کے بعد آپ کو عورتوں اور بچوں کے خیمے میں جاکر مسلم کی شہادت کی خبر دینا تھی جبکہ ان میں حضرت مسلم کا کنبہ ہے۔ حضرت مسلم کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، حضرت مسلم کے چھوٹے بھائی ہیں، بہن اور کچھ چچیری بہنیں اور حضرت مسلم کے اہل خاندان ہیں۔

اب حضرت لبا عبداللہؑ ان لوگوں کو یہ خبر کس طرح سنائیں۔ حضرت مسلم کی ایک کمسن بیٹی تھی۔ امام حسینؑ جس وقت جاکر بیٹھے تو اسے آواز دی۔ فرمایا اس

سے کہو کہ میرے پاس آئے۔ حضرت مسلم کی بیٹی کو آپ کے پاس لائے۔ آپ نے اسے اپنے زانو پر بٹھایا اور اسے تھپکنا شروع کیا۔ بچی ہوشیار اور عقلمند تھی۔ اس نے دیکھا کہ یہ شفقت غیر معمولی ہے اور ایسی ہے جیسی باپ کیا کرتے ہیں اس لئے بولی یا ابا عبد اللہؑ ! یا ابن رسول اللہ! جب میرے والد کا انتقال ہو جائے تو ۔۔۔۔؟امام حسین علیہ السلام کا دل بھر آیا۔ آپ نے فرمایا۔ میری بچی میں تیرے باپ کی جگہ ہوں۔ تیرے باپ کے بعد میں اس کی جگہ ہوں۔ امامؑ حسینؑ کے اہل بیتؑ میں رونے کا شور اٹھا، کہرام مچ گیا، حضرت نے جناب عقیل کے بیٹوں کو مخاطب کر کے کہا: اے عقیل کی اولاد ! تم نے ایک مسلم دے دیا یہی کافی ہے۔ بنی عقیل کی طرف سے ایک مسلم ہی کافی ہے۔ تم چاہو تو پلٹ جاؤ، واپس چلے جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا یا ابا عبد اللہؑ ! یا ابن رسول اللہ! ہم لوگ اس وقت تک جبکہ مسلم شہید نہیں ہوئے تھے آپ کے ہمراہ تھے اور اب جبکہ ہم مسلم کا خون بہا بھی چاہتے ہیں کیا آپ کو چھوڑ جائیں؟ ہرگز نہیں ! ہم بھی آپ کی خدمت میں رہیں گے یہاں تک کہ ہم کو بھی وہی نصیب ہو جائے جو مسلم کو نصیب ہوا۔

ولا حول ولا قوت الا باللّٰہ العلی العظیم

و صلی اللّٰہ علیٰ محمد وآلہ الطاھرین

دوسری مجلس

پیغام رسانی کے وسائل اور ذرائع

اعوذُ باللّٰہ من الشیطان الرّجیم

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

الّذین یُبلّغون ر سالات اللّٰہ ویخشونہ ولا یخشون احداً الاّ اللّٰہ وکفیٰ باللّٰہ حسیباً(۱)

ہم پچھلی مجلس میں کہہ چکے ہیں کہ کسی پیام کی کامیابی کیلئے چار شرطیں ضروری ہوتی ہیں۔ جن میں سے پہلی شرط خود پیام کی ماہیت اور اصلیت سے متعلق ہے۔ پیام کا غنی ہونا اور اس کی باطنی قوت ہے بلکہ قرآنی الفاظ میں خود پیام کی حقانیت ہے۔ یہ ایسی شرط ہے جس کا تعلق پیغام پہنچانے والے سے نہیں ہے بلکہ خود پیغام سے ہے کیونکہ پیام کی حقانیت اس کی کامیابی کا بہت قوی سبب ہوتی ہے۔ نہ علم اور نفسیات کی رو سے تردید ہو سکتی ہے نہ دینی اور مذہبی منطق کی رو سے۔ قرآن مجید اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اگر کوئی بات حق اور حقیقت ہو تو خود اس کا حقیقت ہونا ہی اس کی بقا کا ایک سبب بن جاتا ہے۔ اور کسی پیام کا باطل ہونا، کھوکھلا ہونا، بے فائدہ اور بے اثر ہونا اس کی فنا کا ذمہ دار ہوتا ہے اور یہ ایک ایسا سبب ہوتا ہے جو اسے اندر سے ختم کر دیتا ہے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں ایک مسئلہ جیسا کہ وہ فرماتا ہے: "انزل

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

من السّماء ماءً فسالت اودية بقدرها فاحتمل السّيل زبداً رابياً وممّا يوقدون عليه فى النّار ابتغاء حلية اومتاع زبد مثله كذالك يضرب اللّٰه الحق والباطل فامّا الزّبد فيذهب جفاءً وّامّا ماينفعُ الناس فيمكث فى الارض كذلك يضرب اللّٰه الامثال"(۱)

اس آیت کے آخری حصے کا مطلب مختصر طور پر بیان کرتا ہوں: بارش کے آنے اور زمین پر پانی کی دھار بہنے کا موضوع بیان کرنے کے بعد اور یہ بتانے کے بعد کہ ہر ندی نہر چھوٹی یا بڑی اپنے اپنے ظرف کے مطابق پانی لیتی ہے اور دھار کے بہاؤ کے درمیان اس پر جھاگ آجاتا ہے جو کبھی کبھی پانی کو اوپر سے ڈھانک دیتا ہے۔ آیت فرماتی ہے: لیکن جھاگ ختم ہو جاتا ہے۔ جو چیز لوگوں کے حق میں مفید اور نفع بخش ہوتی ہے یعنی خود پانی باقی رہ جاتا ہے۔ بعد میں کہتی ہے: یہ مثل حق اور باطل کی مثل ہے۔

پیام کی کامیابی کے دوسرے اسباب بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق اس کی ماہیت اور مشمولات سے نہیں ہوتا۔ جس وقت کوئی پیام یہ چاہے کہ ایک روح سے دوسری روح تک پہنچ جائے، لوگوں کی روح میں سرایت کر جائے اور سماج میں اندرونی طور پر اثر و نفوذ کر جائے۔ بلا شبہ کسی پیام پہنچانے والے کا محتاج ہوتا ہے۔ پیام پہنچانے والے کی خصوصیات، شخصیت اور لیاقت اور وہ شرائط جو پیام رساں میں موجود ہونا چاہئیں ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہمیں الگ گفتگو کرنا چاہئے۔

ایک اور سبب وہ وسائل اور ذرائع ہیں جو پیام پہنچانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پیام پہنچانے والے کو ایسے وسائل و ذرائع کی ضرورت

۱۔ سورۂ رعد آیت ۱۷

پڑتی ہے جن سے وہ اس پیام کو لوگوں تک پہنچاتا ہے جسے پہنچانے کا اس کو حکم ملا ہوتا ہے۔ چوتھا سبب پیام پہنچانے والے کا طریقہ اور ڈھنگ ہوتا ہے۔ پیام پہنچانے کی کیفیت۔ پس وہ چاروں اسباب جو کسی پیام کی کامیابی یا ناکامی کے ذمہ دار ہوتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پیام کی اصلیت (حقانیت اور اس کے مشمولات کا غنی ہونا)

۲۔ پیام پہنچانے والے کی خاص شخصیت

۳۔ پیام پہنچانے کے آلات و وسائل

۴۔ پیام پہنچانے کی کیفیت، طرز اور ڈھنگ

میں پیام پہنچانے کے آلات و وسائل کی گفتگو جاری رکھتا ہوں۔

اگر کوئی پیام لوگوں تک پہنچاتا ہے تو بے شک اسے وسائل و آلات کی ضرورت ہے۔ میں آپ تک کوئی پیام پہنچانا بھی چاہوں تو میرے لئے کسی وسیلے کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں، یعنی میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس پیام کو اشراق کے طریقے سے آپ کے دل میں نہیں ڈال سکتا۔ وہ کم سے کم چیز جسے میں کام میں لاسکتا ہوں خود بات ہے۔ لفظ ہے، قول ہے، تقریر ہے، کتاب ہے، لکھنا ہے، نثر ہے، شعر ہے۔ خود یہ منبر بھی اس وقت یہاں رکھا ہوا ہے تبلیغ کا ایک وسیلہ اور آلہ ہے، یہ مائیکروفون جو یہاں لگا ہوا ہے خود بولنے اور پیام پہنچانے کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔ اور اسی طرح دوسرے ہزاروں وسیلے ہیں۔

البتہ پیام الٰہی کے پہنچانے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہر قسم کے وسیلے سے کام نہیں لے سکتے۔ یعنی اس غرض سے کہ پیام الٰہی پہنچا دیا جائے اور اس لئے کہ مقصد پاک و پاکیزہ ہے انسان کو یوں نہیں سوچنا چاہئے کہ جو بھی وسیلہ ہاتھ لگے جائز ہو یا

ناجائز اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کام میں لے آئیں کہتے ہیں "الغایات تُبرّر المبادی" یعنی نتیجے وسیلوں کو جائز بنا دیتے ہیں۔ یعنی جب تک مقصد براری ہو ابتدا پر نظر نہ ڈالو۔ ایسا اصول نا قابل قبول ہے ہم اگر کسی مقدس مقصد کی خاطر قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو ایک مقدس وسیلے یا ایک جائز وسیلے سے کام لے سکتے ہیں۔ اگر وسیلہ نا جائز ہو تو اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھیں۔ اس مقام پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات ایسے مقاصد کے حصول کی خاطر جو اپنی جگہ شرعاً جائز ہیں ایسے وسائل استعمال کرتے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ وسائل ناجائز ہیں۔ جو لوگ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم ایسا مقصد رکھتے ہیں اور یہ اس کا وسیلہ ہے خود وہی وسیلہ ان کے لئے مقصد کی حیثیت رکھتا ہے۔

مثال کے لئے ہم ایک پرانا موضوع شبیہ خوانی لیتے ہیں (جو تہران میں زیادہ ہوتی تھی) جو در حقیقت سانحۂ کربلا کی ایک طرح کی نمائش ہوتی تھی۔ واقعۂ کربلا کی نمائش اپنی جگہ کوئی حرج نہیں ہے اس لحاظ سے کہ نمائش ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے تھے اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خود شبیہ خوانی کا مسئلہ لوگوں کا مقصد بن گیا تھا۔ امام حسینؑ، داستان کربلا کا مظاہرہ اور اس سانحۂ کی تجسیم ہرگز مدّ نظر نہیں رہی تھی۔ شبیہ خوانی میں ایسی ہزاروں باتیں داخل ہوگئی تھیں جنہیں سانحۂ کربلا اور امام حسینؑ کے سانحے کے علاوہ ہر بات سے متشابہ کہا جا سکتا تھا۔ پھر ان شبیہ خوانیوں میں کیسی کیسی بے ایمانیاں، ہوس پرستیاں، جھوٹ اور دھوکے بازی ہوتی تھی کہ لوگ کبھی تو قطعی امر حرام کے مرتکب ہونے لگے تھے۔ وہ کسی بات کے پابند نہیں تھے۔ بچپن کی یہ بات مجھے یاد ہے کہ اپنے اسی محلے میں جس کا نام فریمان ہے شبیہ خوانی کا معاملہ برابر ہمارے والد مرحوم رضوان اللہ علیہ اور لوگوں کے درمیان جھگڑے کا سبب بنا رہا اگرچہ مرحوم کا جو اثر لوگوں پر تھا اس کے تحت بہت بڑی حد تک اس علاقے میں

انہوں نے اس مسئلے کو روک دیا تھا۔ لیکن ہمیشہ اس بارے میں ایک کشمکش برابر جاری رہتی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ آپ امام حسین علیہ السلام کے نام سے ایک مسلمہ حرام کام کرتے ہیں اور یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

میں جن دنوں قم میں تھا مجھے یاد ہے وہاں بھی لوگوں میں بہت سی فضول نمائشوں اور شبیہوں کا رواج تھا۔ ابتدائی برسوں میں مرحوم آیت اللہ بروجردی موجود تھے جو غیر معمولی قوت اور اثر کے مالک تھے۔ محرم سے پہلے ان سے یہ کہا گیا کہ ہماری شبیہ خوانی کا طریقہ یہ ہے۔ انہوں نے لوگوں کو بلایا تمام انجمنوں کے صدر ان کے مکان پر آگئے۔ آپ نے ان لوگوں سے پوچھا کہ آپ لوگ کس کی تقلید کرتے ہیں؟ سب بولے ہم آپ کے مقلد ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر آپ میری تقلید میں ہیں تو میرا فتویٰ یہ ہے کہ آپ یہ شبیہیں جس طرح نکالتے ہیں حرام کام ہے۔ ان لوگوں نے نہایت صفائی سے آقائے بروجردی سے عرض کیا کہ ہم سال بھر آپ کی تقلید کرتے ہیں لیکن ان تین چار دن تک ہرگز آپ کی تقلید نہیں کریں گے۔ یہ کہہ کر چلے گئے۔ اور اپنے مرجع تقلید کی بالکل پرواہ نہیں کی۔ اس بات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ مقصد امام حسین علیہ السلام نہیں، مقصد اسلام بھی نہیں ہے بلکہ مقصد نمود و نمائش ہے جس سے دوسرے ہی کام لئے جاتے ہیں یا کم سے کم ایک لذت حاصل کی جاتی ہے۔ یہ ایک پرانی شکل تھی۔

ہم اس کی ماڈرن (جدید) شکل آج ان نمائشوں میں دیکھتے ہیں جو عارفوں اور فلسفیوں کے لئے وقتاً فوقتاً ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کسی بڑے عارف مثلاً مولوی معنوی کے نام پر ایک بڑی کانگریس کے عنوان سے تشکیل دیتے ہیں۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ صوفیاء سماع کی محفل برپا کرتے ہیں جبکہ خود محفل سماع میں ہزار باتیں ہوتی ہیں۔ بہر حال میں مان لیتا ہوں کہ وہ صوفی بزرگ مجلس سماع بھی منعقد کرتے

تھے۔وہ شرعی اعتبار سے جائز تھی یا ناجائز۔ اس سے بھی بحث نہیں، لیکن اس مجلس سماع کا یہ ڈھنگ مسلّم اور متند نہیں تھا کہ جس میں ایسے چار پچنیوں اور گویّوں نے شرکت کی ہو کہ جو کچھ ان کی سمجھ میں نہ آئے وہی عرفانی معنی ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت مولوی معنی کا ہفت صد سالہ جشن مناتے ہیں تو ایک بے مثل کام یہ کیا گیا کہ پچنیوں کی ایک ٹولی لے آئے اور محفل سماع آراستہ کردی۔ ہوس پرستی کی ایک محفل۔ یہ بھی مولوی کی شان ہے!

مقصد اگر شرعاً حلال ہو تو جائز وسائل سے کام لینا چاہئے۔ دوسری طرف پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کو شرعاً جائز وسائل کام میں لانے کے لئے بھی بڑی مشکل سے راضی کرنا پڑتا ہے کہ جناب ان وسائل کو کام میں کیوں نہیں لاتے۔؟ یہی لاؤڈ اسپیکر جب پہلی بار آیا تو آپ جانتے ہیں کہ اس کی کتنی مخالفت ہوئی تھی! سبحان اللہ۔ آواز کے لئے لاؤڈ اسپیکر ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کے لئے عینک اور کان کے لئے سمعک (ایر فون)۔ جب انسان بہرا ہو جاتا ہے تو سمعک (ایر فون) لگا لیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو پہلے نہیں سن پاتا تھا اب سن لیتا ہے۔ قرآن پہلے نہیں سن پاتا تھا اب قرآن بہتر طور پر سن لیتا ہے۔ گالی بھی پہلے نہیں سن پاتا تھا اب گالی خوب سن لیتا ہے۔ یہی بات مائیکروفون کی ہے۔ مائیکروفون کسی حرام کام سے مخصوص نہیں ہے۔ اس آلے سے کام لینا حرام ہے جس سے فعل حرام کے سوا اور کوئی کام نہ لیا جاسکے مثلاً صلیب جو شرک کی ایک علامت کے علاوہ کچھ نہیں ہے یا مثلاً بُت یعنی مورتی۔ لیکن ایسے آلے کا استعمال کیوں حرام ہو جو حرام کام میں بھی استعمال ہوتا ہو اور حلال کام میں بھی۔

ایک بہت مشہور واعظ کا بیان تھا لاؤڈ اسپیکر ایجاد ہوئے سال ہی ہوا تھا۔ ہم بھی لاؤڈ اسپیکر کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے اور بقول ان کے نیا نیا تھا عیش کر رہے تھے (یہ

لاؤڈ اسپیکر واعظوں کی جان پر بہت حق رکھتا ہے۔ آپ اگر تیس سال پہلے کے زمانے کا تصور کریں تو ستر سال کی عمر تک پہنچنے والے بہت کم پائیں گے۔ بیشتر واعظ چالیس پچاس کی عمر تک ایک طرح سے مر جایا کرتے تھے۔ انہیں لاؤڈ اسپیکر نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ چیخنا پڑتا تھا۔ یہ موٹر بھی نہیں ہوتی تھی جو تقریر کے بعد میں موٹر پر سوار ہو سکیں۔ خچر یا گدھے پر سوار ہوتے تھے جو جاڑوں میں ان کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ وہ لوگ بیشتر جوانی ہی میں مر جاتے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر نے ان کی سن لی) لیکن ابھی تک لاؤڈ اسپیکر عام نہیں ہوا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ میں ایک بڑی مجلس میں تقریر کروں گا۔ لاؤڈ اسپیکر بھی لگا دیا تھا۔ مجھ سے پہلے ایک صاحب تقریر کرنے لگے۔ جیسے ہی وہ تقریر کرنے لگے بولے شیطان کے اس چرخے کو یہاں سے ہٹا دو۔ شیطان کا چرخا لوگ ہٹا لے گئے۔ ہم نے دیکھا کہ اگر ہم بات کو پی گئے اور کچھ نہ بولے اور لوگ شیطان کے چرخے کو ہٹا لے گئے تو پھر کبھی اسے استعمال نہیں کر سکیں گے۔ مجھے منبر پر آنے کی دعوت دی گئی اور جیسے ہی میں جاکر منبر پر بیٹھا میں نے کہا کہ شیطان کی اس سواری کو لیکر آؤ۔

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی دقیانوسی سوچ اور تنگ نظری بے موقع ہے۔ لاؤڈ اسپیکر کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلم بھی اپنی جگہ بے قصور ہیں۔ ان کے مشمولات کیا ہیں؟ ریڈیو پر جو کچھ کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ ٹیلی وژن پر جو کچھ کہا جاتا ہے اور جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ فلم میں جس شے کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ اس معاملے میں انسان کو دقیانوسیت نہیں دکھانا چاہئے اور جو چیز اپنی جگہ حرام نہیں ہے بلکہ شرعاً جائز ہے اسے شرعاً ناجائز کیوں بتایا جائے۔ اب یہ جاننے کے لئے کہ تاریخ اسلام میں انہیں وسائل سے جو اس زمانے میں موجود تھے کیا کیا کام لئے گئے ہیں اور اسلام کا پیغام پہنچانے میں ان وسائل نے کتنی غیر معمولی کامیابی

دکھائی ہے۔ اس نکتے پر توجہ فرمایئے: کبھی آپ نے قرآن مجید کی آیات کی فصاحت، بلاغت اور سیاست، ان آیات کی روانی اور ان آیات کی دلکشی کے موضوع پر بھی غور کیا ہے؟ قرآن کی دو خصوصیات ہیں: ایک خصوصیت اسکے مشمولہ موضوعات و مطالب ہیں جنہیں حقانیت کہتے ہیں اور دوسری اسکی زیبائی۔

قرآن کی آدھی کامیابی اس لئے ہے کہ یہ حسین کلام ہے، علم اور دانش کا کلام ہے۔ قرآن انسان کی حد سے بڑھ کر فصاحت رکھتا ہے اور اس کی تاثیر اس کے حسن کی مرہون منت ہے۔ کلام کی فصاحت اور دلفریبی خود اس بات کا بہترین وسیلہ ہوتی ہے کہ وہ کلام خود ہی اپنے مطالب دوسروں تک پہنچا سکے۔ قرآن مجید اپنی اس فصاحت اور دلکشی پر کس قدر ناز کرتا ہے، اس سلسلے میں کتنی گفتگو کرتا ہے اور آیات قرآنی کی تاثیر سے متعلق بھی قرآن میں کیسی کیسی گفتگو ہوئی ہے! قرآنی اسلوب کی یہ تاثیر اس کی فصاحت اور دلکشی ہے۔

" اللّٰہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابها مثانی تقشعرمنه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم و قلوبهم الی ذکر اللّٰہ ذالك هدی اللّٰہ یهدی به من یشاء"(۱) اس حقیقت کو جو موجود تھی اور ہے قرآن بیان کرتا ہے۔ سب سے اچھی اور سب سے حسین بات کہ کتاب ہے مثانی (مثانی سے جو بھی مراد ہو) " تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم" وہ لوگ جن کے دلوں میں خوف خدا کا ذرا سا شائبہ بھی ہے جس وقت قرآن سنتے ہیں کانپ اٹھتے ہیں، انہیں جھر جھری آجاتی ہے۔ " ثم تلین جلودهم و قلوبهم الی ذکر اللّٰہ" اور ایک اور آیت میں فرمایا ہے: "انما المؤمنون الذین اذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبهم واذا تلیت علیهم آیاته زادتهم ایمانا وعلی ربهم یتوکلون"(۲) یا کچھ آیات میں ان لوگوں

۱۔ سورۂ زمر آیت ۲۳۔ ۲۔ سورۂ انفال آیت ۲۔

کا ذکر کرتا ہے جو قرآن سنتے وقت زمین پر جھک جاتے ہیں۔ "یخرّون للاذقان سجّدا" (۱) یا بعض عیسائیوں کے بارے میں کہتا ہے: " اذا سمعوا ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع"(۲) جس وقت قرآن کی آیات سنتے ہیں ان کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

در اصل ملک حبش میں انقلاب کس طرح آیا؟ انقلاب حبشہ کی ابتدا کس بات نے کی؟ حبشہ مسلمان کیسے ہوا اور حبشہ کے اسلام کا منشا کیا تھا؟ کیا قرآن اور قرآن کے حسن و دلفریبی کے علاوہ اور کچھ تھا؟ یہ لمبا چوڑا قصہ کیا تھا کہ حضرت جعفر ابن ابی طالبؑ حبشہ میں اس دربار میں پہنچتے ہیں جو سلطنت کے رعب اور دبدبے کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ پھر وہ قرآن کی آیات (سورہ طٰہٰ) پڑھنی شروع کرتے ہیں تو دربار میں ایک انقلاب سا برپا ہو جاتا ہے؟ قرآنی کلام اپنے طرز بیان، فصاحت، روانی، دلکشی اور قوت اثر سے اس قدر مالامال ہے کہ دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔

عوام میں حضرت امیر المومنینؑ کی کامیابی ان کی فصاحت کی مرہون منت ہے۔ نہج البلاغہ کی تالیف کو ہزار سال گزر چکے ہیں یعنی اسکی کتابی شکل میں آنے کے بعد ہزار سال گذر چکے ہیں اور اسکی تقریروں کی انشاء یعنی تصنیف کو تقریباً چودہ سو سال (قمری) گزرے ہیں۔ اس کتاب نے ماضی میں بھی اور آج کے زمانے میں بھی اپنا بلند مقام بدستور قائم رکھا ہے۔ میں نے ایک بار پرانے اور نئے زمانے یعنی امیر المومنینؑ کے وقت سے اس زمانے تک کی تحقیق کر کے دیکھا کہ عرب کے تمام ادیب اور فصیح انشاپرداز فصاحت و بلاغت کے نقطۂ نظر سے امیر المومنینؑ کے کلام کے سامنے خاضع ہیں۔

۱۔ سورۂ اسراء آیت ۱۰۷
۲۔ سورۂ مائدہ آیت ۸۳

کہتے ہیں کہ مصر میں آخری برسوں میں شکیل ارسلاں کے لئے جسے لوگ امیر البیان یعنی امیر سخن کہتے تھے لوگوں نے ایک جلسہ ترتیب دیا تھا، اس کے نام کو افتخار بخشنے کے لئے گویا اس کی قدر دانی اور عزت افزائی کے لئے جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں ایک شخص نے شکیل ارسلاں کے بارے میں تقریر کی اور اس کا امیر المومنینؑ سے موازنہ کر کے یہ کہہ دیا کہ جس طرح حضرت علی ابن ابی طالبؑ اپنے زمانے میں امیر سخن تھے اسی طرح یہ شکیل ہمارے زمانے کا امیر بیان اور امیر سخن ہے، جس وقت خود شکیل اسٹیج پر پہنچا وہ بہت غصے میں تھا۔ کہنے لگا: آپ کیا مُزخرافات (جھوٹی سچی کا ملمع) کر رہے ہیں؟ میرا حضرت علیؑ سے مقابلہ کرتے ہیں؟ میں تو حضرت علیؑ کے جوتے کے تسمے کے برابر بھی نہیں ہوں۔ میرا ذکر کہاں اور حضرت علیؑ کا ذکر کہاں؟ ہم اپنے ہی زمانے میں دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ جن کے دل بہت پاک اور صاف ہیں جس وقت حضرت علیؑ کا کلام سنتے ہیں ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں! یہ کس وجہ سے ہے؟ یہ حسن کلام کے باعث ہے۔ امیر المومنینؑ کے پاس اپنے زمانے میں اس کی بہت زیادہ مثالیں تھیں۔

آپ کے اس خطبہ الغریٰ کے بارے میں جو بظاہر آپ نے صحرا میں دیا تھا لکھا ہے جس وقت حضرت علیؑ کے کلمات ختم ہوئے سب لوگوں کا یہ حال تھا کہ اشک جاری تھے۔ "ہمام" نامی ایک شخص نے امیر المومنینؑ سے عرض کیا میرے سامنے ذرا پرہیزگاروں کی تصویر کشی کر کے دکھایئے۔ پہلے تو حضرت نے انکار کیا۔ دو تین جملے کہے لیکن اس نے کہا کہ یہ کافی نہیں ہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ میری خاطر پرہیزگاروں کی مکمل تصویر کھینچ دیجئے۔ حضرت علیؑ فی البدیہہ متقیوں کی حالت بیان کرنے لگتے ہیں۔ متقیوں کی راتیں ایسی گذرتی ہیں ۔ ان کے دن اس طرح کٹتے ہیں،ان کا لباس ایسا اور لباس پہننے کا طریقہ ایسا ہوتا ہے۔ ان کا سماجی میل جول اس

قسم کا ہوتا ہے۔ وہ قرآن اس طرح پڑھتے ہیں۔ میں نے ایک بار شمار کیا تھا آپ نے اپنے فی البدیہہ چالیس جملوں میں متقیوں کے ایک سو تیس اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ یہ شخص (ہمام) جیسے جیسے سنتا گیا اس کے دل کی آگ بھڑکتی گئی، اچانک اس نے ایک چیخ ماری اور مر گیا۔ بالکل بے جان ہوگیا۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا" هكذا تصنع المواعظ البالغته باهلها" (۱) بات اگر پُر تاثیر اور دل قابل ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

اب دعاؤں کے پیچھے چلتے ہیں، دعا میں انسان خدا سے بات چیت کرتا ہے۔ اگرچہ لفظ اور بات میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی پھر بھی ہماری دعائیں فصاحت اور دلکشی کی بلند ترین سطح پر پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ دعا کے مطالب انسان کے دل تک پہنچانے میں دعا کی دلکشی مدد کرتی ہے۔ موذن کا خوش الحان ہونا کیوں مستحب ہے؟ یہ بات فقہ اسلامی میں آئی ہے۔ "اللہ اکبر" کے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے کوئی خوش الحان انسان کہے چاہے یا کریہہ الصوت۔ "اشهد ان لا اله الاّ اللہ" کے معنی میں کوئی فرق نہیں آتا چاہے کوئی خوش الحان کہے چاہے بد آواز۔ لیکن جس وقت انسان اللہ اکبر کو کسی خوش الحان سے سنتا ہے اس کے دل پر کسی کریہہ الصوت کے مقابلہ میں ایک اور ہی قسم کا اثر ہوتا ہے۔

میں نے ایک مجلس میں دیکھا کہ ایک بوڑھا نعرہ لگاتا تھا۔ نجانے بیچارا فالج زدہ تھا یا اس کے زبان نہیں تھی کیا بات تھی کہ جب کوئی کلمہ کہنا چاہتا تھا مثلاً صلوات بھیجنا چاہتا تھا تو مضحکہ خیز انداز میں خود جھٹکا سا کھاتا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا سبحان اللہ! اس کے علاوہ کیا کوئی اور شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو صلوات کا نعرہ لگائے؟ کیا ہمیں ایسے کاموں کے لئے نہایت مکروہ آواز والے لوگوں کو منتخب کرنا چاہئے؟

۱۔ نہج البلاغہ فیض الاسلام خطبہ ۱۸۴ معروف بہ خطبہ ہمام صفحہ ۶۱۸

سعدی ایک قصہ سناتے ہیں : فلاں شہر میں ایک کریہہ الصوت مؤذن تھا۔ وہ کریہہ آواز سے ہی اذان دیتا تھاایک بار دیکھا کہ اس کے لئے ایک یہودی تحفہ لیکر آیااور کہنے لگا کیا آپ میرا یہ ناچیز تحفہ قبول فرمائیں گے ؟ اس نے پوچھا کیوں ؟ وہ بولا آپ نے میرا ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ کیا کام ؟ میں نے تو تمہارا کوئی کام نہیں کیا۔ وہ بولا میری ایک بیٹی مدت سے اسلام کی طرف جھکاؤ رکھتی تھی جب سے آپ نے اذان دینا شروع کیا ہے اور وہ آپ سے اللہ اکبر سن رہی ہے اسلام سے قطعی بیزار ہو گئی ہے۔ اب میں آپ کے لئے یہ تحفہ لایا ہوں کیونکہ آپ نے یہ کام کیا ہے کہ میری بیٹی کو مسلمان نہیں ہونے دیا۔ یہ خود بھی ایک مسئلہ ہے۔

بو علی سینا بہت اچھی اور مزیدار باتیں کرتا ہے۔ مقامات العارفین میں اس بارے میں کہ کسی انسان کے گرد لوگ کس وسیلے سے جمع ہو سکتے ہیں وہ کچھ اسباب کا ذکر کرتا ہے جن میں سے ایک بات یہ بتاتا ہے :" الکلام الواعظ من قائل زکی" "اس واعظ کی بات جو نہایت اعلیٰ درجے کا پاک اور پاکباز ہو"۔ یہ بات جو ہم کہہ رہے ہیں تم اس وقت سمجھوگے کہ ہم ان میں سے بہت سی خصوصیات کے حامل نہیں ہیں۔ سب سے پہلے تو واعظ کو پاک دل ہونا چاہئے۔ پھر کہتا ہے :"بعبارة بلیغة و نغمة رخیمة" اس واعظ کی آواز کا آہنگ اچھا ہو تا کہ سننے والے کے دل پر بہتر اثر کرے۔ واعظ کی بات بلیغ ہو تاکہ اس کا اثر سننے والے کی روح تک پہنچے۔ واعظ کی بات کی تاثیر میں اس کا حلیہ بھی موثر ہوتا ہے۔ یہ باتیں میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ سمجھ لیں کہ معنی کا ابلاغ خود ایک اہم بات ہے۔ اس میں وسیلے بھی ہیں، خصوصیات بھی ہیں، کیفیات بھی ہیں، اور وسائل بھی ہیں جو پیام کو چاروں طرف عوام و خواص تک پہنچاتے اور پھیلاتے ہیں۔

اب ایک اور مسئلہ پیش کرتا ہوں۔ خود قرآن کس طرح پڑھنا چاہئے ؟ قرآن یقیناً اذان نہیں ہے۔ اذان کے لئے تو ایک شخص مأذنہ (مینار) پر جاتا ہے اور اذان دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ موذن کو خوش آواز ہونا چاہئے لیکن قرآن کو تو سبھی پڑھتے ہیں۔ وہ سب لوگ جو اسے پڑھتے ہیں اس بات کے پابند ہیں کہ ان سے جہاں تک ہو سکے اچھی طرح پڑھیں۔ اس سے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کی روح پر بہتر اثر ہوتا ہے۔ قرآن میں اس ترتیل کے مسئلے پر کہا گیا ہے : "و رتّل القرآن ترتیلاً"(۱) اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہ کہ تم جس وقت اس کے الفاظ ادا کرو تو انہیں اتنی جلدی جلدی نہ پڑھو کہ وہ ایک دوسرے سے چپک جائیں یا لپٹ جائیں اور نہ انہیں اتنا آہستہ پڑھو یعنی ان کے درمیان اتنا وقفہ دے دے کر پڑھو کہ ایک لفظ دوسرے لفظ سے بے تعلق ہو جائے۔ ان الفاظ کو یوں پڑھو جیسے یہ کچھ بتا رہتے ہو۔ اس طرح پڑھو جیسے تم اپنے آپ سے باتیں کر رہے ہو۔ بقول صوفیاء انسان کو قرآن ہمیشہ اس طرح پڑھنا چاہئے جیسے کہنے والا خدا ہے اور وہ خود مخاطب ہے۔ وہ خود براہ راست خدا سے سن اور سمجھ رہا ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں میرے باپ نے مجھ سے ایسی بات کہی ہے جس نے میری قسمت پر غیر معمولی اثر ڈالا ہے۔ وہ کہتا ہے ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا قرآن پڑھ رہا تھا۔ میرے باپ میرے کمرے کے آگے سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے مجھے مخاطب کر کے کہا : محمد اقبال ! قرآن کو اس طرح پڑھ جیسے یہ خود تجھ پر نازل ہو رہا ہے۔ میں اس وقت سے جب بھی قرآنی آیات کو لے کر ان کا مطالعہ کرتا ہوں یہی فرض کر لیتا ہوں جیسے میرا خدا مجھ محمد اقبال سے بات کر رہا ہے۔

۱۔ سورۂ مزمل آیت ۴

حدیث میں ہے: "تغنّوا بالقرآن"(۱) ایسی ہی اور بھی حدیثیں اسی مضمون کی ملتی ہیں۔ اور یہ مانی ہوئی ہیں۔ ان کی مراد یہ ہے کہ قرآن کو بہت خوش الحانی سے پڑھا کرو۔ البتہ جو لحن کھیل کود ناچ رنگ کے مناسب ہیں یا شہوت انگیز اور شہوت آلود ہیں وہ ضرور حرام اور شرعاً ممنوع ہیں۔ ہر لحن انسان کی کسی نہ کسی ایک حالت سے مطابقت رکھتا ہے۔

شروع شروع میں جب ہم مشہد میں طالب علم تھے ایک بزرگ آقا سید محمد عرب نامی قرآن کے قاری تھے۔ مرحوم آقا سید محمد عرب نہایت متدین انسان تھے اور مشہد کے تمام علماء ان کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سے شاگردوں کو قرآنی قرأت کی تعلیم دی تھی۔ وہ قرأت کی دو طرح کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ علم قرأت کے قاعدے پڑھاتے تھے جو بدقسمتی سے ایران میں نہیں پڑھائے جاتے البتہ عرب ممالک بالخصوص مصر میں رائج ہیں۔ دوسرے یہ کہ کچھ لحن انہیں آتے تھے (جن کے رسمی نام بھی ہیں) جن کی تعلیم وہ مسجد گوہر شاہ میں دیا کرتے تھے۔ ان دنوں جتنے لحن تھے ان کے نام موسیقی کے لحن (سُر) کے ناموں سے ملتے جلتے تھے لیکن وہ قرآنی لحن تھے۔ ان کے شاگرد یہ نازک اور لطیف قرآنی لحن سیکھتے تھے۔ یہ خود ایک اہم بات ہے اور ایسا بھی ہونا چاہئے۔ یہ لحن قبول کرنا قرآن کا ایک معجزہ ہے اور وہ بھی شہوانی لحن نہیں بلکہ معنوی اور روحانی لحن جس کے متعلق کسی ماہر فن کو اظہار خیال کرنا چاہئے۔

عبد الباسط کا قرآن تمام اسلامی ممالک میں اس قدر کیوں پھیل گیا؟ اس لئے کہ عبد الباسط بلند آواز اور لحن سے اور طرح طرح کی قرأتیں اور لحن سمجھ کر اور یہ پہچان کر کہ کس سورت کو کس لحن سے پڑھنا چاہئے پڑھتا ہے مثلاً یہ کہ سورۂ والشمس یا سورۂ والضحیٰ کو کس لحن سے پڑھنا مناسب ہے۔

۱۔ بحار الانوار جلد ۹۲ صفحہ ۱۹۱، جامع الاخبار فصل ۲۳ صفحہ ۵۷

بہت سے ائمۂ اطہارؑ کی حضرت سجاد علیہ السلام اور حضرت باقر علیہ السلام کے متعلق یہ حدیث ملتی ہے کہ جس وقت یہ قرآن پڑھتے تھے۔ تو ایسی اونچی اور دلفریب آواز اور لحن سے پڑھتے تھے کہ ان کی آواز گلی تک پہنچتی تھی چنانچہ جو شخص اس گلی سے گذرتا تھا وہیں کھڑا ہو جاتا تھا اس طرح جب تک امامؑ اپنے گھر میں قرآن کو خوش الحانی سے پڑھتے رہتے تھے آپ کے دروازے پر لوگوں کا ایک ہجوم کھڑا ہو جاتا تھا اور راستہ بند ہو جاتا تھا۔ یہاں تک لکھا ہے کہ بہشتی (پرانے زمانے میں یہ معمول تھا کہ لوگ کندھوں پر مشکیں رکھے کنوؤں سے پانی کھینچ کھینچ کر گھروں میں پہنچاتے تھے۔ مدینے میں صرف کنوئیں تھے نہر نہیں تھی۔ اب بھی نہر نہیں ہے۔) زیادہ ہو جاتے تھے۔ جس وقت وہ کندھوں پر مشکیں رکھے امامؑ کے گھر سے گذرتے تھے تو امام کی آواز سنتے ہی ان کے پیروں میں جیسے طاقت نہیں رہتی تھی اور وہ تھم جاتے تھے اور بہشتی کندھوں پر بھری ہوئی مشکیں رکھے رکھے اس وقت تک قرآن سنتے رہتے تھے جب تک کہ امامؑ کی قرآن خوانی ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ امامؑ یہ پیام کس طرح پہنچاتے تھے؟ پیام الٰہی پہنچانے کے لئے شرعاً جائز وسائل استعمال کرتے تھے۔

امام بہت دلکش آواز سے قرآن خوانی کیوں کرتے تھے؟ وہ اسی وسیلے سے تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قرآن کو اسی وسیلے سے لوگوں تک پہنچائیں۔ اسلام کے سلسلے میں جس وقت انسان شعر پر غور کرتا ہے تو اسے عجیب و غریب باتیں نظر آتی ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ شعر کے خلاف بھی تھے اور شعر کی ترویج بھی کرتے تھے۔ ایسے شعروں کے خلاف رہتے تھے جو آج کی اصطلاح میں پابند یا ذمہ دار نہیں ہوتے تھے یعنی ایسے شعر جو کوئی مقصد نہیں رکھتے ہوں۔ صرف تخیل ہوتا ہے۔ جوش پیدا کر دیتے ہے۔ جھوٹ کے انبار ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص توصیفی شعر کہتا

تھا کہ فلاں کا نیزہ ایسا تھا یا اس کا گھوڑا ویسا تھا یا معشوق کی زلف کی تعریف میں شعر کہتا تھا یا کسی کی ہجو اور کسی کی مدح کرتا تھا صرف اس لئے کہ اس سے رقم اینٹھے۔ پیغمبر اکرمؐ ایسے شعر کی سختی سے مخالفت کرتے تھے۔

آپ فرماتے تھے: "لان یمتلی جوف رجل قیحاً خیرٌ لہٗ من ان یمتلی شعراً" (۱) غلاظت سے بھرا ہوا انسان کا پیٹ اس سے بہتر ہے کہ اس میں فضول شعر بھرے ہوں۔ لیکن پھر فرمایا: "انّ من الشعر لحکمۃً "(الغدیر جلد ۲ صفحہ ۹) لیکن میں ہر شعر کے لئے یہ بات نہیں کہتا کیونکہ بعض شعر حکمتوں اور حقیقتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

خود پیغمبرؐ کے حضور میں کتنے ہی شاعر تھے۔ ان میں سے ایک حسان بن ثابت ہیں۔ دونوں قسم کے شعروں کو نہ صرف پیغمبر اکرمؐ کی حدیث میں ہی الگ کیا گیا تھا بلکہ قرآن نے بھی ان میں تفریق کی ہے۔ "والشعراءُ یتّبعہمُ الغاؤن الم ترا نّہم فی کلّ وادٍ یہیمون وانّہم یقولون مالا یفعلون الّا الّذین آمنوا و عملوالصّا لحات" (۲) ایسے بھی شاعر تھے جن کی پیغمبر اکرمؐ یا ائمۂ اطہارؑ ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے لیکن وہ کس قسم کے شاعر تھے۔ وہ ایسے شاعر تھے جو اسلام کا پیام اور اسلام کی باتیں شعر کے دلکش لباس میں لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ جو کام شعر کر جاتا ہے نثر نہیں کر سکتی۔ اسی لئے کہ شعر نثر سے زیادہ دل پذیر ہوتا ہے۔ شعر میں وزن ہوتا ہے، قافیہ ہوتا ہے، آہنگ ہوتا ہے، لوگوں کے ذہن شعر کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے حسان بن ثابتؓ سے جو آپ کی درگاہ کا شاعر تھا فرمایا تھا: "لا تزال مؤیّد اًبروح القدس

۱۔ نہج الفصاحت صفحہ ۴۷۰ حدیث ۲۲۱۵

۲۔ سورۂ شعراء آیت ۲۲۴ تا ۲۲۷

ما ذہبت عنّا اہل البیت" (۱) روح القدس کی طرف سے تمہاری تائید اس وقت تک جاری رہے گی جب تک تم جس راہ پر چل رہے ہو چلتے رہو گے اور اس سے نہیں ہٹو گے، جب تک تم حقیقت اور سچائی کا دفاع کرتے رہو گے، جب تک ہمارے اہلبیت کا دفاع کرتے رہو گے۔ ایک شاعر کے بارے میں، پیغمبر اکرمؐ ان خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔

ائمہؑ کے زمانے کے شعراء نے کیسی کیسی خدمتیں انجام دی ہیں! تاریخ اسلام میں عربی اور فارسی زبانوں میں حماسی اور توحیدی اشعار موجود ہیں۔ (بلکہ اور زبانوں جیسے ترکی اور اردو میں بھی ہیں)۔ عربی اور فارسی زبانوں میں پندو موعظت سے متعلق غیر معمولی اشعار ہیں۔ یہ اسلامی کلچر کا نتیجہ ہیں۔ جو اثر شعر میں ہوتا ہے وہ نثر نہیں کر سکتی۔ نہج البلاغہ کی حیرت انگیز بات یہی ہے کہ نثر ہے لیکن اتنی فصیح اور دلکش ہے کہ شعر سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ آپ فارسی نثر کا کوئی ایک صفحہ بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے جو سعدی کے شعر کے ایک صفحے کے برابر ہو سکے حالانکہ فارسی زبان میں عمدہ نثر بہت زیادہ ہے جیسے خواجہ عبداللہ انصاری کے کلمات قصار (مختصر کلمات) یا سعدی کی نثر۔

مولانا رومی کی اس قدر شعری توانائی کے باوجود جب آپ ان کی وعظ کی مجلسوں میں جائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں کچھ بھی نہیں ہے یعنی انہوں نے جو کچھ نثر میں کہا ہے وہ کچھ بھی وقیع نہیں ہے۔ عربی زبان میں بھی ایسی نثر نہیں ملتی جس میں نہج البلاغہ کی سی غیر معمولی قوت پائی جاتی ہو۔ شعر نے اپنے قالب میں بہت کام کیا ہے اور بہت کام کر سکتا ہے۔ شعر بہت برا بھی ہو سکتا ہے اور اچھا بھی

۱۔ (الغدیر جلد ۲ صفحہ ۳۴) (الغدیر کی عبارت میں روح القدس کے بعد ما نصر تابلسانک کا جملہ آیا ہے

ہو سکتا ہے۔ حکمت پر شعر، توحید پر شعر، معاد پر شعر، نبوت پر شعر، پیغمبر اکرمؐ پر نعتیہ شعر، ائمہ اطہارؑ پر تعریفی شعر، قرآن کے بارے میں شعر، مرثیے اور عزا کے شعر بشرطیکہ ائمۂ اطہار کے زمانے کے اشعار کی طرح اچھے ہوں بہت اثر آفریں ہو سکتے ہیں۔

میں نے کسی وقت اپنی تقریروں میں کہا تھا کہ ان مرثیوں میں جو کمیت یا خزاعی کہتے تھے اور ان مرثیوں میں جو آخری زمانوں میں جوہری اور محتشم جیسوں نے کہے ہیں بہت فرق ہے۔ ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلے بہت سبق آموز ہیں اور یہ سبق آموز نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو حقیقت میں مضر ہیں۔

علامہ اقبال واقعی ایک گراں قدر اسکالر ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جس نے اسلام کا پیام پہنچانے کا کام اپنے ذمے لیا اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ہر اچھا اور شرعاً جائز وسیلہ استعمال کیا۔ اس نے جو وسائل استعمال کئے ان میں سے ایک وسیلہ شعر کا ہے۔ فارسی زبان کے شاعروں میں خاص طور پر آخری زمانوں میں مقصد کے نقطۂ نظر سے بلا شبہ اقبال کی سی شاعری نہیں ملتی۔ اگر شعر شاعر کے حصول مقصد کا وسیلہ ہو تو پھر اس کی کوئی نظیر نہیں ہو سکتی۔ اقبال کو چونکہ سرود (بزمیہ اشعار) کہنا تھا اس لئے سرود کہتا تھا۔ اس غیر معمولی سرود کا جو عربی میں ترجمہ ہوا ہے وہ اس نے اردو میں کیا ہے۔ پچھلے برسوں میں آقا سید محمد علی سفیر نے اس سرود کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو حسینیہ ارشاد میں سنایا جاتا تھا۔ کتنا عمدہ اور نفیس تھا! میں خود یہ سرود سن کر رویا ہوں اور میں نے بارہا دوسروں کو بھی روتے دیکھا ہے۔ ہم سرود سے کیوں نہ کام لیں؟ یہ بھی وسیلہ ہے۔ آج وسیلے سے غفلت نہیں برتنی چاہئے۔ آج کے نئے زمانے میں ایسے ایسے وسیلے ایجاد ہو گئے ہیں جو پہلے زمانے میں نہیں تھے۔ ہمیں صرف قدیم وسیلوں کو کافی نہیں سمجھنا چاہئے صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ کون سا وسیلہ شرعاً جائز ہے اور کون سا ناجائز۔

خود حضرت امام حسین علیہ السلام حالات و واقعات کی اس گرما گرمی میں بھی جو وسیلہ بھی ممکن ہوتا تھا اسے اپنا پیام اور اسلام کا پیام پہنچانے کیلئے استعمال کرتے تھے۔ مکہ سے کربلا تک کے سفر میں اور کربلا پہنچنے کے وقت سے شہادت تک حضرت امام حسین علیہ السلام نے جو تقریریں فرمائی ہیں وہ غیر معمولی طور پر جوش، ولولہ انگیز، جذباتی اور غیر معمولی طور پر دلکش، فصیح اور بلیغ ہیں۔ جس فرد واحد کی تقریریں امیر المئومنینؑ کی تقریروں کا مقابلہ کر سکتی ہیں وہ حضرت امام حسینؑ ہیں بلکہ بعضوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی روز عاشور کی تقریریں حضرت امیر علیہ السلام کی تقریروں سے برتر ہیں۔ آپ جس وقت مکہ سے نکلنا چاہتے ہیں۔ دیکھئے اپنا مقصد اور مدعا کتنی عمدہ زبان اور کتنی دلکشی اور فصاحت سے بیان فرماتے ہیں۔

ان خوبیوں کو سمجھنے کے لئے جو قرآن مجید، پیغمبر اکرمؐ کے کلمات، ائمہ اطہارؑ کے کلمات، دعاؤں اور تقریروں میں ملتی ہیں عربی زبان سے خوبی واقفیت درکار ہے۔ فارسی ترجمہ میں انکا مفہوم جیسا کہ چاہئے ادا نہیں ہو پاتا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں: موت انسان کی گردن کی زینت ہے۔ موت اسی طرح انسان کی زیب و زینت اور فخر و ناز کا سبب ہے جس طرح کسی دوشیزہ کے لئے گلوبند۔ اے لوگو! میں نے ہر شے کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میں جان دینے والا عاشق ہوں۔ میں اپنے بزرگوں کے دیدار کا عاشق ہوں۔ جس طرح حضرت یعقوبؑ حضرت یوسفؑ کے دیدار کے عاشق تھے۔ اس کے بعد اپنا یہ اطمینان قلب ظاہر کرنے کے لئے کہ میرا مستقبل تابناک ہے اور لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کہ مبادا تم یہ سمجھ بیٹھو کہ میں دنیا کی ظاہری کامیابی حاصل کرنے کی امید میں جا رہا ہوں۔ نہیں بلکہ میں اپنے مستقبل کو اس طرح جانتا ہوں جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اس صحرا میں بیابانی

بھیڑیے اور بھیڑیوں جیسے انسان میرا جوڑ جوڑ الگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، آپ فرماتے ہیں: "رضی الله رضانا اہل البیت" (۱) ہم اہل بیت اس چیز سے راضی ہیں جس سے خدا راضی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جسے خدا نے پسند کیا ہے تو ہم بھی اسی راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ خدا کی رضا ہماری رضا ہے۔ صرف تین چار خط سے زیادہ نہیں ہیں لیکن ایک پوری کتاب سے زیادہ طاقت اور اثر بخشتے ہیں۔ آخر میں جب لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور تم سے کیا چاہتا ہوں تو فرماتے ہیں:

جو ہمارے راستے میں اپنے دل کا خون دینے پر آمادہ ہے، جس نے اپنے خدا سے ملاقات کا پکا ارادہ کر لیا ہے، تیار رہے ہم کل صبح کوچ کریں گے۔ عاشور کی رات کو ہم دل پذیر، عمدہ اور اونچی اونچی آوازیں اور قرآن مجید کی تلاوت سنتے ہیں۔ ایسی ایسی گنگناہٹیں اور شور سنتے ہیں جو دشمن کے دل پر بھی اثر کرتے ہیں اور انہیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ میں نے کل رات کو عرض کیا تھا کہ مدینے سے جو اصحاب حضرتؑ کے ہمراہ آئے تھے ان کی تعداد بہت کم تھی۔ شاید بیس اشخاص بھی نہیں ہوں گے کیونکہ ایک جماعت راستے میں ہی الگ ہو کر چلی گئی تھی۔ آخری بہتر ۷۲ افراد میں سے بہت سے ایسے تھے جو کربلا میں ہی آکر آپ سے ملے تھے اور پھر ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو عمر ابن سعد کے لشکر سے الگ ہو کر حضرت امام حسین علیہ السلام کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے ان میں کچھ ایسے بھی تھے کہ جب اس خیمے سے گزر رہے تھے تو عمدہ اور دلکش زمزمے کی آواز سنتے تھے۔ قرآن کی تلاوت، خدا کی تسبیح، رکوع اور سجدہ کا ذکر، حمد کی سورت اور دوسری سورتوں کی آواز۔ یہ آواز

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۶۷، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۱۹۳، اللہوف صفحہ ۲۵، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۲۹

انہیں موہتی اور مدہوش کر دیتی تھی۔ یعنی حضرت ابا عبد اللہؑ اور آپ کے اصحاب جس قسم کے وسیلے کا استعمال بہتر طور پر ہو سکتا تھا کر لیتے تھے۔ یہاں تک کے ہم ان باقی دوسرے وسائل کو دیکھتے ہیں جو حضرت امام حسین علیہ السلام نے صحرائے کربلا میں استعمال کئے تھے۔ آپ نے خود مناظر اس طرح ترتیب دیئے تھے جیسے کوئی تاریخی نمائش لگا دی ہو، جو تاریخ کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی نمائش کی صورت میں قیامت تک باقی رہیگی۔

لکھا ہے کہ جب تک اصحاب زندہ رہے جب تک ان میں کا ایک شخص بھی باقی رہا انہوں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ منظور ہی نہیں کیا کہ پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ میں سے، امام حسینؑ کے خاندان کا، ان کے بیٹوں، بھتیجوں، بھائیوں اور چچیرے بھائیوں میں سے کوئی ایک شخص بھی میدان جنگ میں چلا جائے۔ وہ کہتے تھے آقا ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اپنا فریضہ ادا کریں۔ جب ہم مارے جائیں تب آپ دیکھ لیجئے گا۔ پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ انتظار میں تھے کہ ان کی باری آئے۔ جیسے ہی امام حسین علیہ السلام کے اصحاب کا آخری شخص شہید ہوا پیغمبرؐ کے خاندان کے جوانوں میں اچانک ولولہ اٹھا۔ سب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لکھا ہے" فجعل یودع بعضہم بعضاً "انہوں نے ایک دوسرے کو وداع کرنا، ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنا، گلے ملنا اور ایک دوسرے کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔

اہل بیت پیغمبرؐ کے جوانوں سے جو پہلا جوان اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا وہ امام حسینؑ کے جوان اور رشید بیٹے حضرت علی اکبر تھے جن کے متعلق خود امام حسین علیہ السلام نے گواہی دی ہے کہ وہ جسم، صورت، اخلاق و عادات اور گفتگو میں پیغمبرؐ سے ملتے جلتے تھے۔ بات کرتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے پیغمبرؐ بول رہے

ہیں۔ صورت شکل اور چال ڈھال میں اس قدر مشابہ تھے کہ خود امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا: اے خدا! تو خود جانتا ہے کہ میں جس وقت اپنے جد بزرگوار پیغمبر اکرمؐ کی زیارت کرنا چاہتا تھا تو اس جوان کو دیکھ لیا کرتا تھا۔ وہ پیغمبرؐ کا مکمل عکس تھے۔ یہ جوان باپ کے پاس آیا۔ بولا بابا جان مجھے جہاد کی اجازت دیجئے۔ بہت سے اصحاب خصوصاً جوانوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب اجازت لینے حضرت کی خدمت میں آتے تھے تو حضرت کسی نہ کسی طرح کا عذر یا تاخیر کر دیا کرتے تھے جیسا کہ آپ نے جناب قاسم کے واقعے میں بار بار سنا ہوگا۔ لیکن جس وقت جناب علی اکبر آتے ہیں اور میدان جنگ کی اجازت چاہتے ہیں تو آپ صرف اپنا سر جھکا دیتے ہیں اور جوان میدان کو روانہ ہو جاتا ہے۔

لکھا ہے حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنی نیم باز آنکھوں سے جیسی کہ غنودگی میں ہوتی ہے "ثم نظر الیه لآئس" (۱) جناب علی اکبر کو یوں دیکھا جیسے کوئی مایوس شخص اپنے جوان کو دیکھتا ہے۔ آپ نے اپنی مایوس نگاہوں سے اپنے جوان کو دیکھا، چند قدم ان کے پیچھے پیچھے گئے۔ اس وقت فرمایا اے خدا! تو گواہ رہنا کہ ان ظالموں سے لڑنے کے لئے وہ جوان جا رہا ہے جو سب لوگوں سے زیادہ بہتر ہے پیغمبرؐ کا ہم شکل ہے۔ ایک جملہ عمر ابن سعد سے بھی فرمایا۔ اتنی بلند آواز سے کہا کہ عمر ابن سعد نے بھی سنا: "یابن سعد قطع الله رحمك" (۲) خدا تیری نسل قطع کرے جس طرح تو نے اس فرزند سے میری نسل قطع کی۔ امام حسین علیہ السلام کی اس دعا کے بعد دو تین سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مختار نے عمر ابن سعد کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد عمر ابن سعد کا بیٹا اپنے باپ کی سفارش اور جاں بخشی کے لئے مختار

۱۔ اللہوف صفحہ ۴۷

۲۔ اللہوف صفحہ ۴۷، مقتل علی اکبر (مقرم) صفحہ ۷۶، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۳۱، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۳۰، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۴۳

کے دربار میں پہنچا۔ مختار کے دربار میں عمر ابن سعد کا سر اس طرح لائے تھے کہ اس پر ایک کپڑا ڈھانک کر مختار کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اب اس کا بیٹا باپ کی جاں بخشی کے لئے پہنچا تو اس سے پوچھا گیا کیا تو اس سر کو جو یہاں رکھا ہوا ہے پہچانتا ہے؟ جیسے ہی وہ کپڑا ہٹایا تو اس نے دیکھا کہ اس کے باپ کا سر ہے۔ ایک دم اپنی جگہ سے بھاگا۔ مختار نے حکم دیا اسے بھی باپ کے ہمراہ روانہ کر دو۔

تو جس وقت حضرت علی اکبر میدان میں جا رہے تھے یہ منظر تھا۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ جناب علی اکبر نے نہایت بہادری اور بے مثال سرفروشی سے جنگ کی۔ جب بہت زیادہ لڑ چکے تو اپنے پدر بزرگوار کی خدمت میں واپس آئے۔ اب یہ ایک تاریخی معما ہے کہ آپ کا کیا مقصد تھا اور آپ کس لئے آئے تھے؟! عرض کیا۔ بابا جان "العطش قد قتلنی" پیاس مجھے مارے ڈالتی ہے۔ ان ہتھیاروں کے بوجھ نے مجھے بہت تھکا دیا ہے۔ اگر ذرا سا پانی میرے حلق میں پہنچ جائے تو جسم میں جان آجائے اور میں پھر جا کر لڑوں۔ اس بات نے باپ کو تڑپا دیا۔ وہ فرماتے ہیں میرے بیٹے! دیکھ لو میرا منہ تو تمہارے منہ سے بھی زیادہ خشک ہے البتہ میں تم سے یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ تم اپنے جد بزرگوار پیغمبر خداؐ کے ہاتھ سے پانی پیو گے۔ یہ جوان میدان کو واپس جاتا ہے اور پھر لڑتا ہے۔

حمید بن مسلم نام کا ایک شخص ہے جسے اصطلاح میں راوی حدیث کہتے ہیں۔ وہ کربلا کے میدان میں بطور خبر نگار (رپوٹر) رہا ہے لیکن وہ لڑائی میں شریک نہیں تھا۔ اس نے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے: میرے پاس ایک شخص تھا۔ جس وقت حضرت علی اکبر حملہ کرتے تھے تو ان کے سامنے سے لوگ بھاگ جاتے تھے۔ وہ شخص ناراض ہوتا تھا۔ خود بھی بہادر آدمی تھا۔ کہنے لگا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر یہ جوان میرے پاس سے گزرا تو میں اس کے باپ کے دل پر اس کا داغ ضرور

لگاؤں گا۔ میں نے اس سے کہا تجھے کیا مطلب۔ جانے بھی دے اور آخر لوگ اسے مار ہی ڈالیں گے۔ اس نے کہا۔ نہیں! جیسے جناب علی اکبر اس کے نزدیک سے گزرے اس نے ان پر بے خبری میں اچانک حملہ کر دیا اور اس قوت سے جناب علی اکبر کو نیزہ مارا کہ پھر ان میں طاقت نہیں رہی اور انہوں نے اپنے ہاتھ گھوڑے کی گردن میں ڈال دئے چونکہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے فریاد کی: "یا ابتاہ ہذا جدی رسول اللہ"۔(۱) بابا جان! میں اس وقت اپنے جد کو اپنی باطنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں اور پانی پی رہا ہوں۔ گھوڑا جناب علی اکبر کو دشمن کے لشکر میں لے گیا، وہ گھوڑا جس گھوڑے پر واقعی کوئی سوار نہیں تھا وہ لوگوں کے درمیان چلا گیا۔ یہاں ایک عجیب جملہ لکھا ہے: " فاحتملہ الفرس الی عسکر الاعداء فقطّعوہ بسیوفھم ارباً اربا"(۲)

ولا حول ولا قوت الا باللہ العلی العظیم

و صلی اللہ علی محمد و آلہ الطاھرین

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۴۴، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۳۱، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۲۴، مقتل العواصم صفحہ ۹۵

۲۔ مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۲۴، مقتل العواصم صفحہ ۹۵، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۴۴، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۳۱، یہی عبارت مختلف مضامین کے ساتھ اعلام الوری صفحہ ۲۴۲، فی رحاب ائمہ اہل البیت جلد ۳ صفحہ ۱۲۷، الکامل فی التاریخ جلد ۴ صفحہ ۷۴، مناقب ابن شہر آشوب صفحہ ۱۰۹، اللہوف صفحہ ۴۸، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۹ پر بھی نقل کی ہوئی ہے۔

تیسری مجلس

تبلیغ کا طریقہ

اعوذُ باللہ من الشیطان الرّجیم

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

الّذین یبلّغون رسالات اللہ و یخشونہٗ ولا یخشون احداً الّا اللہ و کفی باللہ حسیباً(۱)

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حسینی تحریک کا ایک پہلو اس کا تبلیغی پہلو ہے۔ تبلیغ آج کے اصطلاحی معنوں میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی معنوں میں یعنی لوگوں تک اپنا پیام پہنچانا جو پیام اسلام ہی ہے، لوگوں تک اسلام کی آواز پہنچانا۔ دیکھئے امامؑ نے اپنے اس سفر اور تحریک میں کون کون سی روشیں استعمال کیں جو خاص طور پر تبلیغی اہمیت رکھتی ہیں۔ یعنی اس نظر سے زیادہ قیمتی اور اہم ہیں کہ امام حسینؑ نے ان طریقوں سے اپنا مقصد اور ہدف اور اسلام کی حقیقی آواز جو آپ کے گلے سے نکلتی تھی بہترین انداز میں لوگوں تک پہنچادی۔ سب سے پہلے ہم اسلوب کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جسے آج کل روش کہتے ہیں۔

ہر کام میں کامیابی کی ایک شرط صحیح صحیح روش اور اسلوب کا اپنانا بھی ہے۔

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

مثلاً آپ دیکھتے ہیں کہ علم طب کی قسم تو وہی ہے لیکن بعض اوقات طبیبوں یا جراحوں کے کام کا ڈھنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض کی عملی روش اور اسلوب دوسروں سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔

ایک مسئلہ علم قدیم اور علم جدید کو ملانے سے متعلق بھی درپیش ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک زمانے یعنی عہد کو علم جدید کا عہد کہتے ہیں لیکن حقیقت میں علم قدیم اور جدید نہیں ہوتا البتہ ایک عہد کو علم کا جدید عہد کہہ دیتے ہیں۔ علم کے نئے اور پرانے عہد یا دور کا فرق کس بات میں ہے؟ جدید دور میں علم نے غیر معمولی تیزی اور ترقی دکھائی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے علم کے پہیّے کے سامنے سے ایک دم جو رکاوٹ دور کردی تو علم نے تیزی سے سفر شروع کردیا جبکہ علم کا سفر پرانے دور میں سست تھا۔ لیکن دور جدید میں اس تیزی کا سبب کیا ہے؟ کیا پاستر جیسے جدید علماء بقراط، جالینوس اور بو علی سینا جیسے قدیم علماء کے مقابلے میں زیادہ ذہانت رکھتے ہیں؟ دوسرے الفاظ میں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید دنیا میں غیر معمولی قسم کے لوگ پیدا ہوئے جبکہ دنیائے قدیم میں ایسے اشخاص اور مفکر نہیں تھے؟ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ آج شاید کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ پاستر یا دوسرے لوگوں کی ذہانت ارسطو، افلاطون، بو علی سینا، بقراط، جالینوس یا خواجہ نصیر طوسی سے زیادہ رہی ہے پھر بھی ان لوگوں کے کام کی تیزی اور کامیابی بڑھی ہوئی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟!

کہتے ہیں کہ اس کا راز یہ ہے کہ یکایک علماء کا اسلوب بدل گیا۔ جس وقت سے تحقیق میں علماء کا اسلوب بدلا علمی ترقی میں تیزی زیادہ آگئی۔ کامیابیوں میں اسالیب کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ کسی ذہین، ہوشیار، باصلاحیت

اور نہایت قابل شخص کو کسی ادارے کا سربراہ مقرر کردیں پھر بھی وہ ادارے کو نہ چلا سکے۔ دوسرے شخص کو جو اس کے برابر حافظہ، ہوش، استعداد اور سمجھ کے لحاظ سے قابلیت اور ذہانت نہیں رکھتا اسی ادارے کا سربراہ مقرر کرتے ہیں اور وہ ادارے کو بہتر طور پر چلاتا ہے اس وجہ سے کہ اس کا اسلوب اور روش بہتر ہے۔

ہم ایک اور واضح اور روشن مثال پیش کرتے ہیں: ہم نے کئی بار ایسے لوگ دیکھے ہیں جو بہت ہوشیار، مستعد اور بہت یاد داشت والے ہیں لیکن سیکھنے میں یہ ان لوگوں سے کم کامیاب ہیں جو ہوش، حافظہ اور کام کرنے کی طاقت میں ان سے نچلے درجے پر ہیں۔ کیوں؟! اس وجہ سے کہ ان کا کام کرنے کا طریقہ بہتر ہے۔ مثلاً ایک بہت اچھی یاد داشت رکھنے والا آدمی ممکن ہے رات دن میں سولہ گھنٹے لگا تار کام کرے لیکن کس طرح؟ کسی کتاب کا شروع سے آخر تک مطالعہ کرتا ہے۔ پھر فوراً ہی دوسری کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے جبکہ پہلی کتاب کسی ایک فن کی ہے اور دوسری کتاب دوسرے فن سے متعلق ہے۔ پھر ایک اور کتاب، پھر ایک اور سبق۔ لیکن ایک اور شخص ممکن ہے آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرپائے پہلے کتاب کو دھیان دے کر دھیرے دھیرے پڑھتا ہے۔ اس کے ایک بار پڑھ لینے پر اکتفا نہیں کرتا۔ اسی کتاب کو ایک بار پھر پڑھتا ہے اور دوسری کتاب اس وقت تک ہاتھ میں نہیں لیتا جب تک اس کتاب کی باتیں اس کے ذہن نشین نہیں ہوجاتیں۔ وہ اس پر بھی قناعت نہیں کرتا بلکہ تیسری بار کہ اس میں سے جو خاص خاص اور اچھی باتیں نوٹ کی ہیں اور جنہیں وہ ضروری اور اہم سمجھتا ہے۔ کتاب کے ورقوں میں کاغذ کی نشانیاں رکھ رکھ کر انہیں یاد کرتا ہے یعنی اپنے لئے کتابوں کے یاد کرنے کا ایک ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے کہ آخر عمر تک جب پڑھے اس کا مطلب تلاش کرسکے۔ جب اس نے یہ ایک کتاب ختم کرلی تو اسی موضوع سے متعلق دوسری کتابیں پڑھتا ہے۔ بہت دن کے بعد

اس قسم کی کتابیں پڑھنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے پھر دوسری قسم کی کتابوں کے سلسلے کا رخ کرتا ہے لیکن جو آدمی آج ایک کتاب، کل دوسری کتاب اور پرسوں کسی اور کتاب کا مطالعہ کرتا ہے وہ ایسے شخص کی طرح ہوتا ہے جو ایک نوالہ اس غذا سے دو لقمے اس غذا سے، چار لقمے ایک اور قسم کی غذا سے، اور پانچ لقمے اس سے بھی مختلف غذا سے لیکر کھاتا ہے اور آخر میں اپنا معدہ خراب کر لیتا ہے۔ وہ کوئی کام پورا نہیں کر پاتا۔ اس بات کا تعلق اسلوب، روش اور ڈھنگ سے ہے۔

تبلیغ کے صحیح اور اصلی معنی لوگوں تک پیام پہنچانا اور پہنچوانا ہیں۔ لوگوں کو ایک پیام سے آگاہ کرنا، لوگوں کو کسی پیام کا مقصد بتانا، اس کی طرف مائل کرنا اور ان کی نظر اور توجہ مبذول کرانا ہے۔ پیام پہنچانے کے لئے صحیح اور درست اسلوب اور روش کی ضرورت ہوتی ہے اور صرف صحیح روش اختیار کرنے ہی سے تبلیغ کامیاب ہوگی۔ اگر آپ اس کی مخالف روش اختیار کریں گے تو نہ صرف یہ کہ نتیجہ موافق نہیں نکلے گا بلکہ نتیجہ الٹا ہوگا۔ جب انسان کسی بات پر غور کرے گا اور توجہ دیگا اور پھر اس بات سے متعلق قرآنی آیات تلاش کر کے ان پر غور و فکر کریگا تو اسے معلوم ہوگا کہ قرآنی آیات سے کیسے کیسے نکات حاصل ہوتے ہیں۔ ہر موضوع سے متعلق یہی حال ہے چنانچہ ایسا ہی تبلیغ کا موضوع بھی ہے۔

قرآن کریم نے تبلیغ کا اسلوب اور طور طریقہ یا تو خود ہی براہ راست یا پیغمبروں کی زبان سے بیان کیا ہے۔ قرآن کریم نے تبلیغ کے اسلوب سے متعلق جس بات پر اصرار کیا ہے وہ کلمۂ "البلاغ المبین" ہے یعنی صاف، سیدھی اور ظاہر تبلیغ اور ابلاغ۔ اس واضح روشن لفظ سے کیا مراد ہے؟ اس کا مطلب ہے پیام کا سادہ اور سلیس ہونا تاکہ دوسرا شخص (یعنی مخاطب) اسے نہایت آسانی اور سہولت سے سمجھ سکے۔

پیغمبروں کی تبلیغ میں پیچیدہ، مشکل، گرہ دار، لپیٹی ہوئی باتیں نہیں ہوتی تھیں نہ زیادہ اصطلاحات سے کام لیتے تھے اور نہ ایسے جملے ہوتے تھے جنہیں سمجھنے کے لئے آپ کو عرصے تک تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت پڑے۔ وہ لوگ اپنی باتیں بالکل سیدھے سادے طریقے سے اور کھول کر بیان کرتے تھے۔ جس طرح بڑے بڑے عالم انہیں سمجھتے اور ان سے نتیجہ نکالتے تھے بالکل اسی طرح ان پڑھ اور گئے گذرے جاہل لوگ بھی کم سے کم اپنی جگہ اور اپنی استعداد کے مطابق ان سے نتیجہ نکالتے اور فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ (میں یہ نہیں کہونگا کہ سب ایک سا فائدہ اٹھاتے تھے)۔

جو مبلغ اور پیغام پہنچانے والا پیغمبروں کی زبان میں بات کرنا چاہتا ہے، پیغمبروں کی طرح بولنا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ ان کا طرز اختیار کرے تو اس کی پیغام رسانی بھی واضح پیغام رسانی ہونا چاہئے۔ یہ مبین کے معنی کی ایک بہت ہے۔ لیکن اس مقام پر دوسرے احتمالات بھی ہیں (اور یہ سب کے سب ممکن ہے درست بھی ہو سکتے ہیں)۔ لفظ مبین کے ایک معنی کھلم کھلا بات کرنی بھی ہو سکتے ہیں یعنی پیغمبر نہ صرف مشکل اور پیچیدہ بات نہیں کہتے تھے بلکہ لوگوں سے بے جھجک، ضروری اور صاف صاف گفتگو کرتے تھے۔ اشاروں کنایوں سے کام نہیں لیتے تھے۔ اگر یہ محسوس کرتے تھے کہ بات کہہ دینا چاہئے تو وہ لوگوں سے کھل کر صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا کرتے تھے۔ " اتعبدون ما تنحتون؟"(۱) کیا تم لوگ اپنے ہی تراشے ہوؤں کو پوجنے پر تلے ہوئے ہو؟

دوسری بات جس پر قرآن مجید تبلیغ کے معاملے میں تکیہ کرتا ہے "نصح" کہلاتی ہے۔ ہم بالعموم نصح کا ترجمہ خیر خواہی کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ

۱۔ سورۂ صافات آیت ۹۵

معنی بھی ٹھیک ہے لیکن بظاہر لفظ خیر خواہی سے نصح کے مکمل معنی ادا نہیں ہوتے، اس کے معنی کا ایک جزو ادا ہوتا ہے۔ بظاہر "نصح" کا مقابل لفظ یعنی ضد "غش" ہے۔ اگر آپ کسی کو دودھ فروخت کریں تو یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اسے خالص دودھ دیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں پانی ملا کر دیں یا آپ کسی کو سونے کا سکہ دینا چاہیں تو ممکن ہے اسے خالص شکل میں (عام معیار کے مطابق) دیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کھوٹ ملا ہوا (کھوٹا) سکہ دے دیں۔ نصح کا لفظ غش کی ضد ہے۔ ناصح دراصل وہ شخص ہے جو پورا پورا خلوص بھی رکھتا ہو۔ توبۂ نصوح کے معنی خالص توبہ کے ہیں۔ مبلغ کو بھی خالص اور مخلص اور ناصح ہونا چاہئے۔ یعنی اس کی گفتگو میں اس پیغام کے پہنچانے کے علاوہ اس کے مخاطب کی بھلائی ہو، اس کی کوئی ذاتی غرض یا مقصد نہ ہو۔ دوسرا مسئلہ اخلاص اور خلوص کا ہے۔ "النّاس کلّهم هالکون الّا العالمون والعالمون هالکون الّا العاملون والعاملون هالکون الّا المخلصون والمخلصون علیٰ خطر عظیم۔" آگاہوں اور عالموں کے علاوہ باقی سب لوگ ہلاک ہونے والے ہیں (جاہل کوئی تدبیر نہیں کر سکتا) اور عالم بھی ہلاک ہونے والے ہیں بجز ان کے جو عامل ہیں اور عمل کرتے ہیں یعنی بے عمل عالم بھی ہلاک ہونے والے ہیں اور وہ عامل ہلاک ہونے والے ہیں جو مخلص نہیں ہیں اور مخلص لوگ برابر خطرے میں ہیں۔

یہ واقعہ میں نے مجلسوں میں بار بار بیان کیا ہے: آیت اللہ بروجردی مرحوم اعلی اللہ مقامہ سے یہ بات نقل کی گئی ہے۔ وہ مرض الموت میں مبتلا تھے (دو ایک دن بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا)۔ کچھ لوگ ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہمارے یاد رکھنے کے لئے بھی اور دوسروں کی نصیحت کے لئے بھی کوئی جملہ فرما دیجئے۔ انہوں نے کہا۔ آقا ہم جا رہے ہیں لیکن ہم کوئی کام نہیں کر سکے اور نہ خدا

کے پاس ہماری جمع کی ہوئی کوئی پونجی ہے۔ ایک صاحب نے سوچا یہ تعریف کرنے کا موقع ہے۔ بولے: جناب آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ایسا کیا، ایسا کیا، مسجد بنائی، مدرسہ بنایا، حوزہ علمیہ قائم کیا وغیرہ وغیرہ..... جیسے ہی ان صاحب نے یہ باتیں کیں تو انہوں نے حاضرین کی طرف رخ کیا اور حدیث کا ایک جملہ دہرا کر خاموش ہو گئے۔ آپ نے فرمایا: "خلّص العمل فانّ النّاقد بصیر بصیر۔"(۱) عمل کو اچھی طرح سپرد کر دے کہ جو ناقد ہے وہ نقد کریگا۔ جو صراف اس سکے کو پرکھے گا وہ خوب واقف ہے۔ اخلاص کا مسئلہ کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بھی بظاہر تمام انبیاءؑ کی زبان سے یہ بات کہلواتا ہے کہ "ما اسئلکم علیه من اجر"(۲) میں تم سے اپنی تبلیغ کی کوئی اجرت نہیں چاہتا کیونکہ میں ناصح (نصیحت کرنے والا) ہوں اور ناصح اور خیر خواہ کو اپنے عمل میں انتہائے اخلاص رکھے۔

ایک اور مسئلہ پر متکلف نہ ہونے کا ہے۔ تکلف مختلف موقعوں پر کیا جاتا ہے اور اس کے حقیقی معنی اپنے آپ سے کسی شئے کا باندھ لینا یا چپکا لینا ہیں یعنی انسان کوئی چیز زبردستی اپنے آپ سے باندھ لے یا اپنے اوپر لازم کرلے۔ تکلف گفتگو میں بھی کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے سخن میں فصیح و بلیغ ہونے کی بجائے تصنع کے ساتھ بولتے ہیں انہیں پر تکلف یا بناوٹی کہتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کے سامنے اپنی گفتگو میں پر تکلف یعنی بناوٹی لفظ بول رہا تھا تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "انا و اتقیاء امّتي براءٌ من التکلّف۔" میں اور میری امت کے پرہیزگار بناوٹی گفتگو سے بری ہیں اور پرہیز کرتے

۱۔ مواعظ العددیہ صفحہ ۱۲۴

۲۔ سورۂ (ص) آیت ۸۶

ہیں۔ تکلف فصاحت کے خلاف ہے۔ در حقیقت فصاحت خود گفتگو کی روانی ہے اور اس کا تکلف اور تعقید سے خالی ہونا ہے تبلیغ کے سلسلے میں پیغمبروں کی زبان پر آیا ہے: "ما انا من المتکلفین"(۱) جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے اس جملے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں بات چیت میں متکلف نہیں ہوں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں اس بات میں پُر تکلف نہیں ہوں یعنی میں جس چیز کو نہیں جانتا اور جو میرے نزدیک اتنی پکّی، واضح اور پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچی ہوئی ہے جتنی کہ ہونا چاہئے میں اسے بیان نہیں کرتا۔ لوگوں کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کرتا کہ میں سمجھ گیا جبکہ اس کی میں خود ابھی تک توجیہہ نہیں کرپایا ہوں۔

مجمع البیان میں اس آیت کے سلسلے میں عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ "ایّھا النّاس من علم شیئاً فلیقل" (۲) اے لوگو! جو کوئی بات جانتا ہے وہ کہے "ومن لم یعلم"(۳) اور جو کوئی بات نہیں جانتا "فلیقل اللّٰہ اعلم"(۴) پس کہو کہ خدا بہتر جانتا ہے۔" فانّ من العلم ان یقول لا یعلم اللّٰہ اعلم" (۵) یہ بھی ایک علم ہے کہ انسان اپنے عدم علم سے واقف ہو۔ سیدھا سادہ جاہل ہو۔ کم سے کم اتنا جانتا ہو کہ وہ نہیں جانتا (خود جانتا ہو کہ نہیں جانتا) اس بات کا مان لینا خود علم کا ایک درجہ ہے۔ پھر عبد اللہ ابن مسعود نے یہ آیت پڑھی: "فانّ اللہ تعالی قال لنبیّہ قل ما اسئلکم علیہ من اجر و ما انا من المتکلفین" (۶) معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ ابن مسعود نے جو رسول اکرمؐ کے بڑے صحابی ہیں اس جملے: "ما انا من المتکلفین" کا یہ مطلب لیا ہے کہ جو شخص جو کچھ جانتا ہے وہ لوگوں کو بتادے اور جو نہیں جانتا اس کے لئے کہہ دے کہ میں نہیں جانتا۔ ابن جوزی جو ایک مشہور

۱۔ ایضاً

۲-۳-۴-۵-۶۔ مجمع البیان جلد ۸ صفحہ ۴۸۶

مقرر گذرے ہیں ایک بار منبر کی تیسری سیڑھی پر بیٹھے تھے۔ ایک عورت آئی اور اس نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا میں نہیں جانتا۔ عورت نے کہا اگر تم نہیں جانتے تو تیسری سیڑھی پر کیوں بیٹھے ہو؟ انہوں نے جواب دیا جن تین سیڑھیوں پر میں بیٹھا ہوں وہ ان باتوں کے لئے ہیں جنہیں میں جانتا ہوں اور تم لوگ نہیں جانتے۔ اگر لوگ یہ چاہیں کہ ان باتوں کے لحاظ سے منبر بنائیں جو میں نہیں جانتا تو انہیں ایسا منبر بنانا چاہئے جس کی سیڑھیاں اوپر چاند تک پہنچیں۔

شیخ انصاری ہمارے ایک بڑے عالم ہیں۔ وہ علمی لحاظ سے بھی، فقہ اور اصول کے دو فنون میں واقعی محقق اور اول درجے کے علماء میں شامل ہیں اور پرہیزگاری کے لحاظ سے بھی۔ اسی لئے جب لوگ ان کے بارے میں بات کرتے تھے تو مبالغے سے کام لیتے تھے مثلاً یہ کہتے تھے کہ جناب سے آپ جو کچھ پوچھنا چاہیں وہ جانتے ہیں۔ نا ممکن ہے کوئی بات نہ جانتے ہوں (شوشتری بھی گزرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ آخری عمر تک خوزستانی لہجہ حفظ کرتے رہے تھے) جب ان سے کوئی مسئلہ (شرعی مسئلہ) پوچھتے تھے، باوجودیکہ مجتہد تھے، اگر انہیں معلوم نہیں ہوتا تھا تو اونچی آواز سے کہہ دیا کرتے تھے کہ میں نہیں جانتا کہ سننے والا اور شاگرد بھی سمجھ جائیں کہ اپنے نہ جاننے یعنی ناواقفیت یا لاعلمی کو مان لینا کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔ جب ان سے کوئی ایسی بات پوچھتے تھے جسے وہ جانتے تھے تو مخاطب کو اتنا آہستہ سے بتادیا کرتے تھے کہ وہ خود سمجھ جائے اور جب وہ نہیں جانتے تھے تو اونچی آواز سے کہہ دیتے تھے: میں نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا۔

ایک اور بات جو قرآن مجید پیغمبروں کی تبلیغی روش اور طور و طریقے کے سلسلے میں بیان کرتا ہے عاجزی اور انکساری (استکبار کی ضد) ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ کوئی پیام بلکہ خدا کا پیام لوگوں تک پہنچائے اسے لوگوں کے سامنے بے حد عاجزی

اور انکساری سے کام لینا چاہئے۔ شیخی نہ بگھارے، غرور اور تکبر کا اظہار نہ کرے، لوگوں کو پست اور حقیر نہ جانے یعنی انہیں ذلیل نہ کرے، عاجزی اور انکساری سے پیش آئے۔ (قرآن مجید حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے ان کی قوم کے لوگوں کو خطاب کرکے فرماتا ہے)"او عجبتم ان جاء کم ذکر مّن رّبّکم علی رجل مّنکم(۱) کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک مرد (آدمی) کے ذریعے تمہارے پروردگار کا پیغام، تمہارے پروردگار کا ذکر (حکم)، تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت لایا ہے۔ عبارت: "من رّبکم" یہ بتاتی ہے کہ وہ خدا کو اپنی ذات سے مخصوص نہیں کرنا چاہتے اور ایسے مقام پر کہہ دیں کہ میرا خدا، تم اس قابل نہیں ہو جو کہے تمہارا خدا۔ پھر کہتے ہیں: "علی رجل منکم"۔ تمہیں میں کے ایک مرد کے ذریعے یعنی میں بھی تم ہی میں سے ایک ہوں۔ آپ دیکھئے اس آیت میں کس قدر عاجزی دکھائی گئی ہے جو پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کرکے کہتی ہے۔" قل انّما انا بشر مثلکم" (۲)لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم ہی جیسا بشر ہوں۔ "یوحی الیّ"(۳) تم ہی جیسے میں سے ایک شخص پر وحی نازل ہوتی ہے۔" انّما الٰھکم الٰہ وّاحد فمن کان یرجوا لقاء ربّہ فلیعمل عملاً صالحاًوّ لا یشرک بعبادۃ ربّہ احدا" (۴) اسی بات سے متعلق تبلیغ کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ ہے اور وہ نرمی، ملائمت، شرافت اور خشونت سے پرہیز کا مسئلہ ہے۔ جو شخص کوئی پیام بلکہ پیام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے تاکہ ان میں ایمان اور علاقہ پیدا ہو اسے چاہئے کہ نرمی اور ملائمت سے بات کرے۔ بات بھی مادی چیزوں کی طرح نرم اور سخت ہوتی ہے کہ انسان کا دل چاہتا ہے جس طرح بھی ہو اسے قبول کرلے۔ بعض

۱۔ سورۂ اعراف آیت ۶۳
۲-۳-۴۔ سورۂ کہف آیت ۱۱۰

اوقات اس کے برعکس ایک بات ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی کیل ٹھونک دی ہے۔ ریتی کی طرح کاٹ رہی ہے۔ اس میں اس قدر کانٹے ہیں اس قدر اشارے کنائے ہیں اتنی تحقیر و تذلیل اور اتنی سختی رکھتی ہے کہ سننے والا اسے قبول کرنا نہیں چاہتا۔

جب خدا حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون جیسے شخص کو دعوت دینے کے لئے بھیجتا ہے تو فرعون کو دعوت دینے کے قاعدے بتاتا ہے۔: "فقولا لہٗ قولاً لیّنا لعّلہ یتذکّر او یخشی" (۱) اس مغرور شخص فرعون سے (آگے چل کر ایسے تمام اشخاص کا نام فرعون پڑ گیا) پوری پوری نرمی اور ملائمت سے بات کرنا۔ جب تم ایسے مغرور شخص کے روبرو جاؤ تو اس سے نرمی سے بات کرنے کی کوشش کرنا۔ اس سے سہولت سے گفتگو کرنا، تاکہ ممکن ہے اسے یاد آجائے اور اپنے پالنے والے اور اپنے خدا سے ڈر جائے۔ حضرت موسیٰ اور ہارونؑ نے تو بے شک نرمی اور ملائمت سے بات چیت کی لیکن وہ اس کا بھی اہل نہیں تھا اور نہیں پسیجا۔

قرآن کریم پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں فرماتا ہے: "فبما رحمۃ مّن اللّٰہ لنت لھم و لوکنت فظّا غلیظ القلب لا نفضّوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم و شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکّل علی اللّٰہ انّ اللّٰہ یحبُّ المتوکلین" (۲) اللہ کی رحمت اور مہربانی سے تم لوگوں کے ساتھ نرم ہو، نرمی برتتے ہو، تمہارا اخلاق اور گفتگو نرم ہے۔ تم اخلاق اور گفتار کی سختی سے بچتے ہو۔ پیغمبر اکرمؐ کے طرز بیان سے متعلق بہت سے قصے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی گفتگو میں رُکھائی اور سختی سے کس قدر بچتے تھے۔ قرآن پیغمبرؐ کو خطاب کر کے فرماتا ہے اگر تم سخت مزاج اور کٹھور دل کے ہوتے تو اس قرآن کے باوجود جو تم ہاتھ میں

۱۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۴۴
۲۔ سورۂ آل عمران آیت ۵۹

اور انکساری سے کام لینا چاہئے۔ شیخی نہ بگھارے، غرور اور تکبر کا اظہار نہ کرے، لوگوں کو پست اور حقیر نہ جانے یعنی انہیں ذلیل نہ کرے، عاجزی اور انکساری سے پیش آئے۔ (قرآن مجید حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے ان کی قوم کے لوگوں کو خطاب کرکے فرماتا ہے)"او عجبتم ان جاء کم ذکر مّن رّبّکم علی رجل مّنکم(۱) کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک مرد (آدمی) کے ذریعے تمہارے پروردگار کا پیغام، تمہارے پروردگار کا ذکر (حکم)، تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت لایا ہے۔ عبارت: "من رّبکم" یہ بتاتی ہے کہ وہ خدا کو اپنی ذات سے مخصوص نہیں کرنا چاہتے اور ایسے مقام پر کہہ دیں کہ میرا خدا، تم اس قابل نہیں ہو جو کہے تمہارا خدا۔ پھر کہتے ہیں: "علی رجل منکم"۔ تمہیں میں کے ایک مرد کے ذریعے یعنی میں بھی تم ہی میں سے ایک ہوں۔ آپ دیکھئے اس آیت میں کس قدر عاجزی دکھائی گئی ہے جو پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کرکے کہتی ہے۔" قل انّما انا بشر مثلکم" (۲)لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم ہی جیسا بشر ہوں۔ "یوحی الیّ"(۳) تم ہی جیسے میں سے ایک شخص پر وحی نازل ہوتی ہے۔" انّما الٰھکم الٰہ وّاحد فمن کان یرجوا لقاء ربّہ فلیعمل عملاً صالحاًوّ لا یشرک بعبادۃ ربّہ احدا" (۴) اسی بات سے متعلق تبلیغ کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ ہے اور وہ نرمی، ملائمت، شرافت اور خشونت سے پرہیز کا مسئلہ ہے۔ جو شخص کوئی پیام بلکہ پیام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے تاکہ ان میں ایمان اور علاقہ پیدا ہو اسے چاہئے کہ نرمی اور ملائمت سے بات کرے۔ بات بھی مادی چیزوں کی طرح نرم اور سخت ہوتی ہے کہ انسان کا دل چاہتا ہے جس طرح بھی ہو اسے قبول کرلے۔ بعض

۱۔ سورۂ اعراف آیت ۶۳

۲-۳-۴۔ سورۂ کہف آیت ۱۱۰

اوقات اس کے برعکس ایک بات ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی کیل ٹھونک دی ہے۔ ریتی کی طرح کاٹ رہی ہے۔ اس میں اس قدر کانٹے ہیں اس قدر اشارے کنائے ہیں اتنی تحقیر و تذلیل اور اتنی سختی رکھتی ہے کہ سننے والا اسے قبول کرنا نہیں چاہتا۔

جب خدا حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون جیسے شخص کو دعوت دینے کے لئے بھیجتا ہے تو فرعون کو دعوت دینے کے قاعدے بتاتا ہے۔: "فقولا لہٗ قولاً لیّنا لعّلہ یتذکّر او یخشی" (۱) اس مغرور شخص فرعون سے (آگے چل کر ایسے تمام اشخاص کا نام فرعون پڑ گیا) پوری پوری نرمی اور ملائمت سے بات کرنا۔ جب تم ایسے مغرور شخص کے روبرو جاؤ تو اس سے نرمی سے بات کرنے کی کوشش کرنا۔ اس سے سہولت سے گفتگو کرنا، تاکہ ممکن ہے اسے یاد آجائے اور اپنے پالنے والے اور اپنے خدا سے ڈر جائے۔ حضرت موسیٰ اور ہارونؑ نے تو بے شک نرمی اور ملائمت سے بات چیت کی لیکن وہ اس کا بھی اہل نہیں تھا اور نہیں پسیجا۔

قرآن کریم پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں فرماتا ہے: "فبما رحمۃ مّن اللّٰہ لنت لھم و لوکنت فظّا غلیظ القلب لا نفضّوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم و شاور ھم فی الامر فاذا عزمت فتوکّل علی اللّٰہ انّ اللّٰہ یحبُّ المتوکلین" (۲) اللہ کی رحمت اور مہربانی سے تم لوگوں کے ساتھ نرم ہو، نرمی برتتے ہو، تمہارا اخلاق اور گفتگو نرم ہے۔ تم اخلاق اور گفتار کی سختی سے بچتے ہو۔ پیغمبر اکرمؐ کے طرز بیان سے متعلق بہت سے قصے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی گفتگو میں رُکھائی اور سختی سے کس قدر بچتے تھے۔ قرآن پیغمبرؐ کو خطاب کر کے فرماتا ہے اگر تم سخت مزاج اور کٹھور دل کے ہوتے تو اس قرآن کے باوجود جو تم ہاتھ میں

۱۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۴۴

۲۔ سورۂ آل عمران آیت ۵۹

لئے ہو، اپنے تمام معجزات یا اوصاف جو تم رکھتے ہو اور ان تمام فضائل اور خوبیوں کے ہوتے ہوئے جن کے تم حامل ہو، لوگ تم سے دور بھاگتے۔ لوگوں میں تبلیغ، ہدایت عرفان اور ایمان میں سب سے زیادہ کارگر صفت تمہاری نرمی ہی تو ہے۔

اس سلسلے میں اتنے زیادہ قصے ہیں کہ اگر میں ان سب کو بیان کرنے پر آؤں تو اپنی گفتگو رہ جائے گی۔ سعدی کہتے ہیں:

درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جرّاح و مرہم نہ است

میں یہ نہیں چاہتا کہ سختی کی تشریح کروں البتہ یہ شعر میں نے اس لئے پڑھا ہے کہ یہ میرے مقصود کے قریب ہے۔ کیا نرمی کے ساتھ ساتھ سختی نہیں ہونا چاہئے؟ لیکن خشکی یعنی خشونت اور صلابت میں فرق ہوتا ہے۔ یہ جو دریا کی تہہ میں ذرات ہیں۔ برسوں تک ان پر ہو کر پانی گزرتا اور انہیں پیستا رہا ہے۔ جب انسان دریا کے تہہ سے ایک دانہ اٹھاتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سخت اور چکنا ہے۔ اسی لئے باقی پتھروں سے مختلف ہے۔ لیکن اتنا صاف ہے کہ اسے چھونا انسان کو ذرا بھی ناگوار نہیں گزرتا۔ حد یہ ہے کہ انسان اپنے کپڑوں پر ہاتھ پھیر کر جتنا کھردرے پن کا احساس کرتا ہے اتنا احساس اس پتھر پر ہاتھ پھیر کر نہیں ہوتا، صیقل کی ہوئی تلوار جیسی نرمی ہوتی ہے ایسی کہ اس میں اسپرنگ کی سی لچک ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں صلابت بھی ہوتی ہے صلابت اور مضبوطی کا حامل ہونا، بہادر ہونا اور غیر خدا سے نہ ڈرنا یہ خشونت کے مسئلے سے الگ ہے۔ پیغمبرؐ اگرچہ لوگوں کے ساتھ اپنی ملاقاتوں، گفتگوؤں اور اپنے برتاوے اور اخلاق میں انتہائی نرمی اور انکساری برتتے تھے لیکن اپنی روش سے ہٹتے بھی نہیں تھے اور خدا کے سوا نہ کسی ایک کا خوف رکھتے اور نہ کسی سے ڈرتے تھے۔

شہامت اور شجاعت کو پیغام پہنچانے والے کی شرائط میں سے ایک شرط اور تبلیغ کے طریقہ کار کا ایک جز کہا جاسکتا ہے۔ جو آیت میں نے اپنی گفتگو کی ابتدا میں تلاوت کی ہے وہ یہی معنی بیان کرتی ہے: "الّذین یبلّغون رسالات اللّٰہ"(۱) جو لوگ خدا کے پیغامات لوگوں تک پہنچاتے ہیں "و یخشونہٗ ولا یخشون احداً الاّ اللّٰہ"(۲) اور اپنے خدا سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس کی ذرا سی بھی مخالفت نہیں کرتے [پیام میں کمی نہیں کرتے] یا اسمیں) زیادتی نہیں کرتے۔ خدا کے راستے سے نہیں ہٹتے "ولا یخشون احداً الاّ اللّٰہ" (۳) اور بجز خدا کے کسی سے نہیں ڈرتے (یہ ایک اور شرط ہے جس کی جگہ بہت خالی ہے)۔ پیغمبروں کی تبلیغی روش کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم رسالت (پیغام پہنچانے) کے سوا اور کوئی منصوبہ نہیں رکھتے۔ ہم اللہ کی مخلوق ہیں، اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کا پیام لانے والے ہیں۔ پیغمبرؐ اس لئے نہیں آئے کہ لوگوں کو بہشت اور جہنم کے پروانے جاری کریں جیسا کہ پادری کیا کرتے تھے اور شاید اب بھی کرتے ہوں۔ اس قسم کے کام کہ کسی کو اس بات کی سند دیں کہ جناب آپ مطمئن رہیں، آپ کو اس سند سے میں نے اتنی بہشت کی ضمانت دے دی ہے۔ اس کے باوجودیکہ اپنی رسالت اور اس کی جامعیت کے لحاظ سے اپنے اوپر کوئی اعتراض نہیں آنے دیتے تھے اور مسائل کو پوری طرح بیان کرتے تھے لیکن ایسے سوالات کے جواب میں کہ: میرا انجام کیا ہوگا؟ کہہ دیتے تھے خدا عالم ہے میں کیا جانوں! باطن کے حالات خدا جانتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تمہارا انجام کہاں تک پہنچے گا؟

جناب رسول خداؐ کے ایک بہت بڑے صحابی جناب عثمان بن مظعون کے بارے میں لکھا ہے کہ رسول اکرمؐ کے مدینہ کو ہجرت کر جانے کے بعد وہ بھی مہاجر ہوگئے تھے۔ عثمان بن مظعون وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مدینہ میں وفات پائی اور

۱، ۲، ۳۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

رسول اکرمؐ نے حکم دیا کہ انہیں بقیع میں دفن کیا جائے اور بقیع کو اسی دن سے قبرستان بنا دیا گیا۔ یہی جناب عثمان بن مظعون ہیں جو بقیع کے مشرق کی طرف دفن ہیں جو بہت بڑے صحابی تھے اور جن سے رسولؐ بہت محبت کرتے تھے اور اس بات کو سب جانتے تھے۔

امیر المومنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: "کان لی فیما مضی اخ فی الله و کان یعظّمه فی عینی صغرالدنیا فی عینه" (۱) یعنی ماضی میں میرا ایک دینی بھائی تھا۔ وہ ایسا بھائی تھا جو حق کی راہ پر تھا۔ میری نظر میں اسے جس بات نے بڑا بنا دیا تھا وہ یہ تھی کہ تمام دنیا اس کی نظر میں بہت چھوٹی اور حقیر تھی۔ نہج البلاغہ کے شارحین نے کہا ہے کہ اس سے امیر المومنینؑ کی مراد عثمان بن مظعون ہیں۔ امیر المومنینؑ کے ایک بیٹے کا نام بھی عثمان ہے۔ جس وقت وہ پیدا ہوئے تو امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ میں اس کا نام بھائی عثمان بن مظعون کے نام پر رکھنا چاہتا ہوں وہ چاہتے تھے کہ اس بیٹے سے عثمان بن مظعون کی یاد تازہ رہے۔ ایسا شخص دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ ایک انصار کے گھر میں رہا کرتے تھے۔ اس گھر میں ایک عورت بھی تھی اور وہ شاید ان کے انصاری بھائی کی بیوی تھی جس کا نام ام علاء تھا اور جو ان کی خدمت کیا کرتی تھی۔ رسول اکرمؐ عثمان بن مظعون کے جنازے کے مشایعت (کاندھا دینے) کے لئے آئے۔ آپ نے ان رسوم و مراسم میں وہی چلن دکھایا جو خاص اصحاب کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ یکایک ام علاء نے عثمان بن مظعون کے جنازے کی طرف منہ کر کے کہا: "هنیئاً لك الجنة." تمہیں بہشت مبارک ہو۔ رسول اکرمؐ نے اس کی طرف رخ کر کے سختی سے فرمایا: تجھے یہ بات کس نے بتائی؟! وہ بولی اے خدا کے رسولؐ! یہ آپ کے صحابی ہیں۔ آپ کو ان سے جو محبت ہے میں

۱۔ نہج البلاغہ حکمت ۲۸۱ صفحہ ۱۲۲۵

نے اس کے پیش نظر یہ بات کہہ دی تھی۔ رسول خداؐ نے یہ آیت پڑھی: "قل ما کنتُ بدعاًمن الّرسل وما ادری ما یفعل بی ولا بکم" (۱) جو بہت معنی خیز ہے۔ اسی طرح سورۂ جن کے آخر میں ہے: "قل انّی لا املك لکم ضرّا ولا رشداً" (۲) کہہ دو (اے رسول) کہ مجھے تمہارے نفع نقصان کا اختیار نہیں ہے۔ "قل انّی لن یجیرنی من الله احد ولن اجد من دونه ملتحداً" (۳) مجھے خدا کے سوا اور کوئی پناہ نہیں دیگا۔

ایک اور خصوصیت جو پیغمبروں کی تبلیغی روش کو بہت واضح کرتی ہے اور جو شاید رسول اکرمؐ کے سلسلے میں زیادہ ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں لوگوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ جاہلیت کا زمانہ تھا۔ اس جامعہ پر ایک عجیب قسم کی طبقاتی زندگی کا راج تھا۔ گویا غریب لوگ حقیقت میں انسان ہی نہیں تھے۔ پھر غلاموں اور لے پالکوں کا تو کہنا ہی کیا۔ وہ لوگ جو امراء و روساء اور قرآنی الفاظ میں ملاء تھے اپنے آپ کو ہر چیز کا مستحق سمجھتے تھے اور جن کے پاس کچھ نہیں تھا انہیں کسی چیز کا حقدار نہیں گردانتے تھے۔

وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ دنیا میں ہمارے پاس سب کچھ ہے اور تمہارے پاس کچھ نہیں ہے لیکن آخرت میں ممکن ہے اس کا الٹا ہو جائے یعنی ہمارے پاس کچھ نہ رہے اور تمہارے پاس سب کچھ ہو جائے۔ بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ دنیا خود آخرت کی نشانی ہے۔ ہمارے پاس جو دنیا کی ہر شئے موجود ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم خدا کے پیارے ہیں۔ خدا نے ہمیں اپنا پیارا سمجھ کر ہمیں سب کچھ دے دیا ہے تو آخرت میں بھی یہی ہوگا۔ تم آخرت میں بھی اسی طرح رہو گے۔ جو دنیا میں بد بخت

۱۔ سورۂ احقاف آیت ۹
۲۔ سورۂ جن آیت ۲۱
۳۔ سورۂ جن آیت ۲۲

ہے وہ آخرت میں بھی بدبخت ہوگا۔ وہ لوگ پیغمبر خداؐ سے کہتے تھے۔ اے خدا کے رسولؐ! کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے کام میں خرابی کیا ہے؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم آپ کی رسالت کو ماننے کے لئے کیوں تیار نہیں ہیں؟ اس لئے کہ آپ نے اپنے پاس حقیر اور ذلیل جمع کر لئے ہیں۔ ان کو دور بھگا دیجئے تب وہ امراء و روساء و شرفاء آپ کے پاس آ سکیں گے۔ قرآن کہتا ہے۔ ان سے کہہ دو: "وما انا بطارد المؤمنین"(۱) میں کسی مومن کو اس وجہ سے کہ وہ غلام ہے، زرخرید ہے، غریب ہے دور نہیں کر سکتا۔ "ولا تطر دالّذین یدعون ربّہم با لغداۃ و العشیّ یریدون وجہہٗ"(۲) ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہرگز دور نہ کرنا۔ اشراف جائیں تو چلے جائیں اگر چاہتے ہیں تو اسلام قبول کر لیں لیکن انہیں آدمی بنا چاہئے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ انہیں لوگوں میں سے ایک جو مسلمان ہو گیا تھا رسول خداؐ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ رسول اکرمؐ کا معمول یہ تھا کہ اول تو مجلس میں اوپر نیچے یا اول آخر کی تفریق ہی نہیں تھی۔ عموماً سب لوگ ایک حلقے میں بیٹھتے تھے تاکہ مجلس میں اوپر اور نیچے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپ منع کرتے تھے کہ آپ کے داخلے کے وقت کوئی اپنی جگہ کھڑا نہ ہو۔ کہتے تھے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے۔ ایرانیوں کا طریقہ ہے۔ اور یہ بھی فرماتے تھے کہ جو آئے جہاں جگہ خالی پائے بیٹھ جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ لوگ آنے والے کے لئے مجبور ہو کر جگہ خالی کریں تاکہ وہ اوپر بیٹھے۔ اسلام میں ایسی بات نہیں ہے۔ ایک غریب خرقہ پوش مسلمان داخل ہوا۔ ایک شخص کی بغل میں جسے اصطلاح میں اشراف کہتے تھے ایک جگہ خالی تھی۔ وہ شخص وہیں جا بیٹھا۔ وہ جیسے ہی جا کر بیٹھا تھا کہ جاہلیت کی عادت کے مطابق

۱۔ سورۂ شعراء آیت ۱۱۴
۲۔ سورۂ انعام آیت ۵۲

اشراف فوراً سکڑا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ رسول اکرمؐ نے دیکھ لیا۔ اس کو مخاطب کر کے آپ نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تمہیں یہ ڈر ہوا کہ تمہاری کچھ دولت اس سے چپک جائیگی؟ نہیں اے رسول خدا! تو کیا تمہیں یہ ڈر ہوا کہ اس کی غربت تمہیں لگ جائیگی؟ نہیں اے خدا کے رسول! پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے غلطی کی اور میں نے جو غلطی کی ہے اس کے جرمانے میں اسی وقت آپ کی اس مجلس میں اپنی آدھی ملکیت اور جائیداد اپنے اس مسلمان بھائی کو بخش دی۔ لوگوں نے اس مومن بھائی سے کہا۔ بہت اچھے تو اب تم اس پر قبضہ کر لو۔ اس نے کہا میں نہیں لیتا۔ لوگوں نے پوچھا تم کیوں نہیں لے لیتے جبکہ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟ اس نے جواب دیا اس لئے کہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے یہ جائیداد لے لی تو ایک دن اسی شخص کی طرح میرا دماغ بھی خراب ہو جائے گا اور اس میں ہوا بھر جائے گی۔

تبلیغ کی روش میں ایک اور مسئلہ صبر و استقامت کا مسئلہ ہے۔ "فاصبر لحکم ربّك ولا تکن کصاحب الحوت" (۱) "فاصبر کما اولوالعزم من الّرسل"(۲) قائم رہو، خود دار رہو، ثابت قدم رہو۔ "فاستقم کما اُمرت" (۳) جس طرح تمہیں حکم دیا جا چکا ہے ثابت قدم رہو۔ جملہ فاستقم کما امرت دو سورتوں میں ایک سورۂ شوریٰ میں اور دوسرے سورۂ ہود میں آیا ہے۔ سورۂ ہود میں فرمایا گیا ہے: "فاستقم کما امرِت و من تاب معك" (۴) تم خود اور تمہارے ساتھ جو مومن ہیں سب کے سب ثابت قدم رہو۔ سورۂ شوری میں پیغمبر اکرمؐ کی ذات کو مخاطب کیا گیا ہے۔ رسول خداؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "شیّبتنی سورۃ ھود"۔(۵) سورۂ ہود نے میری داڑھی سفید کر دی یعنی مجھے بوڑھا بنا دیا۔ وہ آیت جو

۱۔ سورۂ ن والقلم آیت ۴۸
۲۔ سورۂ احقاف آیت ۳۵
۳۔ سورۂ ہود آیت ۱۱۲
۴۔ سورۂ ہود آیت ۱۱۲
۵۔ مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۱۴۰

کہتی ہے : "فاستقم کما امرت و من تاب معك" ثابت قدم رہو لیکن وہ صرف مجھ سے نہیں کہا گیا ہے بلکہ مجھ سے اور دوسروں سے بھی کہا گیا ہے۔ ان کو بھی ثابت قدمی پر مجبور کیجئے۔

اس سلسلے میں ہم کچھ امام حسین علیہ السلام کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ حضرت نے اپنے سفر اور اپنی تحریک کے دوران کتنے ہی ایسے کام کئے جن سے آپ کی روش اور اسلوب کا پتا چل سکتا ہے۔ چھوڑیئے! میں امام حسین علیہ السلام کے کام کی روش اور اسلوب کا مسئلہ آئندہ رات کو جو شب عاشور ہے عرض کرونگا۔ آج رات کو آپ کے سامنے کچھ مقتل کے بارے میں بیان کرتا ہوں۔ یہ قریب قریب ایک دستور سا ہے کہ نویں محرم حضرت ابو الفضل العباس کا ذکر خیر کیا جاتا ہے۔ آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ہمارے ائمہ نے فرمایا ہے :"انّ للعباس منزلةً عند الله يغبطه بها جميع الشهداء" (۱) خدا کے نزدیک عباسؑ کا وہ مرتبہ ہے جس پر تمام شہداء رشک کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے آپ کی زندگی کے زیادہ حالات نہیں ملتے۔ یعنی اگر کوئی شخص آپ کی زندگی کے متعلق کوئی کتاب لکھنا چاہے تو اس کے لئے واقعات دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن زیادہ باتیں بھی کیا کام آئیں گی۔ بعض اوقات کسی شخص کی ایک دو یا پانچ دن کی زندگی بھی جس کی شرح ممکن ہے پانچ صفحات سے بھی زیادہ نہ ہو اس قدر تابناک ہوتی ہے جو اس شخص کی قدر و قیمت دس کتابوں پر بھی بھاری ثابت کردے۔ اور جناب ابو الفضل العباسؑ کی شخصیت ایسی ہی تھی۔ کربلا میں آپ کی عمر ۳۴ سال کے قریب تھی۔ آپ کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام عبید اللہ بن عباس بن علی بن ابی طالب ہے اور وہ عرصۂ دراز تک زندہ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دن امام زین العابدینؑ کی نظر عبیداللہ پر پڑی تو آپ کو کربلا کے واقعات یاد آگئے

۱۔ ابصار العین فی انصار الحسین صفحہ ۲۷، بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۲۹۸، منقول از امالی صدوق مجلس ۷۰ رقم ۱۰

اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

حضرت امیر المومنینؑ کی شہادت کے وقت حضرت عباسؑ کی عمر تقریباً چودہ سال کی تھی۔ مجھے ناسخ التواریخ کی یہ بات اس وقت یاد آتی ہے کہ جناب ابو الفضل العباسؑ جنگ صفین میں موجود تھے لیکن ابھی نابالغ اور بچے تھے (تقریباً بارہ سال کے ہونگے کیونکہ جنگ صفین امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت سے تقریباً تین سال پہلے ہوئی تھی) امیر المومنینؑ نے ان کو لڑنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مجھے بس اتنا ہی یاد ہے کہ لکھا تھا کہ آپ جنگ صفین میں بالکل بچہ تھے۔ ایک کالے گھوڑے پر سوار تھے۔ اس سے زیادہ میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن لوگوں نے اس موضوع پر بہت لکھا ہے۔ معتبر مقاتل میں یہ بات لکھی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے ایک بار اپنے بھائی عقیل سے فرمایا کہ میرے لئے ایک ایسی بیوی کا انتخاب کرو جو "ولد تہا الفحولہ" جسکے بیٹے بہادر ہوں۔ جناب عقیل حضرت علی علیہ السلام کے بھائی اور نساب بھی تھے۔ خاندانوں اور نسلوں کا علم رکھتے تھے اور قبیلوں اور ماؤں اور باپوں کو اور یہ کہ کون کس سے پیدا ہے خوبی جانتے پہچانتے تھے۔ وہ فوراً کہنے لگے۔ "عنّي لك بأمّ البنين بنت خالد." جیسی بیوی آپ چاہتے ہیں وہ ام البنین بنت خالد ہیں۔ ام البنین کے معنی بیٹوں کی ماں (چند بیٹوں کی ماں) ہیں لیکن یہ لفظ بھی ام کلثوم کی طرح ہے جس پر ہم اب بھی نام رکھتے ہیں خصوصاً میں نے تاریخ میں دیکھا ہے کہ جناب ام البنین کی دادیوں میں سے بھی ایک کا نام ام البنین تھا اور شاید اسی مناسبت سے آپ کا نام بھی ام البنین رکھا گیا تھا۔ انہیں سے امیر المومنین علیہ السلام کا عقد ہوا اور آپ سے چار فرزند پیدا ہوئے۔ بیٹی کوئی نہیں تھی۔ یہ سبھی حقیقی معنوں میں کئی بیٹوں کی ماں ہوئیں۔ امیر المومنینؑ کے دوسرے بیٹے بھی بہادر تھے۔ اول تو خود حسنین (حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ) جن کی شجاعت مسلم تھی خصوصاً امام

حسین علیہ السلام نے کربلا میں دکھا دیا کہ کتنے بہادر تھے اور اپنے والد کی شجاعت کے کس حد تک وارث تھے۔ جناب محمد ابن حنفیہ جناب ابو الفضل سے بہت بڑے تھے اور جنگ جمل میں شریک ہوئے تھے غیر معمولی بہادر، طاقتور، شاندار اور زور مند تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ امیر المومنینؑ کی آپ پر خاص عنایت رہی ہے۔ (لیکن یہ بات تاریخ میں درج نہیں ہے صرف گمان ہے)۔

سب سے زیادہ معتبر قول کے مطابق خاندان پیغمبرؐ کا جو پہلا شخص کربلا میں شہید ہوا وہ حضرت علی اکبر اور آخری شخص حضرت ابو الفضل العباسؑ تھے یعنی آپ اس وقت شہید ہوئے جب اصحاب اور اہلبیت حسینؑ میں سے کوئی باقی نہیں بچا تھا۔ صرف آپ تھے اور حضرت سید الشہداءؑ تھے چنانچہ آپ تشریف لائے اور عرض کیا۔ آقا! مجھے میدان جنگ کو جانے کی اجازت دیجئے اس لئے کہ اب میں زندگی سے بہت بیزار ہو چکا ہوں۔ جناب ابو الفضل اپنے تین چھوٹے بھائیوں کو پہلے ہی خصوصیت کے ساتھ بھیج چکے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا اے بھائیو! تم جاؤ میں اپنے بھائی کی مصیبت کا بوجھ خود بٹانا چاہتا ہوں۔ دراصل وہ یہ اطمینان حاصل کرلینا چاہتے تھے کہ ان کے ماں جائے بھائی ان سے پہلے شہید ہو جائیں اور بعد میں وہ خود بھی ان سے جا ملیں۔ غرض جناب ام البنین کے چار بیٹے تھے لیکن جناب ام البنین کربلا میں نہیں تھیں۔ وہ مدینہ میں تھیں۔ جو لوگ مدینہ میں تھے وہ کربلا کے واقعے سے بے خبر تھے۔ ان لی لی کو، ان کئی بیٹوں کی ماں کو، جن کی زندگی بھر کی پونجی یہی چار بیٹے تھے، خبر ملی کہ تمہارے چاروں کے چاروں بیٹے کربلا میں شہید ہو گئے ہیں۔ بے شک یہ لی لی بہت عالی مرتبت لی لی تھیں۔ بیوہ تھیں جو اپنے تمام بیٹے کھو چکی تھیں۔ کبھی کبھی آتی تھیں اور مدینہ سے کوفہ جانے والے راستے کے کنارے بیٹھ جاتی تھیں اور اپنے بیٹوں کو روتی تھیں۔

تاریخ لکھتی ہے کہ خود یہ لی لی بنی امیہ کی حکومت کے خلاف پروپیگنڈے اور تبلیغ کا ایک وسیلہ بن گئی تھیں۔ جو آتا تھا اور وہاں سے گزرتا تھا۔ رک جاتا تھا اور آنسو بہانے لگتا تھا۔ مروان ابن حکم جو کسی وقت مدینہ کا حاکم رہ چکا تھا اور اہل بیت کا بہت بڑا دشمن تھا جس وقت آتا تھا اور ادھر سے گزرتا تھا تو بے اختیار بیٹھ جاتا تھا اور ان لی لی کے ساتھ ساتھ رونے لگتا تھا۔ یہ لی لی اشعار پڑھتی تھیں جن میں سے ایک شعر میں فرماتی ہیں۔

"لا تدعونی ویك امّ البنین تذکرینی بلیوث العرین
کانت بنون لی ادعی بهم والیوم اصبحت ولا من بنینٍ"

ایک عورت کو مخاطب کر کے فرماتی ہیں: "اے لی لی! اے بہن! تم نے اب تک مجھے ام البنین کہہ کر پکارا ہے اس کے بعد مجھے ام البنین نہ کہنا کیونکہ یہ لفظ میرے دکھ تازہ کرتا ہے۔ مجھے اپنے بیٹوں کی یاد دلاتا ہے۔ اب میرا یہ نام نہ لینا۔ ہاں پہلے تو میرے بیٹے تھے لیکن اب ان میں سے ایک بھی نہیں ہے۔" آپ کے سب سے بڑے بیٹے جناب ابو الفضل العباس تھے چنانچہ جناب ابو الفضل کے متعلق بین خصوصیت سے بہت دل ہلا دینے والے ہوتے تھے۔ فرماتی ہیں:

یامن رأی العبّاس کرّ علی جما هیر النّقد
و وراه من ابناء حیدر کّل لیث ذی لبدٍ
انبئت انّ ابنی اصیب براسه مقطوع یدٍ
ویلی علی شبلی آمال برأسه ضرب العمدٍ
لو کان سیفك فی یدیك لما دنی منه احد(۱)

۱۔ منتہا الآمال جلد ۱ صفحہ ۳۰۶، ابصار العین فی انصار الحسین (علیہم السلام) صفحہ ۳۱ صدوق مجلس ۷۰ رقم ۱۰

جناب ام البنین نے پوچھا تھا کہ میرا بیٹا عباسؑ جو اتنا بہادر اور دلاور تھا کس طرح شہید ہوگیا؟ حضرت عباسؑ کی بہادری تاریخ کی مسلم اور قطعی حقیقت ہے۔ وہ غیر معمولی طور پر حسین تھے کہ لوگ بچپن میں قمر بنی ہاشم کہتے تھے۔ ماہ بنی ہاشم جو بنی ہاشم میں چمکتا رہا ہے۔ وہ بہت قد آور تھے بعض معتبر مورخین نے لکھا ہے کہ جس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر رکاب سے پاؤں نکال لیتے تھے تو پاؤں کی انگلیاں زمین پر خط کھینچتی جاتی تھیں۔ انکے بازو نہایت قوی اور بلند تھے، سینہ بہت چوڑا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ ان کا بیٹا اتنی آسانی سے نہیں مارا جاسکتا تھا۔ انہوں نے دوسروں سے پوچھا کہ میرے بیٹے کو ظالموں نے کیسے مارا؟ انہیں بتایا گیا کہ پہلے ان کے ہاتھ کاٹ دیئے اور پھر کسی طرح انہیں مار ڈالا۔ اس وقت انہوں نے اس سلسلے میں یہ بین کئے۔ کہتی تھیں کہ اے وہ آنکھ جو کربلا میں دیکھ رہی تھی! اے وہ انسان جو کربلا کے ماحول میں موجود تھا! جس وقت میرے عباسؑ کو تو نے دیکھا تھا کہ وہ گیدڑوں کے مجمع پر جھپٹتا تھا اور دشمن کے آدمی میرے بیٹے کے سامنے سے گیدڑوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔

یامن رأی العبّاس کرّ علی جماہیر النّقد

و وراہ من ابناء حیدر کّل لیثٍ ذی لبدٍ

علیؑ کے بیٹے اس کے پیچھے کھڑے تھے اور شیر کے بعد شیر کی طرح میرے بیٹے کے پشتی بان تھے۔ مجھ پر افسوس ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ دشمنوں نے تیرے شیر بچے کو آہنی گرز مارا۔ پیارے عباسؑ، پیارے بیٹے۔ میں خود جانتی ہوں کہ اگر تیرے ہاتھ جسم پر سالم ہوتے تو کوئی تیرے نزدیک آنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم

و صلی اللّٰہ علیٰ محمد وآلہ الطاھرین

چوتھی مجلس

حسینی تحریک کے تبلیغی طریقے

بسم اللّٰہ الرّحمن الرّحیم

الّذین یبلّغون رسالات اللّٰہ و یخشونہ ولا یخشون احداً الّا اللّٰہ و کفی باللّٰہ حسیباً(۱)

کل رات کو میں نے وعدہ کیا تھا کہ آج عاشور کی رات ہے جہاں تک مجھ سے ہوسکتا ہے اور جہاں تک ذہن ساتھ دیتا ہے میں صحیح صحیح حسینی تبلیغ اور تحریک کی کیفیتوں اور روشوں کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں گا۔ لیکن پہلے میں ایک چھوٹا سا پیش لفظ عرض کرتا ہوں جو ان تبلیغی پالیسیوں کی اہمیت کا سراغ لگانے کی بنیاد ہے، جن سے امام حسینؑ نے کام لیا ہے۔

تاریخ اسلام میں جناب رسول خداؐ کی وفات اور حسین ابن علیؑ کی شہادت کے درمیان پچاس سال میں غیر معمولی واقعات اور انقلابات وقوع پذیر ہوئے تھے۔ آج کل کے محققین جو سماجیات کے اصولوں سے واقف ہیں ایک بات کا احساس کر چکے ہیں خصوصاً عبد اللہ علائلی سنّی ہونے کے باوجود شاید سب سے زیادہ اس بات پر

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے : بنی امیہ عرب کے تمام قبیلوں (قریش اور غیر قریش کے) بر عکس صرف ایک نسل ہی نہیں تھے۔ وہ ایک ایسی نسل تھے جن کا طریق کار اور کاروائیاں ایک سیاسی پارٹی سے ملتی جلتی تھیں یعنی وہ مخصوص جماعتی خیالات رکھتے تھے۔ وہ قریب قریب ہمارے زمانے بلکہ پوری تاریخ کے یہودیوں کے مشابہ تھے جو ایک خاص خیال اور نصب العین رکھنے والی نسل ہے۔ اور جو اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر اپنے تمام افراد میں پائی جانے والی ہم آہنگی کو بھی نظر انداز کر کے اسکیمیں اور پالیسیاں بناتی ہے۔

قدیم مؤرخوں نے بنی امیہ کو ایک چالاک اور شیطانی صفات رکھنے والی نسل بتایا ہے اور آج ان الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں کہ بنی امیہ وہ گروہ ہے جس نے اسلام کا ظہور ہوتے ہی دوسری تمام جماعتوں سے زیادہ خطرہ محسوس کیا تھا اور اسلام کو اپنے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھا تھا، چنانچہ جب تک ان میں طاقت رہی اسلام سے لڑتے رہے لیکن فتح مکہ پر انہیں یقین ہوگیا کہ اب اسلام کے خلاف لڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کرلیا اور عمار یاسر کے قول کے مطابق : ما اسلموا ولا کن.....اور پیغمبر اسلامؐ نے بھی ان کا دل رکھنے کے لئے ان سے سمجھوتا کرلیا یعنی انہیں ایسی جماعت سمجھ لیا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوگئے ہیں لیکن جن کی روح کی گہرائیوں میں اسلام نہیں اترا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے اپنے زمانے میں کوئی اہم کام بنی امیہ کے سپرد نہیں کیا تھا لیکن پیغمبرؐ کے بعد بنی امیہ بتدریج اسلامی اداروں میں اثر انداز ہوتے۔ سب سے بڑی تاریخی اور سیاسی اشتباہ حضرت عمر بن خطاب کے زمانے میں رونما ہوئی کہ ابوسفیان کا ایک بیٹا جس کا نام یزید تھا شام کا والی (گورنر) بنا دیا گیا اور اس کے بعد معاویہ حاکم بن

گیا اور بیس سال یعنی حضرت عثمانؓ کی حکومت کے آخر تک شامات پر جس میں موجودہ شام، موجودہ ترکی کا کچھ حصہ، موجودہ لبنان اور موجودہ فلسطین شامل تھا حکومت کرتا رہا۔ یہاں بنی امیہ کیلئے پاؤں ٹکانے کی جگہ ہی نہیں بنی بلکہ ان کی ایک مضبوط جاگیر بن گیا۔

حضرت عثمانؓ جب خلیفہ ہوئے تو اگر چہ دوسرے امویوں سے روحانی اعتبار سے مختلف تھے (ایک خاص قسم کے آدمی تھے اور ابو سفیان سے مختلف تھے) پھر بھی اموی تھے۔ ایک بار اسلامی مملکت میں بنی امیہ کے پاؤں دور دور تک جم گئے۔ بہت سے اہم اسلامی عہدے جیسے مصر، کوفہ اور بصرہ کی بڑی بڑی اور اہم حکومتیں بنی امیہ کے ہاتھ لگ گئیں، یہاں خود حضرت عثمان کی وزارت مروان ابن حکم کے قبضے میں آگئی۔ یہ بہت بڑا قدم تھا جو بنی امیہ نے اپنے حصول مقاصد کی طرف اٹھایا۔

معاویہ بھی روز بروز اپنی حکومت کو مضبوط کرتا گیا۔ عثمان کے وقت تک اس کے پاس صرف دو قوتیں تھیں۔ ایک اہم سیاسی عہدے یعنی سیاسی قوت اور دوسرے بیت المال کی اقتصادی قوت۔ حضرت عثمانؓ کے مارے جانے کے بعد معاویہ نے ایک اور قوت کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا اور وہ یہ کہ اس نے اچانک مقتول اور مظلوم خلیفہ کا قصہ اٹھا دیا اور لوگوں کی ایک بڑی جماعت کے (کم سے کم شامات کے علاقے میں) دینی اور مذہبی جذبات کو اپنے حق میں موڑ لیا۔ وہ کہتا تھا : مسلمانوں کا خلیفہ، اسلام کا خلیفہ مظلوم مارا گیا۔ "من قتل مظلوماًفقد جعلنا لولية سلطاناً"(۱) مظلوم خلیفہ کے خون کا بدلہ لینا واجب ہے۔ ایک لاکھ یا شاید دس لاکھ لوگوں کے دینی جذبات کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ معاویہ نے عثمان پر بین کر کے لوگوں کو کتنا رلوایا ہے۔

۱۔ سورۂ اسراء آیت ۳۳

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد معاویہ مسلمانوں کا مطلق خلیفہ بن گیا اور اس نے دوسری تمام قوتیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اب وہ ایک چوتھی قوت کو بھی ملازم رکھ سکتا تھا اور وہ یہ تھی کہ اس نے دینی لوگوں کو بھی جنہیں آج کی اصطلاح میں روحانیان کہا جاتا ہے اپنا ملازم بنا لیا۔ بس وہ دن تھا جب اچانک حضرت عثمان کی تعریف میں بلکہ کچھ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی تعریف میں بھی حدیثیں گھڑنے کا کام شروع ہوگیا۔ چونکہ معاویہ کو اس میں اپنا فائدہ اور علی علیہ السلام کا نقصان نظر آتا تھا لہذا اس نے اس کام پر بہت کچھ خرچ کیا۔ علی علیہ السلام نے اپنے کلمات میں بنی امیہ کے بڑے خطرے کی طرف اشارے کئے ہیں۔ آپ کا ایک خطبہ ہے جس کی ابتداء خوارج سے متعلق ہے اور جو آپ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں تصنیف فرمایا تھا۔ آپ فرماتے ہیں: "فانا فقأت عین الفتنہ" (۱) میں نے فتنے کی آنکھیں نکال لیں (خوارج کے قصے سے مراد ہے)۔ یکایک آپ اپنی تقریر کے بیچ میں بنی امیہ کی طرف گریز فرماتے ہیں: " الا و انّ اخوف الفتن عندی علیکم فتنة بنی امیّة فانها فتنة عمیاء مظلمة" (۲) لیکن خوارج کا فتنہ اتنا بڑا خطرہ نہیں ہے یعنی بڑا تو ہے مگر بنی امیہ کا فتنہ اس سے بھی بڑا اور اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

بنی امیہ کے فتنے کے بارے میں آپ نے بہت کچھ کہا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام بنی امیہ کی ایک خصوصیت بیان فرماتے تھے کہ اسلامی برابری (مساوات) ان لوگوں کے ہاتھوں بالکل مٹ جائیگی اور اسلام نے جو تعلیم دی کہ سب لوگ ایک دوسرے کے برابر ہیں بنی امیہ کے دور میں اس کا وجود نہیں رہے گا۔ لوگ آقا اور

۱-۲۔ نہج البلاغہ فیض السلام خطبہ ۹۲ صفحہ ۲۷۳

غلام کے دو طبقوں میں بٹ جائیں گے اور تم (عوام) عملی طور پر ان کے غلام بن جاؤ گے۔ آپ ایک جملے میں یوں فرماتے ہیں: "حتّی لا یکون انتصار احد کم منهم الّا کانتصار العبد من ربّه" (۱) اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان لوگوں سے تمہاری ملاقات اس طرح ہوگی جیسی کسی غلام کی اس کے آقا سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سب آقا ہونگے اور تم غلام اور زرخرید جیسے ہوں گے۔

امیر المومنین کے کلمات میں دوسری چیز وہ پیشین گوئیاں ہیں جو بعد میں پوری ہوئیں۔ دانشوروں کی نابودی کی پیشین گوئی آپ نے ہی فرمائی ہے۔ آپؑ کے الفاظ یہ ہیں: "عمّت خطّتها و خصّت بیّتها" (۲) یہ ایسی بلا ہے جو سب کو لپٹ جائیگی۔ لیکن اس سے ایک خاص طبقے میں پریشانیاں پیدا ہونگی۔ آپ کے الفاظ بہت عمدہ اور جچے تلے ہیں: آپ یوں فرماتے ہیں: "و اصاب البلاء من ابصر فیها واخطأ البلاء من عمی عنها" (۳) جس کے پاس سوجھ بوجھ ہوگی اور جو آج کی اصطلاح میں دانشور ہوگا، جو شخص عقل و شعور رکھتا ہوگا یہ بلا اس کو پکڑیگی کیونکہ یہ لوگ (بنی امیہ) یہ نہیں چاہیں گے کہ سمجھ دار لوگ باقی رہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بنی امیہ کے افراد اپنے زمانے کے دانشوروں اور ذہین لوگوں کو ایک ایک کر کے جمع کرتے تھے جیسے مرغی ایک ایک دانہ چنتی ہے اور پھر ان کے سر اڑا دیتے تھے۔ اس سلسلے میں کیسے کیسے وحشیانہ قتل ہوئے ہیں!

تیسرا مسئلہ حرمت الٰہی کی توہین ہے۔ کوئی فعل حرام ایسا باقی نہیں بچے گا جس کا یہ ارتکاب نہیں کریں گے اور اسلام سے ہر وابستگی اور تعلق کو دور

۱۔ ایضاً خطبہ ۹۲ صفحہ ۲۷۴

۲-۳۔ نہج البلاغہ فیض السلام خطبہ ۹۲ صفحہ ۲۷۴

کریں گے :"لا یدعوا للہ محرّماً الّا استحلّوہ ولا عقداً الّا احلّوہ" (۱) چوتھی بات یہ ہے کہ مسئلہ یہی ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ لوگ عملی طور پر اسلام کی مخالفت کریں گے اور لوگوں کو بدلنے کے لئے اسلام کو بدل دیں گے۔ "و لبس الاسلام لبس الفرو مقلوباً" (۲) اسلام کو لوگوں کے جسموں پر اس طرح پہنائیں گے جس طرح الٹی پوستین پہناتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پوستین کی خاصیت یعنی جسم کو گرمی پہنچانا اور اس کے نقش و نگار اسی وقت ظاہر ہوتے ہیں جب اسے صحیح طور سے پہنا جائے۔ جب پوستین الٹی پہنیں گے تو ذرا سی بھی گرمی نہیں ملیگی اور یہ ایسا غیر مہذبانہ فعل ہوگا کہ لوگ ہنسی اُڑائیں گے۔ حضرت علی علیہ السلام شہید ہونے کے بعد معاویہ کے اندازے کے برعکس کہ علیؑ قتل ہوکر ختم ہوجائیں گے معاشرے میں ایک علامت کے طور پر زندہ ہوگئے حالانکہ وہ ایک فرد کی حیثیت سے قتل ہوئے تھے۔ لیکن حضرت علیؑ کے خیالات ان کے مرنے کے بعد بہت پھیلے اور پھر اموی گروہ کے مقابلے میں شیعہ باہم متحد ہوکر ڈٹ گئے اور متحد الخیال بن گئے۔ حقیقت میں وہی وقت تھا جب حضرت علیؑ کے شیعوں نے ایک جماعت کی شکل اختیار کی۔

معاویہ اپنے زمانے میں حضرت علی کی فکر سے بہت کچھ لڑتا رہا۔ مسجدوں کے منبروں پر حضرت علیؑ کو برا بھلا کہا جاتا تھا۔ لوگوں کو انعامات بخشے جاتے تھے کہ پوری اسلامی مملکت میں نماز جمعہ میں حضرت علی علیہ السلام پر لعنت کی جائے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت علیؑ ایک قوت، ایک علامت، ایک نظریہ، عقیدہ اور ایمان کی حیثیت سے لوگوں کی روح میں زندہ اور موجود تھے۔ اس شخص نے حضرت علیؑ کی فکر اور روح کے خلاف میارزہ کے بہت سے کام کئے۔ ایک کو زہر

۱۔ ایضاً خطبہ ۹۷ صفحہ ۲۹۰
۲۔ ایضاً خطبہ ۱۰۷ صفحہ ۳۲۴

دلوایا، دوسرے کا سر نیزے پر چڑھایا۔ یہ باتیں اپنی جگہ لیکن معاویہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے ظاہر کا ایک پردہ ضرور ڈالے ہوئے تھا یہاں تک کہ یزید کا دور آجاتا ہے اور بھانڈا پھوٹ جاتا ہے، پانی اتر جاتا ہے اور قلعی کھل جاتی ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ یزید اموی سیاست کے لحاظ سے بھی ایک نااہل شخص تھا یعنی وہ ایسا شخص تھا جو اموی سیاست کو عمل میں نہیں لاسکتا تھا بلکہ اس نے تو ایک ایسا کام کیا جس سے امویوں کا پردہ ہی چاک ہوگیا اور ان کا بھرم ہی کھل گیا۔ ان حالات میں حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی تحریک شروع کرتے ہیں۔ اب میں آپ کے سامنے حضرت کی تحریک کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک بات کہتا ہوں آپ اس پر غور فرمایئے اور یہ دیکھئے کہ ایسا ہے یا نہیں۔ جس طرح قرآن کے الفاظ اور جملے فصاحت، بلاغت اور روانی کے لحاظ سے ایک خاص آہنگ آسانی سے قبول کر لیتے ہیں اور یہ خود دلوں پر قرآن کے اثر کی ایک بہت بڑی نشانی تھی اور اب بھی ہے۔ اسی طرح انسان جس وقت عاشور کے واقعے کی تاریخ پڑھتا ہے تو اس میں ڈرامائی صلاحیت دیکھتا ہے۔ جس طرح قرآن آہنگ قبول کرنے کے لئے نہیں بنا تھا لیکن آہنگ قبول کر لیتا ہے اسی طرح کربلا کا حادثہ ڈرامے کے لئے نہیں بنا تھا لیکن اسی طور ہے۔

میں نہیں جانتا کہ شاید حضرت امام حسین علیہ السلام کی بھی اس بات پر نظر رہی ہو۔ میں اس بات کا اقرار نہیں کرتا تو اس سے انکار بھی نہیں کرتا۔ کربلا کی داستان آج سے بارہ سو سال پہلے کتاب میں درج ہوئی ہے۔ ایک وقت ایسا آیا تھا جب کسی نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ حادثہ کا ذکر لوگوں میں اس قدر پھیل جائے گا۔ اس سانحے کی تاریخ جیسے واقعی کسی ڈرامے کے لئے لکھی گئی ہے اور ڈرامائی جا سکتی ہے۔ گویا یہ حکم دے دیا گیا ہے کہ اسے ڈرامے میں دکھانے کے لئے لکھیں۔ ہمارے یہاں بہیمانہ شہادتیں بہت ہیں لیکن یہ داستان کیا اس شکل میں اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔ عمداً نہیں

ہو سکتی۔ کیا امام حسین علیہ السلام نے اس بات پر توجہ نہیں کی ہو گی؟ میں نہیں جانتا لیکن قصہ آخر کار اسی طرح ہے اور مجھے یہ یقین بھی نہیں آتا کہ اس کام میں ارادہ شامل نہ ہو۔

امامؑ سے بیعت کا تقاضا ہوتا ہے۔ تین دن بعد امام علیہ السلام سفر کرتے ہیں اور مکہ کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور اصطلاحاً ہجرت کرتے ہیں۔ مکہ میں جو خدا کی طرف امن کی جگہ ہے ٹھہر جاتے ہیں اور کاروائی شروع کر دیتے ہیں۔ آپ مکہ کیوں گئے؟ کیا اس لئے کہ مکہ اللہ کی طرف سے جائے امن ہے۔ اور آپ کو یہ یقین تھا کہ بنی امیہ مکہ کا احترام کریں گے؟ یعنی بنی امیہ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے تھے یا نہیں کہ اگر ان کی سیاست کا تقاضا ہو اور وہ انہیں مکہ میں قتل کرنا چاہیں تو بھی وہ یہ کام نہیں کریں گے؟ آپ کا مکہ جانا پہلے تو اس لئے تھا کہ آپ کی یہ ہجرت خود مخالفت کا اعلان تھی۔ اگر مکہ میں رہ کر یہ کہتے کہ میں بیعت نہیں کرتا تو آپ کی آواز عالم اسلام میں اتنی دور تک نہ پہنچ پاتی۔ اس لئے یہ کہہ کر کہ میں بیعت نہیں کرتا اہلبیت کو بھی ساتھ لیا اور مکہ پہنچ گئے۔ یہ بات تھی جو آپ کی آواز چاروں طرف گونج گئی کہ حسین ابن علیؑ بیعت پر آمادہ نہیں ہوئے اور اسی لئے مدینہ سے مکہ چلے گئے۔ لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے یہ خود بھی ایک تبلیغی حرکت تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک غیر معمولی بات یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام شعبان کی تیسری تاریخ کو مکہ میں داخل ہوتے ہیں اور رمضان، شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ (اس ماہ کی آٹھویں تاریخ تک) کے مہینے، یعنی جن دنوں میں عمرہ مستحب ہوتا ہے اور لوگ چاروں طرف سے مکہ آتے ہیں، آپ وہاں گزارتے ہیں۔

رفتہ رفتہ حج کا موسم آجاتا ہے۔ لوگ چاروں طرف سے بلکہ خراسان تک سے مکہ پہنچنے لگتے ہیں۔ روز ترویہ یعنی آٹھویں ذی الحجہ کا دن آجاتا ہے جس دن سب لوگ حج کے لئے نئے سرے سے احرام باندھتے ہیں اور منیٰ اور عرفات جاکر اعمال حج

بجا لانا چاہتے ہیں۔ ناگہاں امام حسین علیہ السلام اعلان کر دیتے ہیں کہ میں عراق کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ میں کوفہ کی طرف جانا چاہتا ہوں یعنی ایسے حالات میں آپ تکمیل حج کئے بغیر کعبہ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ مجھے ایک عذر ہے۔ آپ اپنے اعتراض، نکتہ چینی اور نا رضامندی کا اس وسیلے اور اس شکل سے اعلان کرتے ہیں یعنی یہ کعبہ آخر بنی امیہ ہی کے قبضے میں تو ہے۔ جس حج کا کرانے والا یزید ہوگا اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ کعبہ کو چھوڑنا اور اعمال حج کو ترک کرنا ایسے وقت میں اور پھر یہ کہنا کہ میں خدا کی خوشنودی کی خاطر جہاد کا رخ کر رہا ہوں اور حج چھوڑ رہا ہوں، امر بالمعروف کی طرف رخ کر رہا ہوں اور حج ترک کر رہا ہوں، اپنے اندر بہت کچھ معنی رکھتا تھا۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں تھا۔ اس مقام پر تبلیغی قدر و قیمت، اسلوب اور روش نہایت بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔ آپ ایسا سفر اختیار کرتے ہیں جسے تمام عاقل لوگ (یعنی وہ عقلمند لوگ جو فائدے کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں) امام حسینؑ کی ذات کے لئے ناسازگار بتاتے ہیں یعنی پہلے ہی سے یہ بتاتے ہیں آپ سفر میں قتل کر دیئے جائیں گے اور امام حسینؑ بہت سے موقعوں پر ان کی پیش بینی کو صحیح بھی بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں خود بھی یہ بات جانتا ہوں۔

لوگ پوچھتے ہیں پھر آپ عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ کیوں لئے جاتے ہیں؟ آپ فرماتے ہیں: مجھے ان کو بھی لے جانا چاہئے۔ کربلا کے منظر میں امام حسین علیہ السلام کے اہل بیت کی موجودگی نے اس منظر کو بہت زیادہ داغدار بنا دیا۔ حقیقت میں امام حسین علیہ السلام نے کچھ تبلیغ کرنے والوں کو اس طرح کام پر لگایا کہ اپنی شہادت کے بعد دشمن کے ذریعے ہی سے دشمن کی حکومت کے مرکز یعنی ملک شام

بھجوادیا۔ یہ ایک عجیب پالیسی اور غیر معمولی کارنامہ ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ یہ آواز دنیا میں زیادہ سے زیادہ گونجے، اس وقت کی اسلامی دنیا میں دور دور تک پہنچے، تاریخ کی حدود اور زمانے کے طول سے گزر جائے اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ سفر کے دوران خود امام حسین علیہ السلام کی کاروائیاں اسلام کی حقیقت اجاگر کرنے والی ہیں، مروت، انسانیت اور اسلام کی روح اور حقانیت دکھانے والی ہیں۔ یہ سب کچھ تو اپنی جگہ ہے۔ یہ دیکھئے! یہ مذاق نہیں ہے۔ راستے میں ایک منزل پر امام حسین علیہ السلام حکم دیتے ہیں کہ زیادہ پانی بھر لو۔ جتنی مشکیں ہیں پانی سے بھر لو اور تمہارے ساتھ جتنے کوتل اونٹ اور مرکب ہیں ان پر پانی لاد دو (یہ پیش بینی ہے) راستے میں اچانک ایک صحابی زور سے چلاتا ہے: "لا حول ولا قوة الّا باللّٰہ یا:لا الہ الا اللّٰہ یا: انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون" (خدا کو یاد کرتا ہے) آپ پوچھتے ہیں: کیا بات ہے؟ وہ کہتا ہے میں اس علاقے سے واقف ہوں۔ اس علاقے میں کوئی درخت نہیں تھا جیسا کہ اس وقت دور سے نظر آرہا ہے۔ یہ درخت کی شاخ ہے۔ آپ فرماتے ہیں: خوب غور سے دیکھو! جن کی نظریں تیز ہیں وہ کہتے ہیں: نہیں آقا درخت نہیں ہے یہ تو پرچم ہیں، انسان ہیں، گھوڑے ہیں جو دور سے مارامار چلے آرہے ہیں۔ تم غلطی کر رہے ہو۔ خود حضرت دیکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں تم ٹھیک کہتے ہو۔ تمہاری بائیں طرف ایک پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ کو پیچھے رکھ لو۔ ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ حر آرہا ہے۔ امام حسین علیہ السلام اپنے باپ حضرت علیؑ کی طرح (جنگ صفین میں) ہیں جو اس قسم کے موقعوں سے بزدلانہ فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ ان کے نزدیک یہ ایسا موقع ہے جب اسلامی شرافت اور مروت کا مظاہرہ کیا جائے۔ فوراً فرماتے ہیں: پانی لاؤ اور گھوڑوں کو سیراب کردو، لوگوں کو سیراب کردو۔ خود بھی نگرانی کرتے ہیں تاکہ ان کے جانور مکمل طور پر سیراب ہوجائیں۔ ایک آدمی کہتا

ہے۔ مجھے ایسی مشک دے دی تھی جس کا دہانہ مجھ سے نہیں کھل سکا تھا تو خود تشریف لائے اور آپ اپنے ہاتھ سے مشک کا دہانہ کھول کر میرے حوالے کر دیا۔ گھوڑے پانی پی رہے تھے کہ آپ نے فرمایا: اگر یہ تھکے ہونگے تو ایک دفعہ میں سیراب ہو کر نہیں پی سکیں گے اس لئے انہیں دو دفعہ تین دفعہ میں پانی پی لینے دو۔ اسی طرح آپ کربلا میں بھی ان سختیوں کے باوجود اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ خود لڑائی نہ چھیڑیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک بار اپنے ایک قدیمی دوست سے بات چیت کر رہا تھا۔ میں ان کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جب امام حسین علیہ السلام کوفہ کے لوگوں سے مایوس ہوجاتے ہیں اور انہیں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کوفہ پر ابن زیاد کا تسلط ہوگیا اور جناب مسلم ابن عقیل مارے جاچکے ہیں تو ان کی تقریریں زیادہ المناک کیوں ہوجاتی ہیں؟ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ امام حسین علیہ السلام کے لئے واپسی کی کوئی راہ نہیں تھی۔ بہت خوب ان کے لئے واپسی کی کوئی راہ نہیں تھی لیکن پھر عاشور کی رات کو جب آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا کہ میں نے اپنی بیعت تم پر سے اٹھالی اور ان لوگوں نے کہا تھا نہیں ہم آپ کا دامن نہیں چھوڑیں گے تو آپ نے یہ کیوں نہیں کہا کہ حقیقت میں تمہارا اس مقام پر رہنا حرام ہے کیونکہ یہ لوگ تو مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں تم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے اگر تم رہ گئے تو تمہارا خون بلاوجہ بہایا جائیگا اور یہ حرام ہے؟ امام حسین علیہ السلام نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تمہارا یہاں سے چلا جانا واجب ہے؟ بلکہ جس وقت ان لوگوں نے اپنے ثبات قدم کا اعلان کیا تو امام حسین علیہ السلام نے ان کی غیر معمولی تائید اور حمایت کی اور اس کے بعد آپ جو راز پہلے انہیں نہیں بتاتے تھے ان سے کہنے لگے۔

شب عاشور کی یہ بات قطعی ہے کہ آپ جناب حبیب ابن مظاہر کو بنی اسد کے پاس بھیجتے ہیں کہ ہو سکے تو کچھ لوگوں کو لے آؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مقتولوں

کی تعداد میں اضافے کے خواہش مند تھے کیونکہ شہیدوں کا جتنا زیادہ خون بہایا جائیگا دنیا اور دنیا والوں تک یہ آواز اتنی ہی زیادہ پہنچے گی۔ عاشور کے دن حضرت حر آکر توبہ کرتے ہیں۔ پھر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں آتے ہیں تو حضرت فرماتے ہیں گھوڑے سے اتر آؤ۔ حضرت حر کہتے ہیں نہیں آقا مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنا خون آپ کے لئے بہاؤں۔ تم اپنا خون ہمارے لئے بہاؤ۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر تم مارے جاؤ گے تو کیا میں بچ جاؤں گا؟ میں تو نہیں بچوں گا۔ حضرت نے کسی سے ایسی بات نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام اس منظر کو خون آلود دیکھنا چاہتے تھے بلکہ خود اس میں رنگ آمیزی کر رہے تھے۔ اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ عاشور سے پہلے عجیب و غریب مناظر سامنے آتے ہیں جیسے وہ با ارادہ تیار کئے گئے ہوں جس سے مقصد زیادہ واضح ہو جائے۔ زیادہ اجاگر ہوجائے۔ اس مقام پر اس سانحے کی ڈرامائیت کا پہلو بہت ابھر آتا ہے۔ خدا ہمارے دوست مرحوم آیتی (جن کی یاد ہمیں آج کی رات آگئی) خدا ان پر اپنی رحمت نازل کرے۔ انہوں نے کتاب "بررسی تاریخ عاشورا" میں اس نکتے پر بہت اصرار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: تاریخی لحاظ سے خون کا رنگ سب رنگوں سے زیادہ پکا ہوتا ہے۔ تاریخ اور تاریخی مسائل میں جو رنگ مٹتا نہیں ہے وہ لال رنگ ہے۔ خون کا رنگ ہے اور حسین ابن علیؑ کا یہ قصد تھا کہ وہ اس پکے اور نہ مٹنے والے رنگ سے اپنی تاریخ لکھیں چنانچہ آپ اپنا پیغام اپنے خون سے لکھ گئے۔

سنا گیا ہے کہ کچھ لوگوں نے مرتے وقت اپنے خون سے اپنی بات لکھی ہے اور پیغام دیا ہے۔ معلوم ہے کہ کوئی اپنے خون سے اپنا پیام اور اپنی بات لکھے تو اس کا اثر ہی دوسرا ہوتا ہے۔ عرب کے ایام جاہلیت میں یہ رسم تھی۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہوجاتا تھا کہ قبیلے آپس میں ایک نہ ٹوٹنے والا عہد کریں تو ایک برتن میں خون بھر کر

لے آتے تھے (اپنا خون نہیں) اور اپنے ہاتھوں کو اس میں ڈبو کر کہتے تھے: اب یہ عہد کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ خون کا عہد ہے اور خونی عہد ٹوٹتا نہیں ہے۔ حسین ابن علیؑ عاشور کے دن گویا رنگ ملاتے ہیں لیکن خون کا رنگ ملاتے ہیں کیونکہ تاریخی اعتبار سے جو رنگ سب سے زیادہ پکا نکلا ہے وہ یہی رنگ ہے چنانچہ امام حسینؑ اپنی تاریخ خون سے لکھتے ہیں۔

کبھی ہم سنتے ہیں یا تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ بہت سے بادشاہوں یا ایسے لوگوں نے جو یہ خواہش رکھتے تھے کہ ان کا نام تاریخ میں باقی رہ جائے کسی دھات کی تختی یا پتھر پر یہ کھدوا دیا ہے کہ میں فلاں ہوں، فلاں کا بیٹا ہوں اور بادشاہوں کی نسل سے ہوں۔ میں وہ ہوں جس کے پاس فلاں شخص آیا اور اس نے میری اطاعت کی، وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ دھات یا پتھر پر وہ اپنا پیام کیوں کندہ کراتا ہے؟ صرف اس لئے کہ نابود نہ ہوجائے۔ باقی رہ جائے۔ ان آثار سے جو ہم دیکھتے ہیں تاریخ نے ان کو بوریوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا اور ان میں سے ایک کی بھی خبر نہیں ملی یہاں تک کہ ہزاروں سال کے بعد یورپ کے کھدائی کرنے والے آئے اور انہوں نے ان کو مٹی کے نیچے سے نکالا۔ اب جو کچھ مٹی کے نیچے سے نکالا ہے وہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ کوئی خاص اور حل طلب بات نہیں ہے۔ کوئی اسکی ماہیت کا قائل ہی نہیں ہوتا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو پتھر پر لکھی ہوئی ہیں دلوں پر نہیں لکھی گئیں۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنا پیغام نہ پتھر پر لکھا نہ کھودا۔ انہوں نے جو کچھ کہا وہ ہوا کی لہروں اور لوگوں کے کانوں میں گونجا لیکن دلوں پر لکھ گیا اور اس طرح لکھ گیا کہ اب دلوں سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ حضرت خود بھی اس حقیقت سے واقف تھے۔ مستقبل کو بالکل صحیح صحیح دیکھ رہے تھے کہ اس کے بعد امام حسینؑ قتل نہیں ہوسکتے۔ وہ کبھی مارے نہیں جا سکیں گے۔ آپ دیکھئے یہ کیا ہے؟ کیا یہ محض ایک

اتفاق ہوسکتا ہے؟ نہیں۔ امام حسین علیہ السلام عاشور کے دن آخری گھڑیوں اور لمحوں میں فریاد کر رہے تھے یعنی مدد طلب کر رہے تھے۔ اب بھی کوئی مددگار چاہتے تھے ایسے مددگار جو آئیں اور قتل ہوں ایسے مددگار نہیں جو آئیں اور انہیں بچائیں۔ امام حسین علیہ السلام اپنے اصحاب، بھائیوں اور بیٹوں کے مارے جانے کے بعد بے شک و شبہ یہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ زندہ رہیں لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ دوست اور مددگار اب بھی آئیں اور قتل ہوں۔ یہ وجہ ہے جو حضرت "ہل من ناصر ینصرنی" فرما رہے تھے۔ آپ کی آواز خیموں میں پہنچی تو عورتیں رونے لگیں۔ ان کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنے بھائی ابو الفضل العباس اور اپنے اہل بیتؑ میں سے ایک اور شخص کو بھیجا۔ جاؤ عورتوں کو خاموش کراؤ۔ وہ لوگ آئے اور انہوں نے انہیں چپ کرایا۔ پھر خود خیام حرم کی طرف پلٹے۔ اس وقت آپ کو دودھ پیتا بچہؑ دے دیا جاتا ہے۔ یہ بچہ اپنی پھوپھی جناب زینب سلام اللہ علیہا کی گود میں ہے جو امام حسینؑ کی بہن ہیں۔ حضرت اس بچے کو گود میں لے لیتے ہیں۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ بہن! اس بلوے میں اس ماحول میں جس میں مطلق امن نہیں ہے اور دوسری طرف سے تیر آرہے ہیں اور دشمن گھات میں ہے آپ یہ بچہ لے آئی ہیں۔ بلکہ آپ نے اسے گود میں لے لیا۔ اسی حالت میں دشمن کی طرف سے ایک تیر آتا ہے اور بچے کا گلہ چھید جاتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کیا کرتے ہیں؟! دیکھئے یہ کیسی رنگ آمیزی ہے؟ جب یہ بچہ اس طرح شہید ہو جاتا ہے تو آپ اس کے گلے کے خون سے اپنا چلو بھر لیتے ہیں اور آسمان کی طرف پھینکتے ہیں کہ اے آسمان دیکھ اور گواہ رہنا۔

ان آخری لمحات میں جب آپ کے جسم اقدس پر بہت زیادہ زخم آچکے تھے، آپ یکایک زمین پر گر پڑے تھے۔ آپ اپنے گھٹنوں پر زور دے کر اٹھتے تھے اور

تھوڑی سی حرکت کے بعد گر پڑتے تھے اور دوبارہ اٹھتے تھے۔ آپ کے گلے پر ایک ضرب لگتی ہے۔ لکھا ہے کہ آپ نے پھر اپنا چلو خون سے بھرا اور اپنی پیشانی اور چہرہ پر مل لیا اور فرمایا میں چاہتا ہوں کہ اپنے پروردگار سے اسی طرح ملاقات کروں۔ میدان کربلا کے یہ دل ہلا دینے والے اور روح کو جھنجھوڑ دینے والے نظارے ہیں۔ ایسے واقعات ہیں جو امام حسین علیہ السلام کے پیغام کو ہمیشہ کے لئے دنیا میں جاوید، ثابت اور باقی رکھنے والے ہیں۔ نویں محرم کی عصر کے قریب دشمن حملہ کرتا ہے۔ حضرت اپنے بھائی حضرت عباسؑ کو بھیجتے ہیں اور ان سے فرماتے ہیں: میں چاہتا ہوں کہ آج کی رات اپنے خدا سے راز و نیاز کروں، نماز پڑھوں، دعا اور استغفار کروں! تم جن الفاظ سے چاہو آج کی رات ان لوگوں کو کل تک کے لئے لوٹا دو۔ کل ہم یقیناً ان سے لڑیں گے۔ آخر کار وہ لوگ لڑائی ملتوی کر دیتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام نے عاشور کی رات میں کچھ کام کئے ہیں جو تاریخ میں لکھے ہوئے ہیں۔

ایک کام یہ تھا کہ اصحاب کو (خصوصاً ان لوگوں کو جو اس فن کے اہل تھے) حکم دیا کہ راتوں رات اپنی تلواریں اور نیزے تیار کرو جس کا آپ خود بھی معائنہ کرتے رہے۔ جون نامی ایک شخص اس کام یعنی ہتھیار تیار کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ حضرت جاتے تھے اور اس کا کام دیکھتے تھے۔ دوسرا کام جو آپ نے اس رات کو کیا آپ کا یہ حکم تھا کہ راتوں رات جو خیمے دور دور تھے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیں۔ یہ خیمے اتنے قریب کر دئے گئے کہ خیموں کی طنابیں ایک دوسرے میں داخل ہوگئیں دو خیموں کے درمیان ایک آدمی کا گزر بھی ناممکن ہوگیا۔ اس کے بعد آپ نے یہ حکم دیا کہ خیموں کو ہلالی شکل میں استادہ کیا جائے اور اسی رات میں خیموں کے پیچھے ایسی خندقیں کھودیں جسے گھوڑے پھلانگ نہ سکیں اور دشمن پیچھے سے حملہ نہ کر سکے۔ اسی طرح آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ جھاڑ جھنکاڑ کو ایک جگہ اکٹھا کر دیں تاکہ

عاشور کی صبح اسے جلا سکیں جس کے باعث دشمن ان لوگوں کے جیتے جی خیموں کے پیچھے سے نہ آسکے یعنی صرف سامنے، دائیں اور بائیں سے دشمن کے مقابل رہیں اور پیچھے کی طرف سے اطمینان رہے۔ حضرت کا ایک اور کام یہ تھا کہ آپ نے تمام اصحاب کو ایک خیمے میں جمع کیا اور آخری بار ان کے سامنے حجت تمام کی۔ پہلے آپ نے شکریہ ادا کیا بہت بلیغ اور عمیق۔ اپنے خاندان یعنی اہل بیتؑ کا بھی اور اپنے اصحاب کا بھی۔ آپ نے فرمایا: دنیا میں نہ میرے اہل بیتؑ سے بہتر کسی کے اہل بیت ہیں نہ میرے اصحاب سے بہتر اصحاب ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ نے فرمایا: تم سب جانتے ہو کہ یہ (دشمن) لوگ میرے سوا اور کسی سے سروکار نہیں رکھتے۔ ان کا نشانہ صرف میں ہوں۔ اگر یہ مجھ پر قابو پالیں تو پھر تم میں سے کسی سے انہیں سروکار نہیں ہوگا۔ تم لوگ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا سکتے ہو اور سب کے سب جا سکتے ہو۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ تم ان بچوں میں سے اور میرے خاندان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑو اور اپنے ساتھ لے جاؤ۔ آپ نے یہیں تک کہا تھا کہ لوگ ہر طرف سے بول اٹھے: یا ابا عبداللہؑ! کیا ہم یہ کام کر سکتے ہیں؟ "بدأهم بهذا القول العباس بن علیؑ"(۱) سب سے پہلے جو شخص بولا وہ امام حسینؑ کے برادر حضرت ابوالفضل العباسؑ تھے۔ اس مقام پر ہم پھر ایسی باتیں سنتے ہیں جو حقیقت میں تاریخی اور ڈرامائی نوعیت کی ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی زبان میں کچھ نہ کچھ کہتا ہے۔ ایک کہتا ہے آقا! اگر مجھے مار ڈالیں، پھر میرے جسم کو جلا ڈالیں اور میری راکھ کو ہوا میں اڑا دیں پھر دوبار زندہ کریں اور ستر بار ایسا ہی کرتے رہیں تو بھی میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ ہماری یہ حقیر جان آپ پر قربانی کے لائق

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۹۳، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۱، اعلام الوری ۲۳۰

نہیں ہے۔ ایک اور کہتا ہے! اگر مجھے ہزار بار مار ڈالیں اور پھر زندہ کریں میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت نے ہر ایسا کام جو لازم تھا انجام دیا تاکہ آپ کے ساتھ صرف خالص اور مخلص لوگ باقی رہ جائیں۔

وہاں ایک ایسا شخص بھی موجود تھا جسے اتفاق سے محرم کے انھیں دنوں میں یہ خبر ملی کہ اس کا بیٹا فلاں جنگ میں دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا ہے۔ وہ اچھا جوان تھا۔ اور معلوم نہیں تھا کہ اس پر کیا بیتنے والی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں زندہ رہوں اور میرے بیٹے کا یہ حال ہو۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کو یہ اطلاع پہنچی کہ آپ کے فلاں صحابی پر یہ افتاد پڑی ہے۔ حضرت نے اسے بلایا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور تعریف کی کہ تم ایسے ہو اور ایسے ہو۔ تمہارا بیٹا گرفتار ہوگیا ہے۔ ضروری ہے کہ کوئی جائے اور دشمن کو رقم اور تحفہ دے کر اسے چھڑا لائے۔ وہاں سامان اور لباس تھا جسے بیچ کر رقم حاصل کی جا سکتی تھی۔ آپ نے فرمایا یہ لیکر چلے جاؤ اور اسے بیچ کر رقم بنا لینا اور اس کو دے کر اپنے بیٹے کو آزاد کرا لینا۔ جب حضرت نے یہ فرمایا تو اس نے عرض کی: "اکلتنی السّباع حیّا ان فارقتك" (۱) اگر میں ایسا کام کروں تو بیابان کے درندے مجھے زندہ کھا جائیں۔ میرا بیٹا قید میں ہے۔ ہوا کرے۔ کیا میرا بیٹا آپ سے زیادہ عزیز ہے؟! اسی رات کو جب آپ حجت تمام کر چکے اور سب نے یک زبان ہو کر صاف صاف الفاظ میں وفاداری کا اعلان کر دیا اور کہا کہ ہم آپ سے ہرگز الگ نہیں ہوں گے تو ایک دم منظر بدل جاتا ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا۔ اب صورت حال یہ ہے۔ آپ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں اور یہ جان لیں کہ ہم سب مارے جائیں گے۔ سب نے کہا۔ خدا کا شکر ہے۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں ایسی توفیق اور سعادت عطا فرمائی۔ ہمارے

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۹۴

لئے یہ خوشخبری ہے۔ شادمانی کا سبب ہے۔

اس مجلس میں ایک بچہ ایک طرف بیٹھا ہوا تھا جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ کی نہیں تھی۔ اس بچے کے دل میں یہ شک گزرا کہ اس قربانی میں میں بھی شامل ہونگا یا نہیں؟! حضرت نے ایک طرف یہ تو فرمادیا کہ تم سب کے سب جو یہاں موجود ہو مارے جاؤگے لیکن ہوسکتا ہے کہ چونکہ میں بچہ اور نابالغ ہوں ان کی مراد مجھ سے نہ ہو۔ اس لئے اس نے حضرت امام حسین علیہ لسلام کی طرف رخ کر کے پوچھا: "یا عمّاہ! و انا فی من قتل؟" چچاجان! کیا کل میں بھی قتل ہونے والوں میں شامل ہونگا؟ لکھا ہے کہ حضرت اس وقت رونے لگے اور اس بچے کو جو حضرت قاسم بن حسن تھے آپ نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ان سے کہا: بیٹا! تم پہلے میرے سوال کا جواب دوپھر میں تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔ پہلے یہ کہو ؛ "کیف الموت عندك؟" تمہارے نزدیک موت کا ذائقہ کیسا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: یا عمّاہ احلی من العسل. میرے نزدیک شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ اگر آپ یہ فرمائیں کہ میں کل شہید ہوجاؤں گا تو یہ میرے لئے خوش خبری ہوگی۔ آپ نے فرمایا ہاں بیٹا۔ "امّا بعد ان تبلو ببلاءٍ عظیم" لیکن بہت زیادہ دکھ جھیلنے کے بعد۔ ایک بہت بڑی مصیبت اٹھانے کے بعد۔ حضرت قاسم نے فرمایا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسا حادثہ ہونے والا ہے۔ اب آپ حضرت امام حسین علیہ السلام کی اس بات پر غور کر کے دیکھئے کل کیسا عجیب و غریب قدرتی منظر سامنے آنے والا ہے۔ حضرت علی اکبر کی شہادت کے بعد یہی بچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں آتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ چونکہ جسم چھوٹا ہے اور نابالغ اور بچے ہیں انکے جسم پر ہتھیار موزوں نہیں ہو

پاتے۔ زرہ بڑے انسانوں کے لئے بنائی گئی ہیں چھوٹے بچوں کے لئے نہیں ہیں۔ خود بھی بڑوں کے سروں پر موزوں ہوتے ہیں، چھوٹے بچوں کے سروں پر نہیں۔ اس نے عرض کیا عموجان! اب میری باری ہے۔ مجھے میدان میں جانے کی اجازت دیجئے۔ (عاشور کے دن کوئی شخص حضرت امام حسین علیہ السلام کی اجازت کے بغیر میدان میں نہیں جاتا تھا۔ جو آتا تھا پہلے سلام کرتا تھا: السلام علیك یا ابا عبد اللّٰہ، مجھے اجازت دیجئے) حضرت ابا عبد اللہ نے اتنی جلدی سے انہیں اجازت نہیں دی۔ رونے لگے۔ حضرت قاسم اور ان کے چچا دونوں لپٹ کر رونے لگے لکھا ہے: "فجعل یقبل یدیه و رجلیه" (۱) یعنی جناب قاسم حضرت امام حسین علیہ السلام کے ہاتھ اور پاؤں چومنے لگے۔ کیا یہ بات ایسی نہیں ہے جس سے تاریخ بہتر طور پر فیصلہ کر سکے؟ وہ اصرار کرتے ہیں اور امام حسینؑ انکار کرتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام قاسم کو اجازت دینا اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن زبان سے انہیں اجازت نہیں دیتے۔ بلکہ اچانک اپنے ہاتھ پھیلا دئے اور کہا: آ میرے بھائی کی نشانی میں تجھے خدا حافظ کروں۔ جناب قاسم نے چچا کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور چچا نے بھتیجے کی گردن میں۔ لکھا ہے کہ یہ دونوں چچا بھتیجے اس قدر روئے (حضرت ابا عبداللہ کے جان نثار یہ جانگداز منظر دیکھ رہے تھے) کہ دونوں بے حال ہوگئے اور ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ یہ بچہ فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

عمر ابن سعد کے لشکر کا راوی کہتا ہے میں نے یکا یک ایک بچے کو دیکھا جو گھوڑے پر سوار تھا۔ جس کے سر پر خود کی جگہ عمامہ بندھا ہوا تھا، جس کے پیروں

۱۔ یہ عبارت مقاتل میں اس طرح ہیں: فلم یزل الغلام یقبل ید یه و رجلیه حتی اذن له۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۳۴، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۲۷

میں تسمہ بھی نہیں تھا معمولی جوتا تھا جس کا ایک بند کھلا ہوا تھا اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ بایاں پاؤں تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "کانه فلقة القمر"(۱) جیسے چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس قدر حسین تھا۔ وہی راوی کہتا ہے: جناب قاسم جس وقت تیزی سے آرہے تھے ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

معمول یہ تھا کہ لوگ اپنا تعارف کراتے تھے کہ میں کون ہوں۔ سب کے سب حیران ہیں کہ یہ بچہ کون ہے؟!۔ جیسے وہ لوگوں کے سامنے آکر کھڑے ہوئے ان کی آواز بلند ہوئی:

ان تنکرونی فانا بن الحسن سبط النّبی المصطفی المؤتمن

اے لوگو اگر مجھے نہیں پہچانتے تو پہچان لو کہ میں حسن بن علی بن ابی طالبؑ کا بیٹا ہوں جو پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفیؐ کے نور سے ہیں۔

هذا الحسین کا لا سیر المر تهن بین اناس لا سقوا صوب المزن(۲)

یہ شخص جسے تم یہاں دیکھ رہے ہو اور جو تمہارا قیدی ہے میرا چچا حسین ابن علی ابن ابی طالبؑ ہے۔ جناب قاسم میدان میں جاتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنا گھوڑا لے آتے ہیں اور اس کی لگام ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس موقع کے منتظر ہیں جب انہیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ اس وقت امام حسینؑ کے دل کا کیا حال ہے؟۔ وہ منتظر ہیں، جناب قاسم کی آواز کے منتظر کہ یکایک جناب قاسم کی یا عماہ! کی آواز بلند ہوئی، راوی کہتا ہے ہم نہیں سمجھ سکے کہ امام حسینؑ کس تیزی سے گھوڑے پر سوار ہو کر جھپٹے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ انہوں نے شکاری باز کی طرح اپنے آپ کو میدان جنگ میں پہنچا دیا۔ لکھا ہے کہ

۱۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۰۶، ایسی ہی عبارت اعلام الوری کے صفحہ ۲۴۲ پر، اللہوف کے صفحہ ۴۸ پر، بحار الانوار کے جلد ۴۵ کے صفحہ ۳۵ پر، ارشاد شیخ مفید کے صفحہ ۲۳۹ پر، مقتل الحسین مقرم کے صفحہ ۳۳۱ پر اور تاریخ طبری کے صفحہ ۲۵۶ پر ملتی ہے

۲۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۴۴

حضرت قاسم کے گھوڑے سے گرنے کے بعد تقریباً دو سو سواروں نے ان کو گھیر لیا تھا اور ایک شخص چاہتا تھا کہ جناب قاسم کا سر تن سے جدا کرے لیکن جونہی انہوں نے دیکھا کہ حسین آپہنچے تو بھگدڑ مچ گئی اور وہی شخص جو قاسم کے قتل کے ارادے سے آیا تھا گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل گیا۔ اشقیاء اس قدر خوفزدہ اور بد حواس ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنے ہی ساتھی کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل دیا۔ مجمع کثیر تھا، گھوڑے دوڑ رہے تھے ایک آنکھ دوسری آنکھ کو نہیں دیکھ سکتی تھی بقول فردوسی۔

زسمّ ستوراں در آں پہن دشت
زمیں شد شش و آسماں گشت ہشت

ایسے میں اب کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ حقیقت حال کیا ہے۔ "و انجلت الغبرة" (۱) جیسے ہی دھول بیٹھی لوگوں نے امام حسینؑ کو دیکھا کہ جناب قاسم کا سر دامن میں لئے ہوئے ہیں (میں یہ بات نہیں بھولتا: قم کے مشہور اشراقی واعظ (مرحوم پر خدا رحمت نازل کرے) بیان کرتے تھے کہ میں نے ایک بار مرحوم آیت اللہ حائری کے سامنے یہ روضہ (مجلس) پڑھی جو عین تاریخ ہے اور عین مقتل ہے جس میں ایک لفظ بھی کم یا زیادہ نہیں ہے۔ حاجی شیخ مرحوم اس قدر روئے کہ بیتاب ہو گئے۔ بعد میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں جس مجلس میں موجود ہوں تم مصائب کا یہ حصہ اب نہ پڑھنا کیونکہ مجھے اس کے سننے کی تاب نہیں ہے اور حضرت قاسم کا یہ حال ہے کہ اپنے آخری لمحات میں تکلیف کی شدت سے زمین پر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں "و الغلامُ یفحص برجلیه" (۲) اس وقت لوگوں نے سنا کہ امام حسینؑ یہ

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۳۵، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۹، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۳۲، اعلام الوری صفحہ ۲۴۳، اللہوف صفحہ ۴۸، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۲۷

۲۔ مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۳۲، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۳۵، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۲۸، اللہوف صفحہ ۴۸، اعلام الوری صفحہ ۲۴۳، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۹، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۰۸۔

کہہ رہے ہیں کہ :"یعزّ واللّٰہ علی عمّك ان تدعوہ فلا ینفعك صوتہ"(۱) اے عم کی جان! مجھ پر یہ بات کس قدر گراں ہے کہ تو فریاد کرے یا عماہ لیکن تیرا عم تجھے ٹھیک ٹھیک جواب بھی نہ دے سکے۔ مجھ پر کس قدر شاق ہے کہ میں تیرے سرہانے پہنچوں لیکن تیرے کسی کام نہ آسکوں۔

ولا حول ولا قوۃ الّا باللّٰہ العلی العظیم

و صلی اللّٰہ علی محمد و آلہ الطاہرین

۱۔ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۰۷،اللہوف صفحہ ۴۸، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۳۵، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۹، اعلام الوری صفحہ ۲۴۳، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۳۲، تاریخ طبری جلد ۶ ، صفحہ ۲۵۷۔

پانچویں مجلس

سانحۂ کربلا، اسلام کا عملی مجسمہ

بسم اللّٰہ الّرحمن الّر حیم

الّذین یبلّغون رسالات اللّٰہ و یخشونہ ولا یخشون احداًالّا اللّٰہ وکفی باللّٰہ حسیباً(۱)

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ممکن ہے ایک جملے کے مختلف پہلوؤں سے مختلف معنی نکلتے ہوں اور وہ سب کے سب صحیح بھی ہوں۔ یہی حال حادثات اور واقعات کا ہے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ حادثہ کربلا بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہے اور واقعی جس وقت میں اس حادثے کے بارے میں غور کرتا ہوں تو ایسا ہی پاتا ہوں کہ انسان اس پر جتنا زیادہ غور کرتا ہے اور سوچتا ہے اس سے اتنے ہی نئے نئے سبق حاصل ہوتے ہیں۔ میں نے کل رات کو عرض کیا تھا کہ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جسے ڈرایا جا سکتا ہے اور جس میں اتنی زیادہ کیل کھونٹیاں ہیں کہ جیسے انہیں نشان دہی کے لئے جمع کر لیا گیا ہو۔ اب میں عرض کرتا ہوں کہ کربلا کے حادثے کے اس پہلو میں ایک اور راز ہے (میں اس حادثے کی تشریح قیام یا تحریک کے لحاظ سے اس لئے

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

نہیں کر رہا ہوں کہ قیام یا تحریک کے لفظ سے اس قصے کی بزرگی کا جیسا چاہے ویسا پتا نہیں لگتا اور میرے پاس بھی کوئی اور لفظ ایسا نہیں ہے جس سے میں اس کی عظمت کا اندازہ کرا سکوں۔ اس لئے اس کا مفہوم میں مجموعی طور پر بیان کرتا ہوں۔ میں کربلا کا حادثہ کہتا ہوں قیام نہیں کہتا کیونکہ یہ قیام سے زیادہ ہے اور اسی لئے میں اسے تحریک بھی نہیں کہتا کیونکہ یہ تحریک سے زیادہ ہے) وہ راز یہ ہے کہ بنیادی طور پر خود یہ حادثہ، تمام کا تمام حادثہ میں اپنے جملہ پہلوؤں اور سمتوں سمیت اسلام کو تجسم بخشنے والا ہے۔ یعنی اس بات کا راز کہ اس حادثہ کو ڈرامایا جا سکتا ہے اور اسٹیج پر دکھایا جا سکتا ہے یہ ہے کہ یہ اسلام کے کئی پہلو، کئی سطحیں، اور کئی سمتیں رکھنے والے سوچ اور تصور کی تجسیم ہے۔ اسلام کے تمام اصول اور پہلو عملی طور پر اس حادثہ میں مجسم ہو گئے ہیں۔ اس میں اسلام جاری ہے، عمل ہے اور تکمیلی مرحلہ میں ہے، یعنی اس میں اسلام اول سے آخر تک اپنے تمہیدی، تعمیلی اور تکمیلی مرحلہ میں نظر آتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ کبھی کبھی مجسمہ سازی یا نقاشی صرف ایک خیال سے مخصوص ہوتی ہے۔ اب جو کبھی کبھی اس میں درحقیقت کوئی تصور نہیں ہوتا بلکہ ہنر برائے ہنر و حسن کاری ہوتا ہے تو اس میں بھی کبھی کبھی کسی خیال کی علامت موجود ہوتی ہے مثلاً ایک شخص جو باہر (بدیس) سے پلٹا تھا کہتا تھا کہ وہاں کے عجائب گھر میں میں نے ایک چیز یہ دیکھی کہ ایک تخت پر ایک حسین اور جوان عورت کا بت رکھا ہوا تھا اور اسی کے پہلو میں ایک جوان مرد کا بھی بت تھا۔ وہ جوان اپنی جگہ سے اٹھ چکا تھا۔ اس کا ایک پاؤں تخت کے نیچے اور رخ دوسری جانب پھرا ہوا تھا گویا وہ تیزی سے اس عورت سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی بغل میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا میں نہیں سمجھ پایا کہ اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ کسی قصے کی نشان

دہی کر رہا ہے؟ میں نے رہنما (گائڈ) سے پوچھا۔ اس نے کہا: یہ افلاطوں کے خیال کا مجسمہ ہے، اس خیال کا جو فلسفی انسانی عشق کے متعلق رکھتے ہیں کہ وصال (ملاقات) عشق کی موت ہے۔ عشق کا اگر سو فیصدی نتیجہ ملاقات نکلے تو عشق بیزاری میں بدل جائے اور معشوق سے نفرت ہو جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے داناؤں اور عارفوں نے بیان کیا ہے کہ انسان اس چیز کا طالب ہوتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی اور جب تک وہ اسے حاصل نہیں ہوتی اس سے عشق کرتا رہتا ہے۔ جب بالکل اس تک پہنچ جاتا ہے تو عشق کی گرمی ٹھنڈک میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ پھر دوسرے معشوق کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک خیال کی تجسیم ہے لیکن بے روح، یعنی فکر کو پتھر میں مجسم کر دیا ہے لیکن پتھر میں زندگی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں حقیقت یا اصلیت نہیں ہوتی یا نقاشی میں بھی ممکن ہے ایسی ہی چیزیں ہوں۔ لیکن بے روح تجسیم اور اس زندہ تجسیم میں کتنا فرق ہوتا ہے جب خیال کسی جاندار ذات میں مجسم ہوتا ہے، اتر جاتا ہے لیکن ان بے حقیقت نمائش اور سنگ تراشیوں کے جانداروں میں نہیں جو آج کل تیار کئے اور بنائے جاتے ہیں۔ بلکہ ان میں جو حقیقی اور اصلی ہوں صرف نمائشی نہ ہوں۔ کربلا کا سانحہ خود اسلام کے سپاہیوں کی ایک نمائش ہے لیکن ایسی نمائش نہیں ہے جو صرف دکھاوا یعنی سنگ تراشی ہو، پہلے بنائیں اور کھلونے تراشیں لیکن ان میں حقیقت نہ ہو مثلاً فرض کیجئے آیت: "انّ اللّٰہ اشتری من المؤ منین انفسہم و اموالہم بانّ لہم الجنتہ"(۱) کربلا کے حادثہ میں اپنے آپ کو عملی طور سے پیش کر رہی ہے اسی طرح انشا اللہ قرآن کی دوسری آیتیں پیش کرنے کی بھی کوشش کروں گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں حادثہ کربلا سے مختلف نتائج نکالے گئے

۱۔ سورۂ توبہ آیت ۱۱۱

ہیں۔ مثلاً میں پہلے بتا چکا ہوں کہ "دعبل خزائی" کا نتیجہ حضرت امام رضا علیہ السلام کے زمانے کے شاعروں سے، "کمیت اسدی" کا نتیجہ حضرت امام سجاد اور امام باقر علیہما السلام کے زمانے کے شاعروں جیسے محتشم کاشانی یا سامانی یا صفی علی شاہ سے مختلف ہے۔ انہوں نے ایک طرح سے سمجھا ہے، محتشم نے دوسرے طریقے سے سمجھا ہے، سامانی نے ایک اور ہی نتیجہ نکالا ہے۔ صفی علی شاہ نے مختلف اور علامہ اقبال نے دوسرے ہی طریقے سے سمجھا ہے۔ یہ کس لئے ہے؟ میری نظر میں تو یہ سب نتائج صحیح ہیں (بیشک غلط نتائج بھی موجود ہیں لیکن ہمیں ان سے کوئی غرض نہیں ہے) لیکن ادھورے ہیں۔ صحیح تو ہیں لیکن مکمل نہیں ہیں۔ صحیح ہیں یعنی غلط یا جھوٹ نہیں ہیں، بے حقیقت نہیں ہیں البتہ حادثہ کربلا کے مکمل نتیجے کا صرف ایک ایک پہلو یا رخ ہیں۔

یہ اسی ہاتھی کا سا قصہ ہے جو مولانا رومی نے بیان کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے اندھیرے میں یہ چاہا کہ ہاتھی کو چھو کر پہچانیں۔ جس شخص نے ہاتھی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تھا اس نے ایک نتیجہ نکالا، جس نے ہاتھی کے کان پر ہاتھ پھیرا اس نے دوسرا نتیجہ نکالا۔ یہ نتیجے صحیح تھے اور غلط بھی۔ غلط اس لحاظ سے تھے کہ ہاتھی کلی طور پر وہ نہیں تھا جو فرداً فرداً کہتے تھے اور صحیح اس لحاظ سے تھے کہ ہاتھی جزواً جزوا وہی تھا جو انہوں نے اپنے اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا تھا۔ جس کا ہاتھ کان پر پڑا تھا اس نے کہا کہ ہاتھی پنکھے کی شکل کا ہے اور وہ سچ کہتا تھا کیونکہ اس نے جو چیز چھوئی تھی وہ پنکھے کی شکل کی تھی لیکن ہاتھی پنکھے کی شکل کا نہیں تھا۔ جس کا ہاتھ سونڈ پر پڑا تھا اس نے کہا کہ ہاتھی موری کی شکل کا ہے۔ یہ بات صحیح تھی اور غلط بھی تھی۔ صحیح اس لحاظ سے تھی کہ اس نے جو چیز چھوئی تھی وہ موری کی شکل کی تھی اور غلط اس لحاظ سے تھی

کہ ہاتھی موری کی شکل کا نہیں تھا۔ ہاتھی ایک کل ہے جس کا ایک عضو چھت کی طرح ہے یعنی اس کی پیٹھ، ایک عضو کھمبے کی طرح کا ہے یعنی ہاتھی کی ٹانگ، ایک اور عضو موری جیسا ہے یعنی ہاتھی کی سونڈ۔ لیکن ہاتھی اپنی کلی اور مجموعی حیثیت سے ہاتھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نتیجے صحیح بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ غلط بھی ہیں۔

تحریک حسینی کو "دعبل خزاعی" نے وقت کے لحاظ سے صرف احتجاجی اور نزاعی سمجھا ہے "محتشم کاشانی" نے اس کے المناک اور دل پگھلانے اور رلانے والے پہلو پر زور دیا ہے۔ "عمان سامانی" یا "صفی علی شاہ" نے اس تحریک سے عرفانی، عشق الٰہی اور راہ حق میں پاک بازی کے پہلو نکالے ہیں کیونکہ حق کی خاطر قیام حسینؑ کا بنیادی اور حقیقی پہلو اس کا پاک بازی کا پہلو ہے۔ یہ تمام نتائج صحیح ہیں۔ لیکن ایک ایک پہلو کی حیثیت سے۔ ایک نے حماسی پہلو کی بات کی ہے۔ ایک نے اخلاقی پہلو کی بات کی ہے۔ ایک نے پند و نصیحت کی بات کی ہے۔ سب نے درست کہا ہے لیکن ہر ایک نے اس تحریک کے پورے جسم یعنی کل سے نہیں صرف ایک ایک پہلو، ایک ایک عضو یعنی ایک ایک جزو سے نتیجہ نکالا ہے۔ جب ہم اسلام کی جامعیت اور کلیت پر نظر ڈالنا چاہیں تو ہمیں تحریک حسینی پر نظر ڈالنا چاہئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے کل اسلام کو کربلا میں عملاً پیش کر کے مجسم کر دیا اور یہ تجسیم بے روح نہیں ہے، زندہ، جاندار، حقیقی اور واقعی جس میں زندگی کی حرارت، دل کی دھڑکن اور لہو کی دھار سب کچھ موجود ہے۔ انسان جب کربلا کے حادثہ پر غور کرتا ہے تو ایسی ایسی باتیں دیکھتا ہے کہ دنگ رہ جاتا ہے اور یہ کہہ اٹھتا ہے کہ یہ محض اتفاقیہ نہیں ہو سکتیں۔ اور ائمۂ اطہارؑ نے اس سبب کو زندہ و پائندہ رکھنے کی اور اس یادگار کی تجدید کرتے رہنے کی وصیت اور تاکید کی ہے اور یہ اجازت نہیں دی ہے کہ کربلا کا واقعہ بھلا دیا جائے۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ یہ حادثہ ایک مجسم اسلام ہے۔ تم اس اسلام

مجسم کو فراموش نہ ہونے دو۔

ہمیں کربلا کے حادثہ میں ایک عجیب رو ملتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس حادثہ میں مرد کا کردار ہے، عورت کا کردار ہے، بوڑھے، جوان اور بچے کا کردار ہے، گورے، کالے کا کردار ہے، عرب اور غیر عرب کا کردار ہے، مختلف طبقوں اور جماعتوں کا کردار ہے ایسا لگتا ہے جیسے بنیادی طور پر قضاو قدر نے یہ طے کر دیا ہے اس حادثہ میں مختلف طبقات اپنے اپنے مختلف کردار ادا کریں یعنی اسلام کی بخوبی اور کلی نشان دہی ہو جائے۔ یہ جو میں عرض کر رہا ہوں کہ اس میں عورت کا حصہ ہے یہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا پر ہی موقوف نہیں ہے اس بارے میں ہمارے پاس کتنے ہی واقعات ہیں۔ کربلا میں ایک شہید کی زوجہ بھی ہے اور وہ جناب عبد اللہ بن کلبی کی زوجہ ہیں۔ دو اور عورتیں بھی ہیں جو با قاعدہ میدان جنگ میں آپہنچی ہیں لیکن امام حسین علیہ السلام نے انہیں روکا اور حکم دیا کہ واپس جاؤ اور وہ پلٹ گئیں۔ مائیں ہیں جنہوں نے اپنے بیٹوں کی شہادت دیکھی اور اسے خدا کی خاطر سمجھ لیا۔ اسی طرح ہم کربلا میں موالی نام (۱) کے پندرہ آدمی دیکھتے ہیں ان میں سے خاص طور پر ایک جن کا نام مولیٰ لیا گیا ہے مالی شوذب مولی عابس بن عبید ہیں۔(۲) مرحوم حاجی نوری اور مرحوم حاج شیخ عباس قمی جیسے بڑے بڑے عالموں نے اس بات کی تائید کی ہے۔ اس

۱۔ مولیٰ عربی کا ایسا لفظ ہے جس کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ کبھی آزاد کئے ہوئے غلام کے ہوتے ہیں اور اکثر اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو دوسری قوم یا شخص سے ولا (دوستی) کا پیمان رکھتا ہو یعنی اس سے یہ عہد کر چکا ہو کہ اس کے پاس رہیگا یا اس کا بچاؤ کریگا۔ جب کہتے ہیں کہ فلاں شخص موالی میں سے ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو باہم ہم پیمان ہیں۔ یہ جو مولی کو بردہ (غلام) کہتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ جس وقت کہتے ہیں کہ عرب لوگ ایرانیوں کو موالی کہتے تھے تو اس سے ہرگز غلام مراد نہیں ہوتے تھے یعنی ایرانیوں کو غلام نہیں کہتے تھے

۲۔ زیارت ناحیہ مقدسہ میں شوذب مولی شاکر نام لیا گیا ہے

میں شک باقی نہیں رہنا چاہئے کہ مولا عباسؑ سے یہ مراد نہیں ہے کہ عابس غلام یا آزاد کئے ہوئے تھے بلکہ یہ معنی ہیں کہ ان کے ہم پیمان تھے اور کہتے ہیں کہ وہ قدرو منزلت اور سماجی شخصیت میں عابس سے بڑھے ہوئے تھے۔

میں آج کی رات سانحہ کربلا کے کچھ پہلو جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا آپ کے سامنے عرض کرونگا۔ توحیدی اور عرفانی پہلو کی نشان دہی کے لئے خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے کا پہلو دکھانے کے لئے اور یہ دکھانے کے لئے کہ خدا کے سوا ہر چیز ہیچ ہے امام حسین علیہ السلام کے شاید وہ دو جملے کافی ہونگے جو آپ نے اپنی پہلی تقریر میں یعنی اس تقریر میں جو مکہ میں کی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا: "رضی اللّٰہ و اللّٰہ رضانا اہل البیت" (۱) ہم اہل بیت اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے ہم صرف وہی پسند کرتے ہیں جو خدا ہمارے لئے پسند کرتا ہے۔ خدا نے ہمارے لئے جو راستہ مقرر کر دیا ہے ہم اسی راہ کو پسند کرتے ہیں۔ امام باقر علیہ السلام جابر کی مزاج پرسی کو جاتے ہیں۔ ان کا حال پوچھتے ہیں۔ امام باقرؑ جو جوان ہیں اور جابر پیغمبرؐ کے بوڑھے صحابی ہیں۔ جابر عرض کرتے ہیں: یابن رسول اللہؐ! میں اس حال میں ہوں کہ غریبی کو دولت پر، بیماری کو صحت پر اور مرنے کو جینے پر ترجیح دیتا ہوں۔ امام علیہ السلام نے فرمایا۔ ہم اہل بیت کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ ہم خود کچھ پسند نہیں کرتے۔ خدا کی جو مصلحت ہو اسی پر ایمان خوب ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے آخری جملوں میں ہم انہیں معنوں کا عکس دیکھتے ہیں۔ مرحوم آیتی کے الفاظ میں (بڑا اچھا نتیجہ نکالا ہے) یہ لڑائی ایک تیر سے شروع ہوئی تھی اور ایک تیر پر ہی ختم ہو گئی۔ عاشور کے دن پہلا تیر عمر ابن سعد نے چلایا۔

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۶۷، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۱۹۳، اللہوف صفحہ ۲۵، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۲۹

پھر کہا امیر کو اطلاع دے دو کہ میں پہلا تیر انداز تھا جس نے حسینؑ پر تیر چلایا۔ اس کے بعد لڑائی شروع ہوئی (امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو لڑائی کی ابتداء کرنے سے منع فرما دیا تھا)۔ پھر ایک تیر پر لڑائی ختم بھی ہو گئی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام گھوڑے پر سوار تھے۔ بہت تھکے ہوئے اور بہت زخم کھائے ہوئے تھے۔ ان کی قوت قریب قریب ختم ہو رہی تھی کہ ایک تیر آتا ہے اور حضرت کے سینے میں پیوست ہو جاتا ہے۔ لبا عبد اللہؑ گھوڑے سے زمین پر گر پڑتے ہیں اور اسی حال میں فرماتے ہیں: "رضاً بقضائك و تسليماً لامرك لا معبود سواك يا غياث المستغيثين"(۱)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: سورۂ والفجر کو اپنے نوافل اور فرائض میں پڑھا کرو اس لئے کہ یہ میرے جد حسین بن علیؑ کی سورۃ ہے۔ لوگوں نے پوچھا: یہ کس طرح آپ کے جد کی سورۃ ہے؟ آپ نے جواب دیا: سورۂ والفجر کی آخری آیات امام حسینؑ کی گواہ ہیں کیونکہ سورۃ کہتی ہے: "يا ايتها النفس المطمئنّة ارجعي الى ربك راضية مرضية فادخلي في عبادي وادخلي جنتي"(۲) آپ دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کی شب عاشور کس طرح گزرتی ہے۔ امام حسینؑ نے یہ رات کس طرح اپنے لئے بچائی تھی استغفار کی خاطر، دعا کے لئے، مناجات کے لئے، اپنے پروردگار سے رازونیاز کرنے کے لئے۔ روز عاشور کی نماز دیکھئے کہ اس میں توحید، عبودیت، ربوبیت اور عرفان کے پہلو کس قدر ابھرے ہوئے ہیں۔

میں نے بار بار عرض کیا ہے کہ گنتی کے اصحاب، تمام اہل بیتؑ اور خود امام

۱۔ اسی قسم کی عبارت مقتل مقرم کے صفحہ ۳۵۷ پر اور قمام زخار کے صفحہ ۲۶۲ پر ہے

۲۔ سورۂ فجر آیات ۲۷ تا ۳۰

حسین علیہ السلام عاشور کے ظہر کے بعد شہید ہوئے ہیں۔ ایک شخص ہمام ابوالصائدی آتا ہے، امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرتا ہے: یابن رسول اللہؐ! نماز کا وقت ہے، ہماری آرزو ہے کہ ہم اپنی آخری نماز آپ کے ساتھ باجماعت پڑھ لیں۔ دیکھئے کیا نمازی تھا! نماز، ایسی تھی کہ تیروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب اپنے حال میں غرق تھے۔ الله اكبر۔ بسم الله الرحمن الرحيم۔ الحمد لله رب العالمين۔ ایک انگریز کہتا ہے: حسین ابن علیؑ نے کیسی طرفہ نماز پڑھی جس کی نظیر کا دنیا میں سراغ نہیں ملتا۔ اپنے چہرۂ مقدس کو جلتی ریت پر رکھ کر کہتے ہیں: "بسم الله و بالله و على ملت رسول الله"(۱) اس کے بعد جو ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حسینی تحریک، ایک عرفانی تحریک ہے، اللہ کی خالص محبت کی۔ فقط امام حسینؑ ہیں اور ان کا خدا، جیسے کسی اور بات کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن ایک اور زاویے سے جب ہم دیکھتے ہیں (جس زاویے سے دعبل اور کمیت اسدی وغیرہ نے نہیں دیکھا ہے) تو ہم ایک رنجیدہ شخص کو دیکھتے ہیں کہ ایک ظالم اور جابر کی قوت کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہوا ہے اور کسی طرح اس کے سامنے نہیں جھکتا۔ اس کے منہ سے جیسے آگ برس رہی ہے اور وہ مجسم عزت، شرافت اور آزادی کی باتیں کر رہا ہے: "لا والله لا اعطيكم بيدي اعطاء الذليل و لا افر فرار العبيد"(۲) میں ذلت آمیز بیعت کے لئے ہرگز ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا اور میرے لئے محال ہے کہ غلاموں کی طرح بھاگوں گا۔ "هيهات منّا الذلة"(۳)

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵، صفحہ ۵۳

۲۔ ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۳۵، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۲۸۰

۳۔ اللہوف صفحہ ۴۱، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۷، تاریخ شام ابن عساکر جلد ۴ صفحہ ۳۳۳ وغیرہ

"الموت اولی من رکوب العار" (۱) ل"ا اری الموت الاّ سعادة والحیواة مع الظالمین الاّ برماً "(۲) ہر بات ایک ایک مقام پر کہی ہے۔ ان پر جب انسان نظر ڈالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ حماسہ ہے اور شجاعت ہے۔ عربوں کی زبان میں اِبا یعنی انکار اور منع کرنا ہے۔ جو لوگ ظلم اور زبردستی برداشت کرنے کو آمادہ نہیں ہوتے انہیں عرب لوگ "ابات" کہتے ہیں۔ ابن ابی الحدید ایک سنی عالم ہے وہ کہتا ہے : حسین ابن علیؑ ابات کے سردار ہیں۔ ان لوگوں کے سردار جو ظلم و جور گوارہ نہیں کرتے، حسین ابن علیؑ ہیں۔ ہم اس زاویے سے دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ سب حماسہ، جنگ، اعتراض اور نکتہ چینی نظر آتی ہے۔ ایک اور زاویے، ایک اور مقام، ایک اور کرسی سے دیکھتے ہیں تو ایک خیر خواہ، ایک واعظ، ایک نصیحت گر نظر آتا ہے جو اپنے دشمنوں کی بھی منحوس قسمت پر رنجیدہ ہے کہ یہ لوگ کیوں جہنم میں جائیں کیوں اتنے بدبخت واقع ہوئے ہیں؟

اس مقام پر حماسہ کی وہ تحریک اپنی جگہ نصیحت سے ملنے والے سکون دے دیتی ہے۔ غور کیجئے! عاشور کے دن اور عاشور کے علاوہ لوگوں کو کیا کیا نصیحتیں کی گئی ہیں۔ آپ کے اصحاب نے کیسی کیسی نصیحتیں کی ہیں۔ حنظلہ بن اسد الشبامی نے کیا کیا نصیحتیں کیں۔ زہیر بن قین نے کیا کیا نصیحتیں کیں۔ حبیب ابن مظاہر نے کیسی کیسی نصیحتیں کی ہیں! حضرت ابا عبداللہؑ دشمنوں کی بدبختی سے ملول تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ایک شخص بھی اس حال میں رہے۔ وہ لوگوں سے ضد تو نہیں کرتے تھے لیکن وہ جس لہجے سے بھی بات کرتے تھے یہ چاہتے تھے کہ ان میں سے کم سے کم ایک

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۵۰، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴، صفحہ ۶۸، ۱۱۰، اللہوف صفحہ ۵۰، کشف الغمہ جلد ۲، صفحہ ۳۶

۲۔ بحار الانوار جلد ۴۴، صفحہ ۳۸۱، اللہوف صفحہ ۳۳، تحف العقول صفحہ ۱۷۶ (۲) سورۂ توبہ آیت ۱۲۸

ہی شخص نکل جائے۔ آپ اپنے جد کی طرح تھے۔ "لقد جائکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم" آپ جانتے ہیں کہ عزیز علیه ما عنتم کے کیا معنی ہیں؟ یعنی تمہاری بدبختی اسے بری لگتی ہے۔ پیغمبرؐ کے دشمنوں کی بدبختی پیغمبرؐ کو بری لگتی تھی۔ دشمن خود یہ بات نہیں سمجھتے تھے۔ یہ بدبختیاں حضرت ابا عبداللہؑ پر بھی گراں تھیں۔ یکایک آپ اونٹ پر سوار ہو کر جاتے ہیں۔ پھر پلٹتے ہیں پیغمبرؐ کا عمامہ سر پر رکھتے ہیں، پیغمبرؐ کا لباس پہنتے ہیں۔ گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور ان کی طرف جاتے ہیں بلکہ اس شقی گروہ میں سے کچھ آدھ کو کم بھی کر سکتے ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کے امام حسینؑ یکسر محبت کا مجسمہ ہیں، سراسر دوستی ہیں جو اپنے دشمن کو بھی سچ مچ دوست سمجھتے ہیں۔

اب ہم اس طرف آتے ہیں جسے اخلاق کہتے ہیں (اسلامی اخلاق) جب ہم اس زاویے سے کربلا کے حادثہ پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اسلامی اخلاق کا اسٹیج سجا ہوا ہے۔ مختصر طور پر آپ کے سامنے میں تین اخلاقی قدروں مروت، ایثار اور وفا کی وضاحت کرتا ہوں جو اس حادثہ میں پائی گئی ہیں۔ مروت کا ایک خاص مفہوم ہے جو شجاعت سے الگ ہے۔ اگرچہ اس کے معنی بہادری کے ہیں لیکن اس کا مفہوم خاص ہے۔ مولانا رومی نے اسے سب سے اچھے طریقے پر مجسم کر دیا ہے۔ وہ حضرت علیؑ کی عمرو ابن عبدود سے لڑائی بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ عمرو کے سینے پر سوار ہو جاتے ہیں اور وہ آپ کے منہ پر تھوک دیتا ہے تو آپ اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پھر واپس آتے ہیں۔ اس مقام پر مولانا رومی آپ کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ کے متعلق ان کا ایک شعر یوں ہے۔

در شجاعت شیر ربانی نیستی
در مروت خود کہ داند کیستی

شجاعت میں آپ خدا کے شیر ہیں لیکن مروت میں کوئی کیا جانے کہ آپ کیا ہیں۔ مروت یہ ہے کہ آدمی اپنے دشمنوں سے بھی محبت برتے۔ حافظ کہتا ہے :

آسائش دوگیتی تفسیر ایں دوحرف است

بادوستاں مروت با دشمناں مدارا

لیکن اسلام کا حکم اس سے بھی بلند ہے۔ اگر اسلام سے قریب ہوں تو یوں کہیں : دوستوں کے ساتھ مروت اور دشمنوں کے ساتھ بھی مروت اور مردانگی۔ دشمن کو پیاس میں امام حسینؑ جو پانی دیتے ہیں اس کے معنی مروت کے ہیں۔ یہ شجاعت سے بھی اونچی چیز ہے بالکل اسی طرح جس طرح حضرت علیؑ نے یہ کام کیا تھا۔

عاشور کی صبح تھی پہلا شخص جو حسین ابن علیؑ کے خیموں کی طرف یہ دیکھنے کے لئے دوڑا کہ حالات کیا ہیں شمر ابن ذی الجوشن تھا۔ جب وہ خیموں کے پیچھے سے آیا تو اس نے دیکھا کہ خیمے پاس پاس کردئے گئے ہیں اور خندق کھودلی ہے اور کانٹے جمع کر کے ان میں آگ لگا دی ہے۔ بہت کچھ بل کھا کے رہ گیا کہ اب پیچھے سے حملہ نہیں ہو سکتا اس لئے بحواس کرنے لگا۔ ایک صحابی نے عرض کیا۔ آقا! اجازت ہو تو اسے ابھی ایک تیر سے ڈھیر کردوں۔ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے کہا آقا! میں اسے خوب جانتا ہوں کہ یہ کتنا پلید، فاسق اور فاجر ہے۔ آپ نے فرمایا: "میں بھی جانتا ہوں لیکن ہم کبھی لڑائی شروع نہیں کریں گے چاہے اس میں ہمارا کتنا ہی فائدہ کیوں نہ ہو۔"

یہ اسلام کا قانون تھا۔ اس بارے میں بہت سے واقعات ہیں۔ صفین کی جنگ کے موقع پر امیر المومنینؑ کا ایک واقعہ آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ معاویہ کے

لشکر میں کریب بن صباح نامی ایک شخص ہے۔ وہ آیا اور اس نے اپنا مقابل مانگا۔ امیر المومنینؑ کے لشکر کا ایک بہادر جو سامنے ہی تھا میدان میں گیا لیکن تھوڑی سی دیر میں کریب نے امیر المومنینؑ کے اس صحابی کو قتل کردیا اور اس کی لاش ایک طرف ڈال دی۔ اور دوبارہ جوڑ مانگا۔ ایک اور شخص گیا۔ اس کو بھی قتل کر دیا اور قتل کرنے کے بعد گھوڑے سے کود کر نیچے آیا اور اس کی لاش پہلی لاش پر چن دی۔ پھر بولا میں اپنا مقابل چاہتا ہوں۔ اس نے حضرت علی علیہ لسلام کے چار اصحاب کو اسی ترتیب سے مار ڈالا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اس شخص کے بازو اور انگلیاں اس قدر طاقتور تھیں کہ سیخ کو ہاتھ سے ملتا تھا تو اس کے نقش گھس جاتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شخص ایسی تیزی اور پھرتی دکھاتا تھا اور بہادری اور پہلوانی کا ایسا مظاہرہ کرتا تھا کہ حضرت علیؑ کے جو اصحاب اگلی صفوں میں تھے وہ پیچھے چلے گئے تاکہ سامنے ہی نہ دھر لئے جائیں۔ اب حضرت علی علیہ السلام خود آگے بڑھے اور آپ نے ایک ہی وار میں اسے قتل کر کے اس کی لاش ایک طرف پھینک دی۔ "الا رجل۔" کوئی ہے؟ دوسرا آیا۔ دوسرے کو بھی مارا اور فوراً اس کی لاش پہلے کی لاش پر چن دی۔ پھر فرمایا: الا رجل۔ کوئی ہے؟ یہاں تک کہ چار آدمی قتل کر دئے۔ پھر کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ آگے آئے۔ اس وقت حضرت علی علیہ السلام نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: "فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم واتقوا الله"(۱) پھر فرمایا۔ اے اہل شام! اگر تم نے لڑائی شروع نہ کی ہوتی تو ہم بھی نہ لڑتے۔ چونکہ تم نے ایسا کیا اس لئے ہم کو بھی یہ کام کرنا پڑا۔ (۲) امام حسینؑ بھی ایسے ہی تھے۔ عاشور کے پورے دن اس بات کے پابند رہے کہ لڑائی میں پہل وہ لوگ کریں جو ظاہر میں

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۹۴

۲۔ وقعۃ الصفین مولفہ نصر بن مزاحم المنقری صفحہ ۳۱۵

مسلمان اور کلمہ گو ہیں۔ آپ نے فرمایا جانے دو۔ وہ پہل کریں ہم ہرگز شروع نہیں کریں گے۔

اب ہم ایثار کی طرف آتے ہیں۔ اس حادثہ میں یہ ایک اور اخلاقی عنصر ملتا ہے۔ کربلا ایثار کی کیسی عظیم اور شاندار نمائش گاہ ہے! ذرا غور کیجئے۔ ایثار کے لئے کیا جناب ابو الفضل العباس کے واقعے سے بہتر کوئی مثال، نمونہ اور تجسیم پیش کی جا سکتی ہے؟ اسلام کے ابتدائی دنوں کی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ وہاں ہیرو ایک نہیں کئی اشخاص ہیں۔ ایک شخص بیان کرتا ہے کہ ایک اسلامی جنگ میں میں زخمیوں میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو زمین پر پڑا ہوا اپنی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے۔ اور جب زخمی کے جسم کا زیادہ خون بہہ جاتا ہے تو وہ زیادہ پیاسا ہو جاتا ہے۔ وہ مجھ سے کچھ بولا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ پانی مانگتا ہے۔ میں گیا اور ایک پیالے میں پانی لے آیا کہ اسے دوں۔ اس نے اشارے سے کہا کہ میرا وہ بھائی میری ہی طرح پیاسا ہے اسے پانی دے دو۔ میں اس کے پاس گیا اس نے بھی ایک اور شخص کی طرف اشارہ کر دیا کہ اسے پانی دے دو۔ میں اس کے پاس پہنچا (بعضوں نے لکھا ہے کہ وہ تین زخمی تھے اور بعضوں نے لکھا ہے کہ دس تھے) یہاں تک کی میں جب آخری کے پاس پہنچا تو وہ ختم ہو چکا تھا۔ میں اس سے پہلے والے کی طرف واپس ہوا تو دیکھا کہ وہ بھی مر چکا ہے۔ اس سے پہلے والا بھی مر چکا۔ جب سب سے پہلے کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ آخر میں ان میں کسی ایک کو پانی پلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ میں جس کے پاس گیا اس نے کہا کہ دوسرے کے پاس جاؤ۔ اس کو کہتے ہیں ایثار جو انسان کی روحانی محبت کا نہایت پر شکوہ جلوہ ہے۔

سورۂ ہل اتی کیوں نازل ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے: "و یطعمون الطعام علی حبه مسکیناًو یتیماًو اسیراً۔انّما نطعمکم لوجه اللّٰه لا نرید

منکم جزاء ولا شکوراً"(۱) ایثار کی قدر شناسی کے لئے اس انسانی اور اسلامی جذبے کی جلوہ نمائی حادثۂ کربلا کا ایک فریضہ رہا ہے اور جیسے یہ کردار حضرت ابو الفضل العباسؑ کے منصب کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ حضرت ابو الفضل فرات کے گھاٹ پر متعین چار ہزار پہرہ داروں کو بھگا چکے ہیں۔ اس کے بعد گھاٹ پر پہنچے ہیں اور گھوڑے کو پانی میں اس حد تک ڈال دیتے ہیں کہ پانی گھوڑے کے پیٹ سے آلگا ہے اور حضرت ابو الفضل گھوڑے سے اترے بغیر مشک پانی سے بھر لیتے ہیں۔ جیسے ہی آپ نے مشک بھر لی۔ چلو میں پانی لیا منہ کے قریب لائے کہ پئیں۔ دشمن دور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے صرف یہی کہا ہے کہ ہم نے دیکھا انہوں نے پانی لیا اور پانی گرا دیا۔ البتہ یہ کوئی نہیں سمجھ پایا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ تاریخ کہتی ہے: "فذکر عطش الحسین علیه السلام" (۲) انہیں یاد آگیا کہ بھائی پیاسے ہیں۔ کہا مناسب نہیں ہے کہ حسین خیمے میں پیاسے ہوں اور میں پانی پی لوں۔ اب تاریخ کہاں سے کہتی ہے؟ حضرت ابو الفضل کے اشعار سے کہتی ہے۔ جس وقت آپ باہر آئے تو رجز پڑھنے لگے۔ رجز سے لوگوں نے سمجھا کہ حضرت ابو الفضل نے پانی کیوں نہیں پیا۔ رجز یہ تھا:

یا نفسُ من بعد الحسین هُونی فبعدهُ لا کنت ان تکونی (۳)

اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں۔ اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

اے عباس کے نفس! میں چاہتا ہوں کہ تو آقا حسین کے بعد زندہ نہ رہے، کیا تو چاہتا ہے کہ پانی پئے اور زندہ رہے؟ عباس! آقا حسین خیمے میں پیاسے ہیں اور تو چاہتا ہے کہ میٹھا پانی پئے؟ خدا کی قسم غلام کا یہ قاعدہ نہیں ہے۔ بھائی ہونے کا یہ دستور نہیں

۱۔ سورۂ دہر آیت ۸

۲-۳۔ ینابیع المودۃ جلد ۲ صفحہ ۱۶۵، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۴۱

ہے،امام کی پیروی کی یہ رسم نہیں ہے، وفاداری کا یہ معمول نہیں ہے۔وہ سراسر وفا تھے۔ وفا کا مجسمہ تھے۔ عمرو بن قرضہ بن کعب انصاری جو انصار مدینہ کی اولاد سے ہیں۔ ان لوگوں میں شامل تھے جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی نماز کے وقت موجود تھے اور جس نے اپنے آپ کو امام حسین علیہ السلام کی ڈھال بنا لیا تھا۔ اس شخص کے جسم پر اتنے تیر لگے کہ آخر گر پڑے۔ آخری سانسیں لے رہے تھے امام حسینؑ ان کے سرہانے پہنچے۔ وہ اپنے بارے میں اب بھی یہ شک کرتے ہیں کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا یا نہیں۔ کہتے ہیں: "اوفیت یا ابا عبد اللّٰہ؟" کیا میں آپ سے وفا کر سکا؟

اب ہم اسلامی مساوات کی طرف چلتے ہیں یعنی اسلامی برابری اور اسلامی برادری۔ ایسے گنتی کے لوگ ہیں جن کے سرہانے امام حسین علیہ السلام پہنچے ہیں۔ ان میں سے دو ایسے ہیں جن کے بارے میں یہ مستند ہے کہ وہ پہلے غلام تھے یعنی آزاد کئے ہوئے غلام تھے۔ ان میں سے ایک کا نام جون ہے۔ جنہیں ابوذر غفاری کا مولی یعنی ابوذر غفاری کا آزاد کردہ کہتے ہیں۔ یہ شخص کالے ہیں۔ اور آزادی کے بعد بظاہر اہل بیتؑ کے دروازے سے دور نہیں ہوئے یعنی اس گھر میں ایک خدمتگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ عاشور کے دن یہی کالے جون حضرت ابا عبداللہؑ کی خدمت میں آتے ہیں اور کہتے ہیں۔ مجھے لڑائی کی اجازت دیجئے۔ حضرت فرماتے ہیں: نہیں۔ اب تیرے لئے یہ مناسب ہے کہ تو چلا جائے اور اس کے بعد دنیا میں آقا بن کر رہے۔ تونے ہمارے خاندان کی جتنی خدمت کی ہے وہی کافی ہے۔ ہم تجھ سے خوش اور رضامند ہیں۔ وہ پھر عرض کرتے ہیں۔ حضرت منع فرماتے ہیں اس کے بعد یہ شخص ابا عبداللہؑ کے قدموں میں گر پڑے اور قدم چومنے لگے کہ آقا مجھے محروم نہ رکھئے اور پھر ایک جملہ کہا جس کے بعد امام حسین علیہ السلام نے انہیں انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

انہوں نے عرض کیا: آقا! میں سمجھ گیا کہ آپ مجھے اجازت کیوں نہیں دے رہے ہیں۔ میں کہاں اور یہ سعادت کہاں؟! میں اپنے کالے رنگ، گندے خون اور اس بدبودار بدن کے باعث اس مقام کے لائق نہیں ہوں۔ آپ نے فرمایا: نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میرے دل میں یہ نہیں۔ اچھا، جاؤ۔

وہ جاتے ہیں، رجز پڑھتے ہیں اور قتل ہو جاتے ہیں۔ امام حسینؑ ان کے سرہانے پہنچے۔ اس وقت دعا کی اور کہا: اے خدا! آخرت میں اس کا چہرہ نورانی بنانا اسکے جسم کی بو خوشگوار بنانا اور اسے نیکوں کے ساتھ محشور کرنا (ابرار یعنی نیک لوگ متقین سے بلند ہوتے ہیں۔ "انّ کتاب الابرار لفی علّیین" (۱) اے خدا دوسری دنیا میں اس کے اور آل محمد کے درمیان پوری دوستی قائم رکھنا۔ دوسرے شخص ایک رومی ہیں (ترک بھی کہا ہے) جس وقت گھوڑے سے گرے۔ امام حسین علیہ السلام ان کے سرہانے پہنچے۔ یہاں ایک اور ہی غیر معمولی طور پر عجیب منظر ہے۔ یہ غلام بے ہوش تھے یا ان کی آنکھوں پر خون جم گیا تھا۔ امام حسین علیہ السلام نے ان کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا اور پھر اپنے ہاتھ سے ان کے چہرے اور آنکھوں پر سے خون صاف کیا۔ اسی دوران انہیں ہوش آگیا انہوں نے امام حسین علیہ السلام کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنا رخسار ان کے رخسار پر رکھ دیا اور یہ بات صرف اس غلام سے مخصوص تھی یا پھر جناب علی اکبر سے۔ تاریخ نے ایسی بات اور کسی کے لئے نہیں لکھی ہے۔ "و و ضع خدّہ علی خدّہ" (۲) یعنی اپنا رخسار ان کے رخسار پر رکھ دیا۔ وہ اتنے خوش ہوئے کہ مسکرا دئے: فتبسم ثمّ صار الی ربّہ (رضی اللہ عنہ) (۳)

۱۔ سورۂ مطففین آیت ۱۸ ۲۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۳۰
۳۔ ایضاً

گر طبیبانہ بیائی بہ سر بالینم
بہ دو عالم نہ دہم لذت بیماری را

ان کا سر امام حسین علیہ السلام کی گود میں تھا کہ انہوں نے جان دے دی۔ گویا انہوں نے کہا:

ایں جان عاریت کہ بہ حافظ سپردہ دوست
روزے رخش بہ بینم و تسلیم وے کنم

ہم عاشور کے حادثہ کو تمام اسلامی پہلوؤں یعنی اخلاقی، اجتماعی، ناصحانہ، جدالی، توحیدی، عرفانی، اعتقادی، اور تجسیمی سے دیکھتے ہیں اور جن لوگوں نے اس میں اپنے اپنے کردار ادا کئے ان میں شیر خوار سے لیکر ستر بلکہ اسّی سال کے بوڑھے اور جناب عبد اللہ ابن عمیر کلبی کی بوڑھی بیوی شامل ہیں۔ تین اشخاص ایسے ہیں جو امام حسینؑ کی خدمت میں اپنے بیوی بچوں سمیت آئے ہیں جن کے بیوی بچے بعد میں امام حسین علیہ السلام کے حرم میں چلے گئے اور اہل حرم کے ساتھ ساتھ رہے۔ باقی کسی کے بیوی بچے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ ایک مسلم ابن عوسجہ ہیں دوسرے عبد اللہ ابن عمیر کلبی ہیں اور ایک اور شخص ہیں جس کا نام جنادہ ابن حرث الانصاری ہے۔

جناب عبد اللہ ابن عمیر کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ کوفہ سے باہر تھے جیسے ہی انہیں خبر ملی کہ کوفہ میں کچھ واقعات رونما ہوئے ہیں اور لشکر جمع کر رہے ہیں تاکہ جاکر امام حسین علیہ السلام سے جنگ کریں۔ وہ اسلام کے مجاہد تھے۔ دل میں کہنے لگے خدا کی قسم میں اسلام کی خاطر برسوں کفار سے لڑائیاں لڑتا رہا ہوں لیکن وہ جہاد مرتبے میں اس جہاد کے ہرگز برابر نہیں ہے جس میں اہل بیت پیغمبرؐ کا دفاع کروں۔ گھر آئے تو اپنی زوجہ سے بولے کہ میں نے ایسا سوچا ہے۔ وہ بولیں سبحان اللہ۔ آپ نے بہت اچھا سوچا ہے لیکن ایک شرط ہے۔ وہ بولے۔ کیسی شرط؟ انہوں

نے کہا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو چنانچہ آپ نے اپنی زوجہ کو ساتھ لیا اور ماں کو بھی۔ اللہ اکبر! کیسی خواتین تھیں! عبد اللہ ابن عمیر بہت بہادر تھے۔ آپ نے عمر ابن سعد اور عبید اللہ ابن زیاد کے ان دو غلاموں سے جنگ کی جنہوں نے اپنا مقابل طلب کیا تھا اور دونوں کو جو بہت طاقتور تھے قتل کر دیا، جس وقت ان دونوں غلاموں نے اپنا مقابل طلب کیا تھا تو سید الشہداءؑ نے عبد اللہ ابن عمیر کے جسم، کاندھوں اور بازوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ شخص ان کا صحیح مد مقابل ہے۔ وہ گئے اور وہ ان لوگوں کے لئے موزوں حریف ٹھہرے۔

پہلے عمر ابن سعد کا غلام آیا جس کا نام یسار تھا۔ عبد اللہ ابن عمیر نے اس کو پچھاڑ دیا لیکن اس سے پہلے ایک شخص نے پیچھے سے جناب عبد اللہ پر وار کر دیا امام حسین علیہ السلام کے اصحاب نے زور سے آواز دی: پیچھے کی طرف سے ہوشیار۔ لیکن جب تک یہ سنبھلیں اس نے تلوار ماری اور جناب عبد اللہ کے ہاتھ کا پنجہ کٹ گیا، لیکن آپ نے اسے دوسرے ہاتھ سے جہنم واصل کر دیا۔ اسی حالت میں آپ رجز پڑھتے ہوئے حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں واپس آئے اور اپنی والدہ سے کہنے لگے۔ اماں جان! کیا میرا عمل اچھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ میں تجھ سے راضی نہیں ہوں، جب تک تجھے مقتول نہیں دیکھ لونگی میں تجھ سے راضی نہیں ہونگی۔ جناب عبد اللہ کی زوجہ بھی تھیں۔ وہ جناب عبد اللہ کے دامن سے لپٹ گئیں۔ ماں نے کہا تم بیوی کی بات نہ سننا۔ یہ وقت بیوی کی بات ماننے کا نہیں ہے اگر تو مجھے خوش کرنا چاہتا ہے تو شہید ہو جانے کے علاوہ تیرے لئے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ عبد اللہ ابن عمیر جاتے ہیں اور شہید ہو جاتے ہیں۔ اشقیاء ان کا سر کاٹ کر خیام اہل حرم کی طرف پھینکتے ہیں (کچھ تھوڑے سے شہداء تھے جن کے سر خیام حرم کی طرف پھینکے گئے تھے۔ ان میں ایک عبد اللہ ابن عمیر کا سر تھا)۔

یہ ماں اپنے بیٹے کا سر لے کر سینے سے لگاتی ہے، چومتی ہے، اور کہتی ہے۔ اے میرے بیٹے! میں اب تجھ سے خوش ہوئی۔ تو نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ پھر کہتی ہے لیکن ہم لوگوں نے جو چیز خدا کی راہ میں دے دی اسے واپس نہیں لیں گے اور یہ کہتے ہوئے عبد اللہ کا سر ایک دشمن کی طرف پھینک دیتی ہے۔

اس کے بعد چوب خیمہ لے کر حملہ کر دیتی ہے" انا عجوز سیّدی ضعیفة"(۱) میں کمزور بوڑھی عورت ہوں لیکن جب تک میری جان میں جان ہے میں فاطمہ کے خاندان کی حفاظت کروں گی۔

کربلا میں نو یا دس نابالغ بچے شہید ہوئے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں تاریخ لکھتی ہے: "و خرج شابٌّ قتل ابوه فی المعرکه"(۲) ایک جوان جس کا باپ معرکے میں شہید ہو گیا تھا (یہ نہیں بتایا کہ باپ کون تھا) سید الشہداءؑ کی خدمت میں آیا اور بولا: مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں بھی میدان میں جاؤں۔ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اسی طرح اہل حرم نے بھی فرمایا: اس جوان کو اجازت نہ دیجئے کہ میدان میں جائے کیونکہ اس کا باپ مارا جا چکا ہے۔ یہی کافی ہے کہ اس کی ماں یہاں موجود ہے شاید وہ راضی نہ ہو۔ بچے نے عرض کیا یا لبا عبد اللہ! دراصل یہ تلوار میری ماں نے ہی میری کمر میں باندھی ہے اور مجھے یہ کہہ کر بھیجا ہے کہ تو بھی اپنے باپ کی راہ پر جا اور اپنی جان حضرت لبا عبد اللہ کی جان پر قربان کر۔ وہ اصرار اور خوشامد کرنے لگا آخر امام حسین علیہ السلام نے اسے اجازت دے دی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مسلم ابن

۱۔ پورا شعر یوں ہے:

انا عجوز سیدی ضعیفه　　خاویه بالیه نحیفه

بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۲۸، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۰۴، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۲۲، مقتل مقرم صفحہ ۳۱۵

۲۔ بحار الانوار جلد ۴۵، صفحہ ۲۸، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۲۲

عوسجہ کا بیٹا تھا یا حرث بن جنادہ کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اپنے خاندانوں سمیت کربلا میں تھے۔ عبد اللہ ابن عمیر بھی اپنے کنبے سمیت کربلا میں تھے لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ عبد اللہ ابن عمیر کا بیٹا نہیں تھا۔ جس وقت یہ بچہ میدان میں پہنچا ہے تو بہت سے لوگوں کے برعکس جنہوں نے اپنے باپ دادا کے نام سے اپنا تعارف کرایا ہے کہ میں فلاں کا بیٹا فلاں ہوں اس نے اپنا تعارف اس طرح نہیں کرایا بلکہ دوسرے ہی ڈھنگ سے گفتگو کی جس کی بدولت وہ دوسروں پر سبقت لے گیا۔ وہ جب بیچ میدان میں پہنچا تو بلند آواز میں یوں بولا:

"امیری حسین و نعم الامیر سرور فؤاد البشیر النذیر"(۱)

اے لوگو! مجھے پہچان لو۔ میں وہ شخص ہوں جس کا آقا حسینؑ ہے جو پیغمبرؐ کی خوشی کا سرمایہ ہے۔ "سرور فؤاد البشیر النذیر" آپ دیکھیں گے کہ اس حادثہ میں بچے، بڑے، شیر خوار ہر ایک کا ایک مقام ہے۔ اب پیغمبرؐ کے اہل بیت کا مقام یعنی عورتوں کا تبلیغی فرض اور رسالت اپنی جگہ پر ہے (حضرت امام حسینؑ کا خاندان سب میں پیش پیش ہے)۔

یہاں میں امام حسن علیہ السلام کے ایک اور صاحبزادے کا مرثیہ پڑھتا ہوں۔ جناب قاسم کے ایک بھائی کا نام عبد اللہ تھا (حضرت امام حسین علیہ السلام سے دس سال پہلے امام حسن علیہ السلام شہید ہو چکے تھے۔ انہیں زہر دیا گیا تھا۔ اس بچے کی عمر بھی دس سال لکھی ہے۔ یعنی یہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب اس کے پدر بزرگوار دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یا اس کے بھی کچھ دن بعد پیدا ہوا۔ بہر حال اسے اپنے باپ یاد نہیں تھے۔ وہ حضرت لبا عبد اللہؑ کے گھر میں پلا بڑھا تھا جو اس کے چچا

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۲۷، مناقب ابن شہر آشوب جلد ۴ صفحہ ۱۰۴، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۲۲

بھی تھے اور باپ کی جگہ بھی)۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس بچے کو اس کی پھوپھی یعنی اپنی بہن زینبؑ کے سپرد کر دیا تھا جو خصوصیت سے ان بچوں کی نگراں اور نگہبان تھیں۔ یہ بچے بار بار کوشش کرتے تھے کہ بیچ معرکے میں پہنچ جائیں لیکن انہیں روک لیتے تھے۔ نہ جانے ان آخری لمحات میں جب حضرت امام حسین علیہ السلام قتل گاہ کے گڑھے میں گر پڑے تھے۔ یکایک یہ دس سال کا بچہ خیمے سے نکل پڑا اور جب جناب زینب سلام اللہ علیہا اسے پکڑنے کو دوڑیں وہ حضرت زینب کے ہاتھ سے نکل گیا اور بولا "واللہ لا افارق عمّی" (۱) خدا کی قسم میں اپنے عمّ سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اور نہایت پھرتی سے وہ حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ آپ اس وقت قتل گاہ میں تھے اور آپ میں ہلنے جلنے کی طاقت بہت کم رہ گئی تھی۔ یہ بچہ آیا اور اپنے عمّ کی گود میں آگرا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اسے گود میں لے لیا تو وہ چچا سے باتیں کرنے لگا۔ اسی وقت ایک دشمن حضرت امام حسین علیہ السلام پر ایک وار کرنے آیا اس بچے نے جو دیکھا تو اسے برا بھلا کہنے لگا: اے حرام زادے! کیا تو اس لئے آیا ہے کہ میرے عمّ کو مار ڈالے؟ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ اس شقی نے جیسے ہی اپنی تلوار تانی اس بچے نے اپنے دونوں ہاتھ کو سپر بنادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھ کٹ کر کھال سے لٹک گئے۔ اس وقت اس نے رو کر کہا: عمو جان دیکھئے اس نے میرے ساتھ کیا کیا؟

ولا حول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم

و صلی اللہ علیٰ محمد وآلہ الطاهرین

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۵۳، اعلام الوری صفحہ ۲۴۳، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۴۱

چھٹی مجلس

اہلبیت سید الشہداؑ کا کردار تحریک حسینی کی تبلیغ میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ و کفی باللہ حسیباً (۱)

حسینی تحریک اور اسلام کی تبلیغ میں سید الشہداء کے اہل بیت کے کردار سے متعلق گفتگو کرنے سے پہلے میں آپ کے سامنے دو مقدمات عرض کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ روایات کے مطابق اور اپنے عقائد کی بنیاد پر جو ہم حضرت سید الشہداء کی امامت پر رکھتے ہیں آپ کے تمام کام پہلے دن سے طے شدہ تھے اور آپ نے کسی حساب، منطق اور دلیل کے بغیر کبھی کوئی کام نہیں کیا یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں واقعہ اتفاقاً پیش آگیا بلکہ جو کچھ ہوا وہ کسی قاعدے اور اصول کی رو سے ہوا اور یہ بات نہ صرف تاریخی قرائن سے واضح ہے بلکہ منطق اور روایات کے لحاظ سے اور حضرت سید الشہداء کی امامت پر ہمارے اعتقاد کی رو سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ایک مسئلہ جس پر تاریخ میں بھی گفتگو ہوئی ہے اور جس کا اخبار اور احادیث

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

میں بھی ذکر ہوا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اس خطرناک سفر میں اپنے اہل بیتؑ کو ساتھ کیوں لے گئے؟ سبھی اس سفر کے خطرے کو بھانپ رہے تھے یعنی یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے سمجھنے کے لئے کسی دانا و بینا شخص ہی کی ضرورت پڑے اور جو کسی عام آدمی کی سمجھ میں نہ آئے۔اس لئے آپ کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے قریب قریب وہ سب لوگ جو آپ کے پاس آئے اور جنھوں نے مشورہ دیا آپ کو بتایا کہ اہل بیت کو ہمراہ لے جانا مناسب نہیں ہے۔ یعنی انہوں ے اپنی عام سمجھ، حساب اور منطق کی رو سے اور حضرت امام حسینؑ اور ان کے خاندان کی جانوں کی حفاظت کی خاطر تقریباًمتفقہ طور پر آپ سے کہہ دیا کہ آقا! خود آپ کا جانا خطرناک اور نا مناسب ہے یعنی آپ کی جان خطرے میں ہے۔ اس پر اپنے اہل بیتؑ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے جواب دیا۔ نہیں۔ مجھے لازم ہے کہ انہیں بھی ساتھ لے جاؤں۔آپ ان کو ایسا جواب دیتے تھے جو ایک قطعی وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ آپ نے فرمایا: میرے جد نے مجھے خواب میں بتایا ہے :" انّ الله شاء ان یرك قتیلاً "(۱)ان لوگوں نے کہا اگر ایسا ہے تو پھر آپ اہل بیت اور بچوں کو ساتھ کیوں لے جارہے ہیں؟آپ نے جواب دیا۔ ان کے لئے بھی میرے جد نے فرمایاہے :"انّ الله شاء ان یراهن سبایاً"(۲) یہاں آپ کے سامنے ایک وضاحت پیش کرتا ہوں :ان دونوں جملوں کا کیا مطلب ہے؟ یہ مفہوم جو میں اب عرض کر رہا ہوں وہی معنی ہیں جنہیں وہ سب لوگ سمجھ رہے تھے جن سے جناب ابا عبد اللہؑ مخاطب تھے۔وہ کوئی ایسا معمہ نہیں تھا جیسے آج کل کبھی کبھی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ خدا کی مشیت یا ارادے کا لفظ جو خود قرآن میں استعمال ہوا ہے دو

۱-۲۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۳۶۴، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۱۹۵

موقعوں پر بولا جاتا ہے جس میں سے ایک کو اصطلاح میں ارادۂ تکوینی اور دوسرے کو ارادۂ تشریعی کہتے ہیں۔ارادۂ تکوینی خدا کی قضاو قدر کو کہتے ہیں۔اگر قضاو قدر حتمی طور پر کسی بات سے متعلق ہوگئی تو پھر اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ قضاو قدر کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔

ارادۂ تشریعی کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس طرح راضی ہے۔خدا یہ چاہتا ہے۔ مثلاًجب روزے کے لئے کہتا ہے:"یرید الله بکم الیسر و لا یرید بکم العسر"(۱) یا دوسرے موقع پر جو صاف زکوٰۃ کا موقع ہے فرماتا ہے: "یرید لیطهرکم" (۲)مقصد یہ ہے کہ خدا نے یہ حکم دیا ہے۔ وہ ایسا چاہتا ہے یعنی خدا کی رضا اس میں ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ تو شہید ہوجائے۔ میرے جد نے مجھ سے کہا ہے کہ خدا کی رضا تیری شہادت میں ہے۔ میرے جد نے مجھ سے کہا ہے کہ خدا چاہتا ہے یہ لوگ قید ہوجائیں یعنی ان کی قید خدا کی رضا ہے۔ مصلحت ہے۔رضائے حق ہمیشہ مصلحت میں ہوتی ہے اور ایسی مصلحت کا مقصد انسان اور انسانیت کا کمال ہے۔

اس بات کے خلاف پھر کسی نے نہیں کہا یعنی کوئی یہ نہیں کہہ سکا کہ اگر ایسا ہی ہے کہ آپ کے جد نے آپ کو روحانی دنیا میں یہ بتا دیا ہے کہ آپ کے قتل ہوجانے ہی میں مصلحت ہے تو ہم ان کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ جو لوگ حضرت ابا عبد اللہؑ سے یہ جملے سنتے تھے وہ اس طرح نہیں سنتے تھے کہ بھائی! یہ بات مقدر ہوچکی ہے اب میں اس کے خلاف نہیں کرسکتا۔ حضرت ابا عبد اللہؑ کی کسی وقت بھی یہ مراد نہیں ہوتی تھی۔اینا نہیں تھا کہ جب لوگ آپ سے پوچھتے کہ آپ عورتوں کو کیوں لے جارہے ہیں تو آپ فرماتے میں دراصل اس معاملے میں مجبور ہوں، مجھے بالکل

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۸۵

۲۔ سورۂ مائدہ آیت ۶

اختیار نہیں ہے بلکہ اس طرح سنتے تھے کہ عالم غیب سے مجھے جو الہام ہوا ہے اس سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ اسی میں مصلحت ہے یہ کام ایسا ہے جسے میں اپنے اختیار سے انجام دے رہا ہوں لیکن اس بنیاد پر کہ میں اسی کو مصلحت سمجھتا ہوں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اہم موقعوں پر سب لوگ ایک طرح کا عقیدہ رکھتے تھے۔ حضرت ابا عبداللہؑ بلند درجے پر ایک اور عقیدہ رکھتے تھے۔ سب لوگ ایک طرح فیصلہ کرتے تھے۔ امام حسین علیہ السلام فرماتے تھے: ایسا نہیں۔ میں دوسری طرح عمل کروں گا۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابا عبد اللہؑ کا کام پہلے سے طے شدہ کام ہے۔ ایک رسالت اور ایک فریضہ ہے۔ وہ اپنے اہل بیتؑ کو بطور طفیلی ساتھ نہیں لے جا رہے تھے کہ چلو میں جا رہا ہوں تو اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے چلوں۔ ان تین شخصوں کے سوا جن کے میں نے کل رات کو نام لئے تھے حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کے بھی بیوی بچے ساتھ نہیں تھے۔ جو شخص خطرناک سفر پر جاتا ہے وہ اپنے بیوی بچوں کو ساتھ نہیں لے جاتا لیکن حضرت ابا عبد اللہؑ اپنے بیوی بچوں کو لے گئے اس لحاظ سے نہیں کہ میں خود جا رہا ہوں تو اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لوں (امام حسین علیہ السلام کا گھر اور زندگی کی تمام چیزیں مدینہ میں تھیں) بلکہ اہلبیت کو اس لئے ساتھ لے گئے کہ اس سفر میں رسالت کا فریضہ انجام دیں۔ ایک یہ مقدمہ ہے۔

دوسرا مقدمہ:

"تاریخ میں عورت کا کردار" کے موضوع پر ایک بحث درپیش ہے کہ عورت کا واقعی تاریخ سازی میں کوئی کردار ہے یا نہیں اور اصل میں اس کا کوئی کردار ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی کردار ہونا بھی چاہئے یا نہیں ہونا چاہئے؟ اسلام کی

رو سے اس معاملے کو کس طرح حل کرنا چاہئے؟

تاریخ میں عورت کا بھی کردار رہا ہے اور ہے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ تاریخ سازی میں عورت کا بالواسطہ کردار ہے۔ کہتے ہیں کہ عورت مرد کی تعمیر کرتی ہے اور مرد تاریخ بناتا ہے۔ مرد عورت کی تعمیر میں جس حد تک دخل رکھ سکتا ہے اس سے زیادہ عورت کو مرد کے بنانے میں دخل ہے۔

یہ خود اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے جس پر میں آج کی رات گفتگو کرنا نہیں چاہتا کہ کیا مرد عورت کی روح اور شخصیت بناتا ہے چاہے وہ عورت ماں ہو بیوی ہو یا نہ ہو، یا یہ عورت ہی ہوتی ہے جو بیٹے بلکہ شوہر کی بھی تعمیر کرتی ہے؟ (خصوصاً شوہر کے معاملے میں) کیا زوجہ شوہر کی زیادہ تعمیر کرتی ہے یا شوہر زوجہ کی؟ آپ کو ضرور تعجب ہوگا جو میں یہ عرض کروں گا کہ تاریخی تحقیقات اور نفسیاتی مطالعے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرد کی شخصیت بنانے میں عورت زیادہ کامیاب اور فعال ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ مرد عورت کی شخصیت بنائے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ سازی میں عورت کے بالواسطہ کردار سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ بات کہ عورت نے مرد کی تعمیر کی ہے اور مرد نے تاریخ کی ایک الگ قصہ ہے اور ایک بہت مفصل بحث ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں کہ تاریخ سازی میں عورت کا بالواسطہ کردار کیسا ہے، کیسا ہونا چاہئے اور کیسا ہو سکتا ہے؟ تینوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ عورت کا تاریخ سازی میں بنیادی طور پر کوئی براہ راست حصہ نہ ہو یعنی عورت کا حصہ خارج محض ہو۔ بہت سے سماجوں میں لوگ عورت کے بچہ جننے، اور پالنے اور گھریلو انتظام کرنے کے علاوہ اس کے کسی کردار کے قائل نہیں ہیں، یعنی عورت کا بڑے سماج میں براہ راست حصہ نہیں بالواسطہ حصہ رہا ہے۔ اس اعتبار سے کہ وہ گھر میں مؤثر تھی اور گھر میں بنا ہوا مرد سماج میں مؤثر رہا ہے۔ یعنی عورت نے مرد کا سا اثر رکھے بغیر بہت

سے سماجوں میں کسی قسم کا کوئی حصہ نہیں لیا ہے لیکن ان سماجوں میں بھی اس کے باوجود کہ عورت نے تاریخ اور سماج کی تعمیر میں کوئی کردار ادا نہیں کیا ہے، بلاشبہ اس پروپیگنڈے کے باوجود جو اس سلسلے میں کیا جاتا ہے عورت ایک نہایت گراں بہا چیز کی طرح زندگی بسر کرتی چلی آرہی ہے اور اپنی اسی بیش قیمت حیثیت کی بدولت اس نے مرد پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ وہ اتنی سستی نہیں ہوئی کہ بازاروں میں ماری ماری پھرتی اور ہزاروں عوامی گھر اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے بن جاتے بلکہ اس نے صرف گھریلو زندگی کے دائرے ہی میں رہ کر فائدہ پہنچایا ہے اس لئے وہ لازمی طور پر صاحب خانہ کے لئے ایک بہت بیش قیمت ہستی رہی ہے کیونکہ صرف اسی کی ہستی تھی جس نے اپنی جنس اور محبت کے جذبات میں وسعت دی ہے اور فطری طور پر بلا شبہ مرد عملاً عورت کی خدمت کرتا ہے لیکن عورت ہیرے کی طرح کا ایک بیش قیمت گوہر ہے۔ شخص نہیں ہے، چیز ہے لیکن گراں قدر چیز۔

تاریخ پر عورت کے اثر کی ایک اور شکل جو قدیم سماجوں میں زیادہ تھی یہ ہے کہ عورت تاریخ میں ایک فعال عنصر ہو، تاریخ میں اس کا براہ راست حصہ ہو اور ایک چیز کی طرح نہیں ایک شخصیت کی طرح موثر ہو، وہ شخصیت بیش قیمت ہو، انمول ہو اور ایسی ہو جس نے اپنے اور مرد کے درمیان دیوار اٹھادی ہو۔ نفسیات کے حقائق نے ثابت کردیا ہے کہ عورت کو عزیز رکھنے کے لئے اس کی فطرت میں بہت نازک یعنی بنیادی مراعات ہوتی ہیں۔ جس وقت سے دیوار بالکل ٹوٹ گئی ہے اور یہ حصار ریزہ ریزہ ہوگیا ہے، عورت کی شخصیت عزت و احترام کے لحاظ سے نیچے آگئی ہے۔ ہاں دوسرے پہلوؤں سے ممکن ہے کہ اس کی شخصیت اونچی ہوگئی ہو مثلاً وہ لکھ پڑھ گئی ہو، عالمہ ہوگئی ہو لیکن اب وہ ہستی مرد کیلئے گراں بہا نہیں رہی۔ دوسری جانب عورت یہ نہیں کرسکتی کہ عورت نہ رہے۔ عورت کی طبعیت کا تقاضا ہے کہ وہ مرد

کے لئے گراں بہا رہے اور اگر یہ بات بھی عورت سے چھین لی جائے تو پھر اس کی ذہنیت ہی پراگندہ اور درہم برہم ہوجائیگی۔ مرد کے جنسی تعلق کے لئے جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ عورت ایک بیش قیمت ہستی رہنے کا اختیار رکھتی ہے لیکن عورت کی فطرت میں یہ بات نہیں ہے کہ مرد اسے ایک گراں بہا چیز سمجھتا رہے بلکہ یہ ہے کہ وہ خود ایک گراں بہا چیز کی حیثیت سے مرد کو اپنے قابو میں رکھے۔

جس وقت عورت کی خصوصی حیثیت ختم ہوگئی (ضروری نہیں ہے کہ وہ شادی کی صورت میں ہی یہ خصوصیت رکھتی ہو) یعنی جس وقت عورت سستی ہوگئی عمومی جگہ میں بکثرت پیدا ہوگئی تو مرد کے لئے عورت سے فائدہ اٹھانے کے ہزاروں وسیلے پیدا ہوگئے۔ کوچہ و بازار عورت کے جلوہ گاہ بن گئے جہاں وہ مرد کے سامنے اپنی نمائش کرے، اور مرد اپنی آنکھیں سینک سکے۔ موسیقی کے ذریعے سے عورت کی آواز سن سکے، چھو سکے اور زیادہ سے زیادہ عورت سے لطف اندوز ہوسکے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی وہ قدر و منزلت ختم ہوجاتی ہے جو اسے مرد کی نظر میں رکھنا چاہئے۔ یعنی پھر وہ قیمتی چیز نہیں رہتی البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ پڑھ لکھ گئی ہو، تعلیم حاصل کرچکی ہو، استانی ہوسکتی ہو، کلاسیں چلا سکتی ہو، یا طبیب بن گئی ہو۔ وہ یہ سب کچھ کرسکتی ہے لیکن ان حالات (یعنی عورت کے سستے پن) میں وہ قدر و قیمت جو عورت کی فطرت میں ہوتی ہے پھر باقی نہیں رہتی۔ حقیقت میں یہی وہ وقت ہوتا ہے جب عورت دوسرے الفاظ میں مردوں کے سماج کا کھلونا بن جاتی ہے اور مردوں میں سے کسی ایک فرد کی نظر میں بھی اس کی وہ عزت اور حرمت باقی نہیں رہتی جو اس کے لئے ضروری ہے۔

یورپ کا معاشرہ اسی سمت میں جارہا ہے یعنی ایک طرف تو وہ براہ راست انسانی استعداد میں سے کچھ علم اور ارادہ میں مدد دیکر عورت کو تشخص رکھنے والا گروہ

بنا دیتا ہے، لیکن دوسری طرف اس کی قدر و منزلت ختم کر دیتا ہے۔ ایک تیسری شکل بھی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عورت ایک گراں بہا شخصیت بن جائے۔ ایک شخصیت بھی ہو اور گراں بہا بھی۔ یعنی ایک طرف وہ روحانی اور معنوی شخصیت کی مالک ہو، روحانی اور انسانی کمالات سے واقفیت رکھتی ہو (علم اور واقفیت عورت کی شخصیت کا ایک ستون ہے۔ صاحب اختیار ہونا، ارادہ بلکہ پکا ارادہ رکھنا، بہادر ہونا عورت کی شخصیت کا دوسرا ستون ہے۔ ایک اور ستون ہر انسان کی طرح عورت کی معنوی شخصیت بھی ہے۔ عبادت گزار ہونا، اپنے خدا سے براہ راست تعلق رکھنا، خدا کا فرماں بردار ہونا، خدا سے اتنے اونچے درجے کے روحانی تعلقات رکھنا جتنے اونچے درجے کے انبیاءؑ نے رکھے ہیں ایسی باتیں ہیں جو عورت کو شخصیت عطا کرتی ہیں) دوسری طرف عورت سماج میں ذلیل نہ ہو یعنی نہ بالکل الگ تھلگ ہی ہو اور نہ شیر و شکر ہی ہو۔ نہ علیحدگی نہ آمیزش بلکہ حریم۔ عورت کی حدبندی اور مرد عورت کے میل جول میں حدبندی ایک مسئلہ ہے۔

جب ہم اسلام کے متن کی طرف آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اسلام عورت کے لئے جو کچھ پسند کرتا ہے وہ عورت کا تشخص ہے اور اس کا گراں بہا ہونا ہے۔ اسی تشخص اور گرانبہائی کے سائے میں عفت کو معاشرہ میں مستقر ملتا ہے، جانیں سلامت رہتی ہیں، معاشرہ میں خاندانی مراکز سلامت رہتے ہیں اور کام میں پختگی آتی ہے۔ عورت کا گراں قدر ہونا یہ ہے کہ اس کے اور مرد کے درمیان سلام کی مقرر کردہ حدیں قائم رہیں۔ یعنی اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ خاندانی مرکز یعنی سماجی منظر کے سوا عورت سے مرد کے خواہ جنسی تعلقات یا لذت اندوزی کی صورت ہو، چاہے اس کے جسم پر نگاہ ڈالنے کی صورت میں ہو، چاہے اس کا جسم چھونے کی صورت میں ہو، چاہے اس کی نسوانی خوشبو سونگھنے کی صورت میں ہو، چاہے اس کے

پاؤں کی آواز سننے کی صورت میں ہو۔ اور جب ہم پوچھیں کہ علم، اختیار، ارادہ، ایمان، عبادت، ہنر اور خلاقیت عورت میں کس طرح آئیگی؟ تو وہ جواب دیگا۔ بالکل مرد کی طرح۔ شریعت نے کچھ چیزیں حرام کردی ہیں جو عورت سے متعلق ہیں اور جو باتیں حرام نہیں کی ہیں وہ کسی پر بھی حرام نہیں کی ہیں۔ اسلام عورت کی شخصیت پر زور دیتا ہے اس کی ذلت نہیں چاہتا۔

چنانچہ تاریخ اس لحاظ سے کہ اس کے بنانے میں صرف مرد کا دخل رہا ہو یا مرد اور عورت دونوں کا دخل رہا ہو تین قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک تاریخ مذکر ہے یعنی وہ تاریخ جو مرد کے ہاتھوں براہ راست بنائی گئی ہے اور جس میں عورت کا کوئی کردار نہیں رہا ہے۔ ایک تاریخ مذکر، مؤنث ہے لیکن مذکر، مؤنث مخلوط ہے۔ اس میں نہ مرد اپنی مدار میں ہے نہ عورت اپنے مدار میں۔ یعنی ایسی تاریخ جس میں یہ نظام ملا جلا ہے۔ مرد عورت کے دائرے میں ہے اور عورت مرد کے دائرے میں اس طرح کہ اگر ہم آج بعض لڑکے اور لڑکیوں کے لباس پہننے کا طریقہ دیکھیں گے تو پتا لگے گا کہ یہ لوگ کس کس طرح سے ایک دوسرے کی جگہ لے رہے ہیں۔ تیسری قسم کی تاریخ مذکر، مؤنث تاریخ ہے جو مرد کے ہاتھوں بھی بنی ہے اور عورت کے ہاتھوں بھی۔ لیکن مرد اپنے دائرے میں رہا ہے اور عورت اپنے دائرے میں۔ ہم جس وقت قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ جس طرح قرآن نے تشریح کی ہے مذہب اور دین کی تاریخ مذکر، مؤنث ہے۔ اور میرے الفاظ میں وہ ایک مؤنث تاریخ ہے یعنی مذکر و مؤنث دونوں لیکن باہمی اختلاط کی صورت میں نہیں بلکہ اس صورت میں کہ مرد اپنے مقام پر اور اپنے دائرے میں ہے اور عورت اپنے مقام اور اپنے دائرے میں ہے۔

ایسا لگتا ہے جیسے قرآن کی خاص عنایت ہے کہ وہ جس طرح تاریخ کے صدیقوں (سچوں) اور قدسیوں (پاکوں) کا حال بیان کرتا ہے۔ اسی طرح تاریخ کی صدیقات (سچی عورتوں) اور قدسیات (پاک عورتوں) کا حال بھی سناتا ہے۔ حضرت آدم اور حضرت حوا کے قصے ہیں۔ ایک نکتہ ہے جو میں نے چند سال پیشتر اپنی تقریروں میں بار بار بیان کیا ہے اور جس کا پھر ذکر کرتا ہوں۔ عیسائیوں نے مذہبی دنیا کی تاریخ میں ایک بہت غلط خیال داخل کر دیا ہے جو واقعی ایک بے ایمانی تھی (حضرت عیسیٰ کا بیوی نہ رکھنا اور پادریوں اور کارڈنیل وغیرہ کا شادی نہ کرنا اور کنوارا رہنا) رفتہ رفتہ یہ خیال قائم ہو گیا کہ عورت بنیادی طور پر گناہ اور دھوکا ہے یعنی چھوٹا شیطان ہے۔ مرد خود بخود گناہ نہیں کرتا بلکہ یہ عورت ہے جو چھوٹے شیطان کی حیثیت سے ہمیشہ بہکاتی رہتی ہے۔ اور مرد کو گناہ پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ عیسائیوں نے بتایا کہ حقیقت میں آدم، شیطان اور حوا کا قصہ اس طرح شروع ہوا کہ شیطان آدم پر قابو نہیں پا سکا اس لئے اس نے آکر حوا کو دھوکہ دیا اور حوا نے آدم کو بہکایا۔ پوری تاریخ میں یہ بات اسی طرح ہے کہ بڑا شیطان عورت کو بہکاتا ہے اور عورت مرد کو بھکاتی ہے۔ دراصل آدم، حوا اور شیطان کا قصہ مسیحیوں میں اس طرح آیا تھا لیکن قرآن اس کے بالکل برعکس کہتا ہے اور اس کی صراحت بھی کرتا ہے اور یہ بڑی عجیب بات ہے۔

جس وقت قرآن آدم اور شیطان کا قصہ بیان کرتا ہے تو آدم کو اصل اور حوا کو ان کا پیرو بتاتا ہے۔ جب وہ ابتدا میں کہتا ہے کہ ہم نے ان دونوں سے کہا کہ بہشت میں رہو (صرف آدم سے ہی نہیں کہا)۔ "لا تقربا ہذہ الشجرۃ" (۱) تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا (اب وہ درخت کسی چیز کا کیوں نہ ہو) پھر فرماتا ہے:

۱۔ سورۂ اعراف آیت ۱۹

"فوسوس لہما الشیطان" (۱) شیطان نے دونوں کو بہکایا۔ یہ نہیں کہتا کہ ایک کو بہکایا اور پھر اس نے دوسرے کو بہکایا: "فدلا ہما بغرور" (۲) پھر "ہما" تثنیہ کی ضمیر ہے "و قاسمہما انّی لکما لمن الناصحین" (۳) جب اس نے بہکایا اور دھوکہ دینا چاہا تو دونوں کے سامنے جھوٹی قسم کھائی۔ حضرت آدمؑ اتنے ہی پہکے جتنی حضرت حوا اور حضرت حوا اتنی ہی بہکیں جتنے حضرت آدمؑ۔ اسلام نے اس خیال کو اس غلط خیال کو جو مذہبوں کی تاریخ سے چمٹ گیا تھا دور کیا اور بتایا کہ انسانی گناہ کا ارتکاب اس طرح نہیں ہوتا کہ شیطان عورت کو بھکاتا ہے اور پھر عورت مرد کو ورغلاتی ہے اور اس لئے عورت گناہ کا عنصر ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے جو قرآن مجید یہ مہربانی کرتا ہے کہ قدسین کے ساتھ ساتھ ان بڑی بڑی قدسیات کا بھی ذکر کرتا ہے جنہیں اپنے اپنے موقعوں پر ان قدسین پر برتری اور فوقیت حاصل رہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں جناب سارہ کا ذکر کتنے احترام سے کرتا ہے! یہاں تک کہ جس طرح حضرت ابراہیم ملکوت سے تعلق رکھتے تھے اور ملکوتی آنکھ رکھتے تھے۔ فرشتوں کو دیکھتے تھے اور فرشتوں کی آوازیں سنتے تھے اس طرح جناب سارہ بھی ان کی آوازیں سنتی تھیں۔ جب ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ خدا تم دونوں (بوڑھے ابراہیم اور بوڑھی سارہ) کو ایک فرزند عطا کرنا چاہتا ہے تو جناب سارہ کی آواز بلند ہوئی اور انہوں نے کہا "ا الدو انا عجوز و ہذا بعلی شیخا" (۴) مجھ بڑھیا بیوی اور اس بوڑھے شوہر کو؟ کیا ہم بڑھاپے میں یہ تمنا کر سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں بچہ پیدا ہو؟ ملائکہ نے جو حضرت ابراہیمؑ سے نہیں حضرت جناب سارہ سے مخاطب

۱۔ سورۂ اعراف آیت ۱۹
۲۔ سورۂ اعراف آیت ۲۰
۳۔ سورۂ اعراف آیت ۲۲
۴۔ سورۂ ہود آیت ۷۲

ہیں کہا: "اتعجبین من امر اللہ" (۱) اے سارہ! کیا تم خدا کے حکم پر تعجب کر رہی ہو؟ اس طرح جب قرآن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام لیتا ہے تو فرماتا ہے: "و اوحینا الی امّ موسیٰ ان ارضعیہ" (۲) ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو خوددودھ پلائے۔ "فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی انّا رادوہ الیک و جاعلوہ من المرسلین" (۳)

قرآن جنابہ مریم کے قصے پر پہنچتا ہے تو کہتا ہے پیغمبرؐ اس خاتون کے سامنے آتے ہیں زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔ جناب زکریاؑ جس وقت آئے تو جناب مریمؑ کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے پاس وہ نعمتیں رکھی ہیں جو اس پوری سر زمین میں نہیں ملتیں، وہ تعجب کرتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جب جناب مریم محراب عبادت میں ہوتی تھیں تو خدا کے فرشتے ان سے باتیں کرتے تھے: "اذ قالت الملائکۃ یا مریم ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسی بن مریم وجیھا فی الدنیا و الاخرۃ و من المقربین" (۴) ملائکہ ان سے براہ راست باتیں کرتے تھے۔ جناب مریم پیغمبری پر مقرر نہیں ہوئی تھیں اور قرآن اس بات کو صحیح بھی نہیں سمجھتا کہ ایک عورت کو عورتوں اور مردوں کے اوپر مقرر کیا جائے۔ جناب مریمؑ کی یہ شان عظیم تھی۔ اس کے باوجود وہ پیغمبر نہیں تھیں پھر بھی بہت سے پیغمبروں سے مرتبے میں بلند تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جناب مریمؑ جو پیغمبر نہیں تھیں خود جناب زکریاؑ سے جو پیغمبر تھے بلند مقام اور مرتبہ رکھتی تھیں۔

قرآن حضرت صدیقہ طاہرہ کے بارے میں فرماتا ہے: "انّا اعطینک

۱۔ سورۂ ہود آیت ۷۳
۲-۳۔ سورۂ قصص آیت ۷
۴۔ سورۂ آل عمران آیت ۴۵

الکوثر" (۱) کوثر سے بڑھ کر اور کوئی لفظ نہیں ہے۔ جس دنیا میں عورت کو شر مطلق اور دھوکے اور گناہ کی جڑ سمجھا جاتا تھا قرآن اس کو نہ صرف نیکی بلکہ کوثر کہتا ہے یعنی بہت بڑی پھیلی ہوئی نیکی، نیکی کی ایک دنیا۔ اب ہم تاریخ اسلام کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے دن دو انسان مسلمان ہوتے ہیں: حضرت علیؑ اور جناب خدیجہؑ جن کا اسلام کی تاریخ بنانے میں اہم کردار ہے۔ اگر ان خاتون کا جو پیغمبرؐ سے پندرہ سال بڑی تھیں ایثار نہ ہوتا تو کیا ظاہری اسباب کے نقطۂ نظر سے پیغمبر اپنے کام میں کامیاب ہوسکتے تھے؟ ہجرت نبوی کے ڈیڑھ صدی کے بعد تاریخ ابن اسحاق میں حضرت خدیجہ کے مرتبے اور پیغمبرؐ کی حمایت خصوصاً ان کی تسلی و تشفی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہؑ کے مرنے کے بعد اسی سال حضرت ابو طالب بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ واقعی پیغمبر اکرمؐ پر زندگی اس قدر تنگ ہوگئی جس کا بیان ناممکن ہے۔ پیغمبرؐ اپنی آخر عمر تک جب بھی جناب خدیجہ کا نام لیتے تھے آپ کے آنسو جاری ہوجاتے تھے۔ جناب عائشہ کہتی تھیں۔ ایک بوڑھی عورت اس لائق تو نہیں تھی کیا بات ہے؟ آپ فرماتے تھے تم سمجھتی ہو میں خدیجہ کی شکل و صورت کے لئے روتا ہوں؟ خدیجہ کہاں اور تم اور دوسری بیویاں کہاں؟ دونوں میں کوئی مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔

جب آپ تاریخ اسلام پر نظر ڈالیں گے تو دیکھیں گے اسلام کی تاریخ ایک مذکر، مؤنث تاریخ ہے لیکن ایسی تاریخ ہے جس میں مرد اپنے دائرے میں ہے اور عورت اپنے دائرے میں۔ پیغمبرؐ کے دوستدار مرد بھی تھے، عورتیں بھی۔ راوی مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ غالباً جن سب کے نام ان کتابوں میں موجود ہیں۔ آج سے ہزار سال پہلے لکھی گئیں تھیں بلکہ ہمارے پاس ایسی روایتیں زیادہ ہیں جن کی

۱۔ سورۂ کوثر آیت ۱

راویہ عورتیں تھیں۔ بلاغات النساء نامی ایک کتاب ہے جس میں عورتوں کی نہایت بلیغ تقریریں درج ہیں۔ اس کتاب کا مولف کوئی بغدادی ہے جو ۲۵۰ ہجری کے آس پاس یعنی امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانے میں زندہ تھا (جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے سن ۲۶۰ ہجری میں وفات پائی ہے)اس کتاب میں بغدادی نے جو تقریریں جمع کی ہیں ان میں وہ تقریریں بھی شامل ہیں جو حضرت زینب نے یزید کی مسجد میں اور ابن زیاد کے دربار میں کیں اور جو تقریر حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کی ابتدا میں حضرت فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا نے کی تھی۔

اس نئی ضریح میں جو حضرت معصومہ کے لئے آخر میں بنی ہے ایک ایسی روایت کا انتخاب کیا گیا ہے جس کی تمام راویہ خواتین ہیں۔ اس ضمن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان سب کے نام فاطمہ ہیں (تقریباً چالیس فاطمہ ہیں)۔ روایت ہے فاطمہ دختر فلاں سے اور وہ روایت کرتی ہیں فاطمہ دختر فلاں سے یہاں تک فاطمہ دختر موسی بن جعفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ فاطمہ دختر امام حسن ابن علیؑ بن ابی طالب تک اور آخر میں جناب فاطمہ دختر پیغمبرؐ پر منتہی ہو جاتا ہے۔ یعنی ان خواتین کی شرکت تو اس قدر عام تھی لیکن کسی وقت بھی عورت مرد میں اختلاط یعنی میل جول نہیں تھا۔ بہت سے راوی تھے جو آتے تھے اور حدیث بیان کرتے تھے۔ عورتیں آتی تھیں اور سنتی تھیں لیکن وہ ایک طرف بیٹھتی تھیں اور مرد دوسری طرف بیٹھ جاتے تھے۔ مرد ایک کمرے میں ہوتے تھے اور عورتیں دوسرے کمرے میں۔ کبھی اس طرح نہیں آتے تھے کہ ایک کرسی رکھ دیں تاکہ ایک مرد بیٹھے اور ایک عورت، عورت منی اسکرٹ پہنے جس سے اس کی جانگھ اوپر تک کھلی رہے کیونکہ خواتین علم حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ واضح ہے کہ ظاہر میں ایک بات ہے اور باطن میں دوسری۔ اسلام کہتا ہے علم لیکن صرف علم نہ جنسی تلذذ، نہ مذاق، نہ فریب، وہ کہتا ہے شخصیت۔

حضرت زہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام نے اپنی شادی کے

بعد چاہا کہ گھر کے کام آپس میں بانٹ لیں لیکن یہ اچھا سمجھا کہ اس کام میں پیغمبرؐ بھی دخل دیں تاکہ لطف آئے۔ دونوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہؐ! ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہ طے فرمادیں کہ اس گھر میں کون کون سے کام علیؑ کریں اور کون سے کام فاطمہؑ؟ پیغمبرؐ نے گھر کے باہر کے کام حضرت علیؑ کے ذمے رکھے اور گھر کے اندر کے کام حضرت فاطمہ کے۔ جناب فاطمہؑ کہتی ہیں کہ تم نہیں سمجھ سکتے کہ میرے والد نے جو باہر کے کاموں کا بوجھ میرے کندھوں سے اٹھا لیا اس سے میں کس قدر خوش ہوئی۔ دنیا کی یہ خاتون جنہیں کوئی حرص نہیں تھی اس طرح کی تھیں۔

لیکن دیکھئے ان زہراؑ کی شخصیت کس طرح کی ہے؟ ان کی استعداد میں کتنی پختگی اور ترقی پذیری ہے۔ ان کا علم کیسا ہے؟ ان کا ارادہ کیسا ہے؟ تقریر اور بلاغت کیسی ہے؟ جناب زہرا سلام اللہ علیہا جوانی ہی میں دنیا سے سدھار گئیں اور اس زمانے میں ان کے دشمن زیادہ تھے۔ ان کی یادگار باتیں کم ہیں۔ البتہ خوش قسمتی سے ان کی ایک مفصل اور لمبی تقریر (تقریباً ایک گھنٹے کی) اٹھارہ سال عمر کی (یا جیسا کہ کہا گیا ہے زیادہ سے زیادہ ستائیس سالہ عمر کی) باقی رہ گئی ہے۔ جس کی صرف شیعہ ہی روایت نہیں کرتے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے تیسری صدی ہجری میں بغدادی نے یہ تقریر نقل کی ہے۔ یہ ایک تقریر ہی یہ دکھانے کے لئے کافی ہے کہ ایک مسلمان خاتون جو مرد سے اپنا تقدس بچاتی ہے اور جو مردوں کو دکھانے کی خاطر آرائش نہیں کرتی کس قدر معلومات رکھتی ہے اور سماج میں اس کی منزلت کتنی ہے۔

حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی تقریر میں توحید نہج البلاغہ کے پائے کی توحید ہے یعنی ایسی سطح کی جو فلاسفہ کی دسترس میں نہیں۔ جب آپ خدا کی ذات و صفات پر گفتگو کرتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے آپ دنیا کے سب سے بڑے فلسفیوں کی سطح پر

ہیں۔ ایسی تقریر بو علی سینا سے بھی نہیں بن پاتی۔ آپ یکایک احکام اسلام کے فلسفے کی طرف آتی ہیں تو فرماتی ہیں کہ خدا نے نماز یوں واجب کی، روزہ اس لئے واجب کیا، حج اس لئے فرض کیا، نیکی کے لئے حکم دینا اور بدی سے منع کرنا اس لئے واجب کیا۔ زکوٰۃ یوں واجب کی وغیرہ وغیرہ۔ پھر آپ اسلام سے پہلے کی عرب قوم اور اس میں لائے ہوئے اسلام کے انقلاب کی قدر و قیمت جانچنے لگتی ہیں کہ تم عرب والو ایسے تھے۔ ان کی اسلام سے پہلے کی مادی اور روحانی زندگی پر توجہ دلاتی ہیں اور ان کی مادی اور معنوی زندگی کو پیغمبر اسلامؐ کی بدولت جو قدر و قیمت بڑھی اسے گوش گزار کرتی ہیں۔ پھر دلیل اور حجت کی منزل پر آجاتی ہیں۔ مدینہ کی مسجد میں ہزاروں لوگ سامنے موجود ہیں لیکن آپ منبر پر تشریف نہیں لے جاتیں کہ معاذ اللہ اس سے خود نمائی ہوتی ہے۔ پیغمبرؐ کا قاعدہ یہ تھا کہ خواتین الگ بیٹھتی تھیں اور مرد الگ اور ان کے درمیان ایک اونچا پردہ تان دیا جاتا تھا۔ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے پردے کے پیچھے سے اپنی تمام باتیں کہہ سنائیں اور اس مجلس کے عورت مرد سب میں ہلچل مچا دی۔ یہ ہیں اس بات کے معنی جو ہم نے بیان کی۔ اس میں شخصیت بھی ہے اور عفت بھی۔ پاکی بھی ہے اور تقدس کی دیوار بھی۔ یہ کسی وقت بھی اپنے آپ کو مردوں کی بھوکی نگاہوں کے سامنے پیش نہیں کرتی لیکن یہ کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو نہ کچھ سمجھے اور جسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔

کربلا کی تاریخ مذکر، مؤنث حادثہ کی تاریخ ہے۔ اس حادثہ میں مرد اور عورت دونوں کے کردار ہیں، دونوں کا حصہ ہے، لیکن مرد اپنے دائرے میں ہے اور عورت اپنے دائرے میں۔ اسلام کا یہی تو معجزہ ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آج کی دنیا اسے قبول کرلے۔ چاہتا ہے کہ جہنم کو قبول نہ کرے۔

حضرت لباعبداللہ اپنے اہل بیت کو اس لئے ساتھ لے گئے کہ اس عظیم

تاریخ میں رسالت کا کام انجام دیں۔ اس لئے متحرک کیا کہ اس عظیم تاریخ کی تعمیر میں جناب زینبؑ کی قافلہ سالاری میں ان کا بلاواسطہ کردار ہو اور وہ اپنے دائرے سے باہر بھی نہ نکلیں۔

عاشور کے سہ پہر سے جناب زینبؑ نظر آنے لگتی ہیں۔ اس کے بعد سے ان کی ذمہ داری شروع ہوگئی۔ وہ قافلے کی سردار ہیں، کیونکہ اس وقت مرد صرف امام زین العابدین علیہ السلام ہیں جو سخت بیمار ہیں اور ایک تیماردار کے محتاج ہیں، یہاں تک کہ دشمنوں نے ابن زیاد کے عمومی حکم کے مطابق امام حسینؑ کی اولاد میں کوئی مرد باقی نہ رہ جائے چند بار حملہ کیا کہ امام زین العابدینؑ کو بھی قتل کر ڈالیں لیکن پھر خود ہی کہنے لگے "انّہ لما بہ" (۱) یہ خود ہی مر رہا ہے۔ چنانچہ یہ بھی خدا کی ایک حکمت اور مصلحت تھی کہ امام زین العابدینؑ اس طریقے سے زندہ بچ گئے۔ اور حسین ابن علیؑ کی پاک نسل باقی رہ گئی۔ جناب زینبؑ کا ایک کام امام زین العابدینؑ کی تیمارداری تھی۔

گیارہ محرم کو عصر کے وقت قیدی لائے گئے اور انہیں ایسی سواریوں (اونٹوں یا خچروں یا دونوں) پر بٹھایا گیا جن کی کاٹھیاں لکڑی کی تھیں اور یہ پابندی لگا دی گئی کہ قیدی کاٹھیوں پر کوئی کپڑا نہ ڈالیں تاکہ انہیں ایذا پہنچے۔ پھر اہل بیتؑ نے ایک خواہش ظاہر کی جو منظور ہوگئی۔ وہ خواہش یہ تھی۔ "قلن بحق اللہ الا ما مررتم بنا علی مصرع الحسین" (۲) انہوں نے کہا تمہیں خدا کی قسم ہے ہمیں اس جگہ سے لے چلو، ہمیں حسین کی قتل گاہ سے ہوکر گزارو کیونکہ ہم اپنے عزیزوں

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۵، صفحہ ۶۱، اعلام الوری صفحہ ۲۴۶، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۴۲

۲۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۵۸، اللہوف صفحہ ۵۵، اسی طرح کی عبارت مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۹۶ اور مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۳۹ پر ملتی ہے جو سب کی سب حمید ابن مسلم سے نقل و روایت کی گئی ہے۔

کو آخری بار الوداع کہیں۔ قیدیوں میں صرف امام زین العابدین علیہ السلام تھے جن کے پاؤں بیماری کی وجہ سے سواری کے پیٹ کے نیچے باندھ دئے گئے تھے۔ دوسرے قیدی سواریوں پر بندھے بیٹھے تھے۔ جب یہ لوگ قتل گاہ میں پہنچے تو انہوں نے بے اختیار اپنے آپ کو سواریوں سے زمین پر گرا دیا۔ زینب سلام اللہ علیہا حضرت لبا عبداللہؑ کے جسم مقدس کے قریب پہنچیں تو انہیں ایسی حالت میں پایا جس میں اس وقت تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ حضرت کا بدن بے سر اور بے لباس کے دیکھتی ہیں۔ اس بدن کو مخاطب کر کے کہتی ہیں: "بأبی المهموم حتی قضی بابی العطشان حتی مضی۔"(۱) ایسا دل سوز بین کرنے لگیں کہ "فأبکت و الله کل عدو و صدیق"(۲) سارے دشمن اور دوست رو دیئے۔

امام حسینؑ کے سوگ کی مجلس پہلی بار جناب زینب (سلام اللہ علیہا) نے قائم کی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فرائض سے بھی غافل نہیں ہیں۔ امام زین العابدینؑ کی تیمارداری انہی کے ذمے ہے۔ آپ نے امام زین العابدینؑ کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ باپ کا یہ حال دیکھ کر حضرت اس قدر بے چین ہوگئے کہ گویا آپ کی جان نکلنے والی ہے۔ فورا بھائی کی لاش کو چھوڑ کر امام زین العابدینؑ کے پاس پہنچتیں ہیں۔ یابن اخی! میرے بھتیجے! تمہاری یہ حالت کس لئے ہوگئی کہ جیسے تمہارے جسم سے روح پرواز کرنے والی ہے؟ پھوپھی جان! اپنے عزیزوں کی لاشیں دیکھ کر مجھے کیونکر اذیت نہ ہو۔ جناب زینب اس وقت امام زین العابدینؑ کو تسلی دینے لگتی ہیں۔

جناب امّ ایمن نہایت شان و شکوہ کی بی بی ہیں جو ظاہر میں خدیجۂ کبریٰ کی لونڈی تھیں۔ بعد میں آزاد ہوگئی تھیں۔ لیکن پیغمبرؐ کے گھر میں ہی رہنے لگی تھیں۔

۱-۲۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۵۹، اللہوف صفحہ ۵۶، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۳۹۶

پیغمبر ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ ایسی ہستی ہیں جو پیغمبرؐ کی حدیث بیان کرتی ہیں۔ یہ ضعیفہ برسوں پیغمبرؐ کے گھر میں رہی تھی۔ انہوں نے جناب زینب کے سامنے پیغمبرؐ کی ایک حدیث بیان کی تھی۔ لیکن چونکہ یہ بیان خاندان سے متعلق تھا یعنی اس کنبے کے آئندہ واقعات سے اس کا تعلق تھا اس لئے ایک دن جناب زینب حضرت علی علیہ السلام کی عمر کے آخری حصے میں یہ اطمینان کرنے کیلئے آپ کے پاس آئیں کہ جو کچھ ام ایمن نے کہا ہے وہ سوفیصدی درست ہے۔ بابا جان! میں نے ام ایمن سے یہ حدیث سنی ہے۔ میں یہ حدیث ایک بار آپ سے بھی سننا چاہتی ہوں تاکہ تصدیق ہوجائے کہ یہ صحیح ہے؟ آپ نے پوری حدیث بیان کی۔ آپ کے والد یعنی حضرت علی علیہ السلام نے تائید کی اور فرمایا ام ایمن کا کہنا سچ ہے۔ یہ بات صحیح ہے۔

جناب زینبؑ اس وقت ان حالات میں یہی حدیث امام زین العابدین علیہ السلام کے سامنے بیان فرماتی ہیں۔ اس حدیث میں یہ ہے کہ اس واقعے میں ایک نکتہ پوشیدہ ہے۔ تم ان حالات میں یہ نہ سمجھ لینا کہ امام حسینؑ مارے گئے اور ختم ہوگئے۔ اے میرے بھتیجے! ہمارے جد کی یہ حدیث ہے کہ امام حسینؑ اسی جگہ بے کفن دفن ہونگے جہاں تم اس وقت ان کا جسم دیکھ رہے ہو اور اسی جگہ امام حسینؑ کی قبر کا طواف ہوا کرے گا۔

بر سر تربت ما چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

آنے والے وقتوں میں یہ جگہ محبت کرنے والوں کا کعبہ بن جائیگی۔ امام زین العابدین کے سامنے جناب زینب سلام اللہ علیہا روایت کرتی ہیں۔ یہی گیارہ تاریخ تھی کہ ظہر کے بعد عمر ابن سعد اپنے سپاہیوں کی لاشیں دفنانے کے لئے وہیں رہ گیا لیکن

حضرت ابا عبد اللہ کے صحابیوں کی لاشیں اسی طرح پڑی رہ گئیں۔اس کے بعد قیدیوں کو (آج کی سی بارہ تاریخ کی رات میں) سیدھے کربلا سے نجف کیلئے جو تقریباً بارہ فرسخ ہے روانہ کر دیا گیا۔ ترتیب یوں رکھی گئی تھی کہ بارہ تاریخ کے دن قیدیوں کو ڈھول تاشہ اور شہنائیوں کی گونج میں اور فتح کی شان و شوکت کے ساتھ کوفہ میں داخل کردیں گے اور اپنے خیال کے مطابق پیغمبرؐ کے خاندان پر آخری ضرب لگا دینگے۔

ان لوگوں کو روانہ کردیا گیا اور اس حالت میں لے چلے کہ جناب زینب غالباً نویں محرم سے بالکل نہیں سوئی تھیں۔ سب سے پہلے سر لے جائے گئے تھے۔ نہ جانے کتنا دن چڑھ آیا تھا (سورج نکلنے کے قریب قریب دو تین ساعتیں گزر چکی تھیں) جب قیدی کوفہ میں داخل ہوئے۔ حکم دیا گیا کہ سروں کو ان کے استقبال کے لئے لے جائیں تاکہ ساتھ آئیں۔ اس وقت ایسی عجیب حالت تھی جو بیان نہیں کی جا سکتی۔ کوفہ کے دروازے پر (علیؑ کی بیٹی، فاطمہ کی بیٹی یہاں نظر آتی ہیں) یہ تشخص والی خاتون جو باقی رہ جانے والی عورت بھی ہے اور گراں قدر تقریر بھی کرتی ہے۔ راویوں نے لکھا ہے کہ ایک خاص وقت پر جناب زینبؑ موقع کو غنیمت جان لیتی ہیں۔ و قد او مأت حضرت علیؑ کی بیٹی نے ایک اشارہ کیا۔ تاریخ کی عبارت یہ ہے: "و قد او مأت الی الناس ان اسکتوا فارتدت الانفاس و سکنت الاجراس" یعنی جس شور و غل میں ڈھول کی آواز بھی نہیں سنی جا سکتی تھی یک بیک ایسی خاموشی چھاگئی کہ جیسے سینوں میں سانسیں رُک گئیں اور گھنٹوں اور غل غپاڑے کی آوازیں بیٹھ گئیں۔ سواریاں بھی رک گئیں (جب لوگ کھڑے ہوگئے تو مجبوراً سواریاں بھی کھڑی ہوگئیں) جناب زینبؑ نے ایک تقریر کی۔ راوی کہتا ہے: "و لم ار والله خفرة قطّ انطق منها" یعنی ان سے عورت کی حیا ظاہر ہوتی تھی۔ علیؑ کی شجاعت عورت کی حیا میں ملی ہوئی تھی۔

حضرت علیؑ بیس سال پہلے اس کوفہ میں خلیفہ تھے اور آپ نے اپنی خلافت کے تقریباً پانچ سال تک کافی تقریریں کی تھیں۔ لوگوں میں حضرت علیؑ کی مقرری ابھی تک ضرب المثل تھی۔ راوی کہتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جناب زینبؑ حضرت علیؑ کے لہجے میں بول رہی ہیں۔ جیسے حضرت علیؑ زندہ ہوگئے ہیں اور ان کے الفاظ جناب زینب کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ جیسے ہی جناب زینب کی باتیں جو زیادہ نہیں تھیں (دس بارہ سطروں سے زیادہ نہیں) ختم ہوئیں۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا سب کے سب دانتوں تلے انگلیاں دابے ہوئے تھے۔ یہ ہے عورت کا کردار جس شکل میں اسلام چاہتا ہے۔ بالکل حیا، عفت، پاکی اور تقدس میں ڈوبی ہوئی ایک شخصیت۔ اس دلیل سے کہ کربلا کی تاریخ مذکرّ مؤنث ہے کہ اس کے بنانے میں مرد کا کردار بھی موثر ہے اور عورت کا کردار بھی موثر ہے لیکن اپنے دائرے میں۔ یہ تاریخ دونوں جنسوں کے ہاتھوں بنی ہے۔

ولا حول ولا قوة الا بالله العلی العظیم

و صلی الله علیٰ محمد وآله الطاهرین

.

ساتویں مجلس

مبلغ کیلئے شرائط اور امام حسینؑ کے اہل بیتؑ کی دوران اسیری تبلیغ کی تاثیر

بسم اللّٰہ الرّحمن الرّحیم

الّذین یبلّغون ر سا لات اللّٰہ و یخشونہ ولا یخشون احدا الّا اللّٰہ و کفی باللّٰہ حسیبا (۱)

جو گفتگو باقی رہ گئی وہ دو باتوں کے متعلق تھی۔ ایک پیغام پہنچانے والے کی شرائط کے متعلق جسے ہم نے تبلیغ پر اپنی مجموعی گفتگو میں پیام کی کامیابی کی چار شرائط میں سے ایک شمار کیا تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ پیام کی کامیابی کے لئے چند شرطیں ہوتی ہیں۔ پہلی شرط اس پیام کے مشمولات کی قوت اور قرآنی زبان میں حقانیت ہے۔ دوسری شرط پیام پہنچانے کا صحیح طریقہ اور اسلوب قائم کرنا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ قدرتی اور انسانی دونوں وسائل اور امکانات سے شریعت کے مطابق جائز طریقے سے فائدہ اٹھایا جائے اور افراط اور تفریط سے پرہیز کیا جائے۔ افراط کے معنی ہیں ان وسیلوں سے کام لینا جو شریعت کی رو سے ناجائز ہیں جن کا لازمی نتیجہ الٹا نکلتا ہے اور

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۳۹

تفریط کے معنی ہیں کاہلی یا سستی کرنا (شرعاً جائز وسیلوں سے کام لینے میں) کیونکہ یہ بھی تبلیغی قوت میں کمی پیدا کرتا ہے۔ چوتھی بات جو باقی رہ گئی وہ پیغام پہنچانے والے شخص کی لیاقت اور ذات ہے۔ اسی طرح تحریک حسینی کے تبلیغی عنصر کے مسئلے میں جو تبلیغ کی گفتگو سے جڑا ہوا تھا اہل بیت کی قید کے زمانے میں کربلا سے کوفہ تک، کوفہ سے شام تک، اور کوفہ اور شام میں اور پھر ان کی آزادی کے زمانے میں جب وہ قیدی نہیں رہے تھے اور شام سے مدینہ بھیج دئے گئے تھے، ان کے تبلیغی اثرات کے کچھ حصے باقی رہ گئے تھے اس لئے ضروری تھا کہ ہم اس کے بارے میں گفتگو کریں۔ یہ باقی رہ جانے والے دونوں حصے لازمی طور پر ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

مبلغ اور پیام رساں کی شرائط ایسا مسئلہ ہے جو میں صحیح صحیح نہیں سمجھ پاتا کہ کس وجہ سے ہمارے معاشرے میں بہت کم اہمیت رکھتا ہے۔ معاشرہ میں بعض مسئلوں کی اہمیت قائم ہے لیکن کچھ دوسرے مسئلوں کی حقیقی اہمیت خاص وجوہ کی بنا پر ختم ہو جاتی ہے۔ میں آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں: ہمارے معاشرہ کی ایک شان مفتی اور مرجع تقلید کا منصب ہے جو ایک بلند روحانی مقام ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارا سماج اس مقام کی حدود اور خصوصیت پہنچانتا ہے۔ جو کوئی مذہبی معاملات میں قدرے دخل دیتا ہے جس وقت مرجع تقلید کا لفظ سنتا ہے اس کے ذہن میں فوراً ایک ایسا شخص مجسم ہو کر آجاتا ہے جس نے کم سے کم چالیس پچاس سال تک اپنی ہڈیاں گھس ڈالی ہوں، تکلیفیں جھیلی ہوں، محنت کی ہو، قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ میں سر کھپایا ہو، برسوں تک عالی قدر استادوں سے درس لیا ہو، سالہا سال درس دیا ہو اور کتابیں تصنیف اور تالیف کی ہوں۔ یہ صحیح ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے اور خدا نہ کرے کہ ذہنوں میں یہ مقام اس طرح گر جائے جس طرح تبلیغ اور مبلغ کا مقام گر گیا ہے۔

اسلام کے گزشتہ دور میں یہ بات اس طرح نہیں تھی۔ آپ اگر کتب رجال کا مطالعہ کریں گے تو یہ دیکھیں گے کہ علماء کی ایک بڑی تعداد واعظ یا خطیب کے نام سے مشہور ہے۔ :خطیب رازی، خطیب تبریزی، خطیب بغدادی، خطیب دمشقی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے نام کا جزو خطیب نہیں ہے۔ یہ کیسے لوگ تھے۔؟کیا یہ ایسے ہی ذاکر تھے جیسے ہم آج اپنے معاشرے میں پاتے ہیں؟ ان لوگوں میں سے جو خطیب کے نام سے مشہور تھے ہر شخص علم کا سمندر تھا مثلاً خطیب رازی۔ یہی مشہور و معروف امام فخر الدین رازی ہیں جن کی صرف ایک کتاب ہے "تفسیر کبیر"۔ جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے اور بہت ضخیم ہے۔ (مثلاً اس کو آخر میں بیس جلدوں پر پھیلا دیا ہے)یہ ایک تفسیر ہے جس کے ساتھ بہت سے اضافے بھی ہیں۔ یہ شخص طب، نجوم، فلسفہ، منطق، حدیث، فقہ، وعظ اور تقریر میں دخل رکھتا تھا اور ایسا شخص تھا جس نے بو علی سینا کے اشارات کی شرح لکھی ہے اور بو علی سینا پر تنقید کی ہے۔ صرف خواجہ نصیرالدین طوسی ایسے صاحب علم تھے جو بو علی سینا پر اس کے کئے ہوئے اعتراض کو رفع کر سکے ہیں۔ یہ صاحب تاریخ اسلام کے ایک زبردست واعظ اور مقرر گزرے ہیں۔

جو شخص خطیب بغدادی کے نام سے مشہور ہے وہ کتاب "تاریخ بغداد" کا مصنف ہے جو اسلامی تاریخ کا ایک معتبر مأخذ ہے۔ اسے خطیب تبریزی بھی کہتے ہیں۔ وہ ایسا شخص ہے جس نے کتاب "مطوّل" لکھی ہے۔ یہ کتاب معانی،بیان اور بدیع کے علوم پر عربی ادبیات کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اسی طرح اور لوگ بھی ہیں جیسے مرحوم علامہ مجلسی رضوان اللہ علیہ شیعوں کے بہت بڑے عالم ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ واعظ اور خطیب بھی تھے۔

گزشتہ زمانے میں اسلام کے عالموں میں خطیب، مبلغ اور واعظ کا مقام یعنی

اس شخص کا مقام جو اسلام کا تعارف کراتا تھا مرجع تقلید کے مقام کے برابر ہوتا تھا۔ یعنی جس طرح آج اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میں نے ایک رسالہ لکھا ہے اور میں مرجع تقلید ہوں تو ناممکن ہے کہ آپ اس کی بات مانیں بلکہ آپ پوچھیں گے کہ جناب! آپ نے کب اور کس مجتہد سے تعلیم حاصل کی ہے؟ اور ان صاحب کی عمر ابھی چالیس سال کی بھی نہیں ہے۔ پہلے ایک مبلغ کے بارے میں بھی لوگ اس طرح محتاط ہوتے تھے۔ جو شخص چالیس سال کی عمر میں دعویٰ کرتا ہے کہ میں مرجع تقلید ہوں وہ نہیں جانتا کہ چالیس پچاس سال تک تو تعلیم حاصل کرنا لازمی ہے۔ تب کہیں جاکر وہ اس درجے پر پہنچ جاتا ہے کہ لوگ اسے مجتہد، فقیہ، مفتی، اور استنباط کے لائق اور شرعی احکام حاصل کرنے کا اہل سمجھ سکیں۔ مثلاًلوگ اگر مرحوم آیت اللہ بروجردی کے بارے میں کہتے ہیں تو آپ مختصر طور پر اتنا تو ان کے بارے میں جانتے ہیں کہ انہوں نے کتنے سال تک محنت کی ہے۔ تقریباً تیس سال کی عمر تک اصفہان میں رہے۔انہوں نے اس شہر کے بڑے بڑے استاد دیکھے۔ فقہ، اصول، فلسفہ اور منطق پڑھا۔ اصفہان میں ایک محقق استاد رہ کر مقام اجتہاد تک پہنچ چکے ہیں، نجف جاتے ہیں، مرحوم آیت اللہ آخوند خراسانی کے درس میں شامل ہوتے ہیں اور برسوں ان کے بہترین شاگرد کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ مرحوم آقا سید محمد باقر قزوینی قم کے ایک عالم تھے بوڑھے تھے اور قم میں ہمارے قیام کے ابتدائی سالوں میں تیس سال پہلے انتقال فرماگئے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ ہم مرحوم آخوند خراسانی کے درس میں تھے (آخوند خراسانی ان استادوں میں سے تھے جن کی مثال اسلامی دنیا میں کم ملتی ہے، اول تو وہ اصول میں غیر معمولی ملا اور اس علم کے استادوں میں سے ہیں۔ دوسرے استادی کے فن میں بھی بے مثال تھے۔ بیان، تحقیق اور تقریر میں حیرت انگیز تھے۔ آپ کی کلاس میں جن بارہ سو لوگوں نے شرکت کی ہے ان میں سے غالباً پانچ سو مجتہد

ہو چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی اتنی بلند آواز تھی جو لاؤڈ اسپیکر (بلند گو) کے بغیر ہی پوری مسجد میں گونج جاتی تھی۔ جب کوئی شاگرد اعتراض کرنا یا کچھ کہنا چاہتا تھا تو کھڑا ہو جاتا تھا تاکہ استاد تک اپنی بات پہنچا سکے)۔ ایک بار یہی مرحوم آیت اللہ بروجردی جو اس وقت جوان تھے کھڑے ہو گئے۔ انہیں استاد کی بات پر کچھ اعتراض تھا۔ اپنی بات کہی (وہ بھی بہت خوش بیان تھے۔ ہم نے انہیں ان کی پیری میں دیکھا۔ ان کی زبان میں ذرا لکنت تھی لیکن کہتے ہیں کہ جوانی میں خوب تھے)۔ مرحوم آخوند نے فرمایا ایک بار پھر کہو۔ انہوں نے دوبارہ کہا۔ آخوند نے سمجھ لیا کہ سچ کہتا ہے، اس کا اعتراض درست ہے۔ فرمایا الحمد اللہ میں نے مرنے سے پہلے اپنے شاگرد سے فائدہ اٹھالیا۔ پھر یہ شخص نجف میں چند سال رہنے کے بعد ایران واپس آجاتے ہیں۔ کیا اس وقت مرجع تقلید کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں؟ نہیں۔ پھر مزید تیس سال تک برابر محنت کرتے ہیں۔

مجھے ۱۳۲۲ھ شمسی میں خدا نے یہ توفیق دی کہ میں ان کی خدمت میں بروجرد پہنچا۔ (وہ تئیس کے جاڑوں میں قم آگئے تھے لیکن سن بائیس میں ابھی بروجرد ہی میں تھے) شعبان کا مہینہ تھا۔ جب پندرہ تاریخ شعبان کی آئی تو سنت کے مطابق جو درس دے رہے تھے (مکاسب کا درسِ خارج) روک دیا۔ آپ نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ ان پندرہ دنوں میں ہم ایک چھوٹی سی گفتگو کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مسیحیت پر گفتگو کی پیش کش کی اور کہا کہ اس مسئلے کا چالیس سال سے کچھ قبل جب میں اصفہان میں تھا ایک بار مطالعہ کیا تھا، اس پر تحقیق کی تھی اور لکھا تھا (لکھا ہوا میرے پاس موجود ہے) اور اس کے بعد سے میں نے اس کی طرف رجوع نہیں کیا ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ چالیس سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد پھر اس مسئلے کا مطالعہ کروں۔ پھر خود ہی فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ اپنی تحریر نہ دیکھوں

بلکہ نئے سرے سے مطالعہ کروں اور اس کے بعد ان تحریروں کو دیکھوں کہ اس وقت سے کوئی فرق آیا ہے یا نہیں۔ دس پندرہ دن کی گفتگو کے بعد جا کر وہ اپنی تحریریں لے آئے جس وقت پڑھا تو دیکھا کہ وہ تمام باتیں جو آج ان کے ذہن میں آئی تھیں چالیس سال پہلے بھی ان کا ذہن ان باتوں تک پہنچ گیا تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ اب ذہن زیادہ پختہ اور مستحکم ہو گیا تھا اور اس وقت اصول اور باقاعدگی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اب اسلام میں زیادہ دخل رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ تحقیق کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ہمارا ذہن فقہ کی طرف زیادہ مائل ہو گیا ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ یہ ایک مرجع تقلید کا مقام ہے اور چاہئے ایسا ہی ہونا خوف ہے کہ ہمارا معاشرہ اس بات کو فراموش نہ کر دے۔ لوگ بے صلاحیت لوگوں کو قبول کر لیں، لیکن یہ مقام محفوظ ہے اور چاہئے کہ محفوظ رہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ اسلام کی تبلیغ کا، عوام تک اسلام کا پیام پہنچانے کا، اسلام کا ایک مکتب کی صورت سے تعارف اور شناسائی کرانے کا مقام، مرجع تقلید کے مقام سے کم نہیں ہے تو تعجب نہ کیجئے گا۔ مقام اسی سطح کا ہے البتہ مرجع تقلید کے لئے جو باتیں ضروری ہیں وہ مبلغ کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ لیکن ہمارا معاشرہ اس مسئلے پر جب پہنچتا ہے تو ہر بات فراموش کر دیتا ہے۔ آپ دیکھئے ہمارے معاشرہ میں مبلغ ہونے کے لئے کتنے سرمائے کی ضرورت ہے اور مبلغ کہاں سے بننا شروع ہوتا ہے؟ اگر کسی کی آواز اچھی ہو اور چار شعر پڑھ سکتا ہو تو وہ دھیرے دھیرے ایک مداح بن جاتا ہے۔ منبر کے پاس کھڑا ہو کر قصیدہ اور مرثیہ پڑھنے لگتا ہے۔ پھر آپ دیکھیں گے وہ ایک چھوٹی سی شال سر پر لپیٹ کر آگیا اور منبر کی پہلی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ مدتوں اس طرح سے تقریر کرتا رہتا ہے اس کے بعد کتاب جواہری، جامع التفصیل سے کوئی حکایت، کوئی قصہ سناتا ہے یا بقول کسی صدر الواعظین سے نقل

کرتا ہے۔ جب آپ اس سے پوچھتے ہیں کہ کہاں سے نقل کر رہے ہو؟ تو وہ کہتا ہے صدر الواعظین یا لسان الواعظین سے۔ ہر شخص یہ سوچنے لگتا ہے صدر الواعظین نامی بھی کوئی کتاب ہوگی لیکن جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ سمجھ پاتے ہیں کہ وہ کہنا چاہتا ہے میں نے دوسروں کے سینے سے دوسروں کی زبان سے سنا ہے۔ کچھ اس سے لیا کچھ اس سے لیا۔ جھوٹ، سچ، اسے اس بات کا بالکل پتہ ہی نہیں کہ بات واقعی کیا ہے۔ کیا قصہ ہے۔ دھیرے دھیرے وہ منبر کی سیڑھیاں طے کرتا ہے اور نچلی سیڑھی سے ایک سیڑھی اوپر آتا ہے رفتہ رفتہ اوپر آتا ہے اور عوام کا مجمع لگا لیتا ہے۔ بانیان مجلس فقط ایک بات پر زور دیتے ہیں اور وہ مجمع کھینچتا ہے کہ کون شخص بہتر مجمع لگا سکتا ہے۔ آخر یہ مجمع اکٹھا کرنا صرف گنتی گننے والی بات ہے۔ یہ تو دیکھئے کہ وہ مجمع کھینچ کر کیسی باتیں کرتا ہے! یہ اسلام سے بد دیانتی ہے، بے ایمانی ہے کہ ایک دلکش اور سریلی زبان سے گفتگو شروع ہو اور یہ عام قاعدہ ہے۔ ہم جہاں جہاں گئے ہیں ان میں سے اکثر مقامات پر یہی معیار پایا ہے اور اسی قسم کی باتوں سے موضوع شروع ہوتے دیکھا ہے۔ ہمارے حال پر افسوس ہے کہ اس زمانے میں، علم کے اس دور میں، شک اور تردید کے اس زمانے میں، شبہ کے عصر میں، اس زمانے میں جبکہ اسلام کے خلاف اتنی باتیں کہی جارہی ہیں، کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب آدمی اخباروں یا رسالوں میں اسلام کے خلاف کوئی بات نہ دیکھتا ہو یا ریڈیو کے مقالات میں نہ سنتا ہو، روزنامہ نے محبت کے لفظ کے لئے فضا کیوں مکدر کی ہے؟ (۱) ایسے وقت میں تو تمہیں لازم ہے کہ ہوشیار رہو، اپنی بات ڈٹ کر کہو، بحث و مباحثہ کرو۔ اگر گزرے وقتوں میں مبلغ کے لئے حالات سنگین اور مشکل تھے تو ہمارے زمانے میں وہ حالات دس بلکہ سو گنے مشکل ہوگئے ہیں۔

مبلغ کے لئے پہلی شرط اپنے مکتب سے واقفیت ہے۔ پیام کی ماہیت سے

۱۔ عہد پہلوی کی طرف اشارہ ہے

آگاہی ہے۔ یعنی جو شخص سماج تک پیام پہنچانا چاہتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ اس پیام کی ماہیت سے واقف ہو۔ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس مکتب کا مقصد کیا ہے۔ اس مکتب کے اصول اور درجے کون کون سے ہیں۔ اس مکتب کی راہ کونسی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ اس مکتب کے اخلاق، اقتصادیات اور سیاست کیا ہیں۔ اس مکتب کے معارف کیا کیا ہیں۔ اس مکتب کی توحید اور معاد کیسی ہے۔ اس مکتب کے احکام اور دستور کیا ہیں۔ پیام کو خود جانے اور سمجھے بغیر کیا کوئی اسے لوگوں تک پہنچا سکتا ہے؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ہم کہیں کہ ایک شخص مرجع تقلید ہے چاہے اس نے فقہ ہی نہ پڑھا ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مرجع تقلید ہو اور وہ فقہ کی رو سے فتوی دینا چاہے لیکن فقہ اس نے پڑھا ہی نہ ہو۔ یا جیسے ایک شخص طبیب بننا چاہے لیکن اس نے علاج کا علم ہی نہ پڑھا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مبلغ کے لئے کتنی وسیع علمی معلومات اور اسلام کی شناخت ایک مکتب کی صورت میں ضروری ہے۔

اسلام خود ایک مکتب ہے، ایک جسم ہے، ایک متناسب مجموعہ ہے یعنی ایک ایک جزو کر کے بھی شناخت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں چاہئے کہ اس کے تمام اجزاء پر مشتمل اسکے پورے جسم کو کلی اور مجموعی طور پر پہچانیں۔ اسلامی مسائل کے بارے میں ہمارا اندازہ صحیح ہونا چاہئے۔ ایک جسم میں محض ایک عضو کی تنہا کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ انسان کے جسم میں ہاتھ، پاؤں، ناک، آنکھ، کان، اندرونی اعضاء جیسے معدہ، آنت، دل اور مغز ہر ایک ایک عضو ہے لیکن جسم میں ان اعضاء کی قیمت باوجود یکہ یہ سب پر لازم اور ضروری ہیں یکساں ہے؟ اگر ضروری ہو تو کیا ہم ان میں سے ایک عضو کو دوسرے پر قربان کر سکتے ہیں؟ ہم کس عضو کو کس عضو پر قربان کریں؟ اگر ضروری ہو تو کیا ہاتھ کو جسم پر قربان کر دیں کیونکہ آدمی ہاتھ کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن دل کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جگر یا مغز اور اعصاب کے بغیر زندہ نہیں رہ

سکتا۔ اسلام بھی اسی طرح کا جسم ہے جو اپنی جگہ ایک اہم بحث ہے۔

پیام پہنچانے والے کے لئے دوسری شرط ایک تو تبلیغی وسائل کو کام میں لانے کی مہارت اور دوسرے ان سے واقفیت ہے یعنی وہ جان لے کہ کن اوزاروں سے کام لے اور کن سے کام نہ لے بلکہ قدرتی آلات کے لحاظ سے کون کون سے اوزار رکھے اور کون سے نہ رکھے۔

آج سے تقریباً بارہ سال پہلے میں نے "منبر و خطابہ" کے عنوان کے تحت کچھ تقریریں کی تھیں جو "گفتار عاشورا" کے نام سے کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں۔ میں نے اس میں بحث کا ایک سلسلہ چھیڑا ہے۔ تقریر کے متعلق علماء نے اصل میں کتاب لکھی ہے۔ دراصل خطابت اپنی جگہ ایک فن ہے۔ جس کسی نے اس فن پر سب سے پہلے کتاب لکھی وہ ارسطو ہے۔ مسلمانوں نے جب ارسطو کی کتابوں کا ترجمہ کیا تو خطابت کو منطق کا حصہ قرار دے دیا۔ بعد میں تقریر کے متعلق بہت کچھ کہا گیا۔ تقریر کے بارے میں لکھی ہوئی بو علی سینا کی کتاب پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ اس میں مقرر کی شرائط کے متعلق کہتا ہے: اس میں شک نہیں کہ مقرر میں کچھ فطری خصوصیات بھی ہونا چاہئے مثلاً شعر گوئی اور قدرت بیان۔ یہ خود اپنی جگہ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور تبلیغ کے لئے یہ قدرتی ہنر رکھنا لازم ہے۔ "الرحمن علّم القرآن خلق الانسان علّمه البیان" (۱)

آپ نے حضرت موسیٰ بن عمران کا رسالت پر مبعوث ہونے کا قصہ سنا ہوگا۔ دس سال کے بعد وہ دوبارہ مصر واپس آنا چاہتے ہیں۔ بیوی کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ برسات کی اندھیری رات ہے۔ بیوی درد زہ میں مبتلا ہیں۔ ہوا بھی سرد ہے اس لئے بیوی کے لئے گرمی مہیا کرنا ضروری ہے لیکن اس کا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ یکایک

۱۔ سورۂ رحمٰن آیت ۴-۱

اس بیابان میں ایک جگہ روشنی نظر آتی ہے (وادی طور، وادی سینا میں)۔ سوچتے ہیں آگ ہے۔ وہاں جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آگ نہیں ہے۔ یہ واقعہ کچھ اور ہی ہے۔ وہیں اور اسی وقت موسیٰ بن عمران نبوت پر مامور ہوجاتے ہیں۔ آواز آتی ہے کہ تم اس وقت سے ہمارے رسول ہو یعنی خدا کے مبلغ ہو۔ ہمارا پیغام فرعون اور اس کے حمایتیوں کو پہنچاؤ۔ موسیٰ جانتے ہیں کہ مبلغ کے لئے کچھ شرائط ضروری ہوتی ہیں۔ وہ اپنی رسالت کو کافی نہیں سمجھتے۔ اللہ سے منت کرتے ہیں: "ربّ اشرح لی صدری" (۱) اے خدا میرا حوصلہ بڑھا۔ میرا سینہ کھول دے تاکہ مجھے غصہ نہ آئے، میں ناراض نہ ہوؤں، میں عاجز نہ آؤں۔ مجھے دریا دل بنادے کیونکہ تبلیغ کا کام دریا دلی چاہتا ہے "و یسر لی امری" (۲) اس بھاری ذمہ داری کو میرے لئے آسان بنادے (دیکھئے ہم تبلیغ کا کام کتنا چھوٹا سمجھتے ہیں اور موسیٰ بن عمران اسے کتنا بڑا شمار کرتے ہیں) پیغمبر اکرمؐ سے تعلق رکھنے والی ایک بات اس موضوع کی تائید کرتی ہے۔ قرآن پیغمبر اکرمؐ سے آپ کے منصب یعنی اسلام کی تبلیغ اور لوگوں کی ہدایت کے بارے میں فرماتا ہے: "انّا سنلقی علیك قولاً ثقیلاً" (۳) ہم عنقریب تمہارے کندھوں پر ایک بھاری بوجھ رکھنے والے ہیں۔ یہ ایسا بوجھ ہے جس کا بھاری پن پیغمبرؐ کے کندھوں کو بھی محسوس ہوتا ہے! پیغمبروں کے کندھوں پر بھی بھاری ہے! پھر ہم اپنے لئے کیا کہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عریضہ جاری رکھتے ہوئے کہا: "واحلل عقدةً من لّسانی" (۴) اے خدا! میری زبان کی گرہ کھول دے۔ (میری لکنت دور کردے) مجھے خوش بیانی اور میرے بیان کو روانی عطا فرما۔ مجھے تقریر اور قوت کلام

۱۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۲۵ ۲۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۲۶
۳۔ سورۂ مزمل آیت ۵ ۴۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۲۷

عطا فرما۔ "یفقہوا قولی" (۱) مجھے سمجھانے کی قوت دے جس سے میں وہ حقیقت جس کی تو مجھے وحی فرمائے لوگوں تک پہنچاؤں اور لوگوں کی سمجھ میں آئے۔ میرے اور لوگوں کے درمیان ایک تعلق قائم کردے جس سے لوگ تیری بات کو اسی طرح مجھ سے سمجھیں جس طرح تو چاہتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ میں ایک بات کہوں اور وہ اپنے آپ کوئی اور ہی بات سمجھ بیٹھیں۔ (ایسا نہ ہو کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے میں اسے بیان نہ کر سکوں)۔ بیان کرنے کی قوت ایک قدرتی صلاحیت ہے (البتہ اس میں سے کچھ کسب کی جاسکتی ہے) لیکن قدرتی صلاحیتوں کو مشق اور کوشش سے قوت پہنچانا چاہئے۔ مثلاً ایک شخص میں ورزش کے کاموں کی کچھ صلاحیت تو ہوتی ہی ہے پھر اس صلاحیت کی مشق اور تکرار سے ورزش تکمیل پا جاتی ہے۔

بہر حال خوش قسمتی سے یہ کہنا چاہئے کہ شیعی دنیا میں امام حسین علیہ السلام کی برکت سے بہت سے زور دار، جوشیلے اور اعلی درجے کے مقرر اور خطیب، خواہ بیان کی رو سے، خواہ غیر بیان دونوں کے لحاظ سے پیدا ہوئے ہیں اور الحمدللہ! اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو واقعی نطق اور سخنوری کے اعتبار سے ایک علامت ہیں۔ مجھے کوئی ایسا شخص یاد نہیں پڑتا جسکا میں نام لے سکوں لیکن ایسے لوگ موجود ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے محنت کی ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ جس حد تک حالات نے ان کا ساتھ دیا ہے انہوں نے بہت زیادہ محنت کی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: "واجعل لی وزیراًمن اھلی ھارون اخی" (۲) میرا خیال ہے کہ میں تن تنہا تبلیغ کے کام اور لوگوں کی ہدایت سے عہدہ برآں نہیں ہو سکوں گا اس لئے اپنے ساتھ ایک مددگار

۱۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۲۸
۲۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۲۹، ۳۰

چاہتا ہوں۔ لیکن میں بد نصیب ابھی تک ایسا محسوس نہیں کرتا۔ میں ابھی تک سوچتا ہوں کہ میں تن تنہا ہی کافی ہوں۔ ہمکار (ساتھی) کسے کہتے ہیں؟ ہم فکر (یکساں سوچنے والے) کسے کہتے ہیں؟ ہم گام (ساتھ ساتھ چلنے والا) کسے کہتے ہیں؟ میں تو اکیلا ہی کام کروں گا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: "اے خدا! یہ تبلیغ کا کام ہے، ہدایت کا کام ہے، لوگوں کو تربیت دینے کا کام ہے، میں پیغمبر اکیلا یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ اے خدا! میرا شریک، ایک معاون، ایک مددگار بھیج۔" وہ نامزد بھی کرتے ہیں۔ میرا بھائی ہارون ہر لحاظ سے لائق ہے اے خدا اسے میری مدد کے لئے بھیج: "کی نسبّحك کثیراًو تذکرك کثیراً" (۱) کس لئے؟ اپنا اخلاص بیان فرماتے ہیں: اے خدا! اس کے سوا میری اور کوئی غرض نہیں ہے کہ میں دنیا میں تیری تسبیح پڑھنے (یاد کرنے) والوں کی تعداد میں اضافہ کروں۔ دنیا میں حق پرستوں کی تعداد بڑھاؤں۔ اسی لئے میں تجھ سے یہ تقاضا کر رہا ہوں اور تجھ سے یہ کمک چاہتا ہوں۔

قرآن پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں بھی یہی باتیں بیان کرتا ہے لیکن تکمیل پاجانے والی باتوں کی طرح۔ حضرت موسیٰؑ کے سلسلے میں ان کی تمنا کی صورت میں بیان کرتا ہے جو یقیناً قبول ہوگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اسی ہدف، رسالت اور نصب العین کی خاطر حضرت موسیٰؑ ابن عمران کی انہیں درخواستوں سے پیغمبر اکرمؐ کی بھی تائید کی۔ فرماتا ہے: "بسم اللّٰہ الرّحمن الرّحیم الم نشرح لك صدرك" (۲) اے پیغمبر! اے ہمارے حبیب! کیا ہم نے تیرا سینہ کشادہ نہیں کیا؟ (عربی میں کھلے سینے سے وسیع زندگی یا روح کا کنایہ ہوتا ہے) کیا ہم نے تیری روح کو وسیع نہیں کر

۱۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۳۲ تا ۳۴
۲۔ سورۂ الانشراح آیت ۱

دیا؟ تجھے دریادل نہیں بنا دیا؟ "و وضعنا عنك وزرك"(۱) وزر یعنی بھاری بوجھ، گناہ کو بھی بھاری بوجھ کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ حسنہ (نیکی، نیک کام) کے برعکس جو انسان کے لئے پروں اور طاقت کا حکم رکھتی ہے، انسان کو اڑاتی اور طاقت بخشتی ہے، برعکس بوجھ ہوتا ہے اور انسان کو حرکت کرنے سے روکتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا: "یسرّلی امری"(۲) میرا کام آسان کر دے۔ یہاں قرآن کہتا ہے: "و وضعنا عنك وزرك" تمہارے کندھے سے بھاری بوجھ اٹھا لیا۔ "الّذی انقض ظهرك"(۳) یہ بہت عجیب ہے۔ انقض کے معنی کی وضاحت کے لئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ اگر کسی لکڑی کی چھت پر بہت سے لوگوں کا بھاری بوجھ ہو جسے سنبھالنے کی اس چھت میں طاقت نہ ہو تو ہم یکایک اپنے عوامی لفظوں میں چھت سے چرچر کی آواز سنیں گے۔ عرب اس مقام پر کہتے ہیں: انقض یعنی چھت کی کڑیاں بول اٹھیں کہ اگر بوجھ ذرا بھی زیادہ ہوا تو چھت گر پڑیگی۔ قرآن فرماتا ہے: اے پیغمبر! بھاری بوجھ سے تیری ریڑھ کی ہڈی ان لکڑیوں کی طرح چٹخنے لگی تھی، تیری کمر جھک رہی تھی تیری پیٹھ ٹوٹ گئی تھی۔ بعد میں پیغمبرؐ کو تسلی دیتا ہے: "فانّ مع العسر یسراًانّ مع العسر یسراًفاذا فرغت فانصب و الی ربك فارغب"(۴) سختی سے نہ ڈر۔ سختی کے ساتھ سہولت ہے اور پھر سہولت کے ساتھ سختی میں پائیداری ہوتی ہے۔ پھر تاکید کرتا ہے اطمینان رکھ۔ سختی سے نہ ڈر اس لئے کہ سختیوں کے ساتھ کے ساتھ سہولتیں بھی ہیں۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی پیغمبر اکرمؐ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، چمکنے لگا اور سرخ ہو گیا۔ خدا کا وعدہ ہے،

۱۔ سورۂ الانشراح آیت ۲
۲۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۲۶
۳۔ سورۂ الانشراح آیت ۳
۴۔ سورۂ الانشراح آیت ۵تا

خدا نے کہہ دیا ہے کہ سختی سے نہ ڈر۔ دوبارہ مجھ سے کہا سختی سے نہ ڈر۔ فاذا فرغت فانصب جب تو اس کام سے فرصت پالے پھر اپنے آپ کو محنت کے کسی اور کام میں لگانا کیونکہ سختی اور محنت سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے اور نہ پہنچے گا۔ و الی ربك فارغب اس کی تفسیر شیعہ یوں کرتے ہیں کہ ہم نے یہ بھاری بوجھ تیرے لئے حضرت علی علیہ السلام کے وسیلے سے ہلکا کر دیا۔ ہم نے حضرت علی علیہ السلام کو تیری مدد کے لئے بھیج دیا۔ شیعوں کو یہ کہنے کا حق ہے اور صحیح بھی ہے یعنی منطق کا یہی فیصلہ ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے ایک حدیث میں جسے شیعہ اور سنی دونوں نے بیان کیا ہے، جس میں تواتر ہے، جس سے سنی بھی انکار نہیں کر سکتے کیونکہ اسے شیعوں سے زیادہ سنیوں نے بیان کیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے خطاب فرمایا: "انت منّی بمنزلة هارون من موسی"(۱) تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ الاّ انّه لا نبی بعدی (۲) فرق صرف اتنا ہے کہ ہارونؑ پیغمبرؐ تھے لیکن چونکہ میرے بعد کوئی پیغمبرؐ نہیں آئے گا اس لئے تم میرے بعد پیغمبرؐ نہیں ہوگے۔ یعنی جس طرح خدا نے حضرت موسیٰؑ بن عمران کی درخواست منظور کی تھی اور ان کے پاس تبلیغ اور ہدایت کے کام میں شریک اور مددگار بھیج دیا تھا اے علیؑ! خدا نے تم کو میرے لئے مددگار اور معاون بنا کر بھیجا ہے۔ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ سے خطاب فرمایا: "انت وزیری....." وزیر کے لفظ کے معنی دراصل مددگار اور معاون کے ہیں۔ وزیروں کو اس نام سے اس لئے پکارتے ہیں کہ وہ بادشاہوں کے مددگار ہوتے ہیں۔ دراصل وزیر کا لفظ کمک دینے والے کے معنی رکھتا ہے۔ یہ بات ہے جو پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے خطاب فرمایا کہ تم میرے وزیر یعنی میرے مددگار ہو جس

۱-۲۔ ینابیع المودة جلد اول صفحہ ۵۶، ذخائر العقبی صفحہ ۶۳، صواعق المحرقہ صفحہ ۱۱۹، مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۴۲۵، حلیۃ الابرار جلد ۱ صفحہ ۵۸۹، مسند الامام رضا جلد ۱ صفحہ ۱۴۹، مناقب ابنشاذلی صفحہ ۲۷ تا ۳۱، شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید جلد ۳ صفحہ ۲۵۸، احتجاج طبرسی جلد ۱ صفحہ ۱۱۸

طرح ہارونؑ موسیٰؑ کے وزیر یعنی موسیٰ کے مددگار تھے۔

دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواستیں ربّ اشرح لی صدری و یسّرلی امری واحلل عقدة من لسانی یفقہوا قولی واجعل لی وزیراًمن اھلی ھارون اخی (۱) جو کچھ پیغمبرؑ کو پیش آیا ہے اس پر سو فیصدی منطبق ہوتی ہیں۔ الم نشرح لك صدركO و وضعنا عنك وزركO الّذی انقض ظہركO ورفعنا لك ذكركO فانّ مع العسر یسراًO انّ مع العسر یسراًO فاذا فرغت فانصبO و الی ربك فارغبO (۲) اگر ہم انصب کے معنی مادہ "نَصَبَ" سے نہ لیں بلکہ مادہ "نَصِبَ" سے لیں یعنی مطلب یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کو خلافت پر نصب (بٹھادے) تو پھر یہ بات آیات قرآنی پر سو فیصدی مطابق ہو جاتی ہے۔

اس سب سے ہم کیا نتیجہ نکالیں؟ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآن کی منطق میں تبلیغ کا کام لوگوں کی ہدایت اور تربیت کا کام بہت دشوار کام ہے۔ جبکہ ہمارے معاشرے میں اتنا حقیر اور سبک سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جو دوسرے اہل علم و فضل ہیں، جنہیں کچھ علم اور معلومات حاصل ہے انہیں منبر پر جا کر تقریر کرنے سے شرم آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص عالم ہے۔ اس کا یہ منصب اور مقام نہیں ہے کہ وہ تقریر اور تبلیغ کرے۔ قصور کس کا ہے؟ معاشرہ کا قصور ہے۔ معاشرہ نے تقریر کو اتنا گرا دیا ہے ہر عالم کو اس سے شرم آتی ہے۔ وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے کہ تبلیغ کا کام اپنے ذمے لے۔ اس وقت الحمدللہ! ہمارے معاشرہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دو خوبیاں رکھتے ہیں امام جماعت بھی ہیں اور خطیب بھی۔ (جیسے جناب ڈاکٹر مفتح) لیکن ہمارے معاشرہ میں پیش نماز کا مقام مبلغ کے مقام سے زیادہ اور بلند

۱۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۲۵ تا ۳۰

۲۔ سورۂ الانشراح آیت ۱ تا ۸

ہے۔ پیش نمازی کوئی ہنر نہیں ہے، کھڑا ہو جانا اور دوسروں کا اس کی پیروی کرنا یہ بھی کوئی ہنر نہیں ہے۔ چونکہ میں نے یہ دونوں کام کئے ہیں اس لئے میں کہتا ہوں۔ میں محراب میں کھڑا ہوا ہوں۔ میں نے پیش نمازی کی ہے۔ میں نے منبر پر جا کر تقریر کی ہے۔ میں نے تبلیغ کی ہے۔ میں نے ہمیشہ دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ میں جب محراب میں ہوتا ہوں لوگوں کی نظر میں اس سے زیادہ محترم ہوتا ہوں جب میں منبر پر تقریر کرتا ہوں۔ خدا جانتا ہے کہ یہ حقیقت ہے۔

رمضان کے مہینے میں ایک مسجد میں تقریر کرتا تھا اور دوسرے وقت پیش نمازی کرتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ جس وقت میں نماز پڑھاتا تھا لوگوں کی نظر میں پہلے وقت کے مقابلے میں زیادہ بڑا اور محترم ہوتا تھا۔ اس وجہ سے میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ ایک بے ہنر کو ہنر مند پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہو؟ (۱) ہم (عوام الناس) خود ہی ہیں جو اس عظیم اور بلند مقام کو نیچے گراتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ خود ہی مبلغ تھے، واعظ تھے، تقریر کرتے تھے۔ شروع شروع میں منبر نہیں تھا ایک کھمبا تھا جس سے رسول اکرمؐ کھڑے کھڑے ٹیک لگا لیا کرتے تھے اور لوگوں کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ بعد میں آپ نے حکم دیا تو ایک منبر بنایا گیا اور اس کے بعد جاتے اور منبر پر بیٹھ جاتے تھے (البتہ آج کل کے منبر پیغمبرؐ کے منبر جیسے نہیں ہیں)۔ نہج البلاغہ کا بیشتر حصہ حضرت علی علیہ السلام کے خطبات ہیں جو منبر سے دئے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام کی کتاب نہج البلاغہ کے تین حصے ہیں۔ تقریریں، خطوط اور مختصر جملے۔

آپ نے مختصر جملے مختلف موقعوں پر کہے ہیں۔ نہج البلاغہ کی ایک تہائی ضخامت خطوط کے مجموعے اور مختصر جملوں پر مشتمل ہے۔ نہج البلاغہ کے دو تہائی حصے میں مولا کی تقریریں ہیں، پھر بھی یہ مولا کی تمام تقریریں نہیں ہیں بلکہ سید رضی

۱۔ اگرچہ ہمارے ماحول میں اس کے برعکس ہے

کے قول کے مطابق تقریروں کے اقتباسات ہیں، یعنی منتخب کئے ہوئے حصے ہیں۔ ورنہ تقریریں تو ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ مسعودی جو سید رضی سے سو سال پہلے گزرا ہے اپنی بہت معتبر کتاب مروج الذہب میں، جو تاریخ اسلام کا نہایت معتبر ماخذ ہے، لکھا ہے کہ اس وقت حضرت علی علیہ السلام کی تقریباً چار سو اسی تقریریں لوگوں کے پاس موجود ہیں(۱) جبکہ نہج البلاغہ میں صرف دو سو تقریریں ہیں۔ پھر یہ تعداد بھی سید رضی کی منتخب کی ہوئی ہے۔ جس کے بہت سے حصے بھی انہوں نے چھوڑ دئے ہیں۔ اس لحاظ سے حضرت علیؑ کی تقریریں غالباً موجودہ نہج البلاغہ کے خطبات سے چار گنا ہونگی۔ نہج البلاغہ کا زیادہ حصہ کیا ہے؟ وہی علیؑ کے خطبات۔ حضرت علی علیہ السلام نے جو خطبات دیئے ہیں ان کو لکھ لیا گیا ہے اور وہ ہمارے لئے باقی رہ گئی ہیں۔ یہ بات اسلام کی تبلیغ کے مقام کی بزرگی اور اہمیت کو واضح کرتی ہے جبکہ ہمارے یہاں اسے کمتر اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا پیغام ہی نہیں پہنچا۔ ہم نے خود ہی اپنی بات بگاڑ لی ہے۔ جب معاشرہ کی یہ حالت اور یہ صورت ہو گئی کہ ہر عالم اپنی حیثیت اور مقام کو بچانے کے لئے (اب یہ عذر صحیح ہے یا نہیں مجھے اس سے غرض نہیں آخر معاشرتی بہاؤ اپنا کام کرتا ہے) خطابت کرنے، لوگوں کو تبلیغ اور ہدایت کرنے اور تربیت دینے سے گریز کرے تو ہدایت اور ارشاد کا کام ایسے لوگوں کے ہاتھ پڑ جاتا ہے جن میں کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اور جن کا کام جودی اور جوہری سے شروع ہوا ہے۔ کیا اس وقت کا انتظار کیا جا سکتا ہے جب اسلام کا پیام، خدا کا پیام، پیغمبرؐ کا پیام، علیؑ کا پیام، یہ عظیم اور وسیع مکتب جس میں دنیا اور آخرت کے مختلف پہلو موجود ہیں صحیح سلامت عوام تک پہنچ جائے؟ کتنا غلط انتظار ہوگا!

۱۔ مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۴۱۹

حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا بلند مقام آپ کی تبلیغ سے ابھرا ہے۔ آپ دیکھئے کہ امام حسین علیہ السلام کے اہل بیتؑ نے کتنی ماہرانہ تبلیغ کی ہے۔ دو تین نکتے ایسے ہیں کہ جب تک انسان ان پر دھیان نہ دے اور غور نہ کرے اس وقت تک اہلبیتؑ کی تبلیغ بلکہ در حقیقت ان کے تبلیغی سفر کی قدر و قیمت کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابا عبداللہؑ کا کام ختم ہو چکا تھا یعنی اس سفر کا انتظام دشمن کے ہاتھوں ہوا تھا۔ یہ سفر دشمن ہی نے کرایا تھا۔ دشمن اپنے خیال خام میں حضرت زینبؑ کو ایک اسیر بنا کر بھیجتا ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک مبلغ بھیج رہا ہے۔

ایک نکتہ عرض کرتا ہوں، ہمیشہ جامعہء بشری میں جابرانہ حکومت ہو یا طاقتور ہو، بالآخر ایک فکری، ایک فلسفی، ایک عقیدتی بنیاد کی نیازمند ہوتی ہے۔ یعنی اس کے لئے ایک ایسا اعتقادی نظام ضروری ہوتا ہے جس پر اس کے مالی اور سیاسی نظام اور اس کے موجودہ ڈھانچے کا دارومدار ہو۔ انسان آخر کار فکر کا محتاج ہوتا ہے۔ جب کوئی صحیح اور صحت مند معاشرہ اپنے جگہ حاکم کے خراب اور ناقص نظام پر غور کرتا ہے تو اس نظام کا باقی رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر موجودہ نظام اپنے آپ کو ایک ایسے نظریاتی اور اعتقادی نظام کا محتاج پاتا ہے جو اس کا تکیہ اور سہارا ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ نظام ایک فلسفے کی صورت میں ہو۔ اس میں ایک نظریہ ہو یا وہ مذہبی شکل میں ہو۔ یزید کی حکومت کسی فکری یا اعتقادی ضمانت اور پشت پناہی کے بغیر یا کم سے کم عوام کے موجودہ اعتقادات کی توجیہ کئے بغیر اپنا کام نہیں چلا سکتی تھی۔

یہ نہ سمجھئے کہ وہ لوگ اتنے احمق تھے جو یہ سوچ بیٹھے کہ بات ختم ہو گئی بلکہ وہ ہر وقت عوام الناس کو بیوقوف بناتے اور انہیں بہت سے نئے افکار کی تلقین کریں تاکہ لوگوں کے دل کو یہ اطمینان ہو جائے کہ موجودہ نظام ہی بہترین نظام ہے اس

لئے یہی قائم رہنا چاہئے۔

البتہ مذہبی لوگوں کی جماعت میں اس اسکیم کا رنگ اور صورت مذہبی ہونا چاہئے۔ شریح قاضی سے کس لئے مدد چاہتے تھے؟ لوگوں کے فکر کی تسکین کی خاطر تاکہ لوگوں کی فکر بدل دیں اور بدل دی۔ کربلا میں یہ پروگرام عاشور کے عصر کے وقت تک کامیاب رہا۔ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ فرزند پیغمبر کے قتل کے لئے کربلا میں تیس ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے "و کلّ یتقرّبون الی اللّٰہ عزوجل بدمہ"(۱) اور وہ سب کے سب قربۃً الی اللّٰہ کی نیت سے آئے تھے۔ حسین ابن علیؑ کو تلواریں مارتے تھے تاکہ بہشت میں جائیں۔ البتہ فرزدق کی تشریح کے مطابق تھیلیاں رشوت سے بھر دی گئی تھیں لیکن عوام کو ان باتوں کی خبر ہی نہیں تھی۔ اس لئے وہ عوام کے فکر کو گمراہ کرتے تھے۔ ابن زیاد کے پروگراموں کا یہ خاص بنیادی تصور تھا۔ شراب پینے سے اور اس وجہ سے کہ اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا لگ رہا تھا یزید کی لگام چھوٹ رہی تھی اور وہ اپنا باطن آشکار کر رہا تھا۔ (اس نے کہا۔ نشہ میں اور سچ)۔ نشے کی حالت میں اس نے سچ کہہ دیا کہ میں کوئی بات قبول نہیں کرتا۔ مستی اس کو بدنام کر رہی تھی ورنہ وہ خود بھی اسی پروگرام پر عمل کر رہا تھا اور اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ابن زیاد نے حضرت لبا عبداللہؑ کی شہادت کے بعد جب لوگوں کو کوفہ کی بڑی مسجد مین جمع کیا تاکہ اس واقعے کی انہیں اطلاع دے۔ اپنا مذہبی اور مقدس حلیہ بنا کر کہنے لگا: "الحمد للّٰہ الّذی اظہر الحقّ و اھلہ و نصر امیر المومنین و اشیاعہ و قتل الکذّاب بن الکذاب" (۲) ہم خدا کا شکر کرتے ہیں جس نے

۱۔ بحار الانوار جلد ۴۴ صفحہ ۲۹۸

۲۔ بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۱۱۹، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۵۲، مقتل الحسین مقرم صفحہ ۴۲۶، ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۴۴، اکامل ف التاریخ جلد ۴ صفحہ ۸۲، اللہوف صفحہ ۶۹، کشف الغمہ جلد ۳ صفحہ ۶۷

حقیقت کو فتحیاب کیا اور ایک جھوٹے کا بیٹا جھوٹا کو جو لوگوں کو فریب دینا چاہتا تھا مار ڈالا گیا۔ وہ لوگوں سے "الہی شکر" کہلوانا چاہتا تھا اور غالبًا سینکڑوں لوگوں نے "الہی شکر" کہا بھی۔ اگر ایک روشن ضمیر اندھا وہاں موجود نہ ہوتا تو وہ مجمع کو اچھی طرح دھوکا دے چکا تھا۔

عبد اللہ ابن عفیف نامی ایک شخص، خدا اس پر رحمت نازل کرے، (بعض اوقات کچھ لوگ جان کی بازی لگا جاتے ہیں ایسے حالات میں کہ ایک دنیا ان کی قیمت ٹھہرتی ہے۔) دونوں آنکھوں سے اندھا تھا ایک آنکھ جنگ جمل میں حضرت علی علیہ السلام کی رفاقت میں اور دوسری جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے لڑتے ہوئے کھو چکا تھا، چونکہ اندھا تھا اس لئے اس سے کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا اور مجبورًا جہاد میں بھی شرکت نہیں کر سکتا تھا، غالبًا عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ اس دن بھی کوفہ کی مسجد میں موجود تھا جیسے ہی اس شخص نے یہ جملہ سنا اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ تو جھوٹا ہے اور تیرا باپ جھوٹا ہے اور پھر وہ بولنے اور تقریر کرنے لگا۔ لوگ دوڑ پڑے، اسے پکڑ لیا اور بعد میں قتل کر دیا لیکن بالآخر اس نے پردہ چاک کر دیا اور یہ بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔

ابن زیاد سچ مچ دونوں معنی میں حرام زادہ ہے، یعنی ایک ناکار شخص اور شیطان۔ غالبًا ان معاشروں میں جہاں لوگ مذہبی خیالات رکھتے ہیں، جب ظالم حکومتیں اپنی حرکتوں اور مظالم کی توجیہ کرنا چاہتی ہیں تو وہ جبر اختیار کرتی ہیں یعنی ہر بات کا ذمہ دار خدا کو بنا دیتی ہیں۔ خدا کا کرنا تھا جو ایسا ظلم ہوا۔ اگر اس کی مصلحت نہ ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔ خدا نے خود نہیں چاہا کہ ایسا ہو، یہ کہ جو کچھ ہے وہی ہے جو ہونا چاہئے۔ اور جو نہیں ہے وہ وہی ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔ یہ ایک استدلال ہے، جبر پسندی کی منطق ہے۔ ابن زیاد کی منطق ہے۔ وہ جس وقت حضرت زینب سلام اللہ

علیہا کے سامنے آتا ہے تو فوراً خدا کی طرف مسئلہ کو مربوط کرتا ہے کہ "الحمد للّٰہ الّذی فضحکم و قتلکم واکذب احدوثتکم" یہ جملے بہت معنی خیز ہیں۔ خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں شرمندہ کیا، قتل کیا اور تمہاری باتوں کو جھٹلایا۔ یہی خدا نے چاہا تھا۔ تم نے مسلمانوں کے لئے عجب فتنہ کھڑا کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کیا۔ خدا کا شکر ہے جس نے تم کو رسوا کیا۔اس کی منطق میں رسوائی کیا ہے ؟ اس کی منطق میں جو شخص بظاہر لڑائی میں شکست کھا گیا وہ رسوا ہو گیا اور اس کا قصہ تمام ہو گیا۔ اگر وہ حق پر ہوتا تو لڑائی میں جیت جاتا۔ "واکذب احدو ثتکم" یعنی تمہارا مغلوب ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ تم جھوٹے تھے۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا نے کیا کہا؟ آپ نے فرمایا: "الحمد للّٰہ الّذی اکرمنا بنبیه" خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں یوں عزت بخشی کہ ہم ہی میں سے اپنا پیغمبر مبعوث کیا اور ہم پیغمبر کا خاندان ہیں۔ "انّما یفتضح الفاسق و یکذب الفاجر وھو غیرنا والحمد للّٰہ" جو لڑائی میں ہار جاتا ہے وہ رسوا نہیں ہوتا۔ رسوائی کا معیار دوسرا ہی ہے۔ رسوائی کا معیار حقیقت کی تلاش اور حقیقت کی طلب ہے۔ جو خدا کی راہ میں شہید ہوتا ہے وہ رسوا نہیں ہوتا۔ رسوا وہ ہوتا ہے جو ظلم و ستم کرتا ہے۔ رسوا وہ شخص ہوتا ہے جو حق سے پھر جاتا ہے۔ رسوا ہونے نہ ہونے کی بنیاد یہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جو مار ڈالا گیا وہ جھوٹا ہے۔ سچے جھوٹے ہونے کا معیار خود انسان ہوتا ہے۔ انسان کا نصب العین ہوتا ہے۔ انسان کا قول و فعل ہوتا ہے۔ میرے حسین مار ڈالے گئے پھر بھی سچے کہلائے، زندہ رہتے تو بھی سچے کہلاتے۔ تو قتل ہو جائے تو بھی جھوٹا ہے زندہ رہ جائے تب بھی جھوٹا رہے گا۔ پھر اس پر سخت حملہ کرتی ہیں۔ آپ نے ایک ایسا جملہ فرمایا کہ ابن زیاد آگ بگولہ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: "یابن مرجانه!" اے مرجانہ کے بیٹے! مرجانہ ابن زیاد کی ماں تھی۔ وہ نہیں

چاہتا تھا کہ اس کی ماں کا نام لیا جائے کیونکہ اس کی ماں آوارہ اور بد نام عورت تھی۔ اے مرجانہ کے بیٹے! اے اس بد نام عورت کے بیٹے! رسوائی مرجانہ کے بیٹے کی ہونا چاہئے۔ اب ابن زیاد مجبور ہو گیا۔ اور غصے میں ایسا بھر گیا کہ بولا جلاد کو بلا کر کہو کہ اس عورت کی گردن اڑا دے۔ ایک شخص جو خارجی تھا اور مولا امیر المومنینؑ کا دشمن تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اچھا آدمی بھی نہیں تھا۔ وہ ابن زیاد کی اس مجلس میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ جس وقت ابن زیاد نے کہا کہ جلاد کو بلاؤ اس میں عربیت یعنی عرب کی غیرت جاگ اٹھی۔ کھڑا ہو گیا اور بولا امیر! تجھے کچھ ہوش ہے کہ تو ایک ایسی عورت سے بات کر رہا ہے جس نے کتنے ہی داغ اٹھائے اور صدمے جھیلے ہیں۔اس عورت سے بات کر رہا ہے جس کے بھائی مارے گئے ہیں جو اپنے عزیزوں اور پیاروں کو کھو بیٹھی ہیں۔

"و عرض علیه علیّ بن الحسین" یعنی اس کے سامنے امام زین العابدینؑ کو پیش کیا گیا۔ وہ فرعون کی طرح چیخا: "من انت؟" (پھر جبر پسندی کی منطق دیکھئے) تو کون ہے ؟ آپ نے جواب دیا: "انا علیّ بن الحسین" میں علی بن حسین ہوں وہ بولا: "الیس قد قتل اللّٰہ علیّ بن الحسین؟" کیا علی ابن حسین کو خدا نے کربلا میں مار نہیں ڈالا ؟ (اب پھر ہر بات خدا پر ڈالی جا رہی ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ لوگ حق پر ہیں)۔ آپؑ نے فرمایا: اس میں شک نہیں کہ ہر ایک کی روح کو قبض کرنا خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کو لوگوں نے مار ڈالا۔ وہ پھر بولا: علی و علی کا کیا مطلب ہے ؟ کیا تمہارے باپ نے اپنے سب لڑکوں کا نام علی ہی رکھا تھا؟ تمہارا نام بھی علی رکھا۔ کوئی دوسرا نام نہیں تھا جو رکھتے ؟ آپ نے جواب دیا میرے والد کو اپنے والد سے بہت محبت تھی انہیں یہ اچھا لگا کہ اپنے بیٹوں کا نام اپنے والد کے نام پر رکھیں۔ یعنی یہ تو ہے جو اپنے باپ زیاد سے شرماتا ہو گا۔

علیہا کے سامنے آتا ہے تو فوراً خدا کی طرف مسئلہ کو مربوط کرتا ہے کہ "الحمد للّٰہ الّذی فضحکم و قتلکم واکذب احدوثتکم" یہ جملے بہت معنی خیز ہیں۔ خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں شرمندہ کیا، قتل کیا اور تمہاری باتوں کو جھٹلایا۔ یہی خدا نے چاہا تھا۔ تم نے مسلمانوں کے لئے عجب فتنہ کھڑا کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کیا۔ خدا کا شکر ہے جس نے تم کو رسوا کیا۔اس کی منطق میں رسوائی کیا ہے ؟ اس کی منطق میں جو شخص بظاہر لڑائی میں شکست کھا گیا وہ رسوا ہو گیا اور اس کا قصہ تمام ہو گیا۔ اگر وہ حق پر ہوتا تو لڑائی میں جیت جاتا۔ "واکذب احدو ثتکم" یعنی تمہارا مغلوب ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ تم جھوٹے تھے۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا نے کیا کہا؟ آپ نے فرمایا: "الحمد للّٰہ الّذی اکرمنا بنبیه" خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں یوں عزت بخشی کہ ہم ہی میں سے اپنا پیغمبر مبعوث کیا اور ہم پیغمبر کا خاندان ہیں۔ "انّما یفتضح الفاسق و یکذب الفاجر وھو غیرنا والحمد للّٰہ" جو لڑائی میں ہار جاتا ہے وہ رسوا نہیں ہوتا۔ رسوائی کا معیار دوسرا ہی ہے۔ رسوائی کا معیار حقیقت کی تلاش اور حقیقت کی طلب ہے۔ جو خدا کی راہ میں شہید ہوتا ہے وہ رسوا نہیں ہوتا۔ رسوا وہ ہوتا ہے جو ظلم و ستم کرتا ہے۔ رسوا وہ شخص ہوتا ہے جو حق سے پھر جاتا ہے۔ رسوا ہونے نہ ہونے کی بنیاد یہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جو مار ڈالا گیا وہ جھوٹا ہے۔ سچے جھوٹے ہونے کا معیار خود انسان ہوتا ہے۔ انسان کا نصب العین ہوتا ہے۔ انسان کا قول و فعل ہوتا ہے۔ میرے حسین مار ڈالے گئے پھر بھی سچے کہلائے، زندہ رہتے تو بھی سچے کہلاتے۔ تو قتل ہو جائے تو بھی جھوٹا ہے زندہ رہ جائے تب بھی جھوٹا رہے گا۔ پھر اس پر سخت حملہ کرتی ہیں۔ آپ نے ایک ایسا جملہ فرمایا کہ ابن زیاد آگ بگولہ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: "یابن مرجانه!" اے مرجانہ کے بیٹے! مرجانہ ابن زیاد کی ماں تھی۔ وہ نہیں

چاہتا تھا کہ اس کی ماں کا نام لیا جائے کیونکہ اس کی ماں آوارہ اور بد نام عورت تھی۔ اے مرجانہ کے بیٹے! اے اس بد نام عورت کے بیٹے! رسوائی مرجانہ کے بیٹے کی ہونا چاہئے۔ اب ابن زیاد مجبور ہو گیا۔ اور غصے میں ایسا بھر گیا کہ بولا جلاد کو بلا کر کہو کہ اس عورت کی گردن اڑا دے۔ ایک شخص جو خارجی تھا اور مولا امیر المومنینؑ کا دشمن تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اچھا آدمی بھی نہیں تھا۔ وہ ابن زیاد کی اس مجلس میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ جس وقت ابن زیاد نے کہا کہ جلاد کو بلاؤ اس میں عربیت یعنی عرب کی غیرت جاگ اٹھی۔ کھڑا ہو گیا اور بولا امیر! تجھے کچھ ہوش ہے کہ تو ایک ایسی عورت سے بات کر رہا ہے جس نے کتنے ہی داغ اٹھائے اور صدمے جھیلے ہیں۔اس عورت سے بات کر رہا ہے جس کے بھائی مارے گئے ہیں جو اپنے عزیزوں اور پیاروں کو کھو بیٹھی ہیں۔

"و عرض علیه علیّ بن الحسین" یعنی اس کے سامنے امام زین العابدینؑ کو پیش کیا گیا۔ وہ فرعون کی طرح چیخا: "من انت؟" (پھر جبر پسندی کی منطق دیکھئے) تو کون ہے؟ آپ نے جواب دیا: "انا علیّ بن الحسین" میں علی بن حسین ہوں وہ بولا: "الیس قد قتل اللّٰہ علیّ بن الحسین؟" کیا علی ابن حسین کو خدا نے کربلا میں مار نہیں ڈالا؟ (اب پھر ہر بات خدا پر ڈالی جا رہی ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ لوگ حق پر ہیں)۔ آپ نے فرمایا: اس میں شک نہیں کہ ہر ایک کی روح کو قبض کرنا خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کو لوگوں نے مار ڈالا۔ وہ پھر بولا: علی و علی کا کیا مطلب ہے؟ کیا تمہارے باپ نے اپنے سب لڑکوں کا نام علی ہی رکھا تھا؟ تمہارا نام بھی علی رکھا۔ کوئی دوسرا نام نہیں تھا جو رکھتے؟ آپ نے جواب دیا میرے والد کو اپنے والد سے بہت محبت تھی انہیں یہ اچھا لگا کہ اپنے بیٹوں کا نام اپنے والد کے نام پر رکھیں۔ یعنی یہ تو ہے جو اپنے باپ زیاد سے شرماتا ہو گا۔

علیہا کے سامنے آتا ہے تو فوراً خدا کی طرف مسئلہ کو مربوط کرتا ہے کہ "الحمد للّٰہ الّذی فضحکم و قتلکم واکذب احدوثتکم" یہ جملے بہت معنی خیز ہیں۔ خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں شرمندہ کیا، قتل کیا اور تمہاری باتوں کو جھٹلایا۔ یہی خدا نے چاہا تھا۔ تم نے مسلمانوں کے لئے عجب فتنہ کھڑا کر دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کیا۔ خدا کا شکر ہے جس نے تم کو رسوا کیا۔ اس کی منطق میں رسوائی کیا ہے؟ اس کی منطق میں جو شخص بظاہر لڑائی میں شکست کھا گیا وہ رسوا ہو گیا اور اس کا قصہ تمام ہو گیا۔ اگر وہ حق پر ہوتا تو لڑائی میں جیت جاتا۔ "واکذب احدو ثتکم" یعنی تمہارا مغلوب ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ تم جھوٹے تھے۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا نے کیا کہا؟ آپ نے فرمایا: "الحمد للّٰہ الّذی اکرمنا بنبیہ" خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں یوں عزت بخشی کہ ہم ہی میں سے اپنا پیغمبر مبعوث کیا اور ہم پیغمبر کا خاندان ہیں۔ "انّما یفتضح الفاسق و یکذب الفاجر وھو غیرنا والحمد للّٰہ" جو لڑائی میں ہار جاتا ہے وہ رسوا نہیں ہوتا۔ رسوائی کا معیار دوسرا ہی ہے۔ رسوائی کا معیار حقیقت کی تلاش اور حقیقت کی طلب ہے۔ جو خدا کی راہ میں شہید ہوتا ہے وہ رسوا نہیں ہوتا۔ رسوا وہ ہوتا ہے جو ظلم و ستم کرتا ہے۔ رسوا وہ شخص ہوتا ہے جو حق سے پھر جاتا ہے۔ رسوا ہونے نہ ہونے کی بنیاد یہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جو مار ڈالا گیا وہ جھوٹا ہے۔ سچے جھوٹے ہونے کا معیار خود انسان ہوتا ہے۔ انسان کا نصب العین ہوتا ہے۔ انسان کا قول و فعل ہوتا ہے۔ میرے حسین مار ڈالے گئے پھر بھی سچے کہلائے، زندہ رہتے تو بھی سچے کہلاتے۔ تو قتل ہو جائے تو بھی جھوٹا ہے زندہ رہ جائے تب بھی جھوٹا رہے گا۔ پھر اس پر سخت حملہ کرتی ہیں۔ آپ نے ایک ایسا جملہ فرمایا کہ ابن زیاد آگ بگولہ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: "یابن مرجانہ!" اے مرجانہ کے بیٹے! مرجانہ ابن زیاد کی ماں تھی۔ وہ نہیں

چاہتا تھا کہ اس کی ماں کا نام لیا جائے کیونکہ اس کی ماں آوارہ اور بد نام عورت تھی۔ اے مرجانہ کے بیٹے! اے اس بد نام عورت کے بیٹے! رسوائی مرجانہ کے بیٹے کی ہونا چاہئے۔ اب ابن زیاد مجبور ہو گیا۔ اور غصے میں ایسا بھر گیا کہ بولا جلاد کو بلا کر کہو کہ اس عورت کی گردن اڑا دے۔ ایک شخص جو خارجی تھا اور مولا امیر المومنینؑ کا دشمن تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اچھا آدمی بھی نہیں تھا۔ وہ ابن زیاد کی اس مجلس میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ جس وقت ابن زیاد نے کہا کہ جلاد کو بلاؤ اس میں عربیت یعنی عرب کی غیرت جاگ اٹھی۔ کھڑا ہو گیا اور بولا امیر! تجھے کچھ ہوش ہے کہ تو ایک ایسی عورت سے بات کر رہا ہے جس نے کتنے ہی داغ اٹھائے اور صدمے جھیلے ہیں۔ اس عورت سے بات کر رہا ہے جس کے بھائی مارے گئے ہیں جو اپنے عزیزوں اور پیاروں کو کھو بیٹھی ہیں۔

"و عرض علیه علیّ بن الحسین" یعنی اس کے سامنے امام زین العابدینؑ کو پیش کیا گیا۔ وہ فرعون کی طرح چیخا: "من انت؟" (پھر جبر پسندی کی منطق دیکھئے) تو کون ہے؟ آپ نے جواب دیا: "انا علیّ بن الحسین" میں علی بن حسین ہوں وہ بولا: "الیس قد قتل اللّٰہ علیّ بن الحسین؟" کیا علی ابن حسین کو خدا نے کربلا میں مار نہیں ڈالا؟ (اب پھر ہر بات خدا پر ڈالی جا رہی ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ لوگ حق پر ہیں)۔ آپؑ نے فرمایا: اس میں شک نہیں کہ ہر ایک کی روح کو قبض کرنا خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کو لوگوں نے مار ڈالا۔ وہ پھر بولا: علی و علی کا کیا مطلب ہے؟ کیا تمہارے باپ نے اپنے سب لڑکوں کا نام علی ہی رکھا تھا؟ تمہارا نام بھی علی رکھا۔ کوئی دوسرا نام نہیں تھا جو رکھتے؟ آپ نے جواب دیا میرے والد کو اپنے والد سے بہت محبت تھی انہیں یہ اچھا لگا کہ اپنے بیٹوں کا نام اپنے والد کے نام پر رکھیں۔ یعنی یہ تو ہے جو اپنے باپ زیاد سے شرماتا ہوگا۔

ابن زیاد یہ امید کرتا تھا کہ امام زین العابدین علیہ السلام بالکل نہیں بولیں گے۔ اس کے خیال سے کسی قیدی کو کچھ نہیں بولنا چاہئے تھا۔ جس وقت وہ آپ سے کہتا ہے کہ یہ خدا کا کام تھا تو اس کے نزدیک آپ کو کہنا چاہئے تھا ہاں، خدا کا کام تھا، یعنی مقدر ہو چکا تھا، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ایسا نہ ہو وغیرہ وغیرہ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ امام زین العابدین علیہ السلام، ایک قیدی اس طرح باتیں کرتا ہے تو کہنے لگا: "و لك جر أة لجوابی"(۱) تم میں اب بھی جان باقی ہے، تم اب بھی سانس لیتے ہو، تم اب بھی میرے مقابلے میں گفتگو کرتے ہو۔ جلاد! آ اور اس کی گردن مار دے۔ لکھا ہے کہ جب اس نے جلاد سے یہ کہا کہ اس کی گردن مار دے اس وقت حضرت زینب سلام اللہ علیہا اپنی جگہ کھڑی ہو گئیں اور امام زین العابدین علیہ السلام کو لپٹا کر بولیں: خدا کی قسم تم اس کو اس وقت تک نہیں مار سکتے جب تک زینب کی گردن نہ مار دو۔ لکھا ہے کہ ابن زیاد کچھ دیر تک ان دونوں کو دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا: خدا کی قسم میں یہ دیکھتا ہوں کہ اگر میں اس وقت اس جواں کو مارنا چاہوں تو پہلے مجھے اس عورت کو مارنا پڑے گا چنانچہ اس نے در گزر کیا۔

اہلبیتؑ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے جبر پسندی کی اس منطق کے خلاف کہ دنیا میں جبر ہے اور جبر ہی انصاف ہے جہاد کیا یعنی اس دنیا میں انسان کا ایسا کوئی فریضہ نہیں ہے کہ وہ تبدیلی یا انقلاب لائے۔ جو کچھ ہے وہی ہے جو ہونا چاہئے۔ اور جو نہیں ہے وہی ہے جو نہیں ہونا چاہئے اور یوں انسان کا کوئی کردار نہیں ہے۔

ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم

و صلی اللّٰه علیٰ محمد وآله الطاهرین

۱۔ ارشاد شیخ مفید صفحہ ۲۴۴، فی رحاب ائمہ اہل البیت جلد ۳ صفحہ ۱۴۰، ۱۴۶، بحار الانوار جلد ۴۵ صفحہ ۱۵۵ سے ۱۱۷ تک، الکامل فی التاریخ جلد ۴ صفحہ ۸۱، ۸۲، اللہوف صفحہ ۶۷، ۶۸، اعلام الوری صفحہ ۲۴۷، مقتل الحسین خوارزمی جلد ۲ صفحہ ۴۲، کشف الغمہ جلد ۲ صفحہ ۶۶

حصہ دوم

۴ حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر (۱)

پہلی مجلس

"حسینی تحریک کے اصلی عناصر"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ انّ اللہ اشتری من المئومنین انفسھم و اموالھم بانّ لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون وعدا علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل والقرآن ط و من اوفی بعھدہ من اللہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ ذالک ھو الفوز العظیم O التّائبون العٰبدون الحامدون السآئحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر و الحٰفظون لحدود اللہ و بشّر المئومنین۔ (۱)

ہماری گفتگو تحریک حسینی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنصر کے

۱۔ یہ تقریر ۲۳، ۱۲، ۱۳۴۸ مطابق ۶، محرم ۱۳۹۰ھ کو کی گئی) ۱۔ سورۂ توبہ آیات ۱۱۱، ۱۱۲

بارے میں ہے۔ اور گفتگو اس بارے میں ہے کہ کیا حسینی تحریک میں اس عنصر کا دخل رہا ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں جن باتوں نے امام حسینؑ کو اس سفر اور تحریک پر مجبور کیا، کیا ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی شامل تھا یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ اس تحریک میں اس عنصر کا دخل کس حد تک ہے؟ ہم سب جانتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی عزاداری اور یاد گار کا فلسفہ، جس کی آئمہ اطہارؑ کی وصیت کے مطابق سال بہ سال تجدید ہونا چاہئے، درس کی خاطر ہے اور اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک بہت بڑا تاریخی درس ہے۔ اگر انسان کسی درس سے کچھ استفادہ حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ پہلے اسے سمجھے اور اس کو تحلیل کرے۔ آج رات کو میں ان تمام اصلی عناصر کے بارے میں جو حسینی تحریک پر اثرانداز رہے ہیں مختصر طور پر بحث کروں گا۔ اس کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں جو اس تحریک کا اصلی عنصر ہے زیادہ تفصیل اور تشریح کے ساتھ بحث کروں گا۔

حسینی تحریک میں بہت سے عوامل کا دخل رہا ہے اور انہی متعدد عوامل کے دخل کے سبب جو حادثہ باوجودیکہ تاریخی اور سطحی واقعات کے لحاظ سے زیادہ طویل اور مفصل نہیں ہے، تفسیر کے لحاظ سے اور اس بڑے تاریخی واقعہ کی ماہیت کو درک کرنے کی نظر سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس حادثے کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں اور کبھی کبھی اس عظیم حادثہ سے غلط نتائج بھی نکالے گئے ہیں۔ اس داستان کی پیچیدگی کا ایک سبب یہ عناصر ہیں جو اس حادثہ کے وجود میں آنے پر اثر انداز ہوئے۔ ہمیں اس حادثہ میں بہت سے مسائل ملتے ہیں: ایک جگہ امام حسین علیہ السلام سے بیعت طلب کرنا اور آپ کا بیعت سے انکار کرنا ہے۔ دوسری جگہ اہل کوفہ کا امامؑ کو دعوت دینا اور امامؑ کا ان کی دعوت قبول کرنا ہے۔ ایک اور مقام پر امامؑ بیعت مانگنے اور بیعت سے انکار کرنے کے مسئلے پر بالکل توجہ دیئے بغیر اور اس مسئلے پر بھی بنیادی توجہ

دیئے بغیر کہ کوفہ والوں نے ان کی بیعت کرنا چاہی اور ان کو بلایا ہے یا نہیں بلایا، اس وقت کے حالات اور حکومت وقت پر تنقید کرتے ہیں، خرابیاں پیدا ہونے اور پھیلنے کا ذکر کرتے ہیں، اسلام کی حقیقت بدل جانے کا ذکر کرتے ہیں، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دینے کا ذکر کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ ان حالات کے پیش نظر خاموش نہ بیٹھے۔ اس مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ نہ بیعت کی بات کرتے ہیں اور نہ بلاوے کی۔ نہ اس بیعت کی بات کرتے ہیں جو یزید ان سے چاہتا ہے اور نہ اس دعوت کا ذکر کرتے ہیں جو اہل کوفہ نے انہیں دی ہے۔ معاملہ کیا ہے؟ کیا یہ مسئلہ بیعت کا مسئلہ تھا؟ کیا یہ مسئلہ دعوت کا مسئلہ تھا؟ کیا یہ مسئلہ اعتراض، نکتہ چینی یا برائیاں پھیلنے کا مسئلہ تھا؟ ان میں سے کونسی بات تھی؟ ہم اس مسئلہ کی کس طرح توجیہ کریں؟ اس کے علاوہ امامؑ کے زمانے یعنی یزید کے دور حکومت اور پہلے کے ادوار میں کون سا واضح فرق تھا؟ خاص طور پر اس دور میں اور معاویہ کے دور میں کیا فرق تھا کہ جب امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کرلی تھی اور امام حسین علیہ السلام کے پاس یزید سے صلح کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور نہ ایسی صلح کو جائز شمار کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حادثے میں ان تمام اسباب کا دخل اور اثر رہا ہے یعنی یہ سب عوامل موجود تھے اور امامؑ نے ان تمام عوامل کے مقابل اپنے رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ امامؑ کے کچھ رد عمل اور عمل کی بنیاد یزید کی بیعت سے انکار پر ہے، امام کے کچھ ارادے اور فیصلے کوفہ والوں کے بلاوے کی بنیاد پر قائم ہیں اور کچھ ان برائیوں اور خرابیوں کے خلاف جد و جہد کرنے پر مبنی ہیں جو اس وقت ہر صورت میں پائی جاتی تھیں۔

حادثہ کربلا میں جو لبا عبداللہ علیہ السلام کی ذات گرامی کے رد عمل اور

ارادوں اور فیصلوں کا مجموعہ ہے ان تمام عناصر کا دخل رہا ہے۔ ہم پہلے بیعت کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں کہ اس عمل کا کتنا دخل تھا، امام نے بیعت طلبی کے سوال پر کیا ردعمل ظاہر کیا اور صرف بیعت طلبی امامؑ پر کون سا فریضہ عائد کرتی تھی؟

ہم سب جانتے ہیں کہ معاویہ ابن ابو سفیان حکومت اور خلافت پر کس طرح سے پہنچا۔ جب امام حسن علیہ السلام کے اصحاب نے کافی کمزوری دکھائی تو امام حسن علیہ السلام معاویہ سے ایک وقتی معاہدہ کرلیتے ہیں لیکن یہ معاہدہ معاویہ کی خلافت اور حکومت کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ اس بنیاد پر تھا کہ معاویہ اگر حکومت کرنا چاہے تو ایک محدود مدت تک حکومت کرے اس کے بعد مسلمان اپنے اختیار سے جس کسی کو مناسب اور موزوں سمجھیں خلافت کے لئے منتخب کرلیں۔ دوسرے الفاظ میں اس شخص کی طرف رجوع کرلیں جو پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے مقرر اور متعین ہوا ہے۔ معاویہ کے دور تک حکومت اور خلافت کا مسئلہ موروثی نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایسا مسئلہ تھا جس کے متعلق صرف دو قسم کے خیالات پائے جاتے تھے۔ ایک خیال یہ تھا کہ صرف وہی شخص خلافت کا سزاوار تھا جسے پیغمبرؐ نے خدا کے حکم سے منصوب کر دیا اور دوسرا طرز فکر یہ تھا کہ لوگوں کو خود اپنا خلیفہ چننے کا حق حاصل ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ پچھلا خلیفہ اپنے بعد کے خلیفہ کا تعین لوگوں پر کر دے، اپنا جانشین مقرر کرے اور وہ پھر اپنا جانشین مقرر کرے۔ یعنی پھر خلافت کا مسئلہ نہ پیغمبرؐ کے حکم کے دائرے میں رہے اور نہ مسلمانوں ہی کو اس کے انتخاب میں کوئی دخل باقی رہے۔ امام حسن علیہ السلام نے صلح نامے میں ایک شرط (جس پر معاویہ نے دوسری شرائط کی طرح صریحاً عمل نہیں کیا بلکہ امام حسن علیہ السلام کو خاص کر زہر دلوا کر شہید کر دیا تاکہ نہ مدعی رہے نہ دعویٰ) یہ رکھوائی تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کوئی حق نہ ہوگا مسلمانوں کے بارے میں۔ خود تو دنیائے اسلام

کے لئے جتنی مصیبت ہے وہ ہے لیکن بعد میں اختیار مسلمانوں کو ہوگا بہر حال معاویہ کو اختیار نہیں ہوگا، لیکن معاویہ کا پختہ ارادہ پہلے ہی دن سے یہ تھا کہ خلافت کو اپنے خاندان سے باہر نہ جانے دے اور مؤرخین کے قول کے مطابق ایسا کام کرے کہ خلافت کو سلطنت کی شکل دیدے۔ لیکن وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کام کے لئے فی الحال فضا سازگار نہیں ہے۔ وہ اس بارے میں بہت کچھ سوچتا تھا اور اپنے خاص دوستوں سے بھی مشورہ کرتا رہتا تھا لیکن ظاہر کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ اور یہ سوچ نہیں پاتا تھا کہ یہ بات عمل میں بھی آسکتی ہے۔

جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے وہ شخص جس نے اسے اس کام کی ہمت بندھائی اور اسے اطمینان دلایا کہ یہ بات عمل میں بھی آسکتی ہے مغیرہ بن شعبہ تھا۔ اسے حکومت کوفہ کا لالچ تھا کیونکہ وہ پہلے کوفہ کا حاکم اور والی رہ چکا تھا اور چونکہ معاویہ نے اسے برخاست کردیا تھا اس لئے ناراض تھا۔ وہ شام پہنچا۔ وہ بڑا نقاش اور زیرک عرب کا دیہاتی تھا۔ اس نے اس غرض سے کہ دوبارہ کوفہ کی حکومت حاصل ہوجائے اس طرح اسکیم بنائی۔ ایک دن اس نے یزید بن معاویہ کو دیکھا تو بولا نہ جانے معاویہ تیرے بارے میں کیوں کوتاہی کر رہا ہے۔ دیر کس بات کی ہے؟ لوگوں کے سامنے تجھے اپنے جانشین کی حیثیت سے پیش کیوں نہیں کرتا؟ اس نے جواب دیا۔ میرا باپ سوچتا ہے کہ یہ بات ناقابل عمل ہے۔ اس نے کہا۔ نہیں، قابل عمل ہے۔ تمہیں کس طرف سے خوف ہے؟ تمہارے خیال میں کس جگہ کے لوگ عمل نہیں کریں گے؟ جو کچھ معاویہ کہے گا شام والے اس کی اطاعت کریں گے۔ ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ رہے مدینہ والے تو اگر فلاں کو تم وہاں بھیج دو تو وہ یہ کام انجام دے گا۔ عراق (کوفہ) البتہ سب مقامات سے زیادہ اہم اور خطرناک ہے۔ وہاں کا کام میں انجام دے سکتا ہوں۔

یزید معاویہ کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مغیرہ نے یہ بات کہی ہے۔ معاویہ مغیرہ کو بلاتا ہے۔ اس نے اپنی چرب زبانی اور پختہ دلیلوں سے معاویہ کو مطمئن کر دیا کہ فضا سازگار ہے اور کوفہ کا کام جو سب جگہوں سے زیادہ سخت اور زیادہ مشکل ہے وہ میں انجام دے دوں گا۔ معاویہ نے اسے دوبارہ حکم دیا کہ کوفہ چلا جائے (البتہ یہ واقعہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی وفات کے بعد اور معاویہ کے آخر عمر کا ہے) واقعات یہ ہیں۔ کوفہ اور مدینہ والوں نے یہ بات قبول نہیں کی۔ معاویہ مجبور ہوا کہ مدینہ جائے۔ مدینہ کے رؤسا یعنی ان لوگوں کو جن کی پبلک میں عزت تھی مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام، عبد اللہ ابن زبیر اور عبد اللہ ابن عمر کو بلایا۔ اپنی چرب زبانی سے کوشش کی کہ اسلامی مصلحت کے خیال سے فی الحال اس طرح منظور کرلیں کہ ظاہری حکومت یزید کے ہاتھ میں رہے لیکن کام سب آپ کے اختیار میں ہو تاکہ لوگوں میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ آپ لوگ فی الحال بیعت کر لیجئے۔ عملی طور پر حکومت کی باگ ڈور آپ ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس نے ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے منظور نہیں کیا۔ یہ کام بھی اس طریقے سے جیسے معاویہ چاہتا تھا عمل میں نہیں آسکا۔ پھر چالاکی سے مدینہ کی مسجد میں یہ چاہا کہ لوگوں کے سامنے یوں ظاہر کرے کہ لوگ حاضر ہوگئے تھے اور انہوں نے قبول کر لیا تھا لیکن یہ چالاکی بھی کام نہیں دے سکی۔

معاویہ مرتے وقت اپنے بیٹے یزید کے طور طریق سے بہت پریشان تھا۔ اس نے اسے نصیحت کی کہ بیعت لینے کے لئے عبد اللہ ابن زبیر کے ساتھ اس طرح پیش آنا۔ عبد اللہ ابن عمر کے ساتھ اس طرح عمل کرنا۔ امام حسین علیہ السلام سے یوں سلوک کرنا۔ اس نے خاص طور پر یہ حکم دیا کہ امام حسینؑ سے بہت محبت اور نرمی کا برتاؤ کرنا۔ اس نے کہا کہ وہ پیغمبر خداؐ کے فرزند ہیں۔ مسلمانوں میں عظیم

مرتبے کے مالک ہیں۔ اس بات سے ڈر کہ امام حسینؑ سے سخت رویہ رکھے اور اپنے ہاتھ ان کے خون میں رنگے کیونکہ پھر تو خلافت نہیں کر سکے گا بلکہ خلافت ابو سفیان کے خاندان سے ہی نکل جائے گی۔ معاویہ بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ وہ ہر ماہر سیاست داں کی طرح حالات کو پہلے سے خوب بھانپ لیتا تھا یعنی خوب سمجھتا تھا اور خوب پہلے سے اندازہ لگا لیتا تھا۔ اس کے بر عکس یزید اول تو جوان تھا دوسرے ایسا شخص تھا جو شروع ہی سے ریاست اور شہزادگی کی حالت میں پلا بڑھا تھا، کھیل تماشوں سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا، سیاست کو واقعاً نہیں سمجھتا تھا، جوانی اور ریاست کا غرور تھا، دولت اور شہوت کا غرور تھا۔ اس نے وہ کام کیا جس نے سب سے زیادہ نقصان ابوسفیان کے خاندان کو پہنچایا اور اس معاملے میں سب سے زیادہ اسی خاندان کی شکست ہوئی۔ ان لوگوں کا کوئی روحانی مقصد تو تھا نہیں۔ یہ سلطنت اور حکومت کے سوا دوسری چیز سے غرض نہیں رکھتے تھے اور اسے بھی ہاتھ سے دیدیا۔ امام حسین علیہ السلام قتل تو ہوئے لیکن اپنے روحانی ہدف تک پہنچ گئے جبکہ ابو سفیان کا خاندان کسی طرح اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکا۔

نصف ماہ رجب ۶۰ ہجری میں جب معاویہ مر جاتا ہے تو یزید مدینہ کے حاکم کو، جو بنی امیہ ہی سے تھا، ایک خط لکھتا ہے جس میں وہ معاویہ کے مرنے کی خبر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگوں سے میرے لئے بیعت لو۔ وہ جانتا تھا کہ مدینہ مرکز ہے اور سب کی نگاہیں مدینہ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے ایک خصوصی خط میں سختی سے حکم صادر کرتا ہے کہ امام حسینؑ کو بلا کر ان سے بیعت لے اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو ان کا سر اس کے پاس بھیج دے۔ چنانچہ امام حسینؑ کو جو بات درپیش تھی وہ یزید بن معاویہ کی اسی بیعت کا تقاضا تھا جس میں دیگر برائیوں کے علاوہ دو برائیاں ایسی تھیں جو معاویہ کے معاملے میں بھی موجود نہیں تھیں۔ ایک یہ کہ یزید کی بیعت امام

حسینؑ کی طرف سے موروثی خلافت کی توثیق ہو جاتی یعنی خلافت کا مسئلہ انفرادی مسئلہ نہ رہتا بلکہ خلافت موروثی ہو جاتی۔

دوسرا موضوع خود یزید کی شخصیت تھی جو اس زمانے کے طور طریق کو ہر دوسرے ادوار کے حالات سے الگ امتیاز دے رہا تھا۔ وہ صرف فاسق اور فاجر شخص ہی نہیں تھا بلکہ کھلم کھلا فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا اور پھر سیاسی اہلیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ معاویہ اور بہت سے عباسی خلفاء بھی فاسق اور فاجر گزرے لیکن وہ ایک بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ اپنا ملک اور حکومت باقی رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں زیادہ سے زیادہ اسلامی مصلحتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ اسلامی مظاہر کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کرنا چاہئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اسلام نہ رہا تو وہ بھی نہیں ہوں گے۔ وہ جانتے تھے کہ ایشیاء، افریقہ اور یورپ کی مختلف نسلوں کے کروڑوں افراد ایک حکومت کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے ہیں اور شام یا بغداد کی حکومت کی پیروی کرتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں، قرآن پر عقیدہ رکھتے ہیں اور خلیفہ کو بہر حال اسلامی خلیفہ جانتے ہیں بصورت دیگر جس دن انہیں یہ احساس ہوگیا کہ خلیفہ خود اسلام سے برگشتہ ہے اور اس کے خلاف عمل کرتا ہے وہ بھی خلیفہ سے بغاوت کردیں گے۔

آخر کیا لازم تھا کہ خراسان، شام، سوریہ اور افریقہ کے ایک حصے کے باشندے بغداد یا شام کے حاکم کی اطاعت کریں اور کوئی سبب نہیں تھا، لہذا جو عقلمند، سمجھدار اور سیاست داں خلفاء تھے وہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کی مصلحتوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے پر مجبور ہیں، لیکن یزید بن معاویہ کو اس کا بھی شعور نہیں تھا۔ بد زبان انسان تھا۔ دوسروں کی توہین کیا کرتا تھا۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ مسلمانوں اور اسلام سے بے اعتنائی برتے، اسلامی حدود کو توڑے۔ معاویہ بھی شاید شراب پیتا تھا

(میرا لفظ "شاید" تاریخی لحاظ سے ہے مجھے یاد نہیں پڑتا۔ ممکن ہے تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس بارے میں کوئی قطعی اور حتمی بات کہہ سکیں) لیکن تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ معاویہ نے کسی محفل میں کھلم کھلا شراب پی ہو یا مستی کی حالت میں وہ مجلس میں آیا ہو جبکہ یہ شخص عام مجالس میں کھلم کھلا شراب پیتا تھا، نشے میں دھت ہو جاتا تھا اور پھر یہودہ بکواس شروع کر دیتا تھا۔ تمام معتبر مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ شخص بندر اور کتے پالتا تھا۔ چونکہ یہ بندر رکھتا تھا اس لئے اس کی کنیت ابا قیس پڑ گئی تھی۔ یہ بندر کو بہت پسند کرتا تھا۔ چونکہ اس کی ماں بدو عورت تھی اور یہ خود بھی صحرا میں پلا بڑھا تھا اس میں بھی بدوی اخلاق پیدا ہوگئے تھے۔ کتوں، شکاری کتوں اور بندروں سے خصوصی رغبت اور دلچسپی رکھتا تھا۔

مسعودی اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھتا ہے: یہ بندر کو خوشنما ریشمی کپڑے پہناتا تھا اور اپنے برابر ملکی اور فوجی افسروں سے بلند جگہ پر بٹھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے جو امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا: "وعلی الااسلام السلام اذ قد بلیت الامته براع مثل یزید۔" اس میں اور دوسروں میں فرق تھا۔ یہ شخص دراصل اسلام کے خلاف تبلیغ کرتا تھا۔ ایسے شخص کی بیعت امام حسینؑ سے طلب کر رہے تھے۔ امام علیہ السلام نے بیعت سے انکار کیا اور فرمایا: "میں کسی سبب بیعت نہیں کروں گا۔ ادھر وہ لوگ بھی کسی طرح بیعت طلبی سے صرف نظر نہیں کر رہے تھے۔ یہ ایک سبب اور واقعہ تھا۔" ان لوگوں کا یہ سخت مطالبہ کہ ہم تم جیسی شخصیت کو بیعت لئے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ایک ایسا شخص جو بیعت نہیں کرتا اور یہ کہتا ہے کہ اس حکومت کی جانب سے مجھ پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔ مجھے اس پر اعتراض ہے۔ وہ لوگ کسی طرح اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ امام حسین علیہ السلام بیعت نہ کریں اور آزادی کے ساتھ بے روک ٹوک عوام سے ملیں جلیں۔ یہ لوگ اس بیعت نہ

کرنے کو اپنی حکومت کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ وہ اچھی طرح جان گئے تھے اور بات بھی یہی تھی۔ امام کا بیعت نہ کرنا یعنی معترض ہونا، منظور نہ کرنا، یزید کی اطاعت کو لازم نہ گردانا بلکہ اس کی مخالفت کو واجب جاننا۔ وہ لوگ مصر تھے کہ آپ بیعت کیجئے۔ امام فرماتے تھے کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ اب اس تقاضے کے پیش نظر، ان اسباب کو دیکھتے ہوئے امام کا کیا فرض ہے؟ ایک مخالفت کے اقدام کے سوا اور کوئی عمل نہیں ہوسکتا۔ میں بیعت نہیں کروں گا۔ دوسری کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ کیا آپ بیعت کرتے ہیں؟ نہیں! اگر بیعت نہیں کرتے تو قتل کر دئے جائیں گے! میں قتل ہونے کو تیار ہوں لیکن بیعت نہیں کروں گا۔ اس مقام پر امام کا جواب فقط ایک "نہیں" ہے۔

مدینہ کے حاکم نے امام حسینؑ کو بلوایا۔ وہ بنی امیہ کا ایک فرد تھا۔ (یہ بات ضرور کہنا چاہئے کہ اگرچہ قریب قریب تمام بنی امیہ ناپاک عنصر تھے لیکن یہ شخص ایک حد تک دوسروں سے مختلف تھا) اس وقت امام حسینؑ مدینہ کی مسجد (مسجد نبوی) میں تشریف فرما تھے۔ عبداللہ ابن زبیر بھی آپ کے پاس تھے۔

حاکم کے گماشتہ نے دونوں کو حاکم کے پاس چلنے کی دعوت دی اور کہا کہ حاکم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے کہا۔ تم جاؤ ہم بعد میں آئیں گے۔ عبداللہ ابن زبیر بولے: اس موقع پر جو حاکم نے ہم لوگوں کو بلایا ہے آپ کا کیا اندازہ ہے؟ امامؑ نے فرمایا: "اظن ان طاغیتهم قد هلك." میرا خیال ہے کہ ان کا فرعون تلف ہوگیا ہے اور ہمیں بیعت کے لئے بلایا ہے۔ عبداللہ ابن زبیر نے کہا۔ آپ نے خوب اندازہ لگایا، میرا بھی یہی خیال ہے۔ اب آپ کیا کریں گے؟ امامؑ نے فرمایا: میں جارہا ہوں۔ تم کیا کرو گے؟ یہ میں بعد میں دیکھوں گا۔ عبداللہ ابن زبیر راتوں رات غیر معروف راستے سے ہوتے ہوئے بھاگ کر مکہ پہنچے اور وہاں پناہ

گزیں ہوگئے۔ امام علیہ السلام گئے اور بنی ہاشم کے کچھ جوانوں کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ تم باہر کھڑے رہنا۔ اگر میری آواز بلند ہو تو تم اندر گھس آنا لیکن جب تک میری آواز بلند نہ ہو اندر نہ آنا۔ ناپاک بدنام زمانہ اموی مروان بن حکم بھی جو کبھی مدینہ کا حاکم رہ چکا تھا وہاں موجود تھا۔(۱) حاکم نے کھلا ہوا خط امام کو سنایا۔ امامؑ نے فرمایا: کیا چاہتے ہو؟ حاکم نے چرب زبانی سے باتیں شروع کیں کہ لوگوں نے یزید کی بیعت کرلی ہے۔ معاویہ کی یہی خواہش تھی اور اسلام کی بھلائی بھی اسی میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی بیعت کرلیں۔ اسلام کی بھلائی کا یہی تقاضا ہے۔ بعد میں آپ جس طرح فرمائیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔ تمام خرابیاں دور کر دی جائیں گی۔ امامؑ نے فرمایا: تم مجھ سے کس لئے بیعت چاہتے ہو؟ لوگوں کے لئے بیعت سے چاہتے ہو یعنی خدا کے لئے نہیں چاہتے۔ اس لحاظ سے کہ خواہ خلافت شرعی ہے یا غیر شرعی، میں بیعت کولوں تاکہ شرعی ہوجائے جو نہیں ہے۔ تم میری بیعت اس لئے چاہتے ہو کہ دوسرے لوگ بھی بیعت کرلیں۔ اس نے کہا۔ ہاں۔! آپ نے فرمایا: تو اس خالی کمرے میں جہاں صرف ہم تین شخص ہیں تم کو میری بیعت سے کیا فائدہ ہوگا؟ حاکم نے کہا۔ آپ درست فرما رہے ہیں، پھر بعد میں ہوگی۔ امامؑ نے فرمایا: مجھے جانا چاہئے۔ حاکم نے کہا بہت بہتر، تشریف لے جائیں۔ مروان ابن حکم بولا کیا کہہ رہے ہو کہ چلے جائیں؟ اگر یہ یہاں سے چلے گئے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ اگر یہ یہاں سے چلے گئے تو کیا بیعت کرینگے؟ خلیفہ کے حکم کی تعمیل کرو۔ امامؑ نے مروان کا گریبان پکڑ کر اسے اوپر اٹھا کر پھر زمین پر زور سے چھوڑ دیا اور فرمایا: تو نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر بات کی۔

۱۔ یہ شخص مدتوں مدینے کا حاکم رہ چکا ہے۔ اس عرصے میں مدینے کی آبادی کافی بڑھ گئی تھی۔ مدینے میں مروان ابن حکم کا جدی کیا ہوا ایک چشمہ ہے جس میں اب تک پانی جاری ہے۔

امامؑ باہر تشریف لے گئے اور اس کے بعد تین راتوں تک مدینہ ہی میں رہے۔ راتوں کو پیغمبر اکرمؐ کی قبر پر تشریف لے جاتے تھے اور وہاں دعا مانگتے تھے۔ اے خدا! مجھے وہ راستہ دکھا جس میں تیری رضا ہو۔ تیسری رات کو امامؑ پیغمبر اکرمؐ(۱) کی قبر پر جاتے ہیں، دعا مانگتے ہیں اور بہت روتے ہیں، وہیں آپ کی آنکھ لگ جاتی ہے، خواب میں پیغمبر اکرمؐ کو دیکھتے ہیں۔ یہ خواب آپؑ کے لئے الہام اور وحی کا درجہ رکھتا تھا۔ حضرت امام حسینؑ اس کے دوسرے روز مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور راستے سے بچ کر نہیں بلکہ اسی عام راستے سے مکہ کی طرف چل دئے۔ بعض ساتھیوں نے عرض کیا: "یابن رسول اللّٰہ! لوتنکبت الطریق الاعظم۔" بہتر ہے کہ آپ شاہراہ سے نہ جائیں۔ ممکن ہے کہ حکومت کے کارندے آپ کو واپس کردیں، روکیں، لڑائی جھگڑا ہوجائے (ایک بہادر اور قوی روح ایسا کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوتی) آپ نے فرمایا: میں پسند نہیں کرتا کہ ایک فرار ہونے والے کی شکل

۱۔ جس جگہ آجکل پیغمبر اکرمؐ کی قبر ہے وہ پیغمبرؐ کا گھر اور جناب عائشہ کا حجرہ تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کو اس حجرے کے جنوبی حصے میں دفن کیا گیا تھا جس سے دیوار تک ایک بالشت سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر کو پیغمبرؐ کے پیچھے کی جانب اس طرح دفن کیا گیا کہ حضرت ابوبکر کا سر پیغمبر اکرمؐ کے پشت پر شانوں کے مقابل تھا۔ حضرت عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ انہیں حضرت ابوبکر کے پیچھے کی طرف اس طرح دفن کیا گیا کہ حضرت عمر کا سر حضرت ابوبکر کے شانے کے مقابل ہوگیا لیکن کچھ دوسروں نے جن کے دلائل زیادہ مستحکم ہیں کہا ہے کہ حضرت عمر کو پیغمبر اکرمؐ کے پائنتی دفن کیا گیا ہے۔
اس واقعے کے بعد عائشہ نے گھر کے بیچ میں ایک دیوار اٹھا دی تھی۔ جنوبی حصے میں پیغمبر اکرمؐ کی قبر تھی اور وہ خود اس گھر کے شمالی حصے میں رہتی تھیں۔ جس کمرے میں پیغمبرؐ کی قبر تھی اس میں خصوصیت سے ایک دروازہ کھول دیا تھا جس سے ہو کر لوگ آپ کی زیارت کو جاتے تھے۔ اس وقت (عہد امام حسنؑ) جناب عائشہ بھی دنیا سے رخصت ہوچکی تھیں۔ معلوم نہیں کہ دیوار ہٹا دی گئی یا نہیں۔ یہ حجرہ شریفہ جو اس وقت پیغمبر اکرمؐ کا مدفن ہے اسی وقت سے زیارت کے لئے مخصوص ہوگیا تھا اور اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

اختیار کروں۔ میں اسی شاہراہ سے جارہا ہوں جو خدا چاہے گا وہی ہوگا۔

پہلا سبب، بیعت کا مسئلہ

بہر حال حسینی حادثہ کا پہلا مسئلہ اور پہلا سبب جس میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا "بیعت کا مسئلہ" ہے۔ یزید کی بیعت جو تاریخ کی صحیح شہادت کے مطابق امام حسینؑ سے طلب کی گئی۔ یزید خصوصی خط میں یوں لکھتا ہے: "خذ الحسین بالبیعت اخذا شدیداً۔" امام حسینؑ کو بیعت کرنے کے لئے گرفتار کرو، سختی کرو اور وہ جب تک بیعت نہ کریں رہا نہ کرو۔ امام حسینؑ نے بھی پامردی سے اس مطالبے کی نفی کی اور کسی طرح یزید کی بیعت کے لئے تیار نہیں تھے۔ ان کا جواب صرف انکار تھا یہاں تک کہ امام حسینؑ کی عمر کے آخری دن میں جب امام حسین کربلا میں تھے عمر ابن سعد آیا اور اس نے امام حسینؑ سے مذاکرات کئے۔ بظاہر اس کا انداز یہ تھا کہ وہ امام حسینؑ کو یزید سے صلح پر مجبور کرے لیکن حقیقت میں یہ صلح بیعت کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی۔ امام حسینؑ تیار نہیں ہوئے۔ امام حسینؑ کی ان باتوں سے جو آپ نے عاشور کے دن کہی ہیں پورے طور پر ظاہر ہے کہ آپ اپنے پہلے دن کے ہی قول پر قائم تھے۔" لا واللّٰہ لا اعطیکم بیدی اعطاء الذلیل ولا اقر اقرار العبید۔" (نہیں خدا کی قسم میں اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہرگز نہیں دوں گا۔ میں یزید کی بیعت ہرگز نہیں کروں گا۔) یہاں تک کہ ان حالات میں بھی جو آج ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ قتل کردیا جاؤں گا اور دیکھ رہا ہوں اپنے عزیزوں کا قتل، دوستوں کا قتل اور اپنے خاندان کی اسیری مگر یزید کی بیعت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔

یہ سبب کب پیدا ہوا؟ معاویہ کے آخری زمانہ میں معاویہ کے مرنے کے بعد جب یزید کو حکومت ملی اور اس میں سختی اور عجلت بڑھی۔

دوسرا سبب، مسئلہ دعوت

دوسرا سبب دعوت کا مسئلہ تھا۔ شاید بعض کتابوں میں آپ نے پڑھا ہوگا خصوصاً ان نام نہاد تاریخ کی کتابوں میں جو مدرسے کے بچوں کے ہاتھوں میں دے دی جاتی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ۶۰ھ ہجری میں معاویہ کا انتقال ہوگیا تو کوفہ والوں نے امام حسینؑ کو بلایا تاکہ آپ کو خلیفہ منتخب کرلیں۔ امام حسینؑ کوفہ آئے۔ کوفہ والوں نے غداری اور بے وفائی کی۔ آپ کی مدد نہیں کی۔ امام حسینؑ قتل ہوگئے۔ انسان جب یہ تاریخیں پڑھتا ہے تو سوچنے لگتا ہے کہ امام حسینؑ ایک ایسے شخص تھے جو اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا اور نہ کسی بات کی انہیں کوئی فکر تھی۔ صرف وہ بات جس نے انہیں اپنی جگہ سے ہلایا کوفہ والوں کی دعوت تھی جبکہ امام حسینؑ رجب کے آخر میں جو یزید کی حکومت کا آغاز تھا بیعت سے انکار کے لئے مدینہ سے نکل گئے اور چونکہ مکہ خدا کی جانب سے جائے پناہ ہے اور وہاں دوسرے مقامات کے مقابلے میں امن کا زیادہ امکان ہے اور مسلمان اس جگہ کا زیادہ احترام کرتے ہیں اور حکومت بھی مکہ کا زیادہ احترام کرنے پر مجبور ہے اس لئے آپ وہاں چلے جاتے ہیں۔ (معاویہ کو مرے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے اور شاید ابھی اس کی موت کی خبر کوفہ میں نہیں پہنچی تھی) نہ صرف اس لئے کہ وہ بہتر پناہ گاہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کا بہتر مرکز ہے۔

رجب اور شعبان کے مہینوں میں عمرہ کے ایام ہوتے ہیں لوگ چاروں طرف سے مکہ آتے ہیں اور ان کو بہتر طور پر تعلیم اور معلومات فراہم کی جاسکتی ہے۔ پھر حج کا زمانہ آجاتا ہے جو تبلیغ کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب وقت ہوتا ہے۔ تقریباً دو ماہ کے بعد کوفہ والوں کے خطوط پہنچتے ہیں۔ کوفہ والوں کے خطوط مدینہ میں نہیں آئے ہیں جبکہ امام حسینؑ نے اپنی تحریک مدینہ سے شروع کر دی ہے۔ کوفیوں

کے خطوط مکہ میں امام حسینؑ کے پاس پہنچتے ہیں یعنی اس وقت جب امام حسینؑ بیعت سے انکار کرنے کا عزم مصمم کر چکے تھے اور اسی عزم نے ان کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا تھا (خود امام علیہ السلام اور دوسرے سبھی یہ بات جانتے تھے کہ نہ وہ لوگ بیعت لینے کے مطالبے سے دست بردار ہوسکتے ہیں اور نہ امام علیہ السلام ہی بیعت پر آمادہ ہوسکتے ہیں) اس لئے کوفیوں کی دعوت اس تحریک کا اصلی سبب نہیں تھا بلکہ ثانوی سبب تھا البتہ کوفیوں کی دعوت کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ مانا جاسکتا ہے کہ اس بلاوے نے لوگوں کے نقطۂ نظر اور تاریخ کے فیصلے کے مطابق مستقبل میں امام کے لئے بظاہر ایک مناسب موقع فراہم کر دیا۔

کوفہ ایک بڑا صوبہ اور اسلام کا فوجی مرکز تھا(۱) یہ شہر جو حضرت عمر بن الخطاب کے زمانے میں بسایا گیا تھا، ایک فوجی چھاؤنی تھا اور اسلامی ممالک کی تقدیر پر بہت گہرا اثر رکھتا تھا۔ اگر کوفی اپنے وعدے پر قائم رہتے تو ممکن تھا کہ امام حسین علیہ السلام کامیاب ہو جاتے۔

اس وقت کے کوفہ کا اس وقت کے مدینہ یا مکہ سے موازنہ نہیں ہوسکتا۔ اس وقت کے خراسان سے بھی موازنہ نہیں ہوسکتا۔ اس کا مدمقابل فقط شام تھا۔ کوفیوں کی دعوت کا اثر زیادہ سے زیادہ اس تحریک کی شکل میں ہو سکتا تھا کہ امام حسین علیہ السلام مکہ سے روانہ ہو جائیں اور اسے مرکز نہ بنائیں (بلا شبہ خود مکہ میں بھی ایسی دشواریاں تھیں کہ اسے مرکز نہیں بنایا جاسکتا تھا)۔ ابن عباس کی بھی یہ تجویز کہ یمن چلے جائیں اور وہاں کے کوہستان میں پناہ لیں قبول نہیں کرتے، اپنے نانا کے مدینہ کو بھی مرکز نہیں بناتے بلکہ کوفہ چلے آئیں۔ پس کوفیوں کے بلاوے کا دخل ایک ثانوی امر تھا کہ یہ عراق میں تحریک اور قیام کی صورت میں ہوتا ورنہ یہ اصلی

۱۔ اس وقت کی اسلامی مملکت کے دو مضبوط مرکز تھے: کوفہ اور شام

سبب نہیں تھا۔

امامؑ جس وقت کوفہ کی سرحد کو پہنچتے ہیں جناب حر کے لشکر کا سامنا ہوتا ہے۔ آپ کوفہ والوں سے فرماتے ہیں: تم نے مجھے بلایا۔ اب اگر تم نہیں چاہتے تو لوٹ جاتا ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں لوٹ جاتا ہوں اور یزید کی بیعت کئے لیتا ہوں اور ان تمام باتوں سے چشم پوشی کئے لیتا ہوں جو میں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ملک میں فسادات کے پھیلاؤ اور ان حالات میں مسلمانوں کے فرائض کے بارے میں کہی ہیں۔ بیعت کر کے اپنے گھر میں خاموش بیٹھ جاتا ہوں اور سکوت اختیار کرلیتا ہوں۔ نہیں! میں اس حکومت کو صالح اور نیک نہیں سمجھتا اور اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کا بھی قائل ہوں۔ تم اہل کوفہ نے مجھے دعوت دی۔ تم نے کہا اے حسینؑ! آپ کے پیش نظر ہدف کے حصول میں ہم آپ کی مدد کریں گے۔ اگر تم بیعت نہیں کرتے تو نہ کرو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نقطۂ نظر سے تمہیں اس حکومت پر اعتراض ہے اور اس کے خلاف قیام کیا ہے تو ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ میں بھی ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں آیا ہوں جنہوں نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اب تم کہتے ہو کہ اہل کوفہ اپنے وعدے پر عمل نہیں کر رہے ہیں تو بہت اچھا، ہم بھی کوفہ نہیں جاتے۔ ہم اس جگہ واپس جاتے ہیں جو ہمارا اصلی مرکز ہے۔ ہم مدینہ یا مکہ چلے جاتے ہیں۔ دیکھیں خدا کیا چاہتا ہے؟ بہر حال ہم بیعت نہیں کریں گے اگرچہ بیعت نہ کرنے پر ہم قتل ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس سبب یعنی کوفیوں کے بلاوے کا زیادہ سے زیادہ دخل اتنا تھا کہ انہوں نے امامؑ کو مکہ سے باہر نکالا اور وہ کوفہ کی طرف چل پڑے۔

یہ تو میں نہیں کہنا چاہتا کہ واقعی یہ لوگ اگر نہ بلاتے تو امام قطعی طور پر مدینہ یا مکہ ہی میں رہتے۔ نہیں! تاریخ بتاتی ہے کہ امامؑ اس سے معذور تھے۔ کوفہ

کے مقابلے میں مکہ کے بھی ظاہری حالات کچھ بہتر نہیں تھے۔ تاریخ میں بہت سے قرائن نشان دہی کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں امامؑ کو حج کے زمانے ہی میں قتل کر ڈالیں۔ صرف طبری کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ اوروں نے بھی بیان کیا ہے کہ امامؑ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اگر وہ حج کے زمانے میں مکہ میں رہ گئے تو ممکن ہے کہ اسی احرام کی حالت میں جب کوئی اصولاً ہتھیار بند نہیں ہوتا بنی امیہ کے ہتھیار بند کارندے ان کا خون بہادیں اور خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہو جائے۔ حج کی توہین ہو اور اسلام کی بے حرمتی ہو، دوہری بے حرمتی ہو، فرزند پیغمبرؐ عبادت کی حالت میں خانہ خدا کی چار دیواری میں قتل بھی کر دیئے جائیں اور ان کا خون رائگاں بھی جائے۔ بعد میں وہ یہ مشہور کر دیں کہ امام حسینؑ کا فلاں شخص سے معمولی جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس نے حضرت کو قتل کر دیا اور خود روپوش ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلے کہ امامؑ کا خون ضائع ہو جائے۔ امامؑ نے اپنے ارشادات میں اس موضوع کے متعلق اشارہ بھی کیا ہے۔ اثنائے سفر میں کسی نے امامؑ سے پوچھا: آپ کس لئے نکل کھڑے ہوئے؟ اس کی مراد یہ تھی کہ آپ مدینہ میں محفوظ تھے۔ وہاں اپنے جد کے حرم یعنی پیغمبرؐ کی قبر کے پہلو میں کوئی شخص آپ سے تعرض نہیں کر سکتا تھا یا آپ مکہ میں ہی رہتے جہاں آپ خدا کے گھر کے قریب تھے۔ اب جو آپ وہاں سے باہر نکل آئے تو گویا آپ نے خود ہی خطرہ مول لے لیا ہے! آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: تم کو دھوکا ہوا ہے۔ چاہے کسی بل میں چھپ جاؤں یہ لوگ مجھے نہیں چھوڑیں گے جب تک میرا خون نہیں بہالیں گے۔ میرے اور ان کے درمیان نہ ختم ہونے والا جھگڑا ہے۔ وہ مجھ سے ایسی بات کے طالب ہیں جس کے لئے میں کسی طرح آمادہ نہیں ہوں اور میں بھی ایسی بات کا خواہاں ہوں جسے وہ کسی طرح قبول نہیں کریں گے۔

تیسرا سبب، امر بالمعروف کا مسئلہ

تیسرا سبب امر بالمعروف ہے۔ یہ بھی خود امامؑ کے کلام کا صریحی اظہار ہے۔ تاریخ لکھتی ہے۔ :امام کے بھائی محمد ابن حنفیہ کا اس وقت ہاتھ مفلوج ہو چکا تھا، بیکار ہو گیا تھا۔ آپ جہاد کے قابل نہیں تھے لہذا آپ نے شرکت نہیں کی۔ امامؑ ایک وصیت نامہ لکھ کر ان کے سپرد فرماتے ہیں۔ ہذا ما اوصی به الحسین بن علی اخاه محمد المعروف بابن حنفیه۔ اس مقام پر امامؑ کے جملے ہیں : حسینؑ خدا کی یکتائی اور پیغمبرؐ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے (کیونکہ امامؑ جانتے تھے کہ بعد میں کچھ لوگ یہ کہہ دیں گے کہ امام حسینؑ اپنے نانا کے دین سے خارج ہو گئے تھے) یہاں تک کہ آپ اپنے قیام کا راز بیان فرماتے ہیں :

"انّی ما خرجت اشراً ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً انّما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی ارید ان امر بالمعروف و انهی عن المنکر واسیر بسیرة جدّی وابی علی ابن ابی طالب علیه السلام"

اب یہاں اہل کوفہ کی دعوت کی کوئی بات ہی نہیں ہے یہاں تک کہ بیعت سے انکار کا بھی ذکر نہیں کرتے یعنی طلب بیعت اور بیعت سے انکار کے علاوہ ایک اور مسئلہ ہے۔ اگر یہ لوگ مجھ سے بیعت نہ بھی چاہیں تب بھی میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ دنیا والے جان لیں :"ما خرجت اشراً ولا بطراً" حسینؑ بن علیؑ کوئی جاہ طلب نہیں تھے، منصب اور دولت کے طالب نہیں تھے، فسادی اور تخریب کار بھی نہیں تھے، نہ ظالم اور ستمگر تھے۔ وہ ایک مصلح انسان تھے۔ " ولا مفسداً ولا ظالماً انما خرجت لطلب الاصلاح فی امته جدی".....

"الاوان لدعی بن الدعی قدرکزبین اثنتین بین السلسلة والذلة وهیهات من الذلة یأب الله ذلك لنا ورسوله والمومنون وحجور طابت وطهرت."

پہلے دن سے آخری لحظہ تک، یہی روح حسین بن علی علیہم السلام کے جسم اقدس میں جلوہ گر تھی۔ خود آپ ہی کے قول کے مطابق آپ کے خون اور زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ امام حسینؑ سے اس کام کا الگ ہونا ممکن نہیں تھا۔ اپنے آخری لمحات میں امام حسینؑ جس وقت قتل گاہ کے نشیب میں پڑے ہوئے ہیں اور ہلنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے ، دشمن سے لڑنے کی بھی طاقت نہیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے اور مشکل سے ہل پاتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کے کلام سے غیرت ٹپکتی ہے۔ امام حسینؑ کے کلام سے عزت آشکار ہے۔ امام حسینؑ کے کلام سے عظمت نمایاں ہوتی ہے۔ فوج یزیدی آپ کا سر مبارک جسم سے الگ کرنا چاہتی ہے لیکن ان پر طاری آپ کی شجاعت اور ہیبت سے ایسا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ بعض لشکری کہتے ہیں ایسا نہ ہو کہ امام حسینؑ نے کوئی جنگی چال چلی ہو کہ جیسے ہی کوئی پاس پہنچے تو اس پر جھپٹ پڑیں۔ ان کے حملے کے سامنے ٹھہرنے کی کسی کو مجال نہیں ہے۔ ایک ناپاک اور بزدلانہ چال چلتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم حسینؑ کے خیموں پر حملہ کر دیں تو ان میں بچاؤ کی طاقت نہیں ہوگی۔ امام حسین علیہ السلام پڑے ہوئے ہیں۔ میں آپ کی اس حالت کا نقشہ نہیں کھینچ سکتا۔ یزیدی لشکر اہل حرم کے خیموں پر حملہ کرتا ہے ایک شخص چلاتا ہے : حسینؑ تم زندہ ہو؟ فوج نے اہل حرم کے خیموں پر حملہ کر دیا ہے،امامؑ بہت مشکل سے اپنے زانوؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اپنے نیزے کا سہارا لے کر فریاد کرتے ہیں :

"ویلکم یا شیعته ال ابی سفیان ان لم یکن لکم دین ولا تخافون المعاد فکونوا احراالً فی دنیاکم۔"

اے لوگو! تم ابو سفیان کی اولاد کے ہاتھوں بک گئے ہو۔ اے آل سفیان کے پیرو! اگر تم خدا کو نہیں پہچانتے، اگر تم قیامت پر ایمان اور اعتقاد نہیں رکھتے، تو بھی

تمہاری انسانی آزادی اور شرافت کہاں چلی گئی؟ ایک کہتا ہے:

"ما تقول یابن فاطمه؟" (اے فاطمہ کے بیٹے! کیا کہتے ہو؟) آپ نے جواب دیا: "انا اقا تلکم و انتم تقاتلوننی والنساء لیس علیهن جناح۔" (میں تمہارا مدمقابل ہوں، حسینؑ کا یہ جسم حاضر ہے، اس پر تیر اور تلواروں کی ضربیں لگاؤ، لیکن حسینؑ کی روح کو یہ گوارہ نہیں کہ وہ زندہ ہو اور کوئی شخص اس کے خیموں کے قریب پہنچ رہا ہو۔)"

"ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم
و صلی اللّٰه علی محمد و آله الطاهرین"

دوسری مجلس

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سبب (۱)

بسم اللّٰه الرّحمن الرّحیم

اعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم۔ انّ اللّٰه اشتری من المؤمنین انفسهم و اموالهم بانّ لهم الجنة یقاتلون فی سبیل اللّٰه فیقتلون و یقتلون وعدا علیه حقا فی التوراة والانجیل والقرآن ط ومن اوفی بعهده من اللّٰه فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم به ذالك هوالفوز العظیم اتائبون العابدون الحامدون السآئحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف و الناهون عن المنکر و الحافظون لحدود اللّٰه و بشر المؤمنین۔(۲)

مقدس تحریک حسینی کی ساخت میں تین بنیادی عناصر ہیں اور مجموعی طور پر تین عوامل نے اس بڑے حادثہ کو صورت بخشی ہے۔ ایک سبب یہ ہے کہ معاویہ کی موت کے فوراً بعد یزید بن معاویہ یہ حکم دیتا ہے کہ امام حسینؑ سے ضرور بیعت حاصل کی جائے۔ امامؑ بیعت سے انکار کرتے ہیں۔ وہ غیر معمولی طور پر مصر ہیں اور اس تقاضے سے باز نہیں آتے اور امامؑ شدت سے منع کرتے ہیں اور کسی قیمت پر بیعت کیلئے تیار نہیں ہیں چاہے جان چلی جائے۔ یہیں سے سخت ضد اور جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔

۱۔ یہ تقریر ۲۴، ۱۲، ۱۳۴۹ مطابق ۷ محرم الحرام ۱۳۹۰ ہجری کو کی گئی۔

۲۔ سورۂ توبہ آیات ۱۱۱، ۱۱۲

دوسرا سبب جس کا اس تحریک پر اثر رہا ہے اور جسے دوسرے بلکہ تیسرے درجے کا سبب شمار کرنا چاہئے یہ ہے کہ جب صورت حال ایسی ہوگئی کہ یزید کی طرف سے اصرار اور امامؑ کی طرف سے انکار ہوتا ہے تو امامؑ مکہ کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ مکہ میں دو ایک مہینے قیام کے بعد اہل کوفہ کو کسی طور حالات کی خبر ملتی ہے۔ اس وقت اہل کوفہ ہوش میں آتے اور امامؑ کو بلاتے ہیں۔ ہم جو کچھ سنتے ہیں اور خاص طور پر جو بعض درسی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اس کے برعکس امامؑ کی تحریک کا سبب اہل کوفہ کی دعوت کا بلاوا نہیں ہے بلکہ امامؑ کی تحریک اہل کوفہ کی دعوت کا سبب ہے۔ امامؑ نے اہل کوفہ کی دعوت پر قیام نہیں کیا بلکہ امامؑ حرکت میں آتے ہیں۔ بیعت کی مخالفت کرنے اور امامؑ کے قیام سے مطلع ہونے پر چونکہ کوفہ کا ماحول نسبتاً سازگار تھا وہ لوگ متحد ہوگئے اور انہوں نے امامؑ کو بلوا بھیجا۔

تیسرا سبب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس سبب کا خود امامؑ نے صراحت کے ساتھ مکرر بیعت کے مسئلے اور اہل کوفہ کی دعوت کا ذکر کئے بغیر ایک مستقل اور بنیادی سبب کے طور ذکر کیا ہے اور اس بات کا حوالہ دیا ہے۔

ان تینوں اسباب کی اہمیت ایک سی نہیں ہے۔ امامؑ کی تحریک میں ہر ایک کی معینہ اہمیت ہے البتہ اہل کوفہ کی دعوت کا مسئلہ :اس سبب سے تحریک امام کو جو اہمیت ملتی ہے وہ بہت سادہ اور معمولی سی ہے (امام حسین علیہ السلام کے عمل کی سطح پر نہ کہ ہمارے کاموں کی سطح پر) کیونکہ اس سبب سے ایک ولایت اور ایک علاقہ جو اپنے اندر طاقت رکھتا ہے اپنی آمادگی کا اعلان کر دیتا ہے۔ قاعدے کے مطابق زیادہ سے زیادہ پچاس فیصدی کامیابی کا امکان رکھتا تھا۔ اس سے زیادہ کامیابی کا امکان نہیں رکھتا تھا۔

جب اہل کوفہ متفق ہوگئے اور فرض کیجئے کہ انہوں نے اتفاق بھی کر لیا اور

اپنے عہد پر قائم بھی رہ جاتے اور خیانت نہ بھی کرتے تب بھی کوئی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ امامؑ کی موافقت سو فیصد ہے کیونکہ تمام لوگ کوفہ کے باشندے نہیں تھے۔ اگر ہم شام کے لوگوں کو نظر میں رکھتے جو بالکل آل سفیان کے وفادار تھے تو کامیابی کے امکان کو پچاس فیصد گھٹا دینا کافی ہوتا (وجہ یہ ہے کہ یہی شامی تھے جو امیر المومنینؑ کی خلافت کے دور میں جنگ صفین میں کوفہ کے باشندوں کے مدمقابل ہوئے اور اٹھارہ مہینے تک کوفیوں سے لڑتے مرتے اور مقابلہ کرتے رہے تھے لیکن بہر حال زیادہ سے زیادہ تیس یا چالیس فیصد کامیابی کا امکان ہے۔ لوگ اپنی آمادگی ظاہر کرتے ہیں اور امامؑ ان کی دعوت کا مثبت جواب دیتے ہیں۔ اس کی جس مقررہ حد تک اہمیت ہے وہ وہی معمولی حد ہے، یعنی بہت سے عام لوگ ان حالات میں مثبت میں ہی جواب دیں گے لیکن بیعت کے مطالبے اور امامؑ کے انکار کا سبب جو انہی ابتدائی دنوں سے ظاہر ہوگیا تھا حسینی تحریک کی قدر و قیمت میں اہل کوفہ دعوت کی بہ نسبت زیادہ اضافہ کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ابتدائی دن میں لوگوں نے ابھی حمایت اور مدد کا اعلان نہیں کیا ہے وفاداری کا اعلان نہیں کیا ہے۔

ایک جابر اور سخت حکومت تھی جس کی سختی پچھلے بیس سال میں معاویہ کے زمانے میں بہت بڑھ گئی ہے۔ معاویہ نے خاص طور پر اپنی حکومت اور سلطنت کی دوسری دہائی میں اس قدر سختی دکھائی کہ سب کی جان نکال لی۔ ایک کام یہ کیا کہ اس کی پوری سلطنت یہاں تک کہ مدینہ اور مکہ میں بھی لوگ جمعہ کی نمازوں میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو کھلم کھلا ایک عبادتی عمل کے طور پر برا بھلا کہتے تھے اور اگر کوئی چوں بھی کرتا تھا تو اس کے سر کی خیریت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اس قدر دہشت زدہ کر دیا تھا کہ کسی شخص کے لئے آخری دنوں میں تو زبان پر حضرت علی علیہ السلام کا نام لانا بھی جرم ہوگیا تھا۔ یہ تاریخ کی عبارت ہے۔ اگر لوگ حضرت علی ابن ابی

طالبؑ کہنا چاہتے تھے تو اشاروں اور سرگوشی میں کہتے تھے۔ حد یہ ہوگئی تھی کہ اگر حضرت علیؑ سے متعلق کوئی ایسی حدیث ہوتی جس حدیث میں حضرت علیؑ کی چھوٹی سے چھوٹی خوبی کا ذکر ہوتا بھی تو وہ محدث اور راوی جو ایک دوسرے سے روایت کرتے تھے ان خالی کمروں پر جہاں صندوق رکھے ہوتے تھے پردے کھینچ دیتے تھے، دروازے بند کر دیتے تھے۔ ایک دوسرے کو قسمیں دلا دیتے تھے کہ اس بات کو ظاہر نہ کرنا۔ میری بات ہر جگہ نقل نہ کرنا۔ اگر روایت کرنا چاہو تو ایسے آدمی سے کہنا جو سو فیصدی راوی ہو، اس روایت کو پی جائے اور ظاہر نہ کرے۔

ایسے مشکل حالات میں اس شخص کا جانشین خلیفہ ہوا ہے جو اس سے زیادہ جوان، زیادہ مغرور، زیادہ ظالم و بے رحم اور سیاست سے اتنا زیادہ بے خبر کہ سیاسی مراعات بھی نہیں دیتا۔ اس وقت ایسی طاقت کے سامنے "نہ" کہنا کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں ہے (تم بیعت کرو۔ نہیں، میں بیعت نہیں کرتا۔ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دو گے تو میں بیعت نہیں کروں گا) ایسی حالت میں ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ تن تنہا صرف اپنی ذات سے ایک نہایت جابر حکومت کے ناجائز مطالبے کے سامنے ڈٹے کھڑے ہیں اور کوئی ایک مددگار اور حامی بھی نہیں ہے، یہاں تک کہ دس فیصدی کامیابی کا بھی امکان نہیں ہے۔ آپ اس لحاظ سے اپنی رائے اور اپنا عقیدہ بچنے کو یا محض دکھاوے کو بھی تیار نہیں ہیں تاکہ بعد میں تاریخ یہ نہ کہے کہ امام حسینؑ نے جبر و زور کے تحت بیعت کرلی ہے۔ یہی لوگ جو جبر سے بیعت لیتے ہیں پیسے کے زور سے تاریخ بھی لکھوا لیتے ہیں، جیسی کہ انہوں نے لکھوائی ہے۔

معاویہ، اس کے ساتھی اور رشتہ دار مسلمانوں کے بیت المال کا کچھ حصہ آج کل کی اصطلاح میں معاوضے دینے اور اس زمانے کے مذہبی لوگوں اور عالموں کو ملازم رکھنے پر صرف کرتے تھے۔ آزاد، بے قید، بے ایمان اور بے ضمیر راویوں کو پیسے

سے خریدتے تھے۔ پیغمبرؐ کی حدیثیں بدل دیتے تھے، پیغمبرؐ کی حدیثوں میں لوگوں کے نام بدل دیتے تھے۔ حضرت علیؑ کے دشمنوں کی تعریف میں حدیثیں گھڑتے تھے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ثمرہ بن جندب نے آٹھ ہزار مثقال سونا لے کر حضرت علی علیہ السلام کے خلاف ایک حدیث گھڑ ڈالی۔ چنانچہ ان کے لئے تاریخ کا بدل دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اب اس کے بعد جتنی تاریخ بچ رہی وہ حسینی تحریک جیسے عملیات کی بدولت بچی اور اگر امام حسینؑ بھی خاموش ہو جاتے تو تاریخ بھی بدل دی گئی ہوتی۔ پس یہ پہلو حضرت ابا عبداللہؑ کی تحریک کو اہل کوفہ کی دعوت کے مقابلے میں زیادہ اور اعلیٰ قدر و قیمت عطا کرتا ہے۔

البتہ تیسرا سبب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے اور حضرت ابا عبداللہؑ کامل صراحت کے ساتھ اس سبب کا حوالہ دیتے ہیں، اس سلسلے میں پیغمبرؐ کی حدیثوں اور اپنے نصب العین کا حوالہ دیتے ہیں اور بار بار نیکی کے حکم اور برائی کی ممانعت کا ذکر کرتے ہیں اور کوفہ والوں کی بیعت اور دعوت کا نام نہیں لیتے۔

یہ سبب دوسرے دو اسباب کی نسبت حسینی تحریک کو بہت زیادہ منزلت بخشتا ہے۔ اسی سبب کی بدولت اس تحریک میں وہ شائستگی پیدا ہوئی جو ہمیشہ قائم رہے گی، ہمیشہ یاد رہے گی، سبق دیتی رہے گی۔ باوجودیکہ تمام اسباب سبق آموز ہیں لیکن اس میں سبق آموزی زیادہ ہے کیونکہ اس سبب کا تکیہ نہ اہل کوفہ کی دعوت پر ہے اور نہ بیعت کے مطالبے پر، یعنی اگر امامؑ کو بلایا بھی نہ جاتا تب بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قانون کے تحت امام حسینؑ تحریک ضرور شروع کرتے۔ ان سے بیعت کا مطالبہ نہ بھی ہوتا پھر بھی وہ خاموش نہ بیٹھتے۔ موضوع بہت دور ہوا جارہا ہے۔ پہلے سبب کے مطابق چونکہ اہل کوفہ نے دعوت دی ہے اور پچاس فیصدی یا اس سے قدرے کم کامیابی کا نقشہ بن گیا ہے اس لئے امامؑ سفر کرتے ہیں یعنی اگر صرف یہی

سبب حسینی تحریک کی تشکیل میں کار گر ہوتا ، اگر اہل کوفہ دعوت نہ دیتے تو امام حسینؑ اپنی جگہ سے نہ ہلتے۔ دوسرے سبب کے مطابق وہ لوگ امامؑ سے بیعت مانگتے ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ میں تمہاری بیعت نہیں کروں گا یعنی اگر صرف یہی سبب ہوتا اگر حکومت وقت امام حسینؑ سے بیعت نہ مانگتی تو امام حسینؑ کو بھی ان سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور آپؑ فرماتے کہ نہ تمہیں مجھ سے کوئی غرض ہے اور نہ میں تم سے کوئی سروکار رکھتا ہوں۔ تم مجھ سے بیعت نہیں چاہتے بس بات ختم ہے۔ چنانچہ اس سبب کے مطابق اگر وہ لوگ بیعت کا مطالبہ نہ کرتے تو حضرت ابا عبد اللہؑ بھی سکون ، امن، اور چین سے رہتے، اپنی جگہ بیٹھے رہتے ، کوئی سانحہ یا ہنگامہ برپا نہ ہوتا۔

البتہ تیسرے سبب کے مطابق امام حسینؑ تنقید اور اعتراض کرنے والے شخص ہیں۔ ایک انقلابی شخصیت ہیں، ایک قیام کرنے والے مرد ہیں، مثبت سوچ رکھنے والے انسان ہیں۔ اب کوئی اور محرکات ضروری نہیں ہیں۔ ہر جگہ خرابی پھیلی ہوئی ہے۔ خدا کا حلال حرام اور خدا کا حرام حلال ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے بیت المال پر نا لائق لوگوں کا قبضہ ہے اور اس کا مال ان طریقوں پر خرچ ہو رہا ہے جن کے لئے خدا کی رضا نہیں ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا :جو شخص ایسے حالات و اطوار دیکھے "فلم یغیر علیه بفعل ولا قول" پس اگر اسے اپنے قول و فعل سے تبدیل نہ کرے "کان حقاً علی اللّٰه ان یدخله مد خله" تو یہ سزاوار ہے (خدا کے قانون سے ثابت ہے) کہ خدا ایسے شخص کو وہاں لے جائے گا جہاں ظالم، جابر، ستم گار اور خدا کا دین بگاڑنے والے جائیں گے اور انہیں کے ساتھ اس کا حشر کرے۔ آپ اپنے جد کے قول کا حوالہ دیتے ہیں کہ ایسے حالات میں جو شخص جانتا اور سمجھتا ہے اور اعتراض نہیں کرتا اس کا حشر گنہگاروں کی جماعت کے ساتھ ہوگا۔ صرف یہی حدیث نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں پیغمبر اکرمؐ کی دوسری حدیثیں بھی موجود

ہیں۔ایک حدیث امام رضا علیہ السلام جناب پیغمبر خداؐ سے روایت فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے : "اذا تواکلت الناس الامر بالمعروف وانهی عن المنکر" جب لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک دوسرے پر ٹالنے لگیں یعنی ہر شخص خاموش رہے اور یہ انتظار کرے کہ دوسرا نیکی کا حکم دیگا اور بدی سے منع کریگا اور یوں نتیجے میں کوئی بھی کھڑا نہ ہو" فالیأذنو ابو قاع من اللّٰه" تو پھر لوگوں کو عذاب الٰہی کا منتظر اور اس کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ کیسا عذاب؟ آسمان سے پتھر برسیں گے؟ نہیں ! قرآن شریف کی آیتیں عذاب الٰہی کی یہ تفسیر کی گئی ہے :

" قل هوا القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم بأس بعض"(۱) (کہہ دے اے رسولؐ! کہ خدا قادر ہے، تم خدا کے عذاب سے ڈرو۔ خدا اس پر قادر ہے کہ تمہارے سروں پر عذاب نازل کرے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے عذاب کو جوش میں لائے یا تمہیں گروہوں میں بانٹ دے یا خود تمہارا نقصان تم تک پہنچا دے یعنی تمہیں ایک دوسرے سے لڑا کر مار دے۔) اہل بیت اپنی روایتوں میں یہ معانی بیان فرماتے ہیں : سر پر عذاب کا مطلب یہ ہے کہ ہم تم پر اوپر سے عذاب نازل کریں گے تم اپنے پاؤں تلے سے یعنی زیر زمیں سے عذاب دیکھو گے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا جس وقت لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں تو وہ منتظر رہیں کہ ان کے پیچھے سے عذاب الٰہی آنے والا ہے۔ پیغمبرؐ کی ایک اور حدیث بھی ہے جسے علماء شیعہ نے اپنی معتبر کتابوں جیسے اصول کافی میں درج کیا ہے اور سنی علماء نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ غزالی نے یہ حدیث احیاء العلوم میں نقل کی ہے اور اس کی سند اہل تسنن کی کتب احادیث میں ملتی ہے :" لتامرون بالمعروف و لتنهون عن المنکر

۱۔ ۶۵ سورۃ انعام۔

او یسلطن اللّٰہ علیکم شرارکم فید عواخیارکم فلا یستجاب لھم۔"

(یعنی نیکی کا حکم دیتے رہو اور بدی سے منع کرتے رہو ورنہ خدا تم پر بدوں کو مسلط کر دیگا۔ پھر تمہارے نیک لوگ بھی بلاتے رہیں گے تو انہیں جواب نہیں دیا جائیگا۔) لوگ زیادہ تر یوں مطلب بیان کرتے ہیں کہ جب برے تم پر مسلط ہوگئے تو تم میں سے نیک لوگ خدا کی درگاہ میں فریاد کریں گے لیکن خدا ان کی دعا کو قبول نہیں کریگا۔ یعنی جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیتے ہیں ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ خدا انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔ وہ چاہے خدا سے جتنی فریاد کریں اس گناہ کی وجہ سے ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ لیکن غزالی نے اس آیت کے ایک باریک معنی بیان کئے ہیں حالانکہ وہ ایک درویش صفت انسان ہے اور اجتماعی مسائل میں نہیں پڑتا، پھر بھی یوں کہتا ہے اس جملے: "فید عواخیار کم فلا یستجاب لھم" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ خدا سے فریاد کرتے ہیں اور خدا ان کی دعا قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں: جب لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں گے تو اتنے حقیر اور پست ہو جائیں گے کہ ان کا رعب، دبدبہ، عزت، کرامت ختم ہو جائیگی۔ چنانچہ جس وقت وہ انہیں ظالموں کی درگاہ میں جائیں گے تو چاہے جتنی ندا کریں گے ان کی کوئی نہیں سنے گا۔ یعنی پیغمبرؐ نے فرمایا: اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری عزت قائم رہے اور دوسرے تمہارے سامنے حساب دہ ہوں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرو البتہ جس وقت تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل نہیں رہو گے تو پہلی خاصیت تو یہ تمہاری کمزوری ہوگی، تم پست اور ذلیل ہو جاؤ گے اور پھر دشمن بھی تمہیں کچھ نہیں سمجھے گا۔

"بر در ارباب بے مروت دنیا"

(دنیا کے بے مروت لوگوں کے دروازے پر)

"چند نشینی کہ خواجہ کے بدر آید"

(تو کب تک اس انتظار میں بیٹھا رہے گا کہ مالک کب باہر آتا ہے)

اس وقت تم ایک غلام کی طرح چاہے جتنی خوشامد کرتے رہو کوئی تمہیں جواب بھی نہیں دے گا۔ یہ معنی بہت لطیف ہے۔ ہمارے اسلام کا یہ قطعی اصول ہے اور امام حسینؑ کی پاک ہستی نے اس اصول کا حوالہ دیا ہے چنانچہ وہ یوں سمجھاتے ہیں: فرض کیجئے کہ اہل کوفہ مجھے دعوت نہ دیتے، فرض کیجئے کہ یزیدی حکومت مجھ سے بیعت نہ مانگتی، پھر بھی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کے مطابق ساکت نہ بیٹھتا۔ ضروری ہے کہ ہم خود اس اصول کے بارے میں مزید گفتگو کریں۔ ہم بنیادی طور پر اس بات کے حاجت مند ہیں کہ اس اصول کو پہچانیں۔ یہ وہ اصول ہے پیغمبر اکرمؐ کی احادیث اور ائمہ اطہار کے فرمودات کی طرف بالکل توجہ نہ دیں اور اس فقہ اسلامی کی طرف بھی رخ نہ کریں جس کی ہر کتاب میں اور اس کے مختلف ابواب میں ابتدائے اسلام سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک باب چلا آتا ہے(۱) اور صرف قرآن ہی کو نظر میں رکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس مقدس آسمانی کتاب میں اس موضوع کا تکرار کیا گیا ہے اور جن گزشتہ قوموں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل نہیں کیا ہے ان کی حد درجہ بد بختی کا حوالہ دیتا ہے۔ "فلو لا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیة ینھون عن الفساد"(۲) قدیم نسلوں میں کچھ لوگ صاحب سرمایہ (سرمایہ عقلی، فکری، روحی) کیوں نہیں ہوئے جو فسادوں کے خلاف لڑتے جس سے یہ قومیں ان فسادوں سے تباہ نہ ہوتیں، نابود اور ہلاک نہ

۱۔ یعنی جس طرح عبادت کے باب میں کتاب الصلوۃ، کتاب الزکوۃ، کتاب الصیام، کتاب الحج، کتاب الجہاد ہے، معاملات میں کتاب البیع، کتاب الاجارہ ہے، کتاب الطلاق، کتاب الارث، کتاب الدیات، اور کتاب الحدود علی قصاص ہے اسی طرح کتاب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر بھی ہے۔

۲۔ سورۂ ہود آیت ۱۱۶

ہوتیں؟ دوسری قوم کے بارے میں فرمایا گیا ہے: "کانوا لا یتنا ھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون"(۱) یہ لوگ مجبور اور مصیبت زدہ ہوگئے، بلاک ہوگئے، مٹ گئے کیوں؟ اس لئے کہ یہ برائیوں سے منع نہیں کرتے تھے، بگاڑ کے خلاف جد و جہد نہیں کرتے تھے اور بہت سی برائیاں کرتے تھے۔ مسلمانوں سے خطاب فرمایا گیا ہے: "ولتکن منکم امة ید عون الی الخیرو یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئك ھم المفلحون"(۲)

تمہارے درمیان ایک ایسی امت، ایک ایسی جماعت ہونا چاہئے جس کا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا ہو۔ اگر لفظ "من" کو تبعیضی کہیں اور دوسری طرح تفسیر کریں تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں: تمہاری امت ایسی امت بنائی جائے یعنی تم سب کو ایک ایسی امت بن جانا چاہئے (تم نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو) یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ نیکی کا حکم اور بدی کی روک ٹوک تمام لوگوں کے لئے ایک عام فریضہ ہے اور ایک مقررہ طبقے کے لئے خصوصی فریضہ ہے جو اس بارے میں ایسی خصوصی ذمہ داری رکھتا ہے جو عوام الناس کی حد سے باہر ہے۔

تمہارے درمیان ایک ایسی جماعت ہو یا تم ایسی امت بن جاؤ جس کا کام نیکی کی طرف بلانا (امر بالمعروف) اور برائی سے روکنا (نہی عن المنکر) ہو "و اولئك ھم المفلحون" صرف ایسی ہی امت جس میں نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا ہو، نجات یافتہ، با عزت، بابرکت اور ثابت قدم ہو سکتی ہے اور بھلائی اور نجات پا سکتی ہے۔ سورۂ آل عمران میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق بہت سی آیتیں

۱۔ سورۂ مائدہ آیت ۷۹
۲۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۰۴

ملتی ہیں۔ میں نے جو آیت پڑھی وہ اس آیت کے بعد آتی ہے:

"واعتصموا بحبل اللہ جمیعاًولا تفرقوا"(۱)

یہ آیت لوگوں کو اتحاد کی دعوت دیتی اور تفرقے سے روکتی ہے: اے مسلمانو! اپنے درمیان تفرقے اور اختلاف کا وجود نہ ہونے دو۔ جو اختلاف پیدا ہوگئے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کرو۔ اختلافات کو کم کرو، یہ شگاف نہ بڑھنے دو، ان تفرقوں سے جو روز بروز شگاف بڑھتے جارہے ہیں کسے فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ کیا اسلام کے دشمن کے سوا بھی کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ دشمن ہم سے کیا چاہتا ہے؟ کیا وہ اس کے سوا بھی کچھ اور چاہتا ہے کہ ہم مذہب اور فرقے کے مختلف ناموں پر سدا ایک دوسرے سے دست و گریباں رہیں، ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہیں؟ قرآن کہتا ہے تفرقے سے بچو! پھر فرماتا ہے: "ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر۔" گویا یہاں "خیر" سے قرآن کی بیشتر مراد وہی اتحاد ہے یعنی تمہارے درمیان ایک جماعت ہونا چاہئے جو مسلمانوں کو برابر اتحاد اور اتفاق کی تلقین کرتی رہے۔ مسلمانوں میں جو تفرقے اور جھگڑے ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کرتی رہے۔ پھر فرماتا ہے: "ولا تکونوا کا لذین تفرقوا واختلفوا"(۲)

ان جماعتوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو متفرق اور مختلف ہوگئیں، فرقہ فرقہ اور گروہ گروہ ہوگئیں، ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں بٹ گئیں۔ آیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ اتحاد کی تلقین کرنے والی اور الگ الگ ہونے سے روکنے والی دو آیتوں کے درمیان یہ آیت آتی ہے: "ولتکن منکم امة ید عون الی الخیرو یأمرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئك ھم المفلحون۔"

۱۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۰۳
۲۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۰۵

یہ بالکل درست نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کے لئے افہام و تفہیم، وحدت اور اتفاق کو ایک ایسی نیکی سمجھتا ہے جو تمام نیکیوں کی ماں اور سرچشمہ ہے اور اختلاف اور فرقہ کو چاہے وہ کسی نام اور عنوان سے ہو سب سے بڑی برائی، غلاظت اور ناپاکی بتاتا ہے۔ دوسری آیت فرماتی ہے: "کنتم خیر امة اخرجت للناس" (اے مسلمانو! تم وہ بہترین امت ہو جسے بشریت کی بھلائی کے لئے ظہور کیا ہے) یعنی انسانیت کی بھلائی کے لئے تم سے بہتر امت آج تک پیدا نہیں ہوئی ہے۔ کیوں؟ کس صفت کے لحاظ سے؟" تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر۔" اس وجہ سے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ اس لئے منطقیوں کے قول کے مطابق ہم اس کی ضد کو یوں سمجھیں: ہم مسلمان قوم انسانیت کے لئے بہترین امت نہیں ہیں کیونکہ ہم نیکی کا حکم نہیں دیتے اور بدی سے نہیں روکتے۔ اس کے نتیجے میں ہم عزت اور عظمت کا دعوی بھی نہیں کر سکتے، کوئی فخر نہیں کر سکتے۔ ہمارا اسلام حقیقی اسلام نہیں ہے۔

اگر ہم اس بات کی اہمیت اور عظمت کے موضوع پر قرآن، سنت، حدیث اور ان باتوں کی رو سے جو اس ضمن میں کہی گئی ہے گفتگو کرنا چاہیں تو بہت سی روایتیں ملتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ اسلام نے اس موضوع کو کس قدر اہمیت دی ہے۔

البتہ اس کے لئے ایک تاریخی گفتگو کی ضرورت ہے جس سے یہ واضح ہو سکے کہ اس عظمت و اہمیت کا یہ موضوع وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کس وجہ سے اسلامی دنیا میں روز بروز کمزور اور چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ علمی نقطۂ نظر سے یعنی کتابوں میں سنیوں نے ہم شیعوں سے زیادہ اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ اگر ہم "کتاب الصلوٰۃ" سے لے کر "کتاب الدیات" تک شیعی فقہ کی کتابیں سنی

فقہ کی کتابوں کے مقابلے میں رکھ دیں تو ہم دیکھیں گے کہ تمام ابواب میں شیعی فقہ مجموعی طور پر زیادہ قطعی، زیادہ شرح، زیادہ مفصل، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مدلل ہے اور میں اس بات کو ثابت بھی کر سکتا ہوں لیکن بد قسمتی سے ہماری فقہی کتابوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باب تمام ابواب میں بہت چھوٹا ہو گیا ہے لیکن سنیوں میں عملاً چھوٹا ہو گیا ہے۔

معتزلہ جو سنی متکلمین کا ایک فرقہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اصول دین سمجھتا ہے فروع دین نہیں۔ شیعہ کہتے ہیں کہ اصول دین پانچ ہیں اور فروع دین آٹھ یا دس ہیں اور ان دس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو شمار کرتے ہیں۔ معتزلہ دین کے پانچ اصولوں کے قائل ہیں جن میں سے ایک امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی ہے لیکن خود انہوں نے اپنی کتابوں میں رفتہ رفتہ اس بحث سے بچتے بچتے اسے بالکل چھوڑ کر دیا۔ تمام مورخین کہتے ہیں کہ اس کا سبب وہ جھگڑا تھا جو اس موضوع پر گفتگو نے اپنے وقت کی سیاست سے پیدا کر لیا تھا۔ چونکہ یہ گفتگو خلفائے وقت کو عریاں کرتی تھی اور وہ اسے روکتے تھے اس لئے معتزلہ مجبور ہو گئے کہ اسے اپنی کتابوں میں بیان نہ کریں یا کم بیان کریں اگرچہ یہ ان کے مذہبی اصولوں میں سے ایک اصول شمار ہوتا تھا۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم شیعوں میں بھی یہ موضوع بہت مختصر رہ گیا ہے۔ یہاں تک چند صدیوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں عملی رسالوں میں کچھ بھی نہیں لکھا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ عملی رسالوں میں جو آخری کتاب میں نے دیکھی اور جس میں یہ موضوع پیش کیا گیا ہے شیخ بہائی کی جامع عباسی ہے جو تقریباً ساڑھے تین صدی قبل کی ہے۔ اس کے بعد پھر یہ موضوع عملی

رسالوں سے بھی مکمل طور پر نکال دیا گیا ہے۔ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نماز روزے کی طرح ہیں تو اسے دفن نہیں ہونا چاہئے۔ یہ کوئی غلامی کا مسئلہ نہیں ہے جو ہم کہیں کہ آج دنیا میں غلامی نہیں ہے جو ہم اس پر بحث کریں اور یہ معقول بات ہے۔ جس وقت وہ مسئلہ موجود تھا اس وقت اسلام میں غلاموں کے فائدے کے لئے احکام موجود تھے اور ان پر بحث درست تھی۔ جب غلامی ہی نہیں رہی تو اب اس کے بارے میں گفتگو غلط اور بے فائدہ ہے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایسا موضوع نہیں ہے جو کبھی ختم ہو سکتا ہو۔ یہ ہمیشہ موجود رہا ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا اس لئے اسے سب مسئلوں سے اوپر رہنا چاہئے۔ یہ کس لئے حذف کیا جائے؟ یہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے تاکہ ہم اسے بھول نہ سکیں۔

یورپ کے کچھ مستشرقین، اسلام کے خلاف دعویٰ کرتے ہیں یا یہ کہوں کہ اسلام پر الزام لگاتے ہیں اور اپنی بہت سی کتابوں میں اسے بار بار دہراتے ہیں۔ یہ اسلام کو بد نام کرتے ہیں کہ یہ قضا و قدر کا دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو انسان کے کسی فعال کردار اور ذمہ داری کا قائل نہیں ہے۔ یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانی فرائض کو خدا کے سپرد کردے۔ تم یوں ہی انتظار کرتے رہو دیکھو خدا کیا کرتا ہے۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام انسان کی آزادی اور اختیار کا قائل نہیں ہے۔ جو کچھ ہے خدا اور اس کا ارادہ ہے۔ بنیادی طور پر انسان اس سلسلے میں کسی کام کا فاعل نہیں ہے۔ اسی لئے اس پر کوئی ذمہ داری یا فریضہ بھی عائد نہیں ہوتا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اتفاق سے قرآن مجید یہودیوں پر یہی جرم عائد کرتا ہے۔ جس وقت موسیٰ نے ان سے کہا: "یاقوم ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللّٰه لکم"(۱) تو انہوں نے موسیٰ کو جواب دیا: "اذهب انت و ربك فقاتلا انا ههنا

۱۔ سورۂ مائدہ آیت ۲۱۔

قاعدون" (۱) اے موسیٰ! ہم تو اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں تم اور تمہارے خدا دونوں جاؤ، جنگ کرو اور دشمن کو ہماری سر زمیں سے نکال دو۔ بعد میں ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ بدر کی لڑائی میں جس وقت پیغمبر اکرمؐ اپنے اصحاب سے مشورہ کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا تھا: تمہاری کیا رائے ہے؟ اب قافلہ بھاگ گیا ہے آیا ہم دشمن کا پیچھا کریں یا مدینہ کو پلٹ جائیں؟ ہر شخص نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا۔ حضرت ابوذر غفاری یا جناب مقداد کندی میں سے کسی ایک بزرگ نے کہا یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہیں گے: "اذهب انت و ربك فقاتلا انا ههنا قعدون" تم اور تمہارا خدا چلے جاؤ کام انجام دو۔ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپؐ جو حکم دیں گے وہی ہوگا۔ اگر آپ حکم دیں کہ دریا میں کود جاؤ تو ہم کود جائیں گے۔ اگر آپ فرمائیں گے کہ آگ میں کود جاؤ تو ہم کود پڑیں گے۔ اس کے علاوہ یہ قرآن ہی ہے جو انسانی آزادی اور انسان کی شخصی ذمہ داری اور فریضے کے موضوع پر پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

"انا هدیناه السبیل اما شاکراً و اما کفوراً" (۲) "انا هدیناه النجدین" (۳) "و من اراد الاخرة و سعی لها سعیها و هو مؤمن فاولئك کان سعیهم مشکوراً" (۴) قرآن کی ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں "بما کسبت ایدیکم" آیا ہے۔ ہم خدا کو جن برائیوں اور خرابیوں سے نسبت دیتے ہیں خدا کا ان سے پاک اور بری ہونا قرآن بار بار بیان کرتا ہے: "ما ظلمنا هم ولکن

۱۔ سورۂ مائدہ آیت ۲۴
۲۔ سورۂ دہر آیت ۳
۳۔ سورۂ بلد آیت ۱۰
۴۔ سورۂ اسریٰ آیت ۱۹

کانوا انفسهم یظلمون"(۱) اگر لوگ مصیبت زدہ اور مجبور ہوگئے تو ہم نے ان پر ظلم نہیں کیابلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

ان افترا پردازیوں اور جھوٹی باتوں کے بالکل بر عکس ایک اور بات یہ ہے کہ اسلام میں ایک ایسا مسئلہ موجود ہے جو دوسری قوموں (آج کی دنیا اور قوموں) میں دینی قانون کی حیثیت سے نہیں ملتا۔ (البتہ میں یہ نہیں کہتا کہ قدیم پیغمبروں کے یہاں نہیں تھا)اور وہ یہ ہے : اسلام تنہا ایک فرد کو اپنے لئے اور خدا کے سامنے ذمہ دار ، جواب دہ اور مکلّف نہیں جانتا ہے بلکہ فرد کو جماعت کے لحاظ سے بھی ذمہ دار اور جواب دہ سمجھتا ہے۔ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" یہی ہے کہ انسان! تنہا بطور ایک شخص یا ایک فرد اپنے پروردگار کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہے بلکہ سماج کے سامنے بھی ذمہ دار ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا دین قضا و قدر کا دین ہے؟ البتہ قضا و قدر اس مفہوم میں جس میں وہ کہتے ہیں یعنی خدا کام پورے کرتا رہے اور انسان اس وقوع اور دائرے سے باہر ہو انسان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ ایسی قضا و قدر جو انسان کی خود مختاری اور ذمہ داری چھین لیتی ہے، قرآن ایسی قضا و قدر کو تسلیم نہیں کرتا۔ کیا آپ اس سلسلے میں اس چھوٹی سی آیت سے بہتر کوئی جملہ پیش کر سکتے ہیں۔ قرآن میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دو مقامات پر آیا ہے؟ "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسهم"(۲)

یہ آیت ان لوگوں کو جو اس انتظار میں رہتے ہیں کہ خدا ہمیشہ کسی غیر معمولی طریقے پر کاموں کو درست کر دے گا صاف صاف بتاتی ہے کہ بے فائدہ انتظار نہ کرو۔ "انّ" یعنی تحقیق کی رو سے بات یہ ہے، حقیقت اور واقعی یہ ہے کہ وہ

۱۔ سورۂ نحل آیت ۱۱۸
۲۔ سورۂ رعد آیت ۱۱

لوگوں کے حالات اور اطوار اس وقت تک نہیں سدھارتا "حتی یغیروا ما بانفسهم" جب تک کہ وہ لوگ خود ان باتوں کو تبدیل نہیں کرتے جو ان سے متعلق ہیں، جو ان کے اندر ہیں : اخلاق، ذہنیت، صلاحیتیں، غرض، نیت اور آخر میں خود ان کی ذات۔ کیا آپ اس سے بھی واضح اور صاف ذمہ داری دکھا سکتے ہیں؟ کسی جماعت کی پیش نظر ذمہ داری۔

ایک اور آیت میں ایک قدیم بگڑی ہوئی امت کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے : "ذلك بان الله لم یك مغیراً نعمة انعمها علی قوم حتی یغیروا ما بانفسهم"(۱)

ایک لحاظ سے اس آیت میں تاکید نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہ وہ لوگ یوں بگڑ گئے اور چونکہ انہوں نے اپنی حالت خراب کر لی ہم نے بھی اس کی اچھی حالت کو بری حالت میں تبدیل کر دیا فرماتا ہے : "ذلك بان اللّٰه" یہ اس وجہ سے ہے یعنی خدا ایسا نہیں ہے یعنی ایسا خدا جو یہ قبول کرتا ہے کہ خدا ایسا نہ ہو (جس وقت انسان کہتا ہے کہ میں ایسا نہیں ہوں ، میں ایسا نہیں رہا ہوں تو وہ اپنی شخصیت پر بھروسہ کر کے یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں ایسا شخص ہوں کہ میری شخصیت کا لازمہ یہ ہے کہ میں گزرے زمانے میں ایسا تھا، آج بھی ایسا ہی ہوں) فرماتا ہے : "ذلك بان الله لم یك مغیراً نعمة انعمها علی قوم حتی یغیّروا ما بانفسهم" خدا ایسا نہیں تھا یعنی اللہ یوں مانتا ہے۔ قرآن میں ایک اور آیت ہے جسے "لم یك مغیرا" کی مناسبت سے عرض کرونگا۔ "وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا"(۲) ہم کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک کہ اس کے سامنے اتمام حجت

۱۔ سورۂ انفال آیت ۵۳
۲۔ سورۂ اسری آیت ۱۵

نہ ہو جائے۔ ہم کسی قوم پر اس وقت عذاب نازل کرتے ہیں جب وہ لوگ بات کو سمجھ لیتے ہیں لیکن اپنی سمجھ اور عقل کے باوجود دوسری طرح عمل کرتے ہیں۔ فرماتا ہے: "ما کنا معذبین" ہم ایسے نہیں تھے یعنی ہمارا جذبہ قبول نہیں کرتا کہ ہم ایسے ہوں ہمارا خدا یہ منظور نہیں کرتا ہے کہ ہم دوسری طرح کے ہوں۔

" ذلك بان الله لم يك مغيرا نعمة انعمها على قوم حتى يغيروا ما بانفسهم" خدا ایسا نہیں ہے۔ کیا ہم اس سے بہتر ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس سے زیادہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ ہم "انتظارات" کی شکل میں جس قسم کے انتظار کر رہے ہیں وہ بے فائدہ ہیں؟ ہم قرآن کی نص سے ٹکرا نہیں سکتے۔

علامہ اقبال نے اسی آیت سے ایک نکتہ پیدا کیا ہے جو بہت ہی اعلیٰ ہے۔ "حتی یغیروا" کی ضمیر سے نکالا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن فرماتا ہے: (۱) "حتی یغیروا ما بانفسهم" اگر ایسا کہتا تو اس کے معنی یہ ہوتے: خدا آدمیوں کے احوال کو چاہے وہ اچھے ہوں چاہے برے ہوں اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ خود ان سے متعلق یعنی روح، اخلاق، اور ان خصوصیات سے متعلق جو ان کے اختیار اور عمل میں ہیں احوال اور اوضاع بدل نہیں جاتے۔ وہ انکار (نہ) کرتا ہے: "یغیروا" جب تک وہ خود اپنی ایجاد، اختیار اور سوچ کے ثبات میں پیش رفت نہیں کرتے ان کی وضع اور حالت نہیں بدلتی یعنی اگر کوئی اور قوم آکر لوگوں کے اطوار و احوال زور زبردستی سے بدلنا چاہے جب تک کہ وہ لوگ خود ارادہ نہیں کر لیتے جب تک کہ وہ لوگ خود سوچ بچار میں ثبات پیدا نہیں کرتے ان کی وضع نہیں بدل سکتی۔ اے لوگو! انتظار نہ کرو کہ باہر سے دوسرے آئیں اور تمہاری وضع درست کریں۔ جو قوم یہ چاہے کہ باہر کے مشیر اس کے لئے کوئی ارادہ کریں تو کبھی بھی آدمی نہیں بن

۱۔ اقبال شناسی مصنفہ سید غلام رضا سعیدی

سکے گی۔ چونکہ وہ "یغیروا" نہیں ہے لہذا اسے یغیروا ہونا چاہئے۔ اس کے پاس ایجاد، خیال اور اسکیم ہونا چاہئے۔ اسے خود اپنے لئے فیصلہ اور انتخاب کرنا چاہئے۔ جس وقت کوئی قوم ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں اس نے اپنے لئے کوئی فیصلہ کیا، خود ہی اپنا راستہ منتخب کیا۔ خود ہی اپنے کام میں طباعی دکھائی وہ قوم خدا کی رحمت اور تائید کی آس لگا سکتی ہے اور ان چیزوں کا انتظار کر سکتی ہے جن کے قرآن نام گناتا ہے خدا کے فیوض، خدا کی امداد اور خدا کی تائید کی توقع کر سکتی ہے۔ اگر بیکار انتظار کرنا درست ہوتا اور انسان اپنی انسانی شخصیت پر ہی بھروسہ کرتا تو امام حسینؑ ہر شخص سے زیادہ اس بات کے لائق تھے کہ اس وقت تک انتظار کرتے رہتے جب تک خدا اپنی رحمت ان پر اور ان کی امت پر نازل نہ کرتا۔ پھر انہوں نے انتظار کیوں نہیں کیا؟ امام حسینؑ چاہتے تھے "انّ الله يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بانفسهم" ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی طباعی سے کام لیں۔ سماجی حالات میں تبدیلی لائیں اسی پیغمبر اکرمؐ کی زبان سے کام لیتے تھے: "فلم يغير عليه بفعل ولا قول كان حقاًعلى الله ان يدخله مدخله" کیسے تبدیل کریں؟ کیا ارادہ کریں؟

سیدھے سادے کاموں سے ہم بھی واقف ہیں انجام دے سکتے ہیں۔ سادہ مسائل کی سطح پر کام تو سبھی خوب کر لیتے ہیں مثلاً اسلام نے کہا ہے کہ حاجی کی زیارت کو جاؤ (خوب، ہم جاتے ہیں، چائے پیتے ہیں، مٹھائی کھاتے ہیں، کھڑے ہوتے ہیں، آجاتے ہیں) جنازے کے پیچھے پیچھے جاؤ، نماز جنازہ میں شرکت کرو۔ یہ اسلام کے آسان کام ہیں۔ ہر شخص یہ آسان کام کر سکتا ہے۔ اسلام ہمیشہ ایسے کاموں سے نہیں چلتا۔ ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ اس وقت امام حسینؑ کی طرح کھڑا ہونا اور حرکت کرنا چاہئے، امام حسینؑ کی طرح قیام کرنا چاہئے جو نہ صرف اس دن کے اسلامی معاشرے کو جھنجھوڑ ڈالے بلکہ اسکی لہر پانچ سال کے بعد ایک رنگ میں اپنا اثر دکھائے دس سال

بعد دوسرے رنگ میں اثر ڈالے تیس سال بعد ایک اور شکل میں ساٹھ سال کے بعد کسی اور شکل میں سو سال پانچ سو سال کے بعد اور شکلوں میں اور ہزار سال کے بعد بھی تحریکوں میں روح پھونکے۔ اسکو کہتے ہیں: "یغیروا ما بانفسھم"

ہم اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں۔ کیا امام حسینؑ اپنے بچوں سے محبت نہیں کرتے تھے؟ یقیناً وہ زیادہ محبت کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ایسے نہیں تھے کہ ہم سے کم اپنے اسماعیلؑ کو پیار کرتے تھے، بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہم سے بہتر انسان تھے اور یہ جذبات انسانی جذبات ہیں، وہ ہم سے بہتر انسان تھے اور ناگزیر طور پر ان کے انسانی جذبات بھی زیادہ بہتر تھے۔ امام حسینؑ بھی ہم سے زیادہ اپنے بچوں کو پیار کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خدا کو سب انسانوں اور سب چیزوں سے زیادہ دوست رکھتے تھے۔ وہ خدا کے سامنے اور خدا کی راہ میں کسی کو گنتی میں نہیں لاتے تھے۔

لکھا ہے کہ جن دنوں لبا عبداللہ علیہ السلام کربلا کی طرف بڑھ رہے تھے ان کا پورا خاندان ان کے ساتھ تھا۔ دراصل ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جب انسان سفر پر جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہوں تو اس کے سامنے ایک فطری ذمہ داری جاگ اٹھتی ہے اور ان کیلئے وہ برابر فکر مند رہتا ہے کہ کیا ہوگا؟

لکھا ہے کہ اسی طرح سفر کر رہے تھے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو نیند آگئی اور اسی سواری کی حالت میں غنودگی طاری ہوگئی۔ ذرا سی دیر کے بعد آپ نے سر اٹھا کر فرمایا: "انا للہ و انا الیہ راجعون" جس وقت آپ نے یہ جملہ کہا اور کلمہ رجاع زبان پر جاری کیا سب لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ امامؑ نے یہ جملہ کس لئے ادا کیا، کیا کوئی نئی خبر ہے امامؑ کے ایک عزیز بیٹے تھے، وہی جنہیں امام حسینؑ بہت چاہتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ان صفات کے علاوہ ایک خاص

صفت جس کے باعث یہ اپنے والد بزرگوار کو بہت زیادہ عزیز تھے آپکی پیغمبر اکرمؐ سے کامل شباہت تھی (جب ایسا فرزند خطرے میں گھرا ہو تو باپ کو جتنا دکھ ہو کم ہے) یعنی جناب علی اکبر سامنے آکر عرض کرتے ہیں: "یا ابتاہ! لم استرجعت؟" آپ نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" کیوں کہا؟ آپؑ نے فرمایا: میں نے نیند میں فرشتے کی آواز سنی جو کہتا تھا: "القوم یسیرون والموت تسیر بھم" یہ قافلہ سفر کر رہا ہے لیکن موت ہے جو اس قافلے کو بڑھائے لئے جارہی ہے یعنی اس طرح میں فرشتے کی آواز سے سمجھ گیا کہ ہمارا انجام موت ہے۔ ہم اپنی موت کے یقینی انجام کی طرف جا رہے ہیں۔ بالکل وہی بات جو حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ سے کہتے ہیں(۱)

انہوں نے کہا: بابا جان! "اولسنا علی الحق؟" کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ کیوں میرے پیارے بیٹے؟ جب مطلب صرف اس طے شدہ بات سے ہے کہ ہم کو مقدر جس طرف لے جارہا ہے، جارہے ہیں۔ بابا! مقدر میں موت ہے یا حیات، اس

۱۔ جس وقت حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ سے کہتے ہیں: اے بیٹے! میں خواب میں بار بار دیکھتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ یہ معمولی خواب نہیں ہے۔ یہ ایک وحی ہے۔ مجھے خدا کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ تجھے ذبح کر ڈالوں۔ (حضرت ابراہیمؑ اس بات کے فلسفے سے بالکل واقف نہیں ہیں البتہ انہیں یقین ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے) یہ بیٹا کیا کہتا ہے؟ آیا مثلاً یہ کہا کہ بابا! یہ خواب ہے۔ اگر کوئی مرنے کا خواب دیکھے تو اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ انشاء اللہ میری عمر دراز ہوگی؟ انہوں نے کہا: "یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شآء اللہ من الصابرین" بابا! چونکہ یہ بات خدا کی طرف سے آئی ہے اور وحی اور خدا کا حکم کافی ہے۔ اور کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جس وقت حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کا سر کاٹنا چاہتے ہیں ان پر یہ وحی نازل ہوتی ہے: "فلما اسلما وتله للجبین و نادیناہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا" ابراہیم! ہم نہیں چاہتے کہ تم اپنے بیٹے کو ذبح کرو۔ ہمارا مقصد یہ نہیں تھا۔ اس کام کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو جائے تم باپ اور بیٹے خدا کے حکم کے سامنے کتنے اطاعت گزار ہو؟ تم خدا کا حکم بجا لانے کے لئے کتنے آمادہ ہو؟ اس اطاعت کا دونوں نے ثبوت دیدیا: باپ نے قربانی دینے کی حد تک اور بیٹے نے قربان ہونے کی حد تک۔ ہم اس سے زیادہ نہیں چاہتے تھے۔ اپنے بیٹے کا سر جدا نہ کر۔

سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہم حق کے راستے پر چل رہے ہیں یا نہیں؟ امام حسینؑ وجد میں آئے، خوش ہوگئے اور چہرہ بشاش ہوگیا آپکی اس دعا سے انسان سمجھ سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اس وقت اس قابل نہیں ہوں کہ تجھ جیسے شائستہ فرزند کے شایان شان جزا دے سکوں۔ خدا سے دعا مانگتا ہوں: اے خدا تو میری جگہ اس فرزند کو وہ جزا عطا فرما جو اس کے لائق ہو۔ "جزاك الله عنی خیر الجزاء" باپ کس قدر چاہتا ہے کہ ایسے فرزند کو مناسب موقع پر جزا دے؟ اب ذرا تصور کیجئے کہ عاشور کے دن ظہر کا وقت گزر چکا ہے۔ یہی بیٹا اسی باپ کے سامنے میدان جنگ میں جاکر دلیری اور جرأت دکھا چکا ہے، زور مندوں کو پچھاڑ چکا ہے، وار کر چکا ہے، وار کھا چکا ہے۔ حال یہ ہے کہ ان کا منہ خشک اور زبان خشک ہو کر لکڑی کی طرح سخت ہوگئی ہے۔ میدان سے پلٹتے ہیں۔ ان حالات میں (میں نہیں جانتا اس روز باپ نے جو جملہ اس سے کہا تھا وہی شاید اسے یاد ہو) آتے ہیں اور باپ سے درخواست کرتے ہیں: "یا ابتاہ! العطش قد قتلنی وثقل الحدید اجهدنی فهل الی شربة من الماء سویل؟" بابا جان! پیاس مجھے مارے ڈال رہی ہے۔ ہتھیاروں کا وزن مجھے تکلیف دے رہا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرے حلق میں پانی کا ایک گھونٹ پہنچ جائے جس سے مجھ میں قوت آجائے اور میں واپس جاکر جہاد کروں؟ اس فرزند رشید کو امام حسینؑ جو جواب دیتے ہیں وہ یہ ہے: پیارے بیٹے! مجھے امید ہے کہ تم جتنی جلد شہادت پر فائز ہوگے، اپنے جد کے ہاتھوں سیراب ہوگے۔

"ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم
و صلی اللّٰه علی محمد و آله الطاهرین"

تیسری مجلس

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے شرائط

بسم اللّٰه الرّحمن الرّحیم

"اعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم۔" "التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الامرون بالمعروف والناهون عن المنکر و بشر المؤمنین (۱)

پچھلی دونوں راتوں میں جو باتیں عرض کی گئیں ان سے معلوم ہوا کہ تحریک حسینی میں کل تین عوامل کارفرما رہے ہیں۔ ایک بیعت سے انکار، دوسرے اہل کوفہ کی دعوت قبول کرنا اور تیسرے جو دونوں سے زیادہ مستحکم ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان تینوں میں سے ہر ایک نے از خود امام کے لئے ایک خصوصی فرض قبول کرلیا۔ ایک خاص رد عمل پیدا کردیا۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس تحریک کی قدر و منزلت ان تینوں عوامل کے مطابق مختلف اور جدا جدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم صرف اہل کوفہ کی دعوت کے عامل کو نظر میں رکھیں تو اس تحریک کی ایک مقررہ حد تک اہمیت ہوگی۔ اگر بیعت سے انکار کے عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کی اہمیت اور قدر و منزلت بہت زیادہ اور عظیم ہوگی۔ اگر

۱۔ یہ تقریر ۱۳۴۸،۱۲،۲۵ مطابق ۸ محرم ۱۳۹۰ ہجری کو کی گئی

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کی اہمیت سو فیصدی بڑھ جائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ دعوت کے عامل سے کامیابی کا امکان تقریباً پچاس فیصدی یا اس سے بھی کمتر ہے لیکن بیعت سے انکار کے عامل سے اتنا بھی امکان نہیں ہے بلکہ وہ تو سو فیصدی خطرناک مقابلہ ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور بیعت کے عامل میں بھی اتنا ہی عظیم فرق ملتا ہے۔ بیعت کے عامل میں مطالبہ دشمن کی طرف سے ہے یعنی ایک غیر شرعی اور ناجائز مطالبہ ہے اس لئے امامؑ اس مطالبہ کے جواب میں "نہ" کہتے ہیں۔ منع کر دیتے ہیں، قبول نہیں کرتے۔ اگر ہم صرف اسی عامل کو نظر میں رکھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ لوگ امامؑ سے یہ مطالبہ نہ کرتے تو امامؑ ان کے مقابلے میں نہ کھڑے ہوتے۔ چونکہ انہوں نے یہ مطالبہ کردیا اس لئے امامؑ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو یہ مطالبہ قبول نہیں کرتا ان لوگوں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ لیکن جب ہم تیسرے عامل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو نظر میں رکھتے ہیں نہ تو کوفہ کی دعوت اور نہ بیعت کا تقاضا بلکہ خود امامؑ ان کے مقابلے میں قیام کرتے ہیں اور یہاں بیعت کا مطالبہ بھی پیچھے جا پڑتا ہے بلکہ غور کریں تو امامؑ از خود ان لوگوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔ دراصل حالات کا بگاڑ، برائیوں کا پھیلاؤ، منکرات و ممنوعات کا عام ہونا، خود امامؑ کے الفاظ میں حرام کا حلال ہونا اور آخر میں معاشرے کو بگاڑ نے والے ناگفتہ بہ حالات امامؑ کو ان کے مد مقابل کھڑا کر دیتے ہیں اور آپ کو قیام تک مجبور کرتے ہیں۔ امامؑ کے قیام کی اہمیت اس تیسرے عامل سے بہت بڑھ جاتی ہے یہ عامل ایک دوسری ہی شکل اختیار کر لیتا ہے، دوسرا ہی حساب کھول دیتا ہے اور اس بات کا نہایت اچھا اور اعلیٰ عامل حالات کا یہی پہلو ہے جس نے اس تحریک کو ایسی شائستگی عطا کر دی ہے کہ یہ ہمیشہ تاریخ کی پیشانی پر چمکتی رہے، "ابدالاباد" تک زندہ

رہے اور دنیا میں ایک دائمی عامل اور بے مثال تحریک بن جائے۔ البتہ میں اس عامل میں ایک خصوصیت کا اضافہ کروں گا۔

یہ عامل اس تحریک کی اہمیت بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے اور اس دلیل کی رو سے ہمیں چاہئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلام کے نقطۂ نظر سے پہچاننے کی کوشش کریں کہ یہ کیا اصول ہے؟ یہ کیا چیز ہے جو اس قدر بنیادی اور طاقتور ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ امام حسینؑ جیسے بہادر شخص کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اسلام کی خاطر اپنی جان کی بازی لگادیں، اپنا خون بہائیں، اپنے رشتہ داروں کا خون بہائیں اور اپنی جان ایسی ہلاکت اور مصیبت میں ڈال دیں جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ تب ہم تقریباً تیرہ سو سال بعد امامؑ کے سامنے کھڑے ہو کر یوں گواہی دیتے ہیں:

"اشهد انك قد اقمت الصلوٰة و آتيت الزكوٰة و امرت بالمعروف و نهيت عن المنكر و جاهدت فى الله حق جهاده حتى اتك اليقين"(۱) اس گواہی کے مفہوم پر ٹھیک ٹھیک غور کیجئے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ اس کے تمام شرائط کے ساتھ ادا کی۔ (۲)

۱۔ زیارت وارث

۲۔ زکوٰۃ صرف پیسہ دے دینا نہیں ہے۔ دولت کی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ گویائی کی زکوٰۃ ہوتی ہے، سوچ بچار کی زکوٰۃ ہوتی ہے، انسانی جسم کی مجموعی زکوٰۃ ہوتی ہے، ہاتھوں اور پیروں کی زکوٰۃ ہوتی ہے، آنکھ کی زکوٰۃ ہوتی ہے، کان کی زکوٰۃ ہوتی ہے، یعنی ہر اس نعمت کا ایک حصہ جو خدا نے آپ کو عطا کی ہے جس وقت آپ خدا کی مخلوقات کے فائدے کے لئے دے دیتے ہیں تو گویا آپ نے اس کی زکوٰۃ دے دی۔ آپ قرآن میں پڑھتے ہیں: "الذين يومنون بالغيب و يقيمون الصلوة و مما رزقنٰهم ينفقون" (سورۂ بقرہ آیت ۳) متقی وہ لوگ ہیں جو غیب اور غیر محسوس پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انہیں جو کچھ عطا کیا ہے وہ اسے دوسروں کو بخش دیتے ہیں۔ جس وقت معصومؑ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے جس کے لئے خدا نے فرمایا ہے کہ: .....

"وامرت بالمعروف و نهيت عن المنكر" آپ نے نیکی کی ہدایت کی اور بدی سے روکا یعنی آپ کی پوری تحریک نیکی کا حکم اور بدی کی ممانعت ہے۔ "وجاهدت فی اللّٰہ حق جهاده" آپ نے خدا کی راہ میں جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اب ایک نکتہ یہ ہے کہ ہم زیارت وارثہ میں کہتے ہیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں۔ ہم کس شخص کے لئے گواہی دیتے ہیں؟ ہم عام طور پر قاضی کے یہاں جاکر گواہی دیا کرتے ہیں۔ جب قاضی کے سامنے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی اور ہم اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں : قاضی صاحب ! میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں شخص نے فلاں وقت فلاں عنوان کے تحت ان صاحب سے اتنی مقدار کی واپسی کا تقاضا کیا تھا۔ ہم اس وقت گواہی دیتے ہیں۔ ہم کس شخص کے سامنے گواہی دیتے ہیں؟ کیا خدا کے سامنے گواہی دیتے ہیں؟ کس کے حق میں؟ امام حسینؑ کے حق میں؟

معانی و بیان کے علماء ایک نکتے کا ذکر کرتے ہیں جو بہت اعلی ہے اور وہ یہ ہے کہ : بعض اوقات انسان کسی موقع پر کوئی بات اس لئے نہیں کہتا کہ سننے والا سمجھ جائے، اسے وہ بات سمجھائے بلکہ سننے والے کو یہ سمجھانے کے لئے کہتا ہے کہ میں اسے یوں سمجھ رہا ہوں۔ یہ بات بہت عام سی ہے۔ کبھی کبھی آپ کسی کے سامنے کسی بات کی گواہی دیتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ سمجھ جائے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ خود یہ بات سمجھتا ہے بلکہ آپ اپنی گواہی سے اسے یہ سمجھانا چاہتے ہیں اس کے سامنے اقرار کرتے ہیں تاکہ وہ جان لے کہ آپ یہ بات جانتے اور سمجھتے ہیں۔

..... ہم نے جو کچھ انہیں عطا کیا ہے؟ تو امامؑ فرماتے ہیں : "اے مما علمنا ہم یعلمون۔" اس میں مال و دولت کی خصوصیت نہیں ہے۔ اس کی ایک نظیر یہ ہے کہ اگر تم عالم ہو اگر تم کوئی ایسی بات جانتے ہو جو دوسرے نہیں جانتے اگر تمہارے پاس ایسا علم ہے جو انسان کے لئے مفید ہے تو راہ خدا میں اس کی زکوۃ یہ ہے کہ اسے حاجت مندوں تک پہنچاؤ۔ یہ بھی زکوۃ اور انفاق ہے۔

اس مقام پر گواہی کے معنی اقرار کے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں یعنی میں بھی ہر سمجھدار اور حقیقت جاننے والے آدمی کی طرح اس بات کا اعتراف کرتا ہوں اور یہ بات مانتا ہوں اے ابا عبد اللّٰہ ! کہ آپ کی تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک تھی یعنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ نے صرف اہل کوفہ کی دعوت پر قیام نہیں کیا۔ آپ تو ان کی دعوت سے پہلے ہی قیام کر چکے تھے۔ کوفیوں نے آپ کو بعد میں دعوت دی۔ میں گواہی دیتا ہوں مانتا ہوں کہ آپ کی تحریک صرف یہ نہیں تھی کہ میں بیعت نہیں کرتا یعنی آپ کی تحریک صرف بیعت سے انکار کی تحریک نہیں تھی۔ آپ کی تحریک میں تو دوسری ہی بات شامل تھی۔ آپ نے اسلام میں ایک اور ہی اصول جاری کر دیا اور وہ اصول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصول ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نے حسینی تحریک کے مقام اور قدر کو بہت بلند کر دیا ہے۔ اس ایک خصوصیت بلکہ اور بھی دوسری خصوصیات کے علاوہ میں ایک ایسی خوصیت بیان کرتا ہوں جو پیغمبروں، اللّٰہ کے ولیوں اور مومنوں کی تمام تحریکوں کو دوسرے انسانی رہبروں اور غیر رہبروں کی تحریک سے ممتاز کرتی ہے ، امتیاز بخشتی ہے۔ وہ کیا ہے؟ انسان کے عمل کا ایک جسم ہوتا ہے اور ایک روح ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں اور آپ کوئی کام یکساں طور پر انجام دیں لیکن کس نقطۂ نظر سے یکساں؟ اس نقطۂ نظر سے کہ میرے کام کا جسم آپ کے کام کے جسم جیسا ہے۔ فرض کیجئے ہم دونوں آدمی نماز پڑھتے ہیں۔ ہم دونوں فلاں نیک کام میں پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ میں سو روپے دیتا ہوں آپ بھی سو روپے دیتے ہیں۔ میں چار رکعت نماز پڑھتا ہوں آپ بھی چار رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ ان کاموں کی ادائیگی میں ایک دوسرے کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ آپ جس خلوص نیت ، خضوع اور خشوع، جس اخلاص و محبت ، جس عشق اور

جس روحانی جذبے سے سر شار ہوں اس سے میں نہ ہوں۔ یہ بات آپ کے کام کی قدرو قیمت کو میرے کام سے ہزار گنا بڑھا دیتی ہے۔ خدا کی راہ میں تو بہت سے لوگوں نے جہاد کیا ہے لیکن" ضربته علی یوم الخندق افضل من عبادة الثقلین" کس لئے ہے؟ علی کا ایک وار اتنی اہمیت حاصل کر جاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ علی وہاں پہنچ گئے تھے جہاں اہل عرفان کے قول کے مطابق "فانی فی اللّٰہ" ہوگئے تھے یعنی ان کے وجود میں انانیت اور خودی جیسی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ اس حال میں جب دشمن آپ کے منہ پر تھوک دیتا ہے تو آپ اس کا سر کاٹنے سے رک جاتے ہیں کہ کہیں اس کے اس فعل سے پیدا ہونے والا غصہ آپ کے عمل پر اثر انداز نہ ہو جائے، آپ کے عمل کی روح کو متاثر نہ کردے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مقام پر اس کا وجود باقی نہ رہے۔ ان کی روح میں صرف خدا کا وجود ہو۔ آپ یہ پہلو صرف انبیاء اور اولیاء کے مکتب میں دیکھیں گے۔ انبیاء کے مکتب کے علاوہ کسی اور مکتب میں ایسی بات نہیں پائیں گے۔

اس آیت میں جو ابتدا میں تلاوت کی گئی. "التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الامرون بالمعروف و الناهون عن المنکر" (سورۂ توبہ آیت ۱۱۲) دوسرے چند لفظوں کے بعد "التائبون" کا لفظ آتا ہے۔ یعنی خدا کی طرف پلٹنے والے۔ عرفاء کہتے ہیں کہ سلوک کی پہلی منزل توبہ ہے کیسی توبہ یعنی واپسی۔ جو شخص کسی دوسری راہ پر چلتا ہے وہ ایک بار حق کی راہ پر واپس آتا ہے، خدا کی طرف پلٹتا ہے التائبون العابدون توبہ کے بعد یہ لوگ خدا کے عبادت گزار ہو جاتے ہیں۔ خدا کی عبادت کرتے ہیں، غیر خدا کو نہیں پوجتے۔ خدا ان کے وجود پر حکومت کرتا ہے۔ خدا کے علاوہ ان کا کوئی حاکم نہیں ہوتا۔ یہ صرف خدا کا حکم مانتے ہیں۔ غیر خدا کا حکم نہیں مانتے۔ خدا کی اطاعت کرتے ہیں غیر خدا کی

پیروی نہیں کرتے۔ الحامدون۔ یہ حمد کرتے ہیں لیکن خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کی تعریف نہیں کرتے۔ دوسری ہستی کو مطلق اس لائق نہیں سمجھتے کہ اس کی مدح کریں، اسے سراہیں، اس کے گن گائیں۔ یہ صرف خدا کی تعریف کرنے اور اسی کے گن گانے والے ہیں۔ "السائحون" سیاحت کرنے والے ہیں۔ سیاحت کے بارے میں تفسیروں میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد روزہ رکھنا ہے یعنی روحانی سیاحت جو روزے میں ہوتی ہے لیکن بہت سے محققین کی طرح علامہ طباطبائی بھی المیزان میں اسے نہیں مانتے۔ ایک گمان یہ ہے کہ وہ لوگ جو زمین کی سیر کرتے ہیں کیونکہ قرآن میں انسان کو زمین کی سیر کی دعوت دی گئی ہے، زمین کی کیسی سیر؟ دنیا کا مطالعہ۔ وہ سیر و سیاحت نہیں جس کا مقصد صرف تفریح اور من بہلاوا ہو! اسلام انسان کی زندگی کو اس سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے وہ صرف تماشائی کی حیثیت سے دنیا کی سیر کرتا پھرے، البتہ اسلام ایسی سیاحت کی سفارش کرتا ہے جس میں انسان سوچے، غور کرے، سبق حاصل کرے: "قل سیروا فی الارض" یہ سبق اور سوچ بچار ہے۔ "السائحون" وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے، وہ انسانی معاشروں کے حالات کا مطالعہ کرنے والے، وہ آفرینش کائنات کے قوانین کا مطالعہ کرنے والے، وہ جو اپنے ذہنوں میں کثیر تعداد روشن خیالات رکھتے ہیں۔ اس کے بعد عبادت کے دو مظاہر بیان کرتی ہے: "الراکعون الساجدون" وہ لوگ جو رکوع اور سجدے کی حالت میں اپنے خدا کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ رکوع میں کہتے ہیں: "سبحان ربی العظیم و بحمده۔" سجدوں میں کہتے ہیں: "سبحان ربی الا علی و بحمده وہ سبحان ربی العظیم و بحمده "کہنے والے۔ وہ "سبحان ربی الا علی و بحمده" کہنے والے ہیں۔ وہ "الامرون بالمعروف و الناهون عن المنکر" ایسی روح، ایسے خیالات، ایسے روحانی سامان، ایسی روحانی پونجی اس لئے رکھتے ہیں کہ

کی اصلاح کریں۔ وہ لوگ جو پہلے خود نیک بن چکے ہیں بعد میں چاہتے ہیں کہ دوسروں کی اصلاح کریں دوسروں کو نیک بنائیں۔ آمر معروف اور ناہی منکر یعنی مصلح، اصلاح کرنے والے، سدھارنے والے۔ کیا غیر صالح صالح ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ جنہوں نے پہلے اپنی اصلاح کی ہے اپنے آپ کو ادب سکھایا اور تربیت دی ہے مصلح یعنی سدھارنے والے، اصلاح کرنے والے ہو سکتے ہیں۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں: "من نصب نفسه للناس اماما فعليه ان يبدأ بتعليم نفسه قبل تعليم غيره، و معلم نفسه و مؤد بها احق بالاجلال من معلم الناس و مؤدبهم"(۱) یعنی جو شخص اپنے آپ کو لوگوں کی رہنمائی کے لئے پیش کرتا ہے، لوگوں کا معلم اور مربی بنا کر پیش کرتا ہے۔ واعظ اور خطیب بنا کر پیش کرتا ہے، لوگوں کا ہادی اور رہبر بنا کر پیش کرتا ہے اسے چاہئے کہ وہ سب سے پہلے اپنے آپ سے شروع کرے، پہلے اپنے آپ کو تعلیم دے۔ یہ سمجھ لے کہ خود اس کے اندر ایک جاہل موجود ہے۔ پہلے اس جاہل کی تلقین کرے جو خود اس کے اندر موجود ہے اور جس کا نام نفس امارہ ہے، یاد رکھے کہ خود اس کے اندر ایک غیر تربیت یافتہ ہستی ہے پہلے اس کی تربیت اور تادیب کرے، پہلے اپنے نفس کو نصیحت کرے، ملامت کرے، اپنے نفس سے حساب لے۔ جب وہ اپنی درستی اور تہذیب کر کے نیک بن جائے تب اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کر سکتا ہوں، لوگوں کو وعظ دے سکتا ہوں، لوگوں کو تعلیم دے سکتا ہوں، لوگوں کی تربیت اور تادیب کر سکتا ہوں، معاشرے کا مصلح بن سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: جو شخص اپنے آپ کو تعلیم دیتا اور سدھارتا ہے وہ اس شخص سے زیادہ احترام کے لائق ہے جو لوگوں کو تعلیم اور تربیت دیتا ہے کیونکہ یہ کام

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار ۷۱

زیادہ مشکل اور زیادہ اہم ہے۔ پھر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا: "الحق اوسع الاشياء فی التواصف و..." کیا جملے ہیں! لوگ انہیں دل پر نقش کر لیں۔ فرمایا ہے حق اور عدالت کا میدان بات کہتے، گفتگو کرتے، تقریر کرتے اور زبان سے کام لیتے وقت بہت وسیع اور کشادہ ہوتا ہے یعنی باتیں کرنے کیلئے حق کے میدان سے زیادہ وسیع کوئی میدان نہیں ہے اگر انسان چاہے کہ حق کے متعلق ہر موضوع سے زیادہ لچھے دار تقریر کرے، لسانی سے کام لے، گفتگو کرے تو نہایت آزادی اور سہولت سے کر سکتا ہے، لیکن جب عمل کا موقع آتا ہے تو پھر حق کے میدان سے زیادہ تنگ اور کوئی میدان نہیں ہوتا، اس وقت انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا دشوار ہے، حق کے بارے میں باتیں بتانا جتنا آسان تھا عمل کا موقع آنے پر ایک قدم اٹھانا بھی اتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہاں قرآن بھی "التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون" کہنے کے بعد "الامرون بالمعروف والناهون عن المنكر" کہتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جو نیکی پھیلانے کی راہ پر چلتے ہیں، بدی اور بگاڑ کے خلاف جد و جہد کرتے ہیں اور صرف یہی لوگ ہیں جو یہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ "و بشر المؤمنين" یہاں مومنوں کو خوش خبری سنا دو کہ اگر وہ تائب (توبہ کرنے والے)، عابد (عبادت کرنے والے)، سائح (سیاحت کرنے والے)، راکع (رکوع کرنے والے) اور ساجد (سجدہ کرنے والے) ہوگئے اور اس کے بعد نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے والے بن گئے تو وہ کامیاب ہو جائیں گے اور اگر سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ نیکی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے والے نہیں بن سکے تو انہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اگر وہ نیکی کا حکم دیتے اور بدی سے روکتے بھی تھے لیکن خود ان کا دامن صاف نہیں تھا، اگر دوسروں سے توبہ کرانے والوں نے خود توبہ کم کی تب بھی وہ کچھ

حاصل نہیں کر سکیں گے۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا: "لعن اللّٰہ الامرین بالمعروف التارکین له، والناہین عن المنکر العاملین۔" خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جو دوسروں کو نیکی کی تلقین تو کرتے ہیں لیکن خود اس نیک کام کے خلاف کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جو دوسروں کو برائیوں سے روکتے ہیں لیکن خود انہیں برائیوں پر عمل کرتے ہیں یعنی جو نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے خود "التائبون" نہیں ہیں، "العابدون" نہیں ہیں، "الحامدون" نہیں ہیں، "السائحون" نہیں ہیں، "الراکعون" نہیں ہیں، "الساجدون" نہیں ہیں، جنہوں نے ابھی یہ مراحل اور منزلیں طے نہیں کی ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ آمر معروف اور ناہی منکر بن جائیں خدا ایسے لوگوں پر لعنت کرے۔

عارفوں کی اپنی ایک اصطلاح ہے: وہ دعوی کرتے ہیں کہ سالک چار مختلف سیریں کرتے ہیں:

۱۔ سیر من الخلق الی الحق یعنی دنیا اور فطرت کی طرف سے خدا کی طرف سیر۔

۲۔ سیر بالحق فی الحق خود خدا کی ذات کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔

۳۔ سیر من الحق الی الخلق۔ خدا کی طرف سے خلق کی طرف سیر یعنی لوگوں کی ہدایت و رہبری کے لئے آنا۔

۴۔ سیر با لحق فی الخلق۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو شخص ایسی لیاقت رکھتا ہے کہ دوسروں کی مدد کر سکے، دوسروں کا ہادی اور رہنما ہو سکے، نیکی کا حکم دے سکے اور بدی سے روک سکے کیونکہ وہ خود اس منزل تک پہنچا ہے اور بعد میں اسے یہ حکم ملا ہے کہ وہ لوگوں کو اس مقام تک لے جائے جہاں وہ خود فائض ہوا ہے۔

معلوم ہوا کہ حسینی تحریک کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے یہ عظمت اور یہ قدر و قیمت حاصل ہوئی ہے۔ تو اس اصول کو پہچان لینا چاہئے کہ یہ اصول کتنی اہمیت رکھتا ہے جو امام حسینؑ اپنے آپ کو اس کی خاطر شہید کر دیتے ہیں اور وہ کتنا شائستہ ہے جو اس کی خاطر امام حسینؑ کی طرح قربان ہو جائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہ بے مثل اصول ہے جو اسلام کی بقا کا ضامن ہے۔ اصطلاح فلسفہ میں "علت مبقیہ" ہے یعنی باقی رکھنے والا عامل ہے، واقعی اگر یہ اصول نہ ہو تو اسلام بھی نہ رہے۔ یہ مسلمانوں کی حالت کی برابر جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ آیا کوئی کارخانہ ماہر انجینئروں کی مسلسل جانچ پڑتال کے بغیر، جو یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ اس کی کیا حالت ہے باقی رہ سکتا ہے؟ کیا یہ اصولی طور پر ممکن ہے کہ کوئی کارخانہ بدستور اپنے حال پر قائم رہے، ہم اس کے متعلق بالکل ہی نہ سوچیں اور پھر بھی وہ اپنی وضع پر چلتا رہے؟ ہرگز نہیں! یہی حال جامعہ کا ہے۔ ایک اسلامی جامعہ کا یہی طور ہے بلکہ سو درجے بلند و بالا۔ آپ کون سا انسان ایسا پیش کر سکتے ہیں جو معالج کا محتاج نہ ہو؟! یا تو انسان خود ہی اپنے جسم کا معالج ہو یا دوسرے معالج ہوں جو اس کا علاج کریں۔ آنکھ کا ماہر، کان، حلق، ناک کا ماہر، مزاج کا ماہر، اعصاب کا ماہر، انسان ہمیشہ طرح طرح کے معالجوں پر نظر ڈالتا رہتا ہے تاکہ وہ اس کے جسم کا معائنہ کریں اور یہ دیکھیں کہ اس کی کیا حالت ہے۔ تو کیا پھر معاشرہ غور و فکر اور دیکھ بھال کا محتاج نہیں ہوتا؟ کیا جامعہ جانچ پڑتال نہیں چاہتا؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! امام حسینؑ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر یعنی اس بنیادی اصول کی خاطر جو اسلامی جامعہ کی بقا کا ضامن ہے، مارے گئے۔ یہ اصول اگر نہ ہو تو انجام معاشرہ کا پارہ پارہ ہو جانا ہے، بکھر جانا ہے، اس کا انجام جماعت کے ڈھانچے کا ٹوٹ جانا، نابودی اور بربادی ہے۔ ہاں! یہ اصول اتنی اہمیت رکھتا ہے۔ اس

ضمن میں قرآن کی بہت سی آیات موجود ہیں۔ قرآن کریم کچھ قدیم معاشروں کا ذکر کرتا اور کہتا ہے کہ یہ بکھر گئے، ہلاک ہوگئے، تباہ و برباد ہوگئے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا موجب ان معاشروں میں اصلاح کی توانائی اور قوت نہیں رہ گئی تھی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قوت نہ تھی بلکہ ان لوگوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا احساس بھی مردہ ہو چکا تھا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے شرائط :

اب ہم دیکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کون کون سی شرائط ہیں اور ہم کس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر سکتے ہیں؟ سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ معروف اور منکر کے کیا معنی ہیں؟ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسے کہتے ہیں؟ اسلام نے یہ نہیں چاہا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موضوع کو مقررہ اشیاء جیسے عبادات، معاملات، اخلاقیات، گھریلو احاطے وغیرہ میں محدود کرے اس لئے ایک عام لفظ استعمال کیا ہے "معروف" یعنی ہر موقع پر (نیکی اور بھلائی کے ہر کام میں) امر بالمعروف لازم ہے۔ اس کی ضد ہر برا کام ہے۔ اس نے شرک یا فسق یا غیبت یا جھوٹ یا عیب جوئی یا تفرقہ اندازی یا سود یا ریا اور منافقت نہیں کہا بلکہ منکر کہا یعنی ہر چیز جو بری اور خراب ہے۔ "امر" یعنی حکم "نہی" یعنی ممانعت، روک ٹوک۔ لیکن یہ حکم کیا ہے؟ کیا اس حکم سے لفظی حکم مراد ہے؟ کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف زبانی معاملہ ہے؟ کیا صرف زبان سے ہی نیکی کا حکم دینا چاہئے اور زبان سے ہی بدی کی ممانعت کرنا چاہئے؟ نہیں! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعلق دل اور ضمیر سے ہے، زبان سے ہے، ہاتھ اور عمل سے بھی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ آمر معروف اور ناہی منکر ہوں۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ قرآن نے روئے زمین کے بعض جانداروں

کے لئے کہا کہ وہ مردہ ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ میت الاحیاء زندوں میں مردہ کون ہے اور کیسے ہے؟ آپ نے جواب دیا: انسانوں کے کئی طبقے ہیں۔ بعض لوگ جب منکرات کو دیکھتے ہیں تو ان کے دل پر اثر ہوتا ہے، ان کی ہڈیوں کا گودا تک جلنے لگتا ہے، ان کی زبان کھل جاتی ہے، وہ تنقید کرنے لگتے ہیں، کہہ اٹھتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں۔ اس پر بھی قناعت نہیں کرتے اور عمل پر اتر آتے ہیں۔ جس قسم کے عمل سے ممکن ہوتا ہے، نرمی سے، سختی سے، مار پیٹ سے یا ڈنڈے سے ہو غرض جس عمل سے بھی وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس منکر سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے، اسے انجام دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ تمام زندوں کا ایک زندہ ہے۔ بعض دوسرے ایسے ہوتے ہیں کہ جس وقت منکرات کو دیکھتے ہیں ان کے دل سلگ اٹھتے ہیں، زبان سے کہنے لگتے ہیں، چیخنے چلانے لگتے ہیں، فریاد اور احتجاج کرتے ہیں، نصیحت کرتے ہیں، وعظ و پند دیتے ہیں لیکن جب عمل کی باری آتی ہے تو وہ میداں میں نہیں آتے۔ آپ نے فرمایا: اس میں بھی زندگی کی دو تین خصلتیں ملتی ہیں لیکن زندگی کی ایک خصلت نہیں ملتی۔

تیسری قسم: اس شخص کے دل میں آگ لگ جاتی ہے لیکن صرف جوش میں آتا ہے، صرف ناخوش ہوتا ہے۔ مثلاً اخبار پڑھتا ہے۔ دیکھتا ہے لوگ خوشی کے دنوں میں امام حسین ؑ کا احترام قائم نہیں رکھتے۔ اخبارات پروپیگنڈا کرتے ہیں، ریڈیو چیختا ہے کہ اس وقت کو تفریح میں صرف کرو!۔ کیا بیٹھے ہوئے ہو۔ تہران کے آدھے لوگ چلے گئے۔ مختلف جگہوں پر پہنچ چکے ہیں۔ تمہاری دس دن کی تعطیل ہے۔ یہ سب پڑھتا ہے۔ دل میں کہتا ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں؟ یہ امام حسین علیہ السلام سے کیوں لڑتے ہیں؟ کس لئے ایک شخص بھی ایک لفظ کسی اخبار میں یا دوسری جگہ نہیں لکھتا کہ بابا تفریح کا وقت اور بھی ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ امام حسینؑ کا ہماری روح سے تعلق ہے۔ ہم نے اس مکتب سے فائدہ اٹھایا ہے اور اٹھا رہے ہیں۔ یہ ملک امام حسینؑ کا ملک ہے، شیعہ ملک ہے، امام حسینؑ اس قوم کا نعرہ ہیں، ملک کا نعرہ ہیں، یہ امام حسینؑ کی توہین ہے کہ آپ ان دنوں میں سیر و تفریح کے لئے چلے جائیں !وہ اخبار میں پڑھتا ہے، جوش میں بھی آتا ہے لیکن اس کے لئے تیار نہیں ہے کہ اپنے دوست سے بھی یہ کہے کہ امام حسینؑ کا احترام قائم رکھ! امام حسینؑ کے سوئم تک ٹھہرا رہ۔ کم سے کم لبا عبداللہ کے احترام کی اتنی سی قدر محفوظ رکھ۔ ہم نے امام حسینؑ کی حفاظت نہیں کی ہے۔ امام حسینؑ ہیں کہ جنہوں نے اب تک ہماری حفاظت کی ہے۔ علامہ اقبال کے قول کے مطابق :"مسلمانوں نے کسی وقت بھی اسلام کی حفاظت نہیں کی ہے۔ یہ ہمیشہ اسلام ہی رہا ہے جس نے مسلمانوں کی نگہداری کی ہے۔" ملک کو جس وقت کوئی سنگین خطرہ لاحق ہوتا ہے تب آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کو حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور نہج البلاغہ یاد آتے ہیں۔ امام حسینؑ یاد آتے ہیں۔

ہم ان لوگوں میں سے ہیں کہ : "اذا رکبوافی الفلك دعو الله مخلصین له الدین فلما نجّٰهم الی البر اذا هم یشرکون"(۱) کچھ لوگ جو کشتی میں سوار ہوتے ہیں جس وقت طوفان آتا ہے تو نہایت خلوص سے یا اللہ یا اللہ، یا خدا یا خدا کی آوازیں بلند کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس وقت خدا کے سوا اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتے لیکن جس وقت خدا انہیں بچا لیتا ہے اور ساحل نجات تک پہنچا دیتا ہے، جس وقت وہ خطرے سے دور ہو جاتے ہیں تو بالکل بھول جاتے ہیں، خدا کے منکر ہو جاتے ہیں، خدا کا شریک ٹھہرا لیتے ہیں۔ کیا ہم نے اپنے اسی ملک میں نہیں دیکھا کہ جو لوگ امام حسین علیہ السلام اور حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا نام

۱۔ سورۂ عنکبوت آیت ۶۵

بھی نہیں لیتے تھے۔ آج سے پچیس سال پہلے لے رہے تھے، جیسے ہی مصیبت سے نجات ملی تو کہنے لگے ہمارے یہاں رستم تھا، اسفند یار تھا، نوشیرواں تھا! جس وقت اس قوم کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو پھر رستم کون سے جہنم میں ہوتا ہے؟ امام حسینؑ سے لڑتے ہیں۔ ان کا مقابل کا قہرمان سجاتے ہیں! بالکل نہیں شرماتے! بجائے اسکے کہ اپنے بیٹے کا نام "حسین" رکھ کر فخر کریں "رستم" "فریدوں" اور "جمشید" رکھتے ہیں۔

خدا کی قسم یہ سب کچھ اسلام کے خلاف جنگ ہے۔ اسلام کو مار ڈالنا ہے۔ دین کے شعار کو زندہ رکھئے۔ دین کی شعار میں سے ایک بچوں کے "نام" ہیں۔ میری سمجھ میں لوگوں کی ایک بات نہیں آتی کہ فلاں نام رواج سے اتر گیا، پرانا ہو گیا۔ کیا مطلب؟ کیا نام میں بھی نیا پن اور پرانا پن ہوتا ہے؟ چونکہ فلاں خادمہ کا نام فاطمہ ہے اس لئے فاطمہ خادمہ کا نام ہے۔ نہایت عجیب بات ہے۔ اب ہم اپنی بیٹیوں کا نام فاطمہ نہ رکھیں! یہ بھی ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک منزل یہ بھی ہے کہ آپ اپنے بیٹوں کے اسلامی نام رکھئے۔ (یہ امر بالمعروف ہے) اور غیر اسلامی ناموں کی مخالفت کیجئے (یہ نہی عن المنکر ہے)۔ اپنے اداروں کے نام اسلامی رکھیئے۔ آپ مدرسے کی بنیاد رکھتے ہیں، شفاخانہ بناتے ہیں۔ ان میں یہ بات مشترک رکھیئے۔ اسلامی نام زندہ رکھیئے۔ اسلام کی زبان زندہ رکھیئے۔ عربی زبان ایک قوم کی زبان نہیں ہے۔ اسلام کی زبان ہے۔ عربی زبان عرب کی زبان نہیں ہے اسلام کی زبان ہے۔ اگر قرآن نہ ہوتا تو دنیا میں اس زبان کا بھی مطلق وجود نہ ہوتا۔ ہمارا اہم فرض یہ ہے کہ ہم اس زبان کی حفاظت کریں۔ جو ثقافت اور جو تہذیب زندہ رہنا چاہتی ہے اس کی زبان کو زندہ رہنا چاہیئے۔ اگر اس کی زبان مر گئی تو سمجھئے کہ وہ خود بھی مردہ ہو گئی۔ اس کھلم کھلا لڑائی پر جو آپ عربی زبان کے خلاف دیکھتے ہیں آپ کو چونکنا اور سمجھنا چاہیئے، شعور رکھیئے، عقل رکھیئے، خدا کی قسم یہ اسلام

سے جنگ ہے۔ یہ حروف تہجی (الف، ب) سے لڑائی نہیں ہے۔ خدا کی قسم ہم پر عربی زبان کی طرف سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اسلام کی اس زبان کی حفاظت کریں، اسے بچائیں۔ آپ کی کسی نے مزاحمت کی ہے؟ کلاسیں بنائیں اور جو عربی جانتے ہیں انہیں بلایئے، آپ خود، آپ کی بیویاں، آپ کے بچے یہ زبان سیکھیں۔ اگر آپ سیکھ لیں گے تو نہ صرف یہ کہ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ آپ کو بہت فائدہ ہوگا کیونکہ یہ بھی ایک دنیا کی زندہ زبان ہے۔ یہ جو انگریزی زبان والوں نے اپنی زبان کی اشاعت کی اور اسے اس حد تک ہم پر تھوپا اور مسلط کیا کہ وہ ہمارے گھروں کے اندر بھی نفوذ کر گئی ہے آخر کس لئے؟ کیا ان کے دل ہمارے حال پر کڑھتے تھے؟ یہ صرف اس لئے ہوا کہ وہ اپنی عادات ہم پر تھوپیں تاکہ ہماری روح کو حقیر و ناچیز بنا دیں۔

ہم مسلمان کتنے غافل تھے اور کتنے غافل ہیں؟ نہ صرف ہم ایرانی بلکہ دنیائے اسلام میں جس جگہ انسان پہنچتا ہے یہ دیکھتا ہے کہ صدیوں سے سو رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ مسلمان جاگنے لگے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جس وقت دو مختلف ملکوں کے دو مسلمان مکہ یا مدینہ میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ پاتے مجبوراً انگریزی زبان کے وسیلے سے کام لیتے ہیں۔ یہ تین سو چار سو سال کی اسکیمیں ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم ان اسکیموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں؟ "کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر"(۱) یہ عظیم فریضہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) دو رکن اور دو بنیادی شرطیں رکھتا ہے۔ ایک رکن اور شرط رشد، آگاہی اور بصیرت ہے۔ میں نے جو ابھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا تو لازمی طور پر ہم سب نے یہ سوچا کہ اچھا

۱۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۱۰

یہاں سے چلیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ میں اور آپ کچھ سمجھے بھی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا ہے اور کس طرح کیا جاتا ہے؟ ابھی تک تو ہمارا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لوگوں کے لباس کے بٹن اور جوتے کے بندوں کے متعلق رہا ہے، لوگوں کے سر کے بالوں اور لباس کی سلائی کے آس پاس رہا ہے! ہم معروف کو کیا پہچانیں کہ کیا ہے؟ منکر کو کیا جانیں کہ کیا ہے؟ ہم کبھی معروف کو منکر سمجھ بیٹھتے ہیں اور کبھی منکر کو معروف۔ بہتر یہی ہے کہ ہم جاہل لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کریں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام سے کیسے کیسے منکرات نہیں ہوئے؟ آگاہی اور بصیرت چاہتی ہے، دانا و بینا، کار آزمودہ چاہتی ہے، حقائق شناس، نفسیات اور جامعہ شناسی چاہتی ہے تاکہ انسان سمجھ لے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کس طرح کرے؟ یعنی نیکی کی راہ کو پہچانے اور جانے کہ نیکی کہاں ہے؟ منکر کو پہچانے، منکر کو جڑ سے اکھاڑ دے کہ اس کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اسی لئے تو دین کے اماموں نے فرمایا ہے: بہتر ہے کہ جاہل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے کیوں؟ "لانه ما يفسده اكثر مما يصلحه"

وجہ یہ ہے کہ جس وقت جاہل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بہتر کرنا چاہتا ہے آزمودہ کار نہ ہونے کی وجہ سے بدتر کر بیٹھتا ہے۔ اس ضمن میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ شاید آپ کہیں ہم جاہل ہیں اس لئے ہم پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں رہا! آپ کو جواب دیا جا چکا ہے۔ قرآن فرماتا ہے: "يهلك من هلك عن بينةٍ و يحي من حي عن بينةٍ لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل"(۱) ایک معصومؑ سے لوگ پوچھتے ہیں: بعض لوگ جاہل ہوتے ہیں۔ قیامت میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ آپ فرماتے ہیں: اس دن ایک عالم کو لائیں گے

۱۔ سورۂ نساء۔ آیت ۱۶۵

جس نے عمل نہیں کیا ہے۔ اس سے پوچھیں گے تونے عمل کیوں نہیں کیا؟ جواب نہیں بن پڑتا تو وہ اپنے شرمناک اور خوفناک مقدر سے دوچار ہوگا۔ ایک آدمی کو لائیں گے اور پوچھیں گے تونے عمل کیوں نہیں کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نہیں سمجھ سکا ، میں نہیں جان پایا! وہ کہیں گے : "ھلا تعلمت" میں نہیں جانتا ، میں نہیں سمجھتا بھی کوئی عذر ہوا؟ خدا نے عقل کس لئے پیدا کی ہے؟ اس لئے کہ تو سمجھے ، بال کی کھال نکالے ، کریدے ، تحقیق کرے۔ تجھے تو ان لوگوں میں سے ہونا چاہئے کہ جو نہ صرف اپنے ہی زمانے کے حالات سمجھیں بلکہ آئندہ کے حالات بھی سمجھیں۔ امیر المومنین نے فرمایا ہے : "ولا نتخوف قارعه حتی تحل بنا"(۱) ہمارے لوگ نادان رہے ہیں۔ وہ ان بلاؤں کو جو ان پر نازل ہوتی ہیں اس وقت تک نہیں پہچان پاتے جب تک کہ وہ ان کے سامنے نہ آجائیں۔ ان میں پیش بینی نہیں ہے۔ پیش بینی کیوں نہیں ہے؟ انہیں پہلے سے دیکھ اور سمجھ لینا چاہئے۔ انہیں نہ صرف اپنے زمانے کے حالات اور طور طریقوں سے آگاہ ہونا چاہئے بلکہ معاشرے کو اس حد تک پہچان لینا چاہئے کہ جو مصیبتیں مستقبل میں پیش آنے والی ہوں ان کی تشخیص کر لیں اور سمجھ لیں کہ پچاس سال بعد ایسا ہوگا۔ "ولقد اتینا ابراهیم رشده."

امام حسین علیہ السلام کی تحریک کو جو چیز زیادہ اہمیت بخشتی ہے وہ روشن بینی ہے۔ روشن بینی کا کیا مطلب ہے؟ یعنی امام حسین علیہ السلام نے اس روز کچی اینٹ میں وہ چیزیں دیکھ لیں جو دوسرے لوگ آئینے میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم آج بیٹھے ہوئے اس زمانے کے حالات کی تشریح کر رہے ہیں لیکن جو لوگ اس زمانے میں موجود تھے وہ اس طرح نہیں سمجھ پائے جس طرح امام حسین علیہ السلام سمجھ رہے تھے۔

۱۔ نہج البلاغہ ، خطبہ ۳۲

نویں محرم کی رات ہے۔ ہم خدا کی راہ کے اس مجاہد ، اس آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر اور اس ہستی یعنی حضرت عباس علیہ السلام کا ذکر خیر کرتے ہیں جن سے امام حسین علیہ السلام کمال راضی تھے۔ اس زمانے میں آج کے سے رابطے نہیں تھے۔ شام میں جو حادثات و واقعات گزر جاتے تھے ان کی کوفہ یا مدینہ کے رہنے والوں کو بہت دیر میں خبر ہوتی تھی اور کبھی کبھی خبر ہوتی بھی نہیں تھی۔ اس کا بہترین ثبوت مدینہ والوں کا قصہ ہے۔ امام حسینؑ مدینہ میں قیام کرتے ہیں۔ بیعت نہیں کرتے۔ مکہ چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بہت سے واقعات پیش آتے ہیں یہاں تک کہ وہ شہید ہوجاتے ہیں۔ مدینہ کے عوام بیدار ہو کر اپنی آنکھیں مل مل کے چونکتے ہیں ارے! امام حسین علیہ السلام شہید ہوگئے؟ کیوں؟ دارالخلافت شام کو چل کر دیکھیں تو یہ قصہ کیا ہوا؟

اس کام کے لئے سات آٹھ آدمیوں کی ایک جماعت تیار کرتے ہیں۔ وہ شام جاتے ہیں۔ وہاں کافی دن تک رہتے ہیں۔ تحقیق کرتے ہیں یہاں تک کہ خلیفہ سے بھی ملتے ہیں۔ وہاں کے حالات اور طور طریقے اچھی طرح دیکھتے ہیں۔ واپس آجاتے ہیں۔ جس وقت لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ قصہ کیا ہوا؟ تو کہتے ہیں یہ نہ پوچھو! ہم جتنے دن تک شام میں رہے ڈرتے ہی رہے کہ اب آسمان سے پتھر برستے ہیں اور اب برستے ہیں اور ہم اب فنا ہوئے جاتے ہیں۔ وہ بات بھی جو ابا عبداللہؑ نے کہی : "وعلی الاسلام السلام اذ قد بلیت الامة براع مثل یزید" سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ سچ کہا امام حسین علیہ السلام نے۔ لوگوں نے پوچھا آخر کیا قصہ ہوا؟ وہ بولے بس ہم تم سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس شخص کے پاس سے آرہے ہیں جو اعلانیہ شراب پیتا ہے، کھلم کھلا کتے پالتا ہے، بندر پالتا ہے، ہر گناہ کرتا ہے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی زبان میں کہا، اپنی ماں سے بھی زنا کرتا ہے، اپنی محرم عورتوں سے زنا

کرتا ہے۔ وہ لوگ امام حسین علیہ السلام کی آخری پیش بینی کو سمجھ گئے کہ امام حسینؑ ان باتوں کو پہلے دن سے جانتے تھے، پہلے دن سے۔ عاشور کے دن بھی آپ نے فرمایا تھا کہ یہ مجھے مار ڈالیں گے لیکن میں آج تم سے کہے دیتا ہوں کہ میرے قتل کے بعد یہ ہرگز اپنی حکومت جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ آل ابوسفیان چلی گئی۔ آل ابو سفیان تو بہت ہی جلدی چلی گئی بلکہ آل امیہ بھی اپنی حکومت قائم نہ رکھ سکی کیونکہ بعد میں بنی عباس نے اسی بنیاد پر آکر تو ان سے خلافت چھینی اور پانچ سو سال تک حکومت کی۔ ایسی صورت میں جبکہ کربلا کے حادثے کے بعد بنی امیہ کی حکومت برابر ڈگمگاتی رہی اس واقعے کا اس سے اچھا اور زیادہ کیا اثر ہو سکتا ہے کہ خود بنی امیہ میں اس نے مخالف پیدا کر دے اور روحانی قوت کو افزائش بخشی۔

اس ظالم ابن زیاد کا عثمان بن زیاد نامی ایک بھائی تھا۔ عثمان نے آکر اپنے بھائی سے کہا: "اے بھائی میرا جی چاہتا تھا کہ زیاد کی تمام اولاد مفلسی، ذلت، نحوست اور بد قسمتی میں مبتلا ہو جاتی لیکن ایسا گناہ ہمارے خاندان میں نہ ہوتا۔" اس کی ماں مرجانہ ایک فاحشہ عورت ہے لیکن جب اس کے بیٹے نے یہ کام کیا تو اس نے بیٹے سے کہا: اے بیٹے! تونے یہ کام تو کر لیا لیکن یاد رکھ کہ تو بہشت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا۔ مروان ابن حکم کا جو ازلی اور ابدی شقی ہے ایک بھائی ہے جس کا نام یحییٰ بن حکم ہے۔ یزید کی محفل میں یحییٰ معترض ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور کہنے لگا: "سبحان اللہ! اولاد سمیہ!" (یعنی زیاد کی ماں کی اولاد) سمیہ کی بیٹیاں تو قابل احترام ہوں لیکن تونے آل پیغمبرؐ کو اس حالت سے اس مجلس میں حاضر کر دیا ہے؟ دیکھئے! حسینی آواز انہیں کے گھروں سے اٹھی۔

آپ نے یزید کی بیوی ہند کا قصہ بھی سنا ہوگا کہ یزید کے گھر میں سے نکلی اور ایک معترضہ کی حیثیت سے اس حالت میں آئی کہ یزید انکار کرنے اور یہ کہنے پر

مجبور ہو گیا کہ میں اس کام کے لئے مطلق رضامند نہیں تھا۔ یہ کام میں نے نہیں کیا ہے۔ عبید اللہ ابن زیاد نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ امام حسینؑ کی آخری پیش بینی یہ تھی، یزید اس کے بعد دو تین سال تک پُر ادبار حکومت کرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اس کا بیٹا معاویہ بن یزید جو اس کا ولی عہد اور خلیفہ ہے اور معاویہ نے جس کی خاطر اس رنگ ڈھنگ کی بنیاد رکھی تھی چالیس دن گزرنے کے بعد منبر پر جاکر بولا: اے لوگو! میرے دادا معاویہ نے حضرت علی ابن ابی طالب سے جنگ کی اور حق میرے دادا کی طرف نہیں حضرت علی کی طرف تھا، میرے باپ یزید نے امام حسینؑ سے جنگ کی جبکہ حق میرے باپ کی طرف نہیں امام حسینؑ کی طرف تھا میں ایسے باپ سے بیزاری چاہتا ہوں اور اپنے آپ کو خلافت کا سزاوار نہیں سمجھتا۔ میں اس غرض سے کہ اپنے باپ اور دادا کے گناہوں کا مرتکب نہ ہوں اعلان کرتا ہوں کہ خلافت سے کنارہ کش ہوتا ہوں۔ یہ امام حسینؑ کی قوت تھی۔ حقیقت کی قوت تھی جس نے دوست اور دشمن سب پر اثر ڈالا۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: "رحم اللہ عمی العباس لقد آثر وابلی بلاء حسنا۔" خدا ہمارے چچا حضرت عباس پر رحمت نازل کرے۔ انہوں نے کیسا اچھا امتحان دیا۔ ایثار کیا، اور بہت بڑی آزمائش جھیلی۔ ہمارے چچا حضرت عباسؑ کا مقام خدا کے نزدیک ایسا ہے جس پر تمام شہداء رشک کرتے ہیں۔ اتنی شرافت، نیت کی اتنی پاکیزگی اور اس قدر جاں نثاری! ہم صرف پیکر عمل کو دیکھتے ہیں عمل کی روح پر نظر نہیں ڈالتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ بھی کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ عاشور کی رات ہے۔ حضرت عباسؑ، امام حسینؑ کی خدمت میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ اسی وقت دشمن کا ایک سردار آتا ہے اور آواز دیتا ہے۔ عباسؑ ابن علیؑ اور ان کے بھائیوں سے کہہ دو کہ یہاں آئیں۔ حضرت عباسؑ سنتے ہیں لیکن سنی ان سنی کر دیتے

ہیں پروا نہیں کرتے۔ امام حسینؑ کے سامنے ادب سے بدستور بیٹھے ہوئے ہیں کہ آقا نے ان سے فرمایا: یہ فاسق ہے تو کیا اسے جواب تو دو۔ آپ باہر آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ شمر ابن ذی الجوشن ہے۔ وہ مادر حضرت عباسؑ کی طرف سے دور کا رشتہ رکھتا تھا کیونکہ وہ اور مادر حضرت عباسؑ دونوں ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس وقت وہ کوفہ سے چلا ہے تو حضرت ابو الفضل العباسؑ اور ان کے مادری بھائیوں کے لئے ایک امان نامہ لیتا آیا ہے۔ اپنے خیال سے اس نے ایک خدمت انجام دی ہے۔ جس وقت اس نے اپنی بات کہی حضرت عباسؑ نے جھڑک دیا۔ آپ نے فرمایا: خدا تجھ پر اور اس شخص پر لعنت کرے جس نے یہ امان نامہ تیرے ہاتھ بھیجا ہے۔ تو نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ تو نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟ تو نے یہ خیال کیا ہے کہ میں ایسا شخص ہوں جو اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے امام اور بھائی حسین ابن علیؑ کو یہاں چھوڑ کر تیرے پیچھے چلا آؤں گا؟ میں جس گود میں پلا ہوں اور میں نے جس چھاتی سے دودھ پیا ہے اس نے مجھے ایسی تربیت نہیں دی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے جناب ام البنین سے چار بیٹے ہیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت علیؑ خاص طور پر اپنے بھائی جناب عقیل سے کہتے ہیں کہ میرے لئے ایک بیوی کا انتخاب کرو جو "ولد تها الفحوله" بہادروں کی نسل سے ہو، جس نے بہادروں سے ورثہ پایا ہو۔ "به لتلد لدلی ولداً شجاعاً۔" میں چاہتا ہوں کہ اس سے میرا ایک بہادر بیٹا پیدا ہو۔ بلا شبہ اس گفتگو میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا کہ اس سے حضرت علیؑ کا مقصود و منشا کیا ہے لیکن جو لوگ حضرت علیؑ کی پیش بینی کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ اس کام کا انجام پہلے سے دیکھ رہے تھے۔ جناب عقیل جناب ام البنین کا انتخاب کرتے ہیں۔ آقا سے عرض کرتے ہیں کہ یہ خاتون ویسی ہی ہیں جیسی آپ چاہتے ہیں۔ ان خاتون سے چار بیٹے پیدا

ہوئے جن میں سب سے بڑے ابا الفضل العباس ہیں۔ چاروں بیٹے کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ رہتے ہیں اور شہید ہوجاتے ہیں۔ جس وقت بنی ہاشم کی باری آئی حضرت ابا الفضل العباس نے جو سب سے بڑے بھائی تھے اپنے بھائیوں سے کہا: اے میرے بھائیو! میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھ سے پہلے میدان جنگ میں لڑنے کے لئے جاؤ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ بھائی کی شہادت کا اجر سمجھ لوں۔ وہ بولے جیسا آپ کا حکم ہو۔ تینوں شہید ہوگئے۔ بعد میں ابا الفضل العباس نکلے۔

ان بزرگ خاتون (جناب ام البنین) کو جو اس وقت تک زندہ تھیں لیکن کربلا میں موجود نہیں تھیں اپنے چاروں نیک بیٹوں کی شہادت کا علم ہوا تو ان کے سوگ میں بیٹھ گئیں۔ انہیں مدینہ میں خبر ملی کہ تمہارے چاروں بیٹے امام حسینؑ کی خدمت میں شہید ہوگئے۔ وہ ان بیٹوں کے لئے فریاد و ماتم کرتی رہتی تھیں۔ کبھی عراق کے راستے پر اور کبھی بقیع میں جا بیٹھتی تھیں اور دل بلا دینے والے بین کرتی تھیں۔ دوسری عورتیں بھی ان کے گرد جمع ہوجایا کرتی تھیں۔

مروان ابن حکم جو مدینہ کا حاکم تھا سخت دشمنی اور سنگدلی کے باوجود وہاں آجایا کرتا تھا، کھڑا ہوجایا کرتا تھا اور رویا کرتا تھا۔ ان کا ایک نوحہ یہ ہے:

"لا تدعونی ویك ام البنین تذکرینی بلیوث العرین
کان لی هنون ادعی بهم والیوم اصبحت ولا من بنین"

اے بی بیو! میں یہ چاہتی ہوں کہ اب تم مجھے "ام البنین" کے لقب سے نہ پکارو کیونکہ "ام البنین" بیٹوں کی ماں، بہادر بیٹوں کی ماں کو کہتے ہیں۔ مجھے اب اس نام سے نہ پکارنا کیونکہ تم جس وقت مجھے اس نام سے پکاروگی مجھے اپنے بہادر بیٹوں کی یاد آئے گی اور میرے دل کی آگ جاگ اٹھے گی۔ میں ایک دن "ام البنین" تھی لیکن اب "ام البنین" اور بیٹوں کی ماں نہیں ہوں۔ حضرت ابا الفضل العباس کے لئے بھی

ایک خصوصی مرثیہ ہے:

" یا من رأی العباس کر علی جماهیر النقد
ووراه من ابناء حیدر کل لیث ذی لبد
انبئت ان ابني اصیب براسه مقطوع ید
ویلی علی شبلی امال برأسه ضرب العمد
لو کان سیفك یدیك لمادنی منك احد "

آپ فرماتی ہیں: اے وہ آنکھ جو کربلا میں موجود تھی اور وہ منظر جب میرا عباس (میرا شیر بچہ) حملہ کرتا تھا دیکھ رہی تھی تونے دیکھا ہے! اے لوگو جو وہاں موجود تھے! مجھ سے ایک قصہ بیان کیا ہے میں نہیں جانتی کہ یہ قصہ سچ ہے یا نہیں؟

انبئت ان ابنی اصیب برأسه مقطوع ید مجھے ایک بہت جانگداز خبر ملی ہے۔ نجانے صحیح ہے یا نہیں؟ مجھ سے کہا گیا ہے کہ تمہارے فرزند کے پہلے تو ہاتھ کاٹے گئے پھر جب تیرے فرزند کے ہاتھ نہیں رہے تو ایک لعین شقی نے آکر اس کے سر پر لوہے کا گرز مارا۔ "ویلی علی شبلی امال برأسه ضرب العمد" افسوس صد افسوس! کہتے ہیں کہ میرے شیر بچے کے سر پر فولادی گرز لگا۔ پھر آپ فرماتی ہیں۔اے عباس! میرے کلیجے کے ٹکڑے! میرے پیارے فرزند! میں خود جانتی ہوں کہ اگر تیرے بدن میں ہاتھ ہوتے تو کوئی شخص تیرے پاس پھٹکنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم
وصلی اللّٰه علی محمد و آله الطاهرین

چوتھی مجلس

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درجے (۱)

بسم اللّٰه الرّحمن الرّحیم

اعوذ باللّٰه الشیطان الرجیم: التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الامرون بالمعروف والناهون عن المنکر و الحافظون لحدود اللّٰه و بشر المومنین (۲)

علمائے اسلام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بہت سے درجات اور اقسام کے قائل ہیں۔ (اس مقام پر کچھ لمحوں کی تقریر ریکارڈ نہیں ہو سکی تھی۔) انہوں نے کہا کہ نہی عن المنکر کا پہلا درجہ اور مرتبہ ہجر اور اعراض ہے یعنی ترک تعلق اور بے اعتنائی۔ جس وقت آپ کسی ایک فرد یا افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ منکرات کے مرتکب ہو رہے ہیں، برے کام کر رہے ہیں تو ان سے مخالفت کے طور پر ان کی شخصیت سے نہیں بلکہ ان کے برے کام کی مخالفت کے طور پر اور اس غرض سے کہ آپ اسے یا انہیں برے کام سے روکیں ان سے بے اعتنائی برتتے ہیں، ان سے دوری اختیار کرتے ہیں یعنی ان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔

۱۔ یہ تقریر ۲۶، ۱۲، ۱۳۴۸ مطابق ۹ محرم ۱۳۹۰ ہجری کو کی گئی

۲۔ سورۂ توبہ آیت ۱۱۲

مثال کے طور پر ایک شخص آپ کا رفیق اور دوست ہے۔ آپ کے ایک دوسرے سے بہت گہرے تعلقات ہیں، ایک دوسرے کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہیں۔ آپ کے باہمی تعلقات دوستانہ ہیں۔ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے ہیں۔ گرم جوشی سے ملتے ہیں ، سفر میں ساتھ ساتھ جاتے ہیں، ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں۔ایک وقت آپ کو یہ خبر ملتی ہے کہ آپ کا یہی ساتھی اور دلی دوست فلاں برا کام کر بیٹھا ہے، فلاں برا کام کرتا ہے ، فلاں گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک درجہ اور ایک قسم کی واقعی تنبیہ جو ایسے موقع پر کی جاسکتی ہے یہ ہے کہ آپ اسے اپنی سرد مہری دکھایئے، بے اعتنائی برتیئے اور جو خلوص پہلے دکھایا کرتے تھے اب نہ دکھایئے۔ یہ خود ایک قسم کی تنبیہ ہے۔ بلا شبہ انسان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملے میں منطق سے بھی کام لینا چاہئے۔ اس کا عمل منطق کے لحاظ سے درست ہونا چاہئے۔ ایسے موقع پر اگر آپ اس شخص سے تعلق ختم کر لیتے ہیں۔ جس سے آپ دلی دوستی رکھتے تھے ، اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں تو آپ کا یہ عمل اس کے لئے تنبیہ ہوگا اور تنبیہ ہی سمجھا جائے گا یعنی ایک قسم کی جھڑکی اور ذہنی سزا شمار ہوگا اور آپ کا یہ عمل اسے برے کام سے روکنے میں ضرور اثر انداز ہوگا ورنہ ایسے موقعے بھی ہوتے ہیں کہ کوئی شخص، آپ کا بیٹا، آپ کا دوست، کوئی جوان کسی بری عادت میں مبتلا ہوگیا ہے اور آپ کے اس کے تعلقات پہلے سے معمول کے مطابق چلے آرہے ہیں۔ اب جو آپ اس تعلق کو ختم کر لیتے ہیں تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے تاکہ وہ بھی آپ سے قطع تعلق کرے اور زیادہ آزادی سے منکرات اور برے افعال کے پیچھے دوڑنے لگے۔اس موقع پر آپ کا اس سے قطع تعلق نہ صرف یہ کہ تنبیہی اثر نہیں رکھے گا بلکہ اسکے شوق و رغبت میں اضافہ بھی کر دیگا یعنی آپ اسے اس کے عمل میں آزاد چھوڑ دینگے اور عملی طور پر اسے اسکے کام کا شوق

اور رغبت دلائیں گے۔ ایسے موقوں پر آپ کا یہ عمل درست نہیں ہوگا۔

علماء جو یہ کہتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک درجہ بے اعتنائی اور قطع تعلق ہے تو اس غرض سے کہ آپ کے عمل کا کچھ اثر ہو اور اثر بھی تنبیہ کرے۔ ایک اور قسم کا بھی اعراض اور ہجر ہوتا ہے جو نہی عن المنکر نہیں ہے بلکہ اس کی صورت دوسری ہے آپ کسی خاندان سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔اس سے دوستی کا اور کبھی کبھی رشتہ داری کا بھی تعلق رکھتے ہیں۔آپ دیکھتے ہیں کہ یہ خاندان بگڑ گیا ہے تو اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو بچانے کی خاطر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی بری عادت آپ کے خاندان میں سرایت کر جائے آپ اس خاندان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں کیونکہ بیمار کے ساتھ رہنے سے بیماری لگ جاتی ہے۔

می رود از سینہ ہا در سینہ ہا
از رہ پنہاں صلاح و کینہ ہا

اور لوگ مخفی طور پر ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ اس غرض سے کہ ان کی بری عادت اپنے خانوادہ پر اثر انداز نہ ہو ان سے رابطہ منقطع کر لیتے ہیں۔ لیکن اس موقع کی بات دوسرے موقعوں سے جدا ہے

پس ایسے موقعوں پر جنہیں انسان خود ہی بہتر طور پر پہچان سکتا ہے ، ان موقعوں پر جب انسان بری عادت میں پھنس گیا ہے اور آپ اس سے اپنی دوستی جاری رکھتے ہیں تو اسے برائی کی مزید رغبت ہوتی ہے اور اگر آپ اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں تو اس کے ذہن پر چوٹ پڑتی ہے اور اسے تنبیہ ہو جاتی ہے۔ آپ پر بالکل واجب ہے کہ اس شخص سے ترک تعلق کر دیں اور اس سے سرد مہری برتیں۔ یہ ایک درجہ ہے۔

نہی عن المنکر کا جو دوسرا درجہ علماء اور دانش مندوں کے بیان کے مطابق

زبان کا مرحلہ ہے۔ پند و نصیحت کا مرحلہ ہے۔ یعنی اکثر ایسا بھی بیمار ہوتا ہے جو منکر سے دوچار ہے اور برا کام کرتا ہے۔اس کا سبب اس کی جہالت اور نادانی ہے۔ وہ ایک تبلیغ کا شکار ہے۔ اسے مربی کی ضرورت ہے۔ ہادی، رہنما اور معلم کی ضرورت ہے۔ ایک سمجھانے والے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس سے ملے جلے، اس سے کمال مہربانی سے پیش آئے، اس کے سامنے موضوع رکھے، اس کی خرابیاں اور برائیاں اس کے سامنے کھول کھول کر بیان کرے تاکہ وہ واقف ہو اور پلٹ جائے۔ یہ مرحلہ بھی نہی عن المنکر کا ایک درجہ ہے اس لحاظ سے کہ ایسے معاملوں میں جن میں کوئی شخص ہم سے میل جول رکھتا ہے لیکن وہ ایک برے کام میں پھنسا ہوا ہے اور ہم واضح دلیل اور منطق سے اس کو اس عمل کے ترک کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں تو ہم پر واجب ہے کہ ہم اسی منطق کی مدد سے اس شخص سے تعلق قائم رکھیں۔

تیسرا مرحلہ عمل کا مرحلہ ہے۔ کبھی کبھی ایک شخص اس درجے اور اس حال میں ہوتا ہے کہ نہ ہمارا اعتراض اور لاتعلقی اس پر اثر کرتی ہے اور نہ ہم منطق، بیان اور سمجھانے بجھانے سے اس کو منکر سے روک سکتے ہیں تو ہم کو عمل کرنا چاہئے۔ اگر ہم عمل کریں تو شاید کچھ کر سکتے ہیں۔ کس طرح عمل کریں؟ عمل کرنے کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ عمل کرنے کے معنی صرف زور زور سے بولنا نہیں ہیں۔ ڈنڈے برسانا اور زخمی کرنا نہیں ہیں۔ بے شک میں یہ نہیں کہتا کہ عملی تنبیہ کبھی بھی نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں! ایسے بھی مواقع ہوتے ہیں جب عملی تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔اسلام ایسا دین ہے جو حد کا قائل ہے، سزا کا حامی ہے یعنی ایک ایسا دین ہے جس کا یہ اعتقاد ہے کہ ایسے مراحل اور مواقع بھی آجاتے ہیں جب مجرم پر عملی تنبیہ کے سوا کوئی دوسری تنبیہ اثر نہیں کرتی اور اسے برے کام سے نہیں

روکتی۔ لیکن انسان کو یہ سوچنے کی بھی غلطی نہیں کرنا چاہئے کہ تمام مواقع سختی اور سرد مہری کے ہی ہوتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں یوں بیان فرماتے ہیں:

"طبیب دوار بطبه قد احکم مراهمه و احمی مواسمه"(۱) وہ ایک طبیب تھے۔ ایسے طبیب تھے جو بیماروں اور بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔ پھر اطباء کے اعمال کو تشبیہ دیتے ہیں کہ اطباء بھی مرہم لگاتے ہیں اور جراحی بھی کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی داغ بھی دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ دو کام کرتے تھے۔ طبیب تھے، مرہم لگانے والے بھی اور چیرا لگانے اور داغ دینے والے بھی۔ مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ دوہرا کام کرتے تھے۔ پیغمبر کا ایک کام شفقت اور مہربانی تھا۔ پہلے "احکم مراهمه" کا ذکر فرماتے ہیں یعنی پیغمبرؐ کا پہلا کام ہمیشہ لطف و مہربانی تھا۔ آپ لطف و مہربانی سے علاج کرتے تھے۔ منکرات اور خرابیوں کے خلاف لڑتے تھے اور اگر ایسا مرحلہ آجاتا تھا کہ لطف، مہربانی، احسان اور نیکی کا مزید فائدہ نہیں ہوتا تھا تو انہیں ان کے حال پر نہیں چھوڑتے تھے۔ پھر یہ وقت ہوتا تھا کہ جب آپ جراحی اور داغ دینے کا عمل کرتے تھے۔ اپنے مرہم بھی بہت مؤثر اور مفید اور کارگر منتخب کرتے تھے اور جہاں داغ دینے اور جراحی کی نوبت آتی تو گہرا داغ لگا دیتے تھے اور قاطع جراحی کرتے تھے۔ سعدی بھی ایسا ہی کہتے ہیں لیکن مہربانی کے حق کو مقدم مانے بغیر کہتے ہیں۔

" درشتی و نرمی بہم در بہ است
چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است "

وہ کہتے ہیں کہ سختی بھی ہونا چاہئے اور نرمی بھی، جس طرح جراح جو نشتر بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے۔ منکرات کے خلاف جدو جہد کے بارے میں گفتگو

۱۔ نہج البلاغۃ - خطبہ ۱۰۷

یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

اب امر بالمعروف کے بارے میں کیا ہو؟ یہ کس شکل اور کس صورت سے انجام پا سکتا ہے؟ امر بالمعروف کی بھی بالکل یہی قسمیں ہیں۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ امر بالمعروف لفظی ہوتا ہے یا عملی۔ لفظی امر بالمعروف اس طرح ہوتا ہے کہ انسان لوگوں سے حقائق بیان کرے۔ لوگوں کے سامنے خوبیوں کی تشریح کرے۔ لوگوں کو شوق دلائے اور انہیں سمجھائے، آج نیک کام کون سا ہے؟ عملی امر بالمعروف یہ ہے کہ انسان صرف یہ کہنے پر ہی قناعت نہ کرے۔ صرف کہنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے آج کے معاشرے کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہم کہنے کی اہمیت اور قدر و قیمت کے ضرورت سے زیادہ قائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کہنے کی بھی اہمیت ہوتی ہے میں کہنے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا جب تک نہیں کہا جائیگا بات واضح نہیں کی جا سکے گی۔ حقائق کی تحریر اور تشریح نہیں ہو سکتی۔ کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ میں جو یہ کہتا ہوں کہ ہم زیادہ اہمیت کے قائل ہیں۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہم ہر بات کو صرف گفتگو سے درست کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرح جو ورد سے ہر شے کو درست کرنا چاہتے ہیں۔ ورد کریں تو زمیں آسمان اور آسمان زمیں بن جائے۔ ہم صرف لفظ اور بیان کی قوت سے کام کرنا چاہتے ہیں حالانکہ بات اس طرح نہیں بنتی۔

کہنا ایک لازمی شرط تو ہے لیکن یہی کافی نہیں ہے۔ عمل بھی کرنا چاہئے۔ لفظی امر بالمعروف اور عملی امر بالمعروف میں سے ہر ایک کی دو دو راہیں ہیں۔ ایک مستقیم اور دوسرا غیر مستقیم۔ آپ جس وقت امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنا چاہتے ہیں تو براہ راست یعنی سیدھے ورود کرتے ہیں۔ آپ سیدھے سیدھے بات کہتے ہیں۔ یعنی اگر آپ کسی کو کام کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں میں چاہتا ہوں

کہ آپ یہ کام کر دیں، لیکن کسی وقت آپ اسے بالواسطہ بھی سمجھاتے ہیں جو زیادہ کارگر اور زیادہ مفید ہوتا ہے یعنی اس کے یہ سمجھے بغیر کے آپ کی گفتگو کا مخاطب اصلی وہی ہے آپ کسی ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں جس نے فلاں کام کیا ہے اس کام کی توجیہ اور تشریح کرتے ہیں، کہتے ہیں فلاں شخص نے فلاں موقع پر ایسا عمل کیا ہے یہ طریقہ برتا ہے، وغیرہ وغیرہ، تاکہ وہ جان لے اور سمجھ لے۔ اس سے اس پر بہت اثر ہوتا ہے۔ گویا عمل بالواسطہ طور پر بھی زیادہ موثر ہے۔ اب میں بالواسطہ طریقے کے متعلق آپ کے سامنے ایک مشہور حدیث بیان کرتا ہوں دیکھئے یہ طریقہ کتنا موثر اور کارگر ہے:

حضرات حسنین علیہما السلام (امام حسنؑ اور امام حسینؑ) جب دونوں لڑکے تھے ایک بوڑھے شخص سے ملتے ہیں جو وضو کر رہا تھا انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا وضو باطل ہے۔ یہ دونوں صاحب زادگان اسلام کے رواج اور نفسیات کے اصولوں سے واقف تھے۔ فوراً آمادہ ہو گئے کہ ایک طرف تو بوڑھے کو بتا دیں کہ تیرا وضو باطل ہے لیکن دوسری طرف اگر اس سے براہ راست کہتے ہیں کہ جناب آپ کا وضو باطل ہے تو اس کی شخصیت مجروح ہو جائے گی اور وہ بے چین ہو جائے گا۔ اس کا پہلا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتا ہے نہیں! اسی طرح درست ہے، چاہے جو کچھ بھی کہیں وہ اس پر کان نہیں دھرتا۔ اس لئے دونوں ان کے سامنے گئے اور کہنے لگے۔ ہم دونوں آپ کے سامنے وضو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ دیکھئے کہ ہم میں سے کون بہتر وضو کرتا ہے (عملاً بوڑھا آدمی بچوں کی بات مان لیتا ہے)۔ وہ کہتا ہے وضو کرو تاکہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں۔ امام حسنؑ نے ان کے سامنے پورا وضو کیا۔ ان کے بعد امام حسینؑ نے بھی کیا۔ آخر میں بوڑھے کو خیال آیا کہ خود اس کا وضو درست نہیں تھا۔ وہ بعد میں کہنے لگا آپ دونوں کا وضو درست ہے۔ میرا ہی وضو غلط تھا۔ اس

یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

اب امر بالمعروف کے بارے میں کیا ہو؟ یہ کس شکل اور کس صورت سے انجام پا سکتا ہے؟ امر بالمعروف کی بھی بالکل یہی قسمیں ہیں۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ امر بالمعروف لفظی ہوتا ہے یا عملی۔ لفظی امر بالمعروف اس طرح ہوتا ہے کہ انسان لوگوں سے حقائق بیان کرے۔ لوگوں کے سامنے خوبیوں کی تشریح کرے۔ لوگوں کو شوق دلائے اور انہیں سمجھائے، آج نیک کام کون سا ہے؟ عملی امر بالمعروف یہ ہے کہ انسان صرف یہ کہنے پر ہی قناعت نہ کرے۔ صرف کہنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے آج کے معاشرے کی ایک بیماری یہ ہے کہ ہم کہنے کی اہمیت اور قدر و قیمت کے ضرورت سے زیادہ قائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کہنے کی بھی اہمیت ہوتی ہے میں کہنے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا جب تک نہیں کہا جائیگا بات واضح نہیں کی جا سکے گی۔ حقائق کی تحریر اور تشریح نہیں ہو سکتی۔ کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ میں جو یہ کہتا ہوں کہ ہم زیادہ اہمیت کے قائل ہیں۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہم ہر بات کو صرف گفتگو سے درست کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرح جو ورد سے ہر شے کو درست کرنا چاہتے ہیں۔ ورد کریں تو زمیں آسمان اور آسمان زمیں بن جائے۔ ہم صرف لفظ اور بیان کی قوت سے کام کرنا چاہتے ہیں حالانکہ بات اس طرح نہیں بنتی۔

کہنا ایک لازمی شرط تو ہے لیکن یہی کافی نہیں ہے۔ عمل بھی کرنا چاہئے۔ لفظی امر بالمعروف اور عملی امر بالمعروف میں سے ہر ایک کی دو دو راہیں ہیں۔ ایک مستقیم اور دوسرا غیر مستقیم۔ آپ جس وقت امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنا چاہتے ہیں تو براہ راست یعنی سیدھے ورود کرتے ہیں۔ آپ سیدھے سیدھے بات کہتے ہیں۔ یعنی اگر آپ کسی کو کام کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں میں چاہتا ہوں

کہ آپ یہ کام کر دیں، لیکن کسی وقت آپ اسے بالواسطہ بھی سمجھاتے ہیں جو زیادہ کارگر اور زیادہ مفید ہوتا ہے یعنی اس کے یہ سمجھے بغیر کے آپ کی گفتگو کا مخاطب اصلی وہی ہے آپ کسی ایسے شخص کی تعریف کرتے ہیں جس نے فلاں کام کیا ہے اس کام کی توجیہ اور تشریح کرتے ہیں، کہتے ہیں فلاں شخص نے فلاں موقع پر ایسا عمل کیا ہے یہ طریقہ برتا ہے، وغیرہ وغیرہ، تاکہ وہ جان لے اور سمجھ لے۔ اس سے اس پر بہت اثر ہوتا ہے۔ گویا عمل بالواسطہ طور پر بھی زیادہ موثر ہے۔ اب میں بالواسطہ طریقے کے متعلق آپ کے سامنے ایک مشہور حدیث بیان کرتا ہوں دیکھئے یہ طریقہ کتنا موثر اور کارگر ہے:

حضرات حسنین علیہما السلام (امام حسنؑ اور امام حسینؑ) جب دونوں لڑکے تھے ایک بوڑھے شخص سے ملتے ہیں جو وضو کر رہا تھا انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا وضو باطل ہے۔ یہ دونوں صاحب زادگان اسلام کے رواج اور نفسیات کے اصولوں سے واقف تھے۔ فوراً آمادہ ہو گئے کہ ایک طرف تو بوڑھے کو بتا دیں کہ تیرا وضو باطل ہے لیکن دوسری طرف اگر اس سے براہ راست کہتے ہیں کہ جناب آپ کا وضو باطل ہے تو اس کی شخصیت مجروح ہو جائے گی اور وہ بے چین ہو جائے گا۔ اس کا پہلا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتا ہے نہیں! اسی طرح درست ہے، چاہے جو کچھ بھی کہیں وہ اس پر کان نہیں دھرتا۔ اس لئے دونوں ان کے سامنے گئے اور کہنے لگے۔ ہم دونوں آپ کے سامنے وضو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ دیکھئے کہ ہم میں سے کون بہتر وضو کرتا ہے (عملاً بوڑھا آدمی بچوں کی بات مان لیتا ہے)۔ وہ کہتا ہے وضو کرو تاکہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں۔ امام حسنؑ نے ان کے سامنے پورا وضو کیا۔ ان کے بعد امام حسینؑ نے بھی کیا۔ آخر میں بوڑھے کو خیال آیا کہ خود اس کا وضو درست نہیں تھا۔ وہ بعد میں کہنے لگا آپ دونوں کا وضو درست ہے۔ میرا ہی وضو غلط تھا۔ اس

طرح وہ اس شخص سے منوا لیتے ہیں۔ اب اگر اس وقت فوراً کہہ دیتے بوڑھے ! تجھے شرم نہیں آتی۔ اس سفید داڑھی پر بھی تجھے وضو کرنا نہیں آتا؟ خدا تجھے موت دے۔ تو وہ نماز پڑھنا بھی چھوڑ دیتا۔ایک خطیب بیان کرتے تھے کہ مشہد میں ایک شخص دین سے قطعی کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ نہ صرف نماز ہی نہیں پڑھتا تھا اور روزہ نہیں رکھتا تھا بلکہ کسی بات پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ دین کا مخالف شخص تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کافی دن تک اس آدمی کے ساتھ رہے یہاں تک کہ وہ نرم وملائم اور واقعی خوش اعتقاد اور مؤمن بن گیا اور اس نے اپنا طور و طریقہ بالکل بدل دیا۔ وہ نماز پڑھتا تھا، روزہ رکھتا تھا، اور پھر یہاں تک ہوا کہ باوجودیکہ افسر تھا اور خراسان میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا آگے چل کر نماز باجماعت پڑھنے کا پابند ہو گیا تھا۔ مسجد گوہر شاہ جاتا تھا مرحوم آقائے نہاوندی کے پیچھے اس شکل سے کہ لباس پہنتا تھا اس پر عبا بھی پہنتا تھا۔ ہمارے جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ ایک مدت کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ شخص غائب ہو گیا۔ ہم نے کہا یقیناً سفر پر چلا گیا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے کہا نہیں وہ یہیں ہے لیکن آتا نہیں ہے۔ اب کیا ہو گیا جو ہمارے جلسوں میں شرکت نہیں کرتا، ہم نہیں جانتے؟ اس کے بعد معلوم ہوا کہ نماز جماعت میں بھی نہیں جاتا۔ ہم نے چھان بین کی کہ دیکھیں کیا سبب ہے؟ یہ شخص جو دین اور مذہب میں یوں داخل ہوا تھا یکایک دین و مذہب سے کیسے پھر گیا؟ ہم اس کی تلاش میں گئے تو معلوم ہوا کہ بات کچھ یوں ہوئی ہے یہ صاحب کچھ دن لگاتار نماز جماعت میں جاکر چوتھی پانچویں صف میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک دن ایک مقدس بزرگ جو امام کے پیچھے پہلی صف میں بیٹھے تھے ، تحت الحنک ڈالتے ہیں۔ میں نہیں جانتا مسواک کس طرح کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کا عاشق جانتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان پہلی صف میں اپنی نماز کی جگہ سے اٹھتے ہیں۔اس شخص کو تلاش کرتے آتے

ہیں۔اس کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، کہتے ہیں جناب وہ کہتا ہے جی! میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں فرمایئے۔ آپ مسلمان ہیں یا نہیں؟ یہ بیچارہ سٹپٹا گیا کہ کیا جواب دے۔ وہ کہتا ہے یہ کیا سوال ہے جو آپ مجھ سے کر رہے ہیں؟ وہ کہتا ہے نہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ فرمایئے کہ آپ مسلمان ہیں یا مسلمان نہیں ہیں؟ یہ بد نصیب ناراض ہو جاتا ہے اور کہتا ہے میں مسلمان ہوں۔ اگر مسلمان نہ ہوتا تو مسجد گوہر شاد میں جماعت کی صف میں میں کیا کام کرتا ہوں؟ وہ کہتا ہے کہ آپ مسلمان ہوتے تو آپ نے اپنی داڑھی ایسی کیوں رکھی ہے؟ وہ اسی وقت جانماز اٹھاتا ہے اور کہتا ہے یہ مسجد، یہ جماعت کی نماز اور یہ دین و مذہب تمہارا۔ یہ جا اور وہ جا۔؟ نہی عن المنکر کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے یعنی لوگوں کو دین سے بھگانا اور بیزار کرنا، مخالف بنانے، دشمن بنانے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔

کسی وقت میں نے ایک رسالے میں باہر کا ایک قصہ پڑھا تھا۔ لکھا تھا کہ ایک لڑکی بہت مذہبی تھی۔ ایک شہزادہ اس لڑکی پر بہت عاشق تھا لیکن وہ عیاش شخص تھا اور چاہتا تھا کہ اسے کسی طرح اپنے جال میں پھنسالے اور یہ لڑکی اپنی پاک دامنی اور راستبازی کے باعث اس کے قابو میں نہیں آتی تھی۔ شہزادے نے ہر چال چلی جس سے اسے فریب دے سکے لیکن کارگر نہیں ہوئی۔ آخر کار وہ قریب قریب نا امید ہو گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک شخص اس لڑکی کا پیغام لایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ اس بات پر آمادہ تھی کہ ساتھ ساتھ رہیں اور کچھ عرصے تک عیش کریں۔ شہزادے کو تعجب ہوا تو اس نے اس کی تحقیق کی۔ اس کو معلوم ہوا کہ ہاں لڑکی آمادہ ہے۔ اس شہزادے نے اس واقعے کے سلسلے میں چھان بین کی کہ ایک لڑکی جو اس قدر پاک دامن اور شریف تھی یکایک عیاشی اور فسق و فجور پر کیسے مائل ہو گئی، تو معلوم ہوا کہ بات کچھ یوں ہوئی تھی کہ ایک پادری کو جب یہ

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی مذہبی رجحان رکھتی ہے اپنے نزدیک اسے زیادہ مذہبی بنانے کی غرض سے ایک دن اس لڑکی سے وقت لیتا ہے اور اس کے پاس آتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں تیرے لئے ایک تحفہ لایا ہوں۔ مثلاً ایک برتن پر تولیہ ڈھانک دیتا ہے۔ تحفہ لاکر اس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور تولیہ اٹھا کر تحفہ دکھاتا ہے۔ ایک بار لڑکی دیکھتی ہے کہ وہ قبرستان سے کسی مردے کی کھوپڑی لے آیا ہے، جیسے ہی اس پر اس لڑکی کی نگاہ پڑتی ہے وہ ہل جاتی ہے، پوچھتی ہے یہ کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میں یہ اس لئے لایا ہوں کہ تم اس کے بارے میں سوچ بچار کرو اور دیکھو کہ دنیا کس قدر بے وفا ہے۔ اس نے اس لڑکی کے دل میں اس قدر نفرت پیدا کردی کہ نہ صرف اس کے وعظ کا اثر نہیں ہوا بلکہ اس وقت سے وہ یہ سوچنے لگی کہ میں اس کے خلاف عمل کروں گی۔ دنیا کا تو یہ انجام ہے۔ میں اپنی زندگی کے یہ چار دن اس طریقے سے کیوں گذاروں؟ چنانچہ وہ عیاشی کی طرف مائل ہوگئی۔

نصیحت کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے۔ یقین کیجئے کہ بہت سے لوگ جو پند و نصیحت کرتے ہیں ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو صورت بنتی ہے وہ بیشتر ایسے ہی منکرات کی ہوتی ہے۔ خود میرا بھی ایک قصہ ہے۔ میں جن دنوں قم میں تھا بری مسافر کمپنیاں نئی نئی چلی تھیں۔ ہم آئے اور مشہد کے لئے سوار ہوگئے۔ بڑی دیر کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس بس کا ڈرائیور میری ذات سے اس لئے بغض و نفرت رکھتا ہے کہ میرے سر پر عمامہ ہے۔ نہ میں اسے جانتا تھا نہ وہ مجھے جانتا تھا۔ ہمارا کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا۔ دراین(۱) میں جب وہ رکا تو میں نے اس سے پوچھنا چاہا کہ تم یہاں کتنی دیر ٹھہروگے اس

۱۔ تہران کے قریب ایک موضع

نے مجھے اس درشتی سے جھڑکا کہ پھر مشہد تک میری ہمت نہیں پڑی کہ میں اس سے کوئی بات بھی کرتا۔ میں نے خود ہی اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ شخص کم سے کم مسلمان نہیں ہے مادی، یہودی، جو بھی ہو میں نے خود فیصلہ کر دیا کہ ایسا ہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم سمنان کے قریب پہنچے ہیں تو ظہر کا وقت گزر چکا تھا۔ میں جس وقت وضو کرنے گیا کہ نماز پڑھوں میں نے اسی ڈرائیور کو دیکھا کہ وہ اپنے پاؤں دھو رہا ہے۔ میں اس پر نظر رکھے رہا۔ میں نے دیکھا کہ پاؤں دھو کر اس نے وضو کیا پھر نماز پڑھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ یہ مسلمان اور نمازی ہے لیکن میرے ساتھ اس کا طرز عمل جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ رات ہوگئی۔ میرے پیچھے (خراسان) تربت کے دو طالب علم تھے۔ وہ بھی تعطیلات میں خراسان (تربت) جانا چاہتے تھے۔ وہ (ڈرائیور) مجھ سے جتنی نفرت اور بے رخی کا اظہار کر رہا تھا ان لوگوں پر اتنا ہی مہربان تھا۔ انہیں پسند کرتا تھا۔ رات کو جب مسافر عموماً سو جاتے ہیں ان میں سے ایک کو اپنے پاس بلالیا کہ بات چیت کریں تاکہ نیند نہ آئے۔ وہ چلا گیا۔ جس وقت سب سو رہے تھے ایک دم میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ یہ ڈرائیور ایک طالب علم کو اپنا حال سنا رہا ہے۔ میں نے کوشش کر کے کان لگائے تاکہ میں بھی سن سکوں۔ پہلے تو اس نے مشہد کے لوگوں کے بارے میں بتایا کہ جو لوگ ملاؤں سے تعلقات رکھتے ہیں وہ مجھے برے لگتے ہیں۔ صرف وہ لوگ جو ثروت مند ہوتے ہیں مجھے اچھے لگتے ہیں۔ وہ بولا مختصر طور پر یہ سمجھو کہ میرے پورے خاندان میں ایک میں ہی ڈرائیور ہوں ورنہ دوسرے ڈاکٹر ہیں، انجنیئر ہیں، تاجر ہیں، افسر ہیں۔ خاندان بھر میں کم نصیب میں ہی ہوں۔ اس

نے پوچھا۔ اس کا سبب کیا ہے؟ وہ بولا : میرا ایک قصہ ہے۔

میرے والد مسلمان اور بہت دین دار شخص تھے۔ میں بچہ تھا۔ مجھے انہوں نے اسکول میں داخل کرادیا۔ میرے محلے کے پیش نماز کو اس بات کی اطلاع ہوگئی تو میرے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ آپ نے اپنے بچے کو اسکول بھیج دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! وہ بولا افسوس۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اگر آپ کا بچہ مدرسہ جائے گا تو لامذہب ہو جائے گا؟ میرے والد بھی بالکل ان پڑھ تھے۔ انہوں نے اس بات پر یقین کر لیا۔ میں بھی بچہ تھا۔ اس کے بعد میرے والد نے مجھے سبق پڑھنے نہیں جانے دیا۔ دوسرے کاموں میں لگا دیا۔ جب میں بال بچوں والا ہوگیا تو ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں تو بالکل ان پڑھ ہوں۔ اب یہ معما مجھ پر کھلا کہ یہ بے چارہ ایک طرف خود مسلمان تو ہے لیکن اپنے آپ کو میری طرح بدنصیب شمار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہی عمامہ باندھنے والے ہیں جنہوں نے مجھے بد بخت رکھا۔ یہ نہی عن المنکر کی ایک قسم ہے یعنی بھگانا، لوگوں کو بد بخت رکھنا اور دین اور روحانیت کا دشمن بنانا۔ پھر میں نے دل میں کہا کہ خدا اس کے باپ کو بخشے یہ صرف ملاؤں ہی کا دشمن ہے اسلام کا دشمن نہیں ہوا۔ نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، امام رضا علیہ السلام کی زیارت کو جاتا ہے۔ یہ بالواسطہ طور پر اسلام کو نقصان پہنچانے والا عمل ہے۔

آپ کو ایک اور قصہ سناتا ہوں۔ ایک طالب علم بہت قابل اور محترم تھا۔ بہت روشن خیال اور دین دار تھا۔ یہ شخص پہلی بار ہیٹ لگا کر مجمع میں جاتا ہے تو اس کے تمام دوست اور رفیق جو اسے دیکھتے ہیں اس پر حملہ کرتے اور اس کی توہین کرنے لگتے ہیں۔ اسے اس قدر ناراض اور مشتعل کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی طبعی بردباری کے باوجود پلٹ کر ان سے ایک بہت منطقی بات کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے اے میرے دوستو! مجھے تم سے ایک بات کہنا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے : تم اپنے دشمنوں کے دوست اور

دوستوں کے دشمن ہو۔ میں تمہارے سامنے اس کی وضاحت کرتا ہوں : میں تم ہی جیسا ایک شخص ہوں، تمہاری طرح سوچتا ہوں، تمہاری ہی طرح خدا، قرآن، پیغمبر اور ائمہ پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ میں نے تمہاری ہی طرح تعلیم پائی ہے، تمہاری ہی طرح میری تربیت ہوئی ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان دس ہزار باتیں مشترک ہیں۔ تمہارے کہنے کے مطابق اگر یہ گناہ ہے تو میں نے زیادہ سے زیادہ ایک گناہ کیا ہے۔ فی الحال میں نے اپنا لباس کسی کام، کسی پیشے، کسی مصرف کے لئے تبدیل کر لیا ہے۔ میں فرض کئے لیتا ہوں کہ یہ گناہ ہے۔ تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر کے مجھے مجبور کروگے کہ میں تم سے تعلق ختم کرلوں اور چونکہ کوئی انسان بے تعلق نہیں رہ سکتا اس لئے میں مجبور ہو جاؤں گا کہ اس وقت کے بعد تمہارے مخالفوں اور دشمنوں کا دوست بن جاؤں۔ چونکہ تم مجھے زبردستی اپنے پاس سے دور کرنا چاہتے ہو اس لئے تم اپنی اس دلیل کی رو سے اپنے دوست کے یعنی میرے دشمن ہو اور اپنے دشمنوں کے دوست ہو۔

پھر وہ مثال پیش کرتا ہے : وہ کہتا ہے کہ فلاں شخص نے اپنی عمر بھر میں کسی وقت بھی اسلام سے ظاہر داری بھی نہیں برتی ہے۔ اس میں اسلام کی کوئی علامت نہیں رہی۔ نہ اس نے کبھی قرآن پر اعتقاد کا اظہار کیا نہ اسلام پر۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ ظالم، فاسق اور شرابی ہے۔ اس شخص سے آپ کو کوئی امید نہیں ہے۔ یکایک آپ دیکھتے ہیں کہ وہ حضرت امام رضا علیہ السلام کی زیارت کو آیا ہے۔ آپ سب کہہ اٹھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ آدمی مسلمان ہے۔ اس بار جب آپ اسے دیکھتے ہیں تو اس سے اچھی طرح ملتے ہیں یعنی اس کی ہزار عادتوں میں سے نو سو ننانوے آپ کے اور آپ کے دین کے خلاف ہیں۔ چونکہ آپ کو اس سے کوئی امید نہیں ہے صرف اس بنا پر کہ وہ حضرت امام رضاؑ کی زیارت کو آگیا ہے آپ کہتے ہیں

نہیں ! معلوم ہوا مسلمان ہے لیکن دوسرے کو جس کی ہزار خصلتوں میں سے نو سو ننانوے خصلتیں مسلمانی ہیں صرف ایک خصلت آپ کے قول کے خلاف ہے اس ایک خصلت کی وجہ سے آپ کہتے ہیں کہ یہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ دوسرا اسلام کے دائرے سے خارج ہوگیا۔ پس آپ اپنے دشمنوں کے دوست ہیں یعنی اپنے دشمنوں کی مدد کرتے ہیں اور دوستوں کے دشمن ہیں یعنی واقعی آپ اپنے دشمن ہیں۔

اگر آپ بالواسطہ طور پر امر بالمعروف کرنا چاہیں تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ خود نیک اور پرہیزگار ہوں، خود اہل عمل اور اہل تقوی ہوں۔ جب آپ خود ایسے ہوں گے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مجسمہ بن جائیں گے۔ انسان پر عمل سے زیادہ کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ انبیاء اور اولیاء کی زیادہ پیروی کرتے ہیں اور دانش مندوں اور فلسفیوں کی اتنی پیروی نہیں کرتے۔ کیوں ؟! اس لئے کہ فلسفی صرف باتیں کرتے ہیں، صرف پڑھاتے ہیں ، صرف نظریہ پیش کرتے ہیں لیکن اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں کتاب لکھتے ہیں اور لوگوں کو دے دیتے ہیں اور انبیاء اور اولیاء صرف نظریہ اور خیال ہی نہیں رکھتے عمل بھی رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں پہلے اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بھی نہیں ہوتا کہ پہلے کہیں پھر عمل کریں بلکہ پہلے عمل کرتے ہیں پھر کہتے ہیں۔ جس وقت انسان نے عمل کرنے کے بعد کچھ کہا تو اس کے کہے ہوئے کا اثر کئی گنا زیادہ ہوجاتا ہے۔

حضرت علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں (اور تاریخ بھی گواہی دیتی ہے کہ ایسا ہی ہے) : "ما امر تکم بشئی الاوقد سبقتکم بالعمل به ولا نهیتکم عن شئ الاوقد سبقتکم بالانتها عنه" تم نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ میں نے خود عمل کرنے سے پہلے تمہیں کسی بات کا حکم دیا ہو۔ جب تک میں پہلے خود عمل نہیں کرلیتا تم سے نہیں کہتا اور میں تمہیں کسی بات سے اس وقت تک منع نہیں کرتا جب تک

پہلے میں نے اسے ترک نہ کر دیا ہو۔ چونکہ میں خود نہیں کرتا اس لئے تمہیں بھی نہیں کرتا ہوں۔ "کونوا دعاۃ للناس بغیر السنتکم" لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ لیکن زبان سے نہیں غیر زبان سے بلاؤ یعنی اپنے عمل سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو!۔ جس وقت انسان خود عمل کرتا ہے تو اس کا عمل اپنے آپ جامعۂ پر اپنا اثر ڈالنے لگتا ہے۔ مشہور فلسفی جان پال سارٹر کا قول ہے۔ گویا اس کے قول میں کوئی ندرت نہیں ہے لیکن اس کی اس تشریح میں نیاپن ہے جو وہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں جو کام کرتا ہوں ایک طرح سے میں اپنے جامعۂ کو اس سے وابستہ کر دیتا ہوں اور یہ بات سچ بھی ہے۔ آپ اچھا یا برا جو کام کرتے ہیں اپنے جامعۂ کو اس کام سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ لامحالہ آپ کا کام ایک لہر پیدا کر دیتا ہے، جامعۂ کے لئے ایک ذمہ داری اور ضمانت پیدا کر دیتا ہے جو آپ کے لئے بھی لازم ہوتی ہے اور آپ کے جامعۂ کے لئے بھی یعنی ہر کام ایک طرح سے معاشرے کے لئے ایک حکم ہوتا ہے کہ تو بھی ایسا کر! جس وقت میں کوئی کام کرتا ہوں تو میرے عمل کی زبان یہ ہوتی ہے کہ دوست! تو بھی میری ہی طرح ہوجا!۔ میں خواہ کتنا ہی کہوں کہ میری طرح نہ ہو ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں چاہے جتنا آپ سے کہوں کہ میرے کہے پر عمل کیجئے لیکن میرے کردار یعنی عمل سے تعلق یا سروکار نہ رکھئے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ سے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ میرے قول پر دھیان دیں۔ اور میرے کردار پر توجہ نہ کریں۔ آپ کے لئے جو ذمہ داری پیدا کرنے والی چیز ہے وہ پہلے نمبر پر میرا عمل ہے دوسرے نمبر پر میرا قول ہے۔

ہر اصلاح کرنے والے کو پہلے نیک ہونا چاہئے تاکہ وہ اصلاح کر سکے۔ وہ آگے آگے چلے اور دوسروں سے کہے کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ان دو شخصوں میں بہت فرق ہے جن میں سے ایک کھڑا ہوا ہے اور اپنے سپاہی کو حکم دیتا ہے کہ آگے

نہیں ! معلوم ہوا مسلمان ہے لیکن دوسرے کو جس کی ہزار خصلتوں میں سے نو سو ننانوے خصلتیں مسلمانی ہیں صرف ایک خصلت آپ کے قول کے خلاف ہے اس ایک خصلت کی وجہ سے آپ کہتے ہیں کہ یہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ دوسرا اسلام کے دائرے سے خارج ہو گیا۔ پس آپ اپنے دشمنوں کے دوست ہیں یعنی اپنے دشمنون کی مدد کرتے ہیں اور دوستوں کے دشمن ہیں یعنی واقعی آپ اپنے دشمن ہیں۔

اگر آپ بالواسطہ طور پر امر بالمعروف کرنا چاہیں تو اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ خود نیک اور پرہیزگار ہوں، خود اہل عمل اور اہل تقوی ہوں۔ جب آپ خود ایسے ہوں گے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مجسمہ بن جائیں گے۔ انسان پر عمل سے زیادہ کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ انبیاء اور اولیاء کی زیادہ پیروی کرتے ہیں اور دانش مندوں اور فلسفیوں کی اتنی پیروی نہیں کرتے۔ کیوں ؟! اس لئے کہ فلسفی صرف باتیں کرتے ہیں، صرف پڑھاتے ہیں ، صرف نظریہ پیش کرتے ہیں لیکن اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں کتاب لکھتے ہیں اور لوگوں کو دے دیتے ہیں اور انبیاء اور اولیاء صرف نظریہ اور خیال ہی نہیں رکھتے عمل بھی رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں پہلے اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بھی نہیں ہوتا کہ پہلے کہیں پھر عمل کریں بلکہ پہلے عمل کرتے ہیں پھر کہتے ہیں۔ جس وقت انسان نے عمل کرنے کے بعد کچھ کہا تو اس کے کہے ہوئے کا اثر کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

حضرت علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں (اور تاریخ بھی گواہی دیتی ہے کہ ایسا ہی ہے): "ما امر تکم بشئی الاوقد سبقتکم بالعمل به ولا نهیتکم عن شئ الاوقد سبقتکم بالانتها عنه" تم نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ میں نے خود عمل کرنے سے پہلے تمہیں کسی بات کا حکم دیا ہو۔ جب تک میں پہلے خود عمل نہیں کر لیتا تم سے نہیں کہتا اور میں تمہیں کسی بات سے اس وقت تک منع نہیں کرتا جب تک

پہلے میں نے اسے ترک نہ کر دیا ہو۔ چونکہ میں خود نہیں کرتا اس لئے تمہیں بھی منع کرتا ہوں۔ "کونوا دعاۃ للناس بغیر السنتکم" لوگوں کو دین کی طرف بلاؤ لیکن زبان سے نہیں غیر زبان سے بلاؤ یعنی اپنے عمل سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو!۔ جس وقت انسان خود عمل کرتا ہے تو اس کا عمل اپنے آپ جامعۂ پر اپنا اثر ڈالنے لگتا ہے۔ مشہور فلسفی جان پال سارٹر کا قول ہے۔ گویا اس کے قول میں کوئی ندرت نہیں ہے لیکن اس کی اس تشریح میں نیاپن ہے جو وہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں جو کام کرتا ہوں ایک طرح سے میں اپنے جامعۂ کو اس سے وابستہ کر دیتا ہوں اور یہ بات سچ بھی ہے۔ آپ اچھا یا برا جو کام کرتے ہیں اپنے جامعۂ کو اس کام سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ لامحالہ آپ کا کام ایک لہر پیدا کر دیتا ہے، جامعۂ کے لئے ایک ذمہ داری اور ضمانت پیدا کر دیتا ہے جو آپ کے لئے بھی لازم ہوتی ہے اور آپ کے جامعۂ کے لئے بھی یعنی ہر کام ایک طرح سے معاشرے کے لئے ایک حکم ہوتا ہے کہ تو بھی ایسا کر! جس وقت میں کوئی کام کرتا ہوں تو میرے عمل کی زبان یہ ہوتی ہے کہ دوست! تو بھی میری ہی طرح ہو جا!۔ میں خواہ کتنا ہی کہوں کہ میری طرح نہ بنو ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں چاہے جتنا آپ سے کہوں کہ میرے کہے پر عمل کیجئے لیکن میرے کردار یعنی عمل سے تعلق یا سروکار نہ رکھئے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ سے یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ میرے قول پر دھیان دیں۔ اور میرے کردار پر توجہ نہ کریں۔ آپ کے لئے جو ذمہ داری پیدا کرنے والی چیز ہے وہ پہلے نمبر پر میرا عمل ہے دوسرے نمبر پر میرا قول ہے۔

ہر اصلاح کرنے والے کو پہلے نیک ہونا چاہئے تاکہ وہ اصلاح کر سکے۔ وہ آگے آگے چلے اور دوسروں سے کہے کہ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ان دو شخصوں میں بہت فرق ہے جن میں سے ایک کھڑا ہوا ہے اور اپنے سپاہی کو حکم دیتا ہے کہ آگے

بڑھ میں یہاں کھڑا ہوا ہوں اور دوسرا خود جو آگے آگے چلتا ہے اور کہتا ہے میں چلا، تم بھی میرے پیچھے پیچھے آؤ۔

انبیاءؑ اور اولیاء کے مکتب میں ہم ان لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ ہمیشہ کہتے ہیں: "ہم چلے" حضرت علیؑ کہتے ہیں میں پہلے چلتا ہوں بعد میں لوگوں سے کہتا ہوں میرے پیچھے پیچھے آؤ۔!

پیغمبر اسلامؐ جس بات کا حکم دیتے تھے اگر پہلے اس میں خود قدم نہ بڑھاتے تو دوسروں کا پیروی کرنا ناممکن تھا۔ جب وہ نماز اور نماز شب کی بات کرتے تھے تو خود دوسروں سے زیادہ عبادت کرتے تھے "و ان ربك يعلم انك تقوم ادنى من ثلثى الليل" اگر خدا کی راہ میں خیرات اور ایثار کے لئے کہتے تھے تو سب سے پہلے ایثار اور انفاق کرنے والے خود ہی تو تھے یعنی سب سے پہلےؐ اپنے آپ سے وصول کرتے تھے اور دوسروں کو دیتے تھے۔ اگر کہتے تھے جہاد فی سبیل اللہ تو لڑائیوں میں خود آگے چلتے تھے، اپنے عزیزوں کو آگے لے جاتے تھے اور پھر دوسرے لا محالہ محبت کرنے لگتے تھے، عاشق ہوجاتے تھے کہ یہ شخص اپنے مقصد کی راہ میں اپنے سب سے زیادہ پیارے رشتہ داروں کو موت کے منہ میں بھیج دیتا ہے، سب سے پہلے خود ہتھیار لگاکر دشمن کی فوج میں گھس پڑتا ہے، خود وار سہتا ہے، اپنا دانت تڑوالیتا ہے، اپنی پیشانی زخمی کروالیتا ہے، اس وقت وہ لوگ ایسے شخص کی ذات میں حقیقت کا نظارہ کرتے تھے۔

پیغمبرؐ کو حضرت علیؑ سے زیادہ کون پیارا تھا؟ سید الشہداء حضرت حمزہ سے زیادہ عزیز کون تھا؟ آپ نے جنگ بدر میں سب سے پہلے کن لوگوں کو میدان میں بھیجا؟ حضرت علیؑ کو بھیجا جو آپ کے داماد اور چچیرے بھائی تھے اور چونکہ حضرت علیؑ بچپن سے پیغمبرؐ کے گھر میں پلے بڑھے تھے اور پیغمبرؐ کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے

حضرت علیؑ حقیقت میں پیغمبرؐ کے بیٹے کی جگہ تھے۔ آپ نے اپنے چچا حضرت حمزہ کو بھیجا جن کی آپ بہت عزت کرتے تھے۔ اپنے چچیرے بھائی جناب ابو عبیدۃ بن الحارث کو بھیجا جو آپ کو بہت عزیز تھے۔ یہ تینوں افراد گئے، دشمن کے تین افراد سے لڑے اور دشمن کے تینوں آدمیوں کو مار ڈالا۔ لیکن جناب ابو عبیدۃ ابن الحارث شدید زخمی ہوئے بعد میں شہید ہوگئے اور دنیا سے چل بسے حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور سید الشہداء حضرت حمزہ زیادہ زخمی نہیں ہوئے، یہ لوگ واپس آگئے۔

امام حسینؑ نے کتنے خطاب کئے اور کتنا عمل کیا۔ ان کے خطبات کتنے کم اور ان کے اعمال کتنے زیادہ تھے۔ جب عمل کا وقت ہوتا ہے تو گفتگو کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ امام حسینؑ اپنی تقریر میں فریاد کرتے ہیں:

"فمن كان باذلا فينا مهجته، موطنا على لقاء الله نفسه فليرحل معنا فاني راحل مصبحاً انشاء الله۔" جو شخص اپنا خون دل ہماری خاطر بخشش کرنا چاہتا ہے اور جس نے خدا کی ملاقات کا ارادہ کرلیا ہے ایسا شخص ہمارے ساتھ سفر کرسکتا ہے (وہ واپس چلا جائے جو ملک کی ہوس میں آیا ہے)۔ جو جان دینے پر آمادہ نہیں ہے وہ ہمارے ساتھ نہ آئے۔ ہمارا قافلہ جانبازوں (جان دینے والوں) کا قافلہ ہے۔ ان جان سے جانے والوں میں سب سے محترم ہستی امام حسینؑ کی ہے۔ اگر امام حسینؑ اپنے عزیزوں کو مدینہ میں چھوڑ دیتے تو کیا کوئی ان پر اعتراض کرسکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔! لیکن وہ اپنے عزیزوں کو کربلا کے منظر میں نہ لاتے اور خود اکیلے شہید ہوجاتے تو کیا جو منزلت انہیں آج حاصل ہوئی وہ حاصل ہوجاتی؟ ہرگز نہیں۔! امام حسین علیہ السلام نے وہ کام کیا جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔ یعنی اپنے عمل کو انتہائی بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جو خدا کی خاطر نہ لٹا دی ہو۔ ان کے رشتہ دار بھی ایسے لوگ نہیں تھے جنہیں امام حسین علیہ السلام زبر

دستی لائے ہوں۔ وہ ان کا سا عقیدہ، ان کا سا ایمان اور انہیں کی سی سوچ بچار رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر امام حسین علیہ السلام ایسے شخص نہیں تھے جن کے وجود میں یا جن کے ہمراہ ذرا سی بھی کمزوری ہوتی، اس لئے انہوں نے راہ میں دو تین بار چھان پھٹک کی۔ اس سے پہلے دن جب مکہ سے سفر کرتے ہیں اعلان کر دیتے ہیں کہ جو جانباز نہ ہو وہ نہ آئے لیکن بعض لوگ ابھی تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید امام حسینؑ کے جانے کی کوفہ کو خبر ہو جائے اور وہاں آپ کا خیر مقدم ہو جائے، پذیرائی ہو جائے۔ ہم پیچھے نہیں رہتے۔ امامؑ کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ ساتھ آتے ہیں۔ راستے میں کچھ عرب صحرانشین بھی امام حسینؑ کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

امامؑ راستے میں تقریر کرتے ہیں: اے لوگو! جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہم کوئی مقام حاصل کر رہے ہیں، کہیں پہنچ رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ واپس چلا جائے چنانچہ کچھ لوگ واپس بھی چلے گئے۔ آپ نے آخری چھان پھٹک شب عاشور میں کی لیکن عاشور کی شب میں کوئی گندہ پانی نہیں تھا۔ صرف ناسخ التواریخ کے مصنف نے یہ تاریخی غلطی کی ہے اور لکھا ہے کہ جس وقت امام حسین علیہ السلام نے عاشور کی رات کو اپنے اصحاب سے بات چیت کی تو ان میں سے کچھ لوگ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر چلے گئے حالانکہ کوئی تاریخ اس امر کی تائید نہیں کرتی۔ یہ صرف ناسخ التواریخ کے مصنف کی غلطی ہے اور کسی شخص کو اس قسم کا مغالطہ نہیں ہوا ہے۔ عاشور کی رات کو امام حسین علیہ السلام کے اصحاب میں سے کوئی شخص بھی نہیں گیا۔ بلکہ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم میں کوئی کھوٹ یا کمزوری رکھنے والا شخص موجود نہیں ہے۔

اگر عاشور کے دن امام حسینؑ کا کوئی ایک صحابی یہاں تک کہ بچہ بھی کمزوری دکھا دیتا، دشمن کے لشکر میں جو زیادہ قوی اور طاقتور تھا جا ملتا اور اپنے آپ کو خطرے

سے بچا کر دشمنوں کی پناہ میں چلا جاتا تو امام حسین علیہ السلام اور ان کے مکتب کا ایک نقص ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس خود دشمن امام حسینؑ کی طرف آگئے۔ یہ اپنے ان دشمنوں کو اپنی طرف لے آئے جو مأمون اور محفوظ تھے اور انہیں خطرے کی جگہ اور مرکز میں لا بٹھایا یعنی وہ لوگ خود ہی آگئے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی خطرے کے اس مقام سے اس محفوظ مقام کو نہیں گیا۔ اگر امام حسینؑ نے پہلے سے وہ چھان پھٹک، وہ خطرے کا اعلان نہ کیا ہوتا تو ایسے بہت سے حادثے پیش آجاتے۔ آپ کسی وقت دیکھتے کہ آدھی جماعت چلی گئی اور پھر وہ نعوذ باللہ امام حسینؑ کے خلاف پروپیگنڈا کرتی کیونکہ جو کوئی چلا جاتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ میرا ایمان کمزور ہے یا میں ڈرتا تھا بلکہ اپنے عمل کی کوئی نہ کوئی توجیہ تلاش کر لیتا ہے، جھوٹ بولتا ہے اور پھر دعویٰ کرنے لگتا ہے کہ اگر ہم تشخیص کرتے تو راہ حق یہی ہے۔ خدا کی خوشنودی اسی میں ہے۔ ہم یہی کام کر رہے تھے۔ ہم نے تحقیق کر لیا تھا کہ حق اسی طرف ہے۔ وہ مجبوراً اپنے حق میں منطق اور دلیل تیار کرتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہ بھی ایک بہت بڑا افتخار امام حسینؑ اور حسینی مکتب کا ہے کہ حریف کے ایک بزرگ ترین سردار کو اپنی طرف لے آئے۔ ایسا شخص جو بنیادی طور پر امیر کے منصب کے لئے نامزد تھا۔ جناب حر بن یزید ریاحی۔ وہ کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہیں تھے اگر حساب لگاتے تو عمر ابن سعد کے بعد اس لشکر کی دوسری شخصیت کون سی ہے؟ جناب حر بن یزید ریاحی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ یہ ایک بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ وہ پہلے شخص تھے جو ایک ہزار سواروں کے ساتھ اس کام پر تعینات کئے گئے تھے۔ لیکن امام حسینؑ کی قوت، جاذبہ، ایمان، عمل اور عملی امر بالمعروف نے جناب حر بن یزید کو جس نے پہلے دن امامؑ کے سامنے تلوار کھینچی تھی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے توبہ کی۔ "التائبون" کا جزو بن گئے۔ "التائبون العابدون الحامدون

السائحون الراکعون الساجدون الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر"

جو شخص بہادری اور جوانمردی میں معروف تھا اور جس کا بہترین ثبوت یہ تھا کہ اسے ہزار سوار دیئے گئے تھے تاکہ امام حسینؑ کی راہ روکے اور جو ایک نامور شجاع ہے امام حسینؑ اس کے دل میں اس طرح ابھرے ہیں کہ جس طرح سماور کے دل آگ اپنا وجود رکھتی ہے اور اسے جوش میں لاتی ہے، بھاپ کا دباؤ ڈالتی ہے اور سماور کو دھکا دیتی ہے، لرزا دیتی ہے، حقیقت کی وہ آگ جو امام حسین علیہ السلام نے اس شخص کے دل میں روشن کی تھی اس کی ہستی کی دیواروں کے سامنے (وہ بھی ہماری آپ کی طرح دنیا کا طالب تھا، پیسہ اور منصب اور سلامتی چاہتا تھا، امن و سکون چاہتا تھا) اس پر دباؤ ڈال کر کہتی ہے امام حسینؑ کی طرف جا لیکن دوسری جانب وہ مادی خیالات جو ہر انسان میں موجود ہوتے ہیں اس میں وسوسہ پیدا کر دیتے ہیں اور بول اٹھتا ہے۔ اگر میں چلا جاؤں تو ایک گھڑی بعد ہی قتل ہو جاؤں گا پھر بیوی بچوں کو نہیں دیکھ پاؤں گا تمام دولت میرے ہاتھ سے نکل جائے گی شاید میرے بعد دشمن میری تمام دولت قطعی ضبط کرلے گا میرے بچے سر پرست کے بغیر رہ جائیں گے میری بیوی بیوہ ہو جائے گی۔ یہ خیالات اسے امامؑ کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔ وہ ان دو مخالف قوتوں کے دباؤ میں آجاتا ہے۔ ایک وقت لوگ اس پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جناب حر کانپ رہے ہیں۔ کسی نے اس سے پوچھا: کیوں کانپتے ہو؟ آپ تو بہادر آدمی تھے! انہوں نے یہ سمجھا کہ وہ میدان جنگ کے ڈر سے کانپ رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ نہیں۔ تو نہیں جانتا کہ میں ضمیر کے کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ میں اپنے آپ کو جہنم اور جنت کے درمیان بااختیار پاتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ بہشت کو ادھار پر لے لوں یا اسی نقد دنیا کے پیچھے جاؤں جس کا انجام جہنم ہے۔ دیر تک اپنے آپ سے لڑتا ہوا کشمکش میں مبتلا رہا لیکن آخر میں اس شریف آدمی اور

بقول امام حسینؑ حر اور آزاد شخص نے فیصلہ کر لیا۔ اس وجہ سے کہ دشمن نہ روکے آہستہ آہستہ ایک طرف ہٹتے گئے پھر یکایک انہوں نے اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگایا اور حسینی خیموں کی طرف چلے گئے لیکن اس خیال سے کہ کہیں مولا یہ نہ سوچیں کہ حملے کے ارادے سے آرہا ہوں انہوں نے امان کی نشانی دکھائی۔

لکھا ہے قلب ترسہ، یعنی انہوں نے اپنی ڈھال الٹ دی اس علامت کے طور پر کہ میں لڑنے نہیں آیا ہوں۔ امان چاہتا ہوں۔ جو شخص سب سے پہلے اس کے سامنے آیا وہ امام حسین علیہ السلام تھے۔ چونکہ امامؑ حرم کے خیموں کے باہر کھڑے ہوئے تھے جناب حر نے سلام کیا! السلام علیک یا ابا عبداللہ! عرض کیا اے آقا! میں گنہگار ہوں، روسیاہ ہوں، میں وہی گنہگار اور مجرم ہوں (وہی پہلا شخص ہوں) جس نے آپ کا راستہ روکا تھا۔ اپنے خدا کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں :اے خدا اس گناہگار کا گناہ معاف کردے "اللّٰھم الیك تبت فتب علی فقد ارعبت قلوب اولیائك۔" (اے خدا! میں نے تیرے ولیوں کے دل لرزائے ہیں۔) میں نے انہیں ڈرایا ہے۔ (جس وقت امام حسین علیہ السلام کے اہل بیت نے انہیں راستے میں دیکھا تھا وہ پہلا موقع تھا جب ان کی نظر دشمن پر پڑی تھی۔ جس وقت ایک ہزار مسلح سپاہی اپنے سامنے کھڑے ہوئے دیکھتے ہیں تو لا محالہ ان پر خوف اور ہراس کی حالت طاری ہو جاتی ہے) اے آقا! میں توبہ کرتا ہوں اور اس غرض سے کہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کروں، وہ کلنک کا ٹیکہ جو میری پیشانی پر لگ چکا ہے خون کے سوا اور کسی چیز سے مٹایا نہیں جاسکتا میں آیا ہوں کہ آپ کی اجازت سے توبہ کروں۔ پہلے یہ فرمایئے کہ میری توبہ قابل قبول ہے یا نہیں؟ امام حسین علیہ السلام ہیں جو اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے۔ حالانکہ یہ جانتے ہیں کہ جناب حر توبہ کرے تو کیا اور نہ کرے تو کیا موجودہ حالات میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن وہ جناب حر کو اپنے لئے نہیں

چاہتے خدا کے لئے چاہتے ہیں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا : بے شک تیری توبہ قبول ہے۔ کیوں قبول نہیں ہوگی؟ کیا توبہ کرنے والے انسان کے لئے رحمت الہی کا دروازہ بند ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

جناب حر اس بات سے خوش ہوگئے کہ ان کی توبہ قبول ہوگئی۔ الحمدللہ کیا میری توبہ قبول ہے؟ ہاں! تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں جاؤں اور اپنے آپ کو آپ پر قربان کروں اور اپنا خون آپ کی راہ میں بہاؤں! امامؑ نے فرمایا : اے حر! تو ہمارا مہمان ہے، گھوڑے سے اتر۔ تھوڑی دیر بیٹھ تاکہ ہم تیری تواضع کریں (میں نہیں جانتا کہ امامؑ کس چیز سے تواضع کرنا چاہتے تھے) لیکن جناب حر نے امامؑ سے سوار رہنے ہی کی اجازت چاہی آقا نے بہت اصرار کیا لیکن وہ گھوڑے سے نہیں اترے!

بعض تاریخ دانوں نے اس بات کے یہ معنی نکالے ہیں کہ جناب حر چاہتے تھے کہ امامؑ کی خدمت میں بیٹھیں لیکن انہیں ایک فکر بے چین کر رہی تھی۔ وہ ڈر رہے تھے کہ جس عرصے میں وہ امامؑ کے پاس بیٹھے ہوں اگر امام حسین علیہ السلام کا کوئی بچہ انہیں دیکھ کر یہ کہہ اٹھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے پہلے دن ہمارا راستہ روکا تھا تو جناب حر کو شرمندگی ہوگی۔ اس غرض سے کہ انہیں شرمندگی نہ ہو اور اس غرض سے کہ جتنی جلدی ہو سکے چہرے کی یہ سیاہی اپنے خون سے دھو ڈالے انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے جانے کی اجازت دیجئے۔ امامؑ نے فرمایا: اچھا، تمہارا اصرار ہے تو میں نہیں روکتا، جاؤ!

یہ بہادر شخص لوگوں کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ ان سے گفتگو کرتا ہے۔ یوں کہ خود بھی کوفی ہے، اہل کوفہ سے دعوت (بلاوے) کا موضوع چھیڑتا ہے اور کہتا ہے : اے لوگو! یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں خود ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے خطوط لکھے تھے لیکن تم لوگوں میں سے اور تمہارے سردار میں سے جو

یہاں موجود ہیں ان لوگوں نے اس شخص کو خطوط لکھے تھے۔ اسے اپنے گھر بلایا تھا۔ اس سے مدد کا وعدہ کیا تھا۔ اب کس اصول کی رُو سے، کس قانون کی رُو سے، کس مذہب اور دین کی رُو سے اپنے مہمان سے ایسا سلوک کر رہے ہو؟

بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعے نے اس شخص کو بہت ناراض کر دیا تھا یعنی ایک ایسی کمینگی اور پست حرکت جو ان لوگوں نے دکھائی تھی، ایسی پستی جو انسانیت اور اسلام کی روح کی ضد ہے۔ تاریخ اسلام گواہی دیتی ہے کہ اسلام نے کسی وقت بھی اس کی اجازت نہیں دی کہ کسی دشمن کے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا جائے یعنی دشمن کو سخت دباؤ میں لا کر اس کا پانی بند کر دیا جائے۔ یہ تجویز حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے سامنے رکھی گئی تھی اور وہ یہ کام معاویہ کے سلسلے میں کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ خود امام حسینؑ نے انہی جناب حر کو ان کے اصحاب کے ساتھ حالانکہ دشمن تھے راستے میں سیراب کیا تھا۔ جناب حر کو یقیناً یاد ہوگا کہ ہم نے اس شخص کا پانی بند کیا ہے جس نے ہماری پیاس کے دن ہماری درخواست کے بغیر ہمیں سیراب کر دیا تھا۔ وہ کتنے شریف، بلند اور بزرگ تھے اور ہیں اور ہم کتنے پست ہیں انہوں نے کہا: اے کوفہ والو! تمہیں شرم نہیں آتی! یہ فرات مچھلی کے پیٹ کی طرح چمک رہی ہے۔ یہ جو تمام موجود جانداروں کے لئے حلال ہے۔ اس سے انسان، پالتو، وحشی اور جنگلی جانور سب پانی پیتے ہیں۔ تم نے یہ پانی فرزند پیغمبرؐ کے لئے روک دیا ہے؟ یہ شخص لڑتے لڑتے شہید ہو جاتا ہے امام حسینؑ اسے انعام دیئے بغیر نہیں رہتے۔ فوراً اس بزرگ ہستی کے سرہانے پہنچتے ہیں۔ اس کے لئے آپ نے ایک غزل پڑھی "انت الحر کما سمیتاك امك و نعم الحر حر ریاح" کتنا اچھا حر ہے۔ اس کی ماں نے اس کا کتنا اچھا نام رکھا ہے۔ اس نے پہلے دن کہا حر، آزاد انسان۔ یہ سچ ہے کہ تو آزاد انسان تھا۔ خوبصورت ہے، عظیم اور شریف ہے۔ جہاں

تک ہو سکتا ہے اپنے اصحاب پر مہربانی کرتا ہے۔ یہ خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ امام حسینؑ جن لوگوں کے سرہانے پہنچے ہیں وہ کتنے ہی تھے۔ ہر کسی کی ایک حالت ہوتی تھی۔ جس وقت امامؑ پہنچتے تھے ایک ابھی تک زندہ تھا اور آقا سے باتیں کر رہا تھا، دوسرا جانکنی کے عالم میں تھا۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنے آپ کو جن لوگوں کے سرہانے پہنچایا ان میں سے کسی کی حالت آپ کے بھائی حضرت ابا الفضل العباس سے زیادہ دلخراش اور جاں سوز نہیں تھی۔ وہ بھائی جنہیں امام حسین علیہ السلام بہت چاہتے ہیں۔ بابا امیر المومنینؑ کی شجاعت کی یادگار ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ امام حسینؑ نے ان سے کہا تھا اے بھائی! "بنفسی انت" اے عباس! میری جان تم پر قربان ہو! یہ بہت اہم بات ہے۔ امام حسین علیہ السلام سے حضرت عباس تقریباً پچیس سال چھوٹے تھے۔ ابا عبداللہؑ ۵۷ سال کے اور حضرت عباس ۳۴ سال کے جوان تھے)۔ عمر اور تربیت کے لحاظ سے امام حسین علیہ السلام حضرت ابا الفضل کے باپ کے برابر شمار ہوتے تھے۔ اس وقت وہ ان سے کہتے ہیں۔ اے بھائی! "بنفسی انت" میری جان تم پر قربان ہو۔

امام حسین علیہ السلام خیمے کے پہلو میں منتظر کھڑے ہیں۔ یکایک حضرت ابا الفضل کی مردانہ فریاد سنتے ہیں (لکھا ہے کہ حضرت ابا الفضل علیہ السلام کا چہرہ اتنا حسین تھا کہ "کان یدعی بقمر بني هاشم" کہ اپنے زمانے میں قمر بنی ہاشم کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ کا قد اتنا بلند تھا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے: "و کان یرکب الفرس المهتم و رجلاه یخطان الارض" بلند گھوڑے پر سوار ہوتے تھے، رکاب سے پاؤں نکال لیا کرتے تھے تو زمین پر انگوٹھوں سے خط بنتا چلا جاتا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ بقول مرحوم آقا شیخ محمد باقر بیرجندی کچھ مبالغہ بھی ہوگا لیکن یہ معلوم

ہوتا ہے کہ جسم بہت بلند تھا ایسا جسم تھا جس پر نظر کرنے سے امام حسینؑ کو خوشی ہوتی تھی)

جس وقت امام حسینؑ ان کے سرہانے پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کے جسم پر ہاتھ نہیں ہیں۔ ان کے سر پر ایک آہنی گرز لگا ہوا ہے اور آنکھ میں ایک تیر پیوست ہے۔ بے سبب نہیں ہے جو کہا گیا ہے: "لما قتل العباس بان الانکسار فی وجه الحسین۔" جیسے ہی حضرت عباس قتل ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ امام حسینؑ کا چہرہ بے رونق ہو گیا۔ آپ نے خود فرمایا تھا: "الان انقطع ظهری و قلت حیلتی۔"

ولاحول ولاقوة الا بالله العلی العظیم

وصلی الله علی محمد وآله الطاهرین

پانچویں مجلس

مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے امر بالمعروف کی اہمیت(۱)

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم: التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللّٰہ و بشر المؤمنین(۲)

جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عامل نے حسینی تحریک کی قدر و قیمت کو بہت بلند و بالا کیا اسی صورت حسینی تحریک نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مقام اونچا کیا۔ جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عامل نے اس تحریک کا درجہ نہایت عالی کیا اس مقدس تحریک نے بھی اس اسلامی اصول کو بہت اعلیٰ سطح پر پہنچا دیا۔ اس اصول کو کس طرح بلند کیا؟ کیا امام حسینؑ کسی اسلامی اصول کو پست یا بلند کر سکتے ہیں؟ نہیں! میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ حقیقتاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام میں کچھ اہمیت رکھتا تھا اور امام حسینؑ آئے اور انہوں نے اسلام میں اس اصول کی قدر و قیمت تبدیل کر دی۔ یہ حسینؑ ابن علیؑ کا کام نہیں ہے، یہ پیغمبر خدا

۱۔ یہ تقریر ۲۶، ۱۲، ۱۳۴۸ مطابق ۹ محرم ۱۳۹۰ ہجری کو کی گئی۔

۲۔ سورۂ توبہ آیت ۱۱۲

کا بھی کام نہیں۔ یہ خدا کا کام ہے۔

یہ اصول خدا نے اپنے بندے کے پاس اپنے بندوں کے لئے بھیجا ہے۔ اس نے ہر اصول کے لئے ایک درجہ، ایک مرتبہ اور ایک قدر و قیمت مقرر کر دی ہے۔ اس بات کی تو پیغمبرؐ کو بھی قدرت نہیں ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل میں کوئی تصرف کر سکیں اور اسلام کے اصلی متن پر اپنا اثر چھوڑیں۔ میری مراد یہ ہے کہ حسینی تحریک نے اسلامی علماء کے استنباط اور اجتہاد اور کل مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کو بہت اعلیٰ سطح پر پہنچا دیا۔

دینی علوم کے طالب علموں کی ایک اصطلاح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر بات کا مقام ثبوت اور مقام اثبات یعنی واقعی اور حقیقی مقام ایک سطح، ایک حد اور ایک درجہ پر ہوتا ہے۔ جدید فلسفیوں کے قول کے مطابق ایک شئ اپنی جگہ ایک حقیقت رکھتی ہے اور پھر اس شئ کے ہمارے لئے ایک معنی بھی ہوتے ہیں یعنی اس کی ایک مختلف حقیقت ہوتی ہے۔ مقام ثبوت کسی شئ کا اپنا اصلی مقام یا ذاتی حقیقت ہے اور مقام اثبات اس شئ کا ہمارے لئے مقام و معنی ہے۔ اس بات کو یوں سمجھئے: فرض کیجئے کہ اس شہر میں دل کے کچھ معالج موجود ہیں۔ حقیقت میں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب کے سب ایک ہی درجے کے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ طبیب "الف" کا درجہ سب سے بلند ہو یعنی وہ دل کا بہترین طبیب، دل کا ماہر ترین طبیب، دل کا سب سے زیادہ عالم طبیب ہو۔ طبیب "ب" دوم درجہ کا طبیب "ج" درجہ سوم کا اور طبیب "د" درجہ چہارم کا ہو لیکن لوگ انہیں کس طرح پہچانیں؟! لوگوں میں ان کی قدر و قیمت اور اعتبار کیا ہے؟ کیا ان لوگوں کی وہ قدر و قیمت اور وہ اعتبار جو یہ حقیقت میں رکھتے ہیں اور ان کی قدر و قیمت اور اعتبار جس کے عوام قائل ہیں ایک ہی ہیں؟ طبیب "الف" جو اول درجے کا دل کا معالج ہے کیا معاشرے میں بھی اول درجے کا

طبیب سمجھا جاتا ہے؟ کیا طبیب "ب" کو جو اس شہر کا درجہ دوم کا طبیب ہے معاشرہ میں بھی درجہ دوم کا طبیب ہی سمجھا جاتا ہے؟ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے لیکن کبھی ممکن ہے اس کا الٹ بھی ہو یعنی معاشرہ اسباب، پروپیگنڈے، غلط فہمیوں اور واقعات کے اثر سے مقام ہدایت کو یعنی ہمارے لئے مقام شئ کو اس کے بالکل خلاف ٹھہرائے۔ درجہ چہارم کے طبیب کو درجہ اول کا طبیب جانے، تیسرے درجے کے طبیب کو دوسرے درجے کا اور دوسرے درجے کے طبیب کو تیسرے درجے کا سمجھے اور جو واقعی درجہ اول کا طبیب ہے اسے درجہ چہارم کا معالج شمار کرے۔ چنانچہ یہاں مقام اثبات اور مقام ثبوت میں فرق ہوتا ہے۔ کسی چیز کی اپنی جگہ حقیقت اور اسی چیز کی ہمارے لئے قدرو قیمت، اہمیت یا معنی میں فرق ہوتا ہے۔

تو جب میں یہ کہتا ہوں کہ امام حسینؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدر و اہمیت بڑھا دی تو میری مراد یہی ہوتی ہے کہ اسلام میں نہیں اسلامی دنیا میں بڑھا دی۔ اصل اسلام میں، مقام ثبوت میں، کسی شئ کے حقیقی مقام میں اس کی قدرو قیمت کو بڑھانا یا گھٹانا امام حسینؑ یا پیغمبرؐ یا حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے اختیار میں نہیں ہے۔ صرف خدا ہے جس کے نزدیک اسلام کے ہر اصول کی منزلت مقرر ہے۔ لیکن اسلامی معاشرے کے نقطہ نظر سے کیا اسلامی معاشرہ اسلامی منزلتوں کو جس حد تک واقعی ان کا وجود ہے، جس حد تک وہ مقام ثبوت اور شئے کے ذاتی مقام میں ہوتی ہیں پہچانتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ معاشرہ اس طرح نہ پہچانتا ہو اور کبھی کبھی اس کے بالکل خلاف بھی جانتا ہو یعنی جو باتیں درجہ اول کی قدر و قیمت رکھتی ہیں اسلامی معاشرے کی نظر میں ان کی قدر و قیمت سب سے کم درجے کی ہو، حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں مستقبل کا کچھ یوں اندازہ لگاتا ہوں جیسے لوگوں میں اسلام کی حالت اس پوستین کی سی ہو جائیگی جسے الٹ کر پہن لیا گیا ہو۔ "و لبس الاسلام لبس الفرو

مقلوباً"(۱) جس طرح پوستین کو الٹ کر پہن لیتے ہیں اسی طرح لوگ اسلام کی الٹی تفسیر کیا کریں گے۔ چہرے کو پیٹھ اور پیٹھ کو چہرہ بنادیں گے۔ اس صورت میں نہ صرف ایسی پوستین میں گرمی نہیں رہتی بلکہ ایک مضحکہ خیز اور ڈراؤنی سی چیز نظر آنے لگتی ہے۔

اگر اسلامی قدریں الٹ جائیں، درجہ اول کی قدر درجہ دوم کی بن جائے اور آخری درجے کی قدر پہلے درجے پر آجائے (۲) تو اس کے وہ اسلامی معنی ہونگے جو الٹے ہوگئے ہوں۔ یہ ایسی پوستین ہوگی جسے الٹ کر پہن لیا گیا ہو۔

مسلمانوں کی نظر سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدر و قیمت مختلف ہوتی ہے۔ میں اس مسئلے کی وضاحت اسلام کے علماء کے نقطہ نظر سے کرتا ہوں۔ علمائے اسلام نے اس بات پر تو بحث نہیں کی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدرو قیمت کس قدر ہوتی ہے؟ لیکن جس مسئلے پر بحث کی ہے اس سے علماء کے نقطۂ نظر سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدر و قیمت کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا اصول اسلام میں موجود ہے اور حدیث نبویؐ بھی ہے جس کے مطابق تمام علمائے اسلام فیصلہ دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: "اذا اجتمعت حرمتان ترکت الصغریٰ للکبریٰ۔" جب اسلام میں دو قدریں یعنی دو حرمت کی باتیں اکٹھی ہو جائیں یعنی ایک دوسرے کی مزاحمت کرنے لگیں تو چھوٹی کو چھوڑ کر بڑی کو اختیار کرلو!

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۷

۲۔ فرض کیجئے کہ جمعہ کے دن ناخن کاٹنے کی اہمیت جو مستحب اس قدر بڑھ جائے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جگہ لے لے یا سر کے بالوں یا داڑھی میں کنگھی کرنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے برابر یا اس سے زیادہ اہمیت حاصل کرلے یا مستحب زیادات کو جانا اول درجے کی قدروں میں شمار ہونے لگے۔

اس بات کی بہت واضح مثالیں ملتی ہیں۔ان میں سے ایک مشہور مثال جس کا ذکر کیا جاتا ہے یہ ہے : غصبی زمین میں داخل ہونا حرام ہے۔ اگر آپ نے یہ دیکھا کہ کسی غصبی زمین میں کوئی انسان، کوئی جانور اور کوئی محترم نفس پانی میں گر پڑا ہے اور ڈوبنے والا ہے تو آپ کو کیا کرنا چاہئے ؟ آیا غصبی زمین پر پاؤں رکھیں (جو اپنی جگہ حرام ہے) اور جاکر اسے بچالیں یا پھر اس غرض سے کہ غصبی زمین پر پاؤں نہ رکھیں اپنی جگہ کھڑے رہیں اور اس محترم نفس کو ہلاک ہوجانے دیں جب کہ اس جاندار کو نہ بچانا عمل حرام ہوگا۔ یہاں کیا کرنا چاہئے ؟ دو(۲) حرمتیں ہیں : ”ایک مال کی حرمت جو قوانین مالی کے مطابق محفوظ رہے ، لوگوں کے شرعاً جائز مال کا احترام برقرار رہنا چاہئے۔ اس مقام کے مالک کی رضا مندی کے بغیر وہاں نہیں جانا چاہئے۔“ دوسرا ”نفس اور جان کا احترام۔“ مال کی حرمت جان کی حرمت کے برابر نہیں ہوسکتی۔ اگر آپ کے لئے یہ ضروری ہو کہ ان دو حرام چیزوں میں سے ایک کو دوسرے پر قربان کر دیا جائے تو جان پر مال کو قربان کر دیجئے۔ ایسے میں اگر آپ غصبی زمین میں داخل ہوں گے تو نہ صرف آپ گناہ کے مرتکب نہیں ہوں گے بلکہ ثواب کے مرتکب ہوں گے، کیونکہ آپ نے اطاعت کی ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق یہ مسئلہ اٹھتا ہے کہ اس کی حد کہاں ہے ؟ امر بالمعروف کی حد کہاں ہے ؟ میں اور آپ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں تو کہاں تک آگے جائیں گے ؟ ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور ہم کو کسی قسم کا کوئی خطرہ یا نقصان درپیش نہیں ہوتا۔ اگر ہم نہ کریں تو محض سستی اور کاہلی ہوگی۔ ہم بغیر کوئی خطرہ مول لئے حقیقت بیان کر دیتے ہیں۔ ہم نہی عن المنکر کر دیتے ہیں لیکن ہماری جان، مال، آبرو کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا، کوئی گزند نہیں پہنچتی۔ ٹھیک ہے۔! اسے تو سب مان لیں گے۔ اور

اگر ایسا ہوا کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں اور میرے مال کو نقصان پہنچے تو کروں یا نہ کروں ؟! اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہوں تو میری حیثیت اور آبرو کو نقصان پہنچتا ہے، مجھے برا بھلا کہتے ہیں، مجھ پر لاٹھیاں برساتے ہیں، میری آبرو ریزی کرتے ہیں، مجھ پر اتہامات لگاتے ہیں۔ کروں یا نہ کروں ؟ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہوں تو میری جان خطرے میں پڑ جاتی ہے ، میں مارا جاتا ہوں۔ کروں یا نہ کروں ؟ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہوں اپنی جان کے علاوہ عزیزوں کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہوجاتا ہے ، میرا خاندان قید ہوجاتا ہے، کروں یا نہ کروں ؟ یہاں ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ بعض علمائے اسلام نے کہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حد وہاں تک ہے جہاں تک کام کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔ کام کو کوئی نقصان نہ پہنچے، آپ کی جان ، آبرو اور مال کو بھی کوئی صدمہ نہ پہنچے، آپ کے جسم پر کوئی آفت نہ آئے۔ حقیقت میں ان لوگوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدر و قیمت گرادی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس حد تک کرنا چاہئے کہ آپ کی آبرو کو کوئی خطرہ نہ ہو یعنی اگر آبرو پر بن جائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھی وہاں دخل ہو تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دو اور آبرو بچالو۔ میں مانتا ہوں کہ اسلام میں آبرو محترم ہوتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مومن کی آبرو اور جسم کا احترام ہونا چاہئے۔ آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ بے سبب اپنے جسم پر ایک چھوٹا سا زخم بھی لگائیں، آپ کو اس کا حق نہیں ہے کہ آپ اپنے بدن پر بلا سبب دیت وارد کرلیں نہ کہ ایسا کام کریں جس سے آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو بلاوجہ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے :

"ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔"(۱) اگر آپ چاہیں کہ چھت سے کود پڑیں چاہے قرض کے فشار میں ہی کیوں نہ ہوں یا محبت میں ہار گئے ہوں، چاہے آپ کے نزدیک دنیا اور مافیہا کی کوئی قدر و قیمت ہی نہ ہو یا زندگی تاریک ہو، یہ عمل جائز نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہیں جیسے انسان نے دوسرے کو قتل کردیا ہو اور قرآن کریم قتل عمد (ارادی قتل) کے بارے میں صاف صاف کہتا ہے: "فجزاؤہ جھنم"(۲) جو شخص نفس محترم کو مار ڈالتا ہے خواہ اپنا نفس ہو یا غیر کا اس کی سزا جہنم ہے۔ "خالداً فیھا" وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی (جہنم) میں رہے گا۔ جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ انہیں اپنی جان کا اختیار حاصل ہے (غلطی پر ہیں)۔ انسان کا مال محترم ہے کیونکہ آپ کے پاس جو مال ہے وہ آپ ہی کا مال نہیں ہے۔ وہ سب سے پہلے معاشرے کا مال ہے اور دوسرے نمبر پر آپ کا مال ہے۔ آپ اس سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتے ہیں لیکن اسے کھونے اور لٹانے کا حق نہیں رکھتے۔ اسلام آپ کے ایسے حق کا قائل نہیں ہے۔ مال محترم ہے، بدن محترم ہے، جان محترم ہے، آبرو محترم ہے، کیا آپ معاشرے میں ایسا کام کر سکتے ہیں جس سے بلاوجہ آپ کی آبرو ریزی ہو، بلا وجہ لوگ آپ پر اتہام لگائیں؟" اتقوا مواضع التھم۔" کلام اس میں نہیں ہے۔ گفتگو یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان محترم باتوں کے مقابلے میں کتنی قوت رکھتا ہے؟ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احترام کا درجہ کتنا بلند ہے اس لئے کہ پیغمبر اکرمؐ کے قول کے مطابق کہ "اذا جتمعت حرمتان ترکت الصغری للکبری" جب دو حرمتیں اکٹھی ہو کر ایک دوسرے کی مزاحم بن جائیں تو ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم چھوٹی حرمت کو بڑی حرمت پر قربان کردیں۔ بعض علمائے اسلام اور بہت

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۹۵
۲۔ سورۂ نساء آیت ۹۳

افسوس کے ساتھ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ شیعوں کے بھی بعض بڑے بڑے علماء جن سے ایسی امید نہیں کی جاتی تھی یہ کہتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حد غیر ضرری ہے۔ آپ کی جان، مال، یا آبرو کو ضرر نہ پہنچے۔ یعنی اگر ان چیزوں کو نقصان پہنچے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیجئے۔ اس کا احترام جان، مال یا آبرو کے احترام سے چھوٹا ہے۔ یہ بات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدر و قیمت گھٹا دیتی ہے۔ ایک اور شخص کہتا ہے۔ نہیں! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدر و قیمت اس سے اونچی ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے۔ یہ دیکھئے کہ آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کس چیز کے لئے کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کس موضوع کے متعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں؟ کسی وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا موضوع بہت چھوٹا موضوع ہوتا ہے مثلاً ایک شخص گلی کو گندہ کرتا ہے۔ گلی میں خربوزے کا چھلکا پھینک دیتا ہے جو اسے نہیں پھینکنا چاہئے۔ آپ اس بارے میں اسے اور نہی عن المنکر کیجئے۔ اسے سمجھائیے اور ہدایت کیجئے۔ اس سے کہئے کہ ایسا نہ کرے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اب اگر گلی میں خربوزے کا چھلکا پھینکنے کے سلسلے میں نہی عن المنکر کرنے کی وجہ سے آپ یہ دیکھیں کہ وہ آپ کو گالی دیتا ہے تو یہاں موقع نہیں ہے۔ اس کام کی اتنی قدر و منزلت نہیں ہے جس کے لئے آپ گالیاں سنیں۔ ایک اور موقع بھی ہے جہاں اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت آپ کی جان، مال اور حیثیت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن خطرے میں پڑا ہوا ہے۔ تمام سازشیں اس بات کی ہو رہی ہیں کہ قرآن سے اختلاف کیا جائے۔ قرآن اور اصول قرآنی کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ عدالت کو خطرہ لاحق ہونے والا ہے جس کے لئے قرآن صاف صاف کہتا ہے: انبیاء کا نصب العین انسانی معاشرے میں عدالت قائم کرنا ہے:

"ولقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط"(۱) ظلم اور عدالت کا مسئلہ انسانی زندگی کی اصل اور محور ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "الملك یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم۔" کوئی معاشرہ ظلم و ستم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ یا جہاں اسلامی وحدت جیسا کوئی مسئلہ خطرے میں ہو کیونکہ اسلام وحدت کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہے اور مسلمانوں کی وحدت کو اہمیت دیتا ہے قرآن فرماتا ہے :"واعتصموا بحبل اللّٰه جمیعا ولا تفرقوا"(۲) آپ دشمن کا ہاتھ دیکھتے ہیں، دشمن کی سازش دیکھتے ہیں جو برابر مسلمانوں میں تفرقہ پھیلاتا اور پھوٹ ڈالتا رہتا ہے۔ کیا اس مقام پر بھی آپ کہیں گے : امر بالمعروف مت کیجئے، منہ سے بات مت کہیں، نہی عن المنکر نہ کیجئے، اسلئے کہ ایسی بات کہتا ہوں تو میری جان خطرے میں ہے، میری آبرو کو گزند پہنچی جاتی ہے، معاشرہ پسند نہیں کرتا ہے۔ کیا ایسی ایسی بیہودہ بات کریں گے ؟

چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بڑے بڑے مسئلوں میں رعایت نہیں کرتا۔ کوئی محترم چیز، کوئی محترم کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی برابری نہیں کرسکتا، اسے نہیں روک سکتا۔ اس اصول کا دارومدار اس پر ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا موضوع کیا ہے۔ یہی سبب ہے جو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدر و قیمت اور اہمیت اتنی بلند کردی۔ جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول نے حسینی تحریک کی قدر و قیمت بہت بڑھادی جیسا کہ میں ایک بیان میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اسی طرح حسینی تحریک نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا درجہ بہت بلند کردیا۔ کیونکہ امام حسینؑ نے

۱۔ سورۂ حدید آیت ۲۵
۲۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۰۳

سمجھا دیا کہ انسان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ میں ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں اسے اپنا مال اور آبرو قربان کر دینا چاہئے۔ لوگوں کی ملامت اسی طرح سننا چاہئے جس طرح امام حسینؑ نے سنی کیونکہ کوئی ایک شخص بھی حسینی تحریک کی تائید نہیں کررہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ لوگ جس طرح سوچتے تھے درست ہی سوچتے تھے لیکن جس سطح پر امام حسینؑ سوچ رہے تھے وہ ان کی فکر کی سطح سے بہت بلند تھی۔ وہ اس طرح سوچتے تھے کہ اگر یہ سفر سرداری حاصل کرنے کے لئے ہے تو اس کا انجام اچھا نہیں ہے اور لوگ سچ ہی کہتے تھے۔ خود امام حسینؑ نے بھی جب عاشور کے دن حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو فرمایا: " للّٰه درّا بن عباس ینظر من ستر رقیق" مرحبا! ابن عباس جو حوادث کو باریک پردے میں سے دیکھ لیتے ہیں۔ انہوں نے آج کے تمام حالات، کوفیوں کے اطوار اور میرے اہلبیتؑ کی حالت مجھ سے مدینہ میں ہی بیان کردی تھی۔ کہ اگر آپ کوفہ جائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ کوفی بد عہدی کریں گے۔ بہت سے دوسرے لوگ بھی یہی کہتے تھے۔ کچھ لوگوں کو جواب دینے کے بجائے خاموش ہوجاتے تھے۔ ان میں سے ایک کے جواب میں آپ نے فرمایا: "لا یخفی علّی الامر" جو بات تم کہہ رہے ہو مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ میں خود بھی جانتا ہوں۔ امام حسینؑ نے ایسے واقعات میں یہ ثابت کردیا کہ امر بالمعروف اور نہیِ عن المنکر کے لئے اسلامی اصول کی خاطر جان قربان کی جاسکتی ہے، عزیز قربان کئے جاسکتے ہیں، مال اور دولت لٹائی جاسکتی ہے، لوگوں کے طعنے سنے اور سہے جاسکتے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی شخص امام حسینؑ بن علیؑ کے برابر امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کی قیمت ادا کرسکا ہے؟ حسینی تحریک کا مطلب یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس قدر بلند ہے کہ اس کی راہ میں اس حد تک فداکاری کی جاسکتی ہے۔

حسینی تحریک کے پیش نظر اب اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوئی حد ہوتی ہے، ہرگز نہیں ہوتی۔ یہ اصول حد تسلیم نہیں کرتا البتہ فتنہ و فساد کو پہچانتا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرط عدم فتنہ (فساد کا نہ ہونا) ہے، وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے ٹھیک کہتے ہیں کہ ممکن ہے میں کبھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں اور اسلام کی خدمت بجا لانا چاہوں لیکن یہی اسلام کے لئے ایک دوسرا ہی فتنہ کھڑا کر دیتا ہے جو میری اس خدمت سے کہیں بڑا اور زیادہ ضرر رساں ہے۔ بہت سے لوگ نہی عن المنکر کرتے ہیں لیکن اس سے نہ صرف یہ کہ انہیں کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ جس کو نہی عن المنکر کرتے ہیں اس شخص کو دین سے ہی بالکل الگ کر دیتے ہیں۔ میں فتنے کی ترتیب کا مسئلہ تو قبول کرتا ہوں لیکن نقصان کا مسئلہ اور وہ بھی شخصی اور ذاتی نقصان کا مسئلہ ان معنوں میں قبول نہیں کرتا کہ امربالمعروف اور نہی عن المنکر کی حد ذاتی یا شخصی نقصان ہے (چاہے اس کا کوئی موضوع ہو، چاہے ہر موضوع کے بارے میں ہو) اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ بات امام حسینؑ نے بھی قبول نہیں کی اور دوسری دلیلوں کی رو سے بھی جن پر بحث کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ امام حسینؑ نے اس اصول کو اپنایا اور ثابت بھی کر دیا کہ میں نے اس دلیل سے قیام کیا ہے، یا کم از کم وہ ایک سبب یا عنصر جس نے مجھے اس تحریک پر آمادہ کر دیا ہے یہی ہے۔ آپ معاویہ کے زمانے میں ایسی علامتوں اور قرینوں کا اظہار کر رہے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ اپنے آپ کو قیام کے لئے آمادہ کر رہے ہیں۔ آپ نے پیغمبرؐ کے صحابہ کو منیٰ میں جمع کر کے ان سے گفتگو کی۔ ان پر واضح کر دیا۔ ان کے سامنے حقائق بیان کئے۔ حالات کی خرابیاں ان کے سامنے ظاہر کر دیں اور فرمایا کہ آپ لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے۔ "تحف العقول" کی وہ

مشہور حدیث جو بہت مفصل اور اعلیٰ ہے۔ یہ واقعہ پورے طور پر بتاتی ہے اور یہ بھی نشاندہی کرتی ہے کہ امام حسینؑ کس طرح سوچ رہے تھے، امام حسینؑ معاویہ کی عمر کے آخری حصے میں اسے ایک خط لکھتے ہیں اور اسے ملامت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: اے معاویہ ابن ابو سفیان! خدا کی قسم! اس وجہ سے کہ میں ابھی تجھ سے جنگ نہیں کر رہا ہوں، ڈرتا ہوں کہ خدا کی بارگاہ میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ یہ خیال نہ کرنا کہ حسین آج خاموش ہے تو قیام پر آمادہ نہیں ہے۔ میں مناسب وقت کا منتظر ہوں تاکہ میرا قیام مؤثر ہو، اور مجھے اس ہدف کی راہ میں جس کے لئے کوشاں ہوں ایک قدم آگے لے جائے۔ آپؑ جس دن مکہ سے نکلتے ہیں ایک وصیت نامہ میں محمد ابن حنفیہ کو لکھتے ہیں اور اپنی بات صاف صاف بیان کرتے ہیں: "انی ماخرجت اشراً ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً و انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی ارید عن امر بالمعروف وانهی عن المنکر۔" راستے میں امام حسینؑ کتنے ہی موقعوں پر اس اصول سے اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہیں۔ اور ان موقعوں پر خصوصیت سے اصل دعوت اور بیعت کا ذکر نہیں کرتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ راستے میں جتنے زیادہ وحشت ناک واقعات کا علم ہوتا تھا اور کوفہ سے جتنی زیادہ مایوس کن خبریں پہنچتی تھیں، امام حسینؑ کی ہر تقریر پچھلی تقریر سے زیادہ اندوہناک ہوتی جاتی تھی چنانچہ جناب مسلم ابن عقیل کی شہادت کی خبر پہنچنے کے بعد آپ یہ مشہور تقریر کر رہے تھے: "ایها الناس! ان الدنیا قد ادبرت و آذنت بوداع و ان الآخره قد اقبلت و اشرفت بصلاح۔" یہ اپنے پدر بزرگوار کے کلمات کا اقتباس ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: "الاترون ان الحق لا یعمل به والباطل لا یتناهی عنه؟ لیرغب المومن فی لقاء الله حقاً۔" کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے؟ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ الٰہی قوانین پامال ہو رہے ہیں؟ کیا تم نہیں

دیکھ رہے ہو کہ اس قدر خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور کوئی منع نہیں کر رہا ہے اور کوئی بھی باز نہیں آرہا ہے؟ "لیرغب المؤمن فی لقاء اللّٰہ حقاً" ایسے حالات میں مومن (یہ نہیں فرمایا : میں جو حسینؑ بن علیؑ ہوں میرا خصوصی دستور ہے ، میں چونکہ امام ہوں میرا فرض یہ ہے) کو جان پر کھیل جانا اور اللہ سے ملاقات کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ ان حالات میں جان پر کھیل جانا چاہئے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اتنی اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔

اثنائے سفر میں ایک تقریر میں حالات کی وضاحت کرنے کے بعد فرماتے ہیں : "انی لا اری الموت الاسعادہ والحیوۃ مع الظالمین الا برما۔"

اے لوگو! ان شرائط اور حالات میں میں مرنے کو ہی سعادت سمجھتا ہوں (بعض نسخوں میں شہادت لکھا ہے اور بعض میں سعادت) میں مرنے کو خدا کی راہ میں شہادت جانتا ہوں۔

یعنی اگر کوئی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ میں مارا جائے تو وہ شہید ہے (کہ میں مرنے کو سعادت سمجھتا ہوں اس فقرے کے معنی بھی یہی ہیں) "والحیوۃ مع الظالمین الابرما" میں ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو باعث ملامت سمجھتا ہوں۔ میری روح ایسی روح نہیں ہے۔ جو ظالموں سے میل کر سکے۔

سب سے بالا اور صریح وقت وہ ہے جب حالات سو فیصد مایوس کن ہو چکے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب آپ عراق کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں اور جناب حر بن یزید ریاحی کا لشکر آپ کے مقابل آگیا ہے۔ ہزار سپاہیوں کا لشکر اس بات پر مامور ہے کہ آپ کو اپنی نگرانی میں کوفہ لے جائے۔ اس مقام پر امام حسینؑ وہ مشہور تقریر فرماتے ہیں جسے طبری جیسے معتبر مؤرخوں نے نقل کیا ہے اور جس میں آپ پیغمبرؐ کی گفتگو سے تمسک کرتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول سے تمسک کرتے ہیں۔

"ایھا الناس! من رأی سلطاناً جائراً مستحلا لحرام اللّٰہ، ناکثا لعھد اللّٰہ مستا ثراً لفئ اللّٰہ، معتدیا لحدود اللّٰہ، فلم یغیرعلیہ بقول ولا فعل کان حقاً علی اللّٰہ ان یدخلہ مدخلہ الا وانما ھؤلاء القوم قد احلوا حرام اللّٰہ و حرموا حلالہ، واستأ ثروا فئ اللّٰہ" مشہور قانون کے مطابق آپ ایک بہت کامل صغریٰ اور بہت کامل کبریٰ(۱) کا انتخاب کرتے ہیں۔ پہلے پورے کبریٰ کا ذکر فرماتے ہیں : اے لوگو! پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی کسی ظالم اور جائر کی حکومت کو دیکھتا ہے کہ وہ خدا کا قانون تبدیل کر رہی ہے ، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا رہی ہے ، مسلمانوں کے بیت المال کو ذاتی پسند پر خرچ کر رہی ہے ، الٰہی حدود توڑ رہی ہے ، مسلمان کے خون کو محترم نہیں شمار کرتی ہے اور پھر ایسے حالات میں بھی وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے تو وہ اس بات کا سزاوار ہے کہ خدا اور سچ مچ خدا یہی کرتا ہے یعنی علم الٰہی میں ثابت ہے کہ ایسے خاموش رہنے والے انسان کو اس جائر اور جابر کی جگہ شمار کرتے ہیں۔ اس کے بعد آپ مطلب صغریٰ کا بیان فرماتے ہیں : "ان ھؤلاء القوم" یہ لوگ جو آج حکومت کر رہے ہیں (آل امیہ) ایسے ہی لوگ ہیں (یعنی جائر و جابر ہیں)۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ انہوں نے حرام کو حلال کر دیا ہے ، حلال کو حرام کر دیا ہے؟ کیا انہوں نے الٰہی حدود کی خلاف ورزی نہیں کی ہے؟ قانون الٰہی کو تبدیل نہیں کر دیا ہے؟ مسلمانوں کا بیت المال اپنے ذاتی اختیار میں نہیں لے لیا ہے اور ذاتی مال کی طرح اپنی ذات کے لئے اسے خرچ نہیں کر رہے ہیں؟ اس لئے جو شخص ان حالات میں خاموش رہیگا وہ انہیں لوگوں کی طرح شمار ہوگا۔ پھر آپ نے اپنی ذات سے اس کی تطبیق فرمائی : "و انا احق من غیر" اپنے نانا کے اس دستور پر عمل کرنے میں دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ موزوں ہوں۔

۱۔ منطقی اصطلاحیں ہیں کبریٰ و صغریٰ

جس وقت انسان امام حسین علیہ السلام کی یہ صفات اور خصوصیات پہچان جاتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ ان کا نام لبد تک زندہ رہنا حق اور سزاوار ہے۔ چونکہ امام حسینؑ خود اپنی ملکیت نہیں تھے، خود اپنی ذات کے مالک نہیں تھے۔ انہوں نے خود کو انسان پر فدا کر دیا، انسانی معاشرے پر قربان کر دیا، انسان کے تقدس پر خدا پر قربان کر دیا اسی سبب تمام لوگ انہیں دوست رکھتے ہیں، چاہتے ہیں، پسند کرتے ہیں۔ جس وقت انسان دوسرے شخص کو دیکھتا ہے اس میں کوئی بات اپنی موجود نہیں ہے جو کچھ ہے شرافت اور انسانیت ہے تو وہ اسے اپنے آپ سے متحد اور ایک سمجھ لیتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام سے ملنے کے بعد جناب حر چاہتے تھے کہ آپ کو کوفہ لے جائے لیکن امامؑ نے منع کر دیا۔ امام حسینؑ اپنے آپ کو ذلیل کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ آپ کو اپنی نگرانی میں لے جائے۔ آپ نے فرمایا: میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ آخر کار بات چیت کے بعد یہ طے پایا کہ ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو نہ کوفہ جاتا ہو، نہ مدینہ پہنچتا ہو یعنی مغرب کی سمت اختیار کیا جو چلتے چلتے زمین کربلا پر ختم ہوا۔ امام حسینؑ محرم کی دوسری تاریخ کو کربلا پہنچے۔ تقریباً بہتر (۷۲) افراد کی جماعت کے ساتھ خیمے لگائے گئے۔ دوسری جانب مقابل میں دشمن کے ہزار نفر کا لشکر خیمہ زن ہوا۔ دشمن کے جاسوس برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ چند روز کے بعد دشمن کی مدد آئی۔ اس مدد میں ایک ہزار لشکری، تین ہزار لشکری اور پانچ ہزار لشکری تھے۔ لکھا ہے کہ چھٹے دن تک "حتی کملت ثلاثین۔" تیس ہزار سپاہیوں کا لشکر مکمل ہو گیا۔ ابن زیاد نے یہ فیصلہ کیا کہ جو شخص اس کو حکومت اور امارت دے گا اسی کو اس لشکر کی سرداری عطا کرے گا۔ وہ ابن سعد تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک نفسیاتی چال چلی۔ چونکہ وہ سعد بن ابی وقاص کا بیٹا تھا اور سعد بن ابی وقاص میں شیعوں کے نقطہ نظر سے ایک ضعف تھا کہ انہوں نے امیر المومنین کی خلافت کے

دور میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی نہ اس طرف آتے تھے نہ اس طرف جاتے تھے۔ اسلامی غزوات میں اپنے لئے کافی عزت حاصل کر چکے تھے اور پیغمبرؐ کے زمانے میں بھی اسی طرح لوگوں میں بہت زیادہ مشہور، نامور اور ہر دل عزیز تھے، لوگوں کی نظر میں وہ ایسے بڑے سردار تھے جنہوں نے اسلامی لڑائیوں میں بہت زیادہ فتوحات حاصل کی تھیں۔

ابن زیاد نے پسر سعد کا انتخاب کیا تھا تاکہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے فائدہ اٹھائے یعنی اس طرح لوگوں کو یہ سمجھائے کہ یہ بھی ان لڑائیوں ہی کی طرح کی ایک لڑائی ہے۔ جس طرح سعد وقاص کفار سے لڑتے تھے پسر سعد بھی نعوذ باللہ ایک ایسے فرقے سے لڑ رہا ہے جو اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ یہ حریص جس نے خود ہی اپنی طمع کا اظہار کر دیا تھا، سمجھدار آدمی تھا اور کسی وجہ سے اس کا بالکل احسان مند ہونا بھی نہیں چاہتا تھا لہذا ابن زیاد کی خوشامد کرنے لگا کہ مجھے اس کام سے باز رکھ۔ ابن زیاد بھی اس کا کمزور پہلو جانتا تھا۔ وہ اس سے پہلے اس کے لئے "رے" اور "گرگان" کی حکومت کا حکم نامہ جاری کر چکا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ میرا حکم نامہ واپس کر دے۔ (یزیدی لشکر کی سرداری پر) نہیں جانا چاہتا تو نہ جا۔ وہ بھی چونکہ اس حکومت کا گرفتار تھا اور اس ملک کی آرزو رکھتا تھا کہنے لگا۔ مجھے جانے دے میں سوچ لوں۔ اب اس نے جس آدمی سے مشورہ کیا اس نے اسے ملامت کی اور کہا ایسا کام بھی نہ کرنا لیکن آخر میں اس پر طمع غالب آ گئی اور اس نے اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا۔

وہ جب سے کربلا میں آیا یہ کوشش کر رہا تھا کہ خدا اور خرما ایک جگہ جمع ہو جائیں بلکہ اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح صلح ہو جائے یعنی خود کو امام حسینؑ کے قتل سے بچالے۔ کم سے کم خود اس سے نجات پائے۔ بعد میں جو ہو سو ہو۔ اس نے دو تین بار امام حسین علیہ السلام سے بات چیت کی۔ بقول طبری چونکہ ان

مذاکرات میں صرف انہیں دو اشخاص نے شرکت کی ہے اس لئے ان مذاکرات کی صحیح صحیح معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ ان کا صرف اتنا حصہ ملا ہے جو بعد میں خود عمر ابن سعد نے بیان کیا ہے یا ہم اس سلسلے میں ائمہ اطہارؑ کی زبان سے جس قدر اطلاعات پاتے ہیں ورنہ اور کوئی معلومات نہیں ہے۔ وہ بہت کوشش کرتا رہا بلکہ کام کرتا تھا (یہ بھی لکھا ہے کہ کبھی کبھی جعل باتیں بھی گھڑ لیتا تھا) کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ اس کا آخری خط جو عبیداللہ ابن زیاد کے نام پہنچا ہے اس وقت مجلس میں کچھ کاسہ لیس بیٹھے ہوئے تھے۔ عبیداللہ قدرے سوچنے لگا۔ بولا ممکن ہے اس جھگڑے کو وہ سلامتی کے ساتھ حل کر لے۔ لیکن ٹکڑے توڑیئے والے مانع آئے جو یخنی کے پایوں سے زیادہ گرم رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک شمر بن ذی الجوشن تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور بولا امیر! تم بہت غلطی کر رہے ہو۔ آج امام حسینؑ تمہارے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس جھگڑے سے نمٹ ہی لو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ان کے والد کے شیعہ اس اسلامی ملک میں کم نہیں ہیں زیادہ ہی ہیں۔ کوفہ ہی کے لوگوں پر منحصر نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اطراف کے شیعہ جمع نہ ہو جائیں اور اگر جمع ہو گئے تو پھر تم حسینؑ سے نہیں جیت سکو گے۔ لکھا ہے کہ ایک آدمی کی طرح جو سوتے سوتے ایک دم جاگ اٹھے ابن زیاد بولا تو نے ٹھیک کہا۔ پھر یہ شعر پڑھا:

"الان قدعلقت مخالبنا به

یر جوا النجاة ولات حسین مناص"

اور اس کے بر عکس عمر ابن سعد پر غضبناک ہوا بولا: وہ کیا سمجھ کر ہم کو دھوکا دیتا ہے۔ فوراً عمر ابن سعد کو خط لکھا کہ ہم نے تجھ کو اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ ہمیں باپ کی سی نصیحتیں لکھ کر بھیجا کرے۔ تو متعینہ افسر ہے، سپاہی ہے، تجھے ضابطے کا خیال رکھنا چاہئے۔ میں جو کچھ تجھے حکم دیتا ہوں تو بے چون و چرا اس کو نافذ کر۔ اگر

تو نہیں چاہتا تو کنارہ کر۔ میں کسی دوسرے کو اس کام پر لگا دوں گا۔ اس نے شمر ابن ذی الجوشن کو خط دیا اور کہا اسے اس کے ہاتھ میں دینا۔ اسی سلسلے میں ایک اور خفیہ فرمان لکھ کر شمر کے ہاتھ میں دیا اور کہا کہ اگر عمر ابن سعد حسینؑ سے لڑنے کو منع کر دیں تو اس فرمان کے تحت تو اس کی گردن مار دے، اسکا سر مجھے بھیج دے اور لشکر کی سرداری خود سنبھال لینا۔

لکھا ہے کہ نویں محرم کو شمر بن ذی الجوشن یہ خط لے کر کربلا پہنچا۔ نویں کے عصر کا وقت تھا، نویں محرم کا دن اہلبیت پیغمبرؐ کے لئے بہت غمناک دن تھا۔ امام صادقؑ نے فرمایا: "ان تا سوعا، یوم حوصرفیه الحسین" وہ دن ہے جب امام حسینؑ کا محاصرہ سخت ہو گیا تھا۔ یہ وہ دن ہے جب عمر ابن سعد کے لشکریوں کو کافی مدد پہنچی لیکن اہل بیت پیغمبرؐ کو کوئی مدد نہ پہنچی۔ تاسوعا (نویں محرم) کے عصر کے وقت یہ ازلی اور ابدی لعین کربلا پہنچتا ہے۔ پہلے وہ کھلا ہوا خط عمر ابن سعد کو دیتا ہے۔ امید کرتا ہے کہ وہ کہے نہیں! میں امام حسینؑ سے جنگ نہیں کروں گا تاکہ دوسرے حکم نامے کی رو سے عمر ابن سعد کو قتل کر دے اور خود لشکر کا سردار بن جائے لیکن اس کی امید کے خلاف عمر ابن سعد نے اس پر نگاہ ڈالی اور کہنے لگا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ میرے خط کا ابن زیاد پر اثر ہوا تھا لیکن تو موجود تھا اور تو مانع ہوا۔ اس نے کہا اب جو کچھ ہے ارادہ بتا، جنگ کرتا ہے یا کنارہ؟ اس نے جواب دیا۔ نہیں! خدا کی قسم! میں اس طرح لڑوں گا کہ سر اور ہاتھ کٹ کٹ کر آسمان کی جانب اڑیں گے۔ اس نے پوچھا۔ میرا فرض کیا ہے؟ عمر ابن سعد جانتا تھا یہ بھی عبید اللہ ابن زیاد سے زیادہ قربت رکھتا ہے (دونوں کی قسم ایک ہی ہے۔ جو زیادہ شقی اور قسی القلب ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں) اس سے کہنے لگا تو بھی پیادوں کی کمان سنبھال لے۔

فرمان بہت سخت تھا کہ میرا خط پہنچتے ہی حسینؑ پر سختی کرنا۔ حسینؑ ان دو باتوں میں سے ایک بات قبول کر سکتے ہیں۔ غیر مشروط اطاعت یا لڑائی اور قتل۔ تیسری بات نہیں ہے۔ لکھا ہے کہ نویں محرم کا آفتاب غروب ہونے والا ہے، حسینؑ بن علیؑ ایک خیمے کے باہر اس طرح بیٹھے ہیں زانوؤں پر ہاتھ اور سر رکھے ہیں۔ نیند سی وہ آگئی ہے۔ جب عمر ابن سعد نے فرمان پڑھ لیا سخت گیر ہو گیا تو آواز دی: "یا خیل اللّٰہ! ارکبی و بالجنة ابشری" (زرا دھو کے بازی، جھوٹ اور ریاکاری دیکھئے) "اے لشکر خدا سوار ہو جاؤ، میں تم کو بہشت کی بشارت دیتا ہوں۔" لکھا ہے کہ یہ تیس ہزار کا لشکر جو حسینؑ کے خیموں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا ایسے سمندر کی طرح جس میں طوفان آجاتا ہے یکایک جوش و خروش اور حرکت میں آگیا اور اس نے طوفان برپا کر دیا۔ یکایک گھوڑوں اور آدمیوں کے شور، آوازوں اور ہتھیاروں کی جھنکاروں سے صحرا گونج اٹھا۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا ایک خیمے میں تشریف رکھتی ہیں۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی تیمارداری کر رہی ہیں۔ باہر کی آوازیں سنیں فوراً باہر نکلیں دیکھا دشمن کا لشکر حصار تنگ کرتا جارہا ہے۔ آئیں! امام حسینؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ بھیا! اٹھیں۔ کیا آپ انہیں دیکھ رہے ہیں؟ کیا آپ انہیں سن رہے ہیں؟ دیکھئے تو کیا بات ہے۔ حسینؑ سر اٹھاتے ہیں، اس لشکر پر توجہ کیے بغیر فرماتے ہیں: "میں نے ابھی خواب میں اپنے جد کو دیکھا، انھوں نے مجھے خوش خبری سنائی، فرماتے تھے میرے حسین تو بہت جلد مجھ سے ملنے والا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس بات سے جناب زینب سلام اللہ علیہا کے دل پر کیا گزری۔

شب عاشور ہے۔ یہ ایسی رات ہے کہ ہم اگر شہیدان کربلا کے حال پر اچھی طرح غور کریں تو ایک طرف تو اس حماسہ کو دیکھتے ہیں جس سے ہماری روح میں

ہیجان برپا ہو جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دوسری طرف ہم غم میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس بات کے دلائل موجود ہیں کہ شب عاشور جتنی سخت جناب زینب سلام اللہ علیہا پر گزری ہے کسی پر نہیں گزری اور پھر جس قدر سختی اس رات گزری ہے اتنی کسی اور موقع پر نہیں گزری۔ اس لئے کہ عاشورہ کے دن گویا جناب زینب سلام اللہ علیہا کی روحانی حالت بہت قوی تھی اور واقعات کے ساتھ ساتھ زیادہ قوی اور توانا ہوتی گئی۔

اس رات میں دو سانحے ایسے پیش آئے جنھوں نے جناب زینب سلام اللہ علیہا کو بہت بے چین کر دیا ہے۔ ایک نویں محرم کی عصر کے وقت پیش آیا اور دوسرا عاشور کی شب میں۔ اس رات کے لئے امام حسینؑ کا ایک مفصل پروگرام ہے۔ اس میں ایک کام یہ ہے کہ آنے والے کل کے لئے اپنے اصحاب کا اسلحہ تیار کر رہے ہیں۔ جون (یا ہوی) نامی ایک شخص ہے جو حضرت ابو ذر غفاریؓ کا آزاد کردہ غلام ہے، وہ اسلحہ تیار کرنے میں ماہر تھا۔ ہتھیاروں کے لئے ایک خیمہ مخصوص تھا جس میں یہ مرد اسلحہ سازی میں مشغول تھا۔ امام حسینؑ اس کا کام دیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے یہ خیمہ امام زین العابدینؑ کے خیمہ کے برابر تھا جو بیمار تھے اور جناب زینب سلام اللہ علیہا آپ کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ یہ دونوں خیمے ایک دوسرے کے بہت نزدیک تھے کیونکہ امام حسینؑ نے حکم دے دیا تھا کہ خیموں کی قناتیں اس رات کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر لی جائیں کہ ایک کی طنابیں دوسرے خیمے میں داخل ہو جائیں۔ اس کی وجہ میں بعد میں عرض کر دوں گا۔

اس واقعے کے راوی امام زین العابدین علیہ السلام ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری پھوپھی میری تیمارداری میں مشغول تھیں۔ میرے والد اسلحہ کے خیمے میں آئے ہوئے یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ ہتھیار بنانے والا شخص کیا کر رہا ہے۔ میں نے یکایک سنا

کہ میرے والد زیر لب ایک شعر گنگنا رہے ہیں۔ انھوں نے اسے دو تین بار دہرایا :

یا دھر! اف لك من خلیلی کم لك با لا شراق ولاصیلی
و صاحب وطالب قتیلی والدھر لا یقنع بالبدیلی
وانما الامر الی الجلیلی

اے زمانے! تو کس قدر حقیر ہے !اے زمانے !تو کس طرح انسان سے دو ستوں کو رلاتا ہے۔ ہاں زمانہ ایسا ہی ہے لیکن معاملہ زمانے کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ معاملہ خدا کے ہاتھ ہے۔ ہم راضی بہ رضائے الٰہی ہیں۔ ہم وہی چاہتے ہیں جو خدا ہمارے لیے چاہتا ہے۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں : میں سن رہا ہوں، میری پھوپھی جان بھی سن رہی ہیں میرے اور میری پھوپھی کے درمیان ایک معنی خیز اور پر اسرار خاموشی قائم ہے۔ میرا دل بھر آیا ہے لیکن میں اپنی پھوپھی زینبؑ کی وجہ سے نہیں رویا۔ میری پھوپھی زینبؑ کا دل بھی بھر آیا ہے لیکن وہ اس وجہ سے نہیں روتیں کہ میں بیمار ہوں۔ ہم دونوں آنسوں کے اس طوفان کو روکے رہے۔ آخر پھوپھی جان زینبؑ (پھر عورت ہیں، رقیق القلب ہیں) سے ضبط جاتا رہا اور وہ زور زور سے رونے اور دھاڑیں مارنے لگیں۔ کاش! مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ کاش دنیا اجڑ گئی ہوتی اور زینب یہ گھڑی نہ دیکھتیں۔ اسی حالت میں امام حسینؑ کی خدمت میں جا پہنچیں۔ امام حسینؑ بڑھ کر جناب زینبؑ کے سامنے آئے ان کا سر دامن میں لیا اور انھیں نصیحت اور موعظت کرنے لگے :

"اخیہ! لایذھبن بحلمك الشیطان۔" اے بہن! خیال رکھو کہ شیطان تمہیں بے صبر نہ بنا دے۔ تمھاری برداشت نہ چھین لے۔ یہ کیا ہے جو تم کہہ رہی ہو؟ کاش زمانہ اجڑ جاتا اس کا کیا مطلب ہے؟ زمانہ کیوں اجڑ جائے؟ مرنا برحق ہے، شہادت برحق ہے، شہادت ہمارا افتخار ہے، میرے نانا پیغمبر خداؐ مجھ سے بہتر تھے،

میرے والد علیؑ، والدہ زہراؑ، بھائی حسنؑ یہ سب کے سب مجھ سے بہتر تھے۔ یہ سب چلے گئے ہیں، میں بھی جا رہا ہوں۔ تم دھیان رکھو میرے بعد اس قافلے کی سرپرستی کرنا۔ میرے بچوں کی دیکھ بھال کرنا۔ جناب زینبؑ نے روتے ہوئے بھرائی ہوئی کمزور آواز میں کہا۔ اے بھائی! یہ سب ٹھیک ہے لیکن ان میں سے جب بھی کوئی گیا میرے پاس ان میں سے کچھ دوسرے کم سے کم ایک تو ضرور ہی رہ گیا جس سے میرے دل کو سہارا رہتا تھا۔ ہم میں سے جو آخری آدمی گیا وہ بھائی حسنؑ تھے۔ ان کے بعد میرے دل کو ڈھارس آپ سے تھی۔ بھائی! اگر تم بھی زینب کے ہاتھ سے چلے گئے تو زینب اس دنیا میں پھر کس سے سہارے ہوگی۔

نویں محرم کو سہ پہر کے وقت امام حسین علیہ السلام نے (خواب کا واقعہ) جناب زینبؑ سے بتانے کے بعد فوراً اپنے سعادت مند بھائی جناب ابوالفضلؑ کو آواز دی۔ بھائی! فوراً چند نفر کے ساتھ ان کے پاس جاکر پوچھو کہ تازہ خبر کیا ہے؟ اگر ہم سے لڑنا بھی چاہتے ہیں تو غروب آفتاب کا وقت جنگی قانون کے مطابق لڑائی کا وقت نہیں ہے (عام طور پر صاحبان حرب صبح سے غروب آفتاب تک لڑتے ہیں۔ رات ہوتے ہی اپنی اپنی قیامگاہوں اور مرکزوں کو واپس چلے جاتے ہیں) یقیناً کوئی نئی بات ہے۔ حضرت عباسؑ کچھ سن رسیدہ اصحاب ظہیرابن القین، حبیب ابن مظاہر کے ساتھ جاتے ہیں اور دشمنوں کے مقابل کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی کی طرف سے پیام لایا ہوں کہ تم سے پوچھوں کہ اس وقت کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟ عمر ابن سعد کہتا ہے۔ ہاں! نئی خبر ہے۔ امیر عبیداللہ ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ آپ کے بھائی یا تو غیر مشروط اطاعت قبول کریں یا ہم جنگ کریں گے۔ حضرت عباس نے فرمایا میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اپنے بھائی کے پاس جاتا ہوں اور ان سے جواب لے کر آتا ہوں۔ حضرت عباس جس وقت امام حسین علیہ السلام کی

خدمت میں پہنچے تو امامؑ نے فرمایا ہم اطاعت نہیں کریں گے، جنگ کریں گے۔ میں اپنے خون کے آخری قطرے تک لڑوں گا۔ ان لوگوں سے صرف ایک جملہ کہہ دو! ایک خواہش، ایک تمنا، ایک مطالبہ کرلو اور وہ یہ ہے کہ اسے کل تک ملتوی کردیں۔ پھر اس وجہ سے کہ یہ گمان نہ گزرے کہ حسینؑ ایک رات اور زندہ رہنا غنیمت سمجھتا ہے اور یہ سمجھا دیں کہ وہ زندگی کو غنیمت نہیں جانتا، چند ساعت کی عمر کی کچھ وقعت نہیں سمجھتا بلکہ وہ کچھ اور چاہتا ہے آپ نے فرمایا: خدا خوب جانتا ہے کہ میں یہ مہلت اس لئے چاہتا ہوں کہ اپنی عمر کی یہ آخری رات میں اپنے خدا سے رازو نیاز کر لوں، اس سے مناجات اور اس کی عبادت کرلوں، قرآن پڑھ لوں۔

حضرت عباسؑ گئے۔ وہ لوگ اس بات کو منظور کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن بعد میں ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا تم بہت بے حیا لوگ ہو کیونکہ ہم اگر کفار سے بھی لڑتے اور وہ اتنی مہلت مانگتے تو انھیں بھی دے دیتے۔ ہم پیغمبرؐ کے خاندان کو اتنی سی مہلت کیوں نہیں دیتے؟ ابن زیاد کے فرمان کو نظر انداز کرنے پر عمر ابن سعد مجبور ہو گیا تاکہ اس کے لشکر میں اختلاف پیدا نہ ہو جائے۔ ان لوگوں نے کہہ دیا۔ بہت اچھا۔ کل صبح سہی۔ حضرت امام حسین علیہ اسلام نے وہ رات غیر معمولی طور پر روشن، نورانی اور پر جوش حالت میں بسر کی۔ جن لوگوں نے اس رات کو امام حسینؑ کی معراج کی رات کہا ہے، سچ کہا ہے۔ اس رات آپ نے اصحاب اور اہلبیتؑ کے سامنے بہت فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ یہی رات ہے جس میں آپ سب سے رخصت ہوتے اور سب کو رخصت فرماتے ہیں: اے میرے ساتھیو! اے میرے اہل بیت! میں اپنے اصحاب سے بہتر کسی کے اصحاب اور اپنے اہلبیت سے بہتر کسی کے اہلبیت کو نہیں پاتا۔ میں تم سب کا شکر گزار ہوں، تم سب کا ممنون ہوں، لیکن یہ جان لو کہ یہ لوگ صرف میرے طلبگار ہیں۔ یہ میرے سوا کسی سے کوئی

سروکار نہیں رکھتے۔ تم نے جو میری بیعت کی ہے وہ میں نے تم سے اٹھالی۔ تم سب آزاد ہو۔ جو جانا چاہے چلا جائے۔ آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا۔ تم میں سے جس جس سے ہو سکے میرے اہلبیتؑ میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑو اور اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ، لیکن اصحاب حسینؑ تو آزمودہ تھے۔

لکھا ہے سب نے ایک آواز ہو کر کہا: یہ آپ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم چلے جائیں اور آپ کو تنہا چھوڑ جائیں؟ ہمارے پاس ایک جان سے زیادہ بھی ہوتی تو وہ بھی آپ پر قربان کر دیتے۔ کاش خدا ہم کو لگاتار ہزار جانیں عطا کرتا، ہم مارے جاتے اور دوبارہ زندہ ہوتے رہتے اور یوں ہزار جانیں آپ پر قربان کر دیتے۔ یہ ایک جان تو کسی قابل ہی نہیں ہے۔ ہماری یہ حقیر جان آپ پر قربان ہونے کے قابل ہی نہیں ہے۔ لکھا ہے: "بدأهم بذالك اخوه ابو الفضل العباس۔" وہ پہلے آدمی جنہوں نے یہ بات کہی آپ کے سعادت مند بھائی حضرت ابو الفضل العباسؑ تھے۔ (آج کی رات ہم یتیم امام حسنؑ حضرت قاسم کا بیان کریں گے جو شب عاشور بیان کیا جاتا ہے۔) جب سب لوگ اپنی اپنی وفاداری کا اعلان کر چکے تو ابا عبداللہ نے اپنی گفتگو کا رخ بدلا۔ ان کے سامنے دوسرے حقائق سے پردہ اٹھایا اور فرمایا: تو اب میں تم سے حقیقت بیان کرتا ہوں۔ تم جان لو کہ کل ہم سب شہید ہو جائیں گے۔ ہم میں سے جو اس جگہ موجود ہیں ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ سب بول اٹھے۔ ہم خدا کا شکر کرتے ہیں کہ جس نے ہمارے نصیب میں ایسی شہادت اور ایسی سعادت بخشی۔ یہ تیرہ سال کا بچہ مجلس میں ایک طرف بیٹھا ہوا ہے۔ جس وقت ابا عبداللہ یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ کل سب شہید ہو جائیں گے تو یہ بچہ اپنے دل میں سوچتا ہے کہ اس سے شاید سن رسیدہ لوگ مراد ہونگے، ہم کم سن ان میں شامل نہیں ہونگے۔ تیرہ سال کے بچے کو ایسا سوچنے کا حق ہے۔ مضطرب ہے، فکر مند ہے۔ ایک مرتبہ اس

نے سر اٹھاکر عرض کیا: "یا عماہ! و انا فی من یقتل؟" عموجان! کیا میں بھی کل قتل ہونے والوں میں سے ہوں یا نہیں؟

حسینؑ ابن علی نے رقت آمیز نگاہ سے دیکھ کر فرمایا: اے بیٹا! پہلے میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں اس کا جواب دیدیں پھر میں آپ کے سوال کا جواب دوں گا۔ انہوں نے عرض کیا: عموجان فرمایئے۔ آپ نے فرمایا: تمہیں موت کا مزہ کیسا لگتا ہے؟ انہوں نے فوراجواب دیا: "احلی من العسل" ایسی موت مجھے شہد سے زیادہ میٹھی لگتی ہے (یعنی میں اس وجہ سے پوچھ رہا ہوں کہ شاید کل مجھے یہ سعادت حاصل نہ ہو) آپ نے فرمایا: ہاں بیٹے! تم بھی کل شہید ہوگے لیکن ایک بہت بڑی مصیبت اور بہت سخت مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد۔ لیکن امام حسینؑ نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ یہ بلا کیا ہے۔ البتہ عاشور کے دن دکھا دیا کہ امامؑ کی کل مراد کیا تھی؟ جناب قاسم میدان کو جاتے ہیں۔ چونکہ چھوٹے ہیں۔ ان کے جسم کے مطابق کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ پھر بھی شیر بچہ ہیں۔ شجاعت دکھاتے ہیں یہاں تک کہ سر پر ایک وار لگتا ہے تو آپ گھوڑے سے گر پڑتے ہیں۔ امام حسینؑ خیمے کے در پر نگراں کھڑے ہیں، آپ کا گھوڑا تیار ہے، گھوڑے کی لگام آپ کے ہاتھ میں ہے۔ گویا انتظار کر رہے ہیں۔ اچانک یا عماہ! کی فریاد فضا میں گونجی۔ عموجان میں بھی چلا۔ عموجان میری خبر لیجئے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ حسینؑ شکاری باز کی طرح جناب قاسم کی طرف جھپٹے۔ کوئی سمجھ ہی نہیں پایا کہ کس تیزی سے گھوڑا اڑایا۔ جناب قاسم کے زمین پر گر پڑنے کے بعد دشمن کے کافی سپاہیوں (تقریباً دو سوآدمیوں) نے اس بچے کو گھیر لیا تھا تاکہ ان میں ایک شخص سر تن سے جدا کر لے۔ اچانک جو انھیں پتہ لگا کہ حسینؑ جھپٹے ہوئے آرہے ہیں تو لومڑیوں کے اس گلّے کی طرح شیر کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے

اور ان کا وہ آدمی جو جناب قاسم کا سر کاٹنے کے لئے گھوڑے سے اتر آیا تھا گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہوکر جہنم واصل ہوگیا۔ اس وقت اتنا گردوغبار اٹھا تھا کہ کسی کو یہ معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ معاملہ کیا ہوا۔ دور سے دوست اور دشمن دیکھ رہے ہیں۔ "فاذن جلس الغرہ۔" جب دھول بیٹھ گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ حسینؑ جناب قاسم کے سرہانے بیٹھے ہیں، ان کا سر زانوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ لوگوں نے حسینؑ کی بلند آواز سنی، وہ کہہ رہے تھے۔ "عزیز علی عمك ان تد عو ہ فلا یجیبك او یجیبك فلا ینفعك۔" اے بیٹے! تیرے عم پر یہ بات کس قدر شاق ہے(۱) کہ تو عموجان کو پکارے اور میں نہ پہنچ سکا، تیرے سرہانے پہنچا اور تیرے کسی کام نہ آسکا۔ راوی کہتا ہے کہ جناب قاسم کا سر امام حسینؑ کے آغوش میں ہے جان کنی کے عالم میں ایڑیاں زمین پر رگڑ رہے ہیں۔ اسی حالت میں "فشھق شھقتاًفمات" ایک فریاد کی اور جان دے دی۔ یکایک لوگوں نے دیکھا کہ حسینؑ نے جناب قاسم کی لاش اٹھاکر بغل میں لے لی۔ لوگوں نے دیکھا کہ جناب قاسم کو گھسیٹ کر خیمہ گاہ کی طرف لے جارہے ہیں۔ یہ بہت عجیب اور عظیم بات ہے۔ جب جناب قاسم میدان میں جانا چاہتے ہیں تو حسینؑ سے درخواست کرتے ہیں۔ حسینؑ کا دل نہیں چاہتا کہ اجازت دیں۔ جس

۱۔ میں نے قم میں سنا تھا کہ اس شہر کے ایک مشہور واعظ نے مرحوم آیت اللہ الحاج شیخ عبدالکریم حائری رضوان اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے یہ بیان پڑھا تھا (یہ بہت مخلص شخص گزرے ہیں یہ ان لوگوں میں سے تھے جو پیغمبر اکرمؐ کے اہلبیتؑ کے عاشق ہیں اور یہ بات مجھے تواتر سے معلوم ہوئی ہے۔ مجھے ان کی موجودگی کا علم نہیں ہوسکا۔ ان کی وفات کے دس ماہ بعد مجھے قم جانے کا اتفاق ہوا تو جن لوگوں نے ان میں دیکھا تھا وہ کہتے تھے کہ جیسے ہی یہ بزرگ شخص امام حسین علیہ السلام کا نام سنتے تھے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوں جاری ہو جاتے تھے) انھوں نے اتنا گریہ کیا اور اپنے آپ کو پیٹ کر بے حال ہوگئے پھر انھوں نے اس واعظ سے کہا۔ میری درخواست ہے کہ جب میں مجلس میں ہوا کروں تو تم یہ بیان نہ پڑھا کرو کیونکہ مجھ میں اسکے سننے کی تاب نہیں ہے۔

وقت امامؑ اجازت دے دیتے ہیں تو ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے ہیں اور دونوں رورو کر بے حال ہو جاتے ہیں۔ یہاں منظر بالکل الٹ گیا ہے یعنی تھوڑی دیر پہلے حسینؑ اور جناب قاسم کو دیکھا تھا کہ ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں لیکن اب جو دیکھتے ہیں تو حسینؑ جناب قاسم کو بغل میں لئے ہوئے ہیں، لیکن جناب قاسم کے ہاتھ نیچے لٹکے ہوئے ہیں کیونکہ اب ان کے جسم میں جان نہیں ہے۔

ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم

وصلی اللّٰہ علی محمد و آلہ الطاھرین

چھٹی مجلس

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں

ہمارا کارنامہ (۱)

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اعوذ باللّٰہ من الشیطانؑ الرجیم۔التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف و الناھون عن المنکر و الحافظون لحدود اللّٰہ وبشر المؤمنین۔(۲)

"حسینی تحریک میں امر بالمعروف اوو نہی عن المنکر کا عنصر" کے متعلق میں نے پانچ مجالس میں جو باتیں عرض کیں اب جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ان کا نتیجہ سمجھئے۔ بطور خلاصہ عرض ہے کہ ہم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں سب سے پہلے یہ کہا تھا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے معروف اور منکر کی کوئی حد بندی نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے تمام مثبت مقاصد معروف میں اور اسلام کے تمام منفی ھدف منکر میں داخل ہیں اور اگر چہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے حکم اور ممانعت مراد ہے لیکن خود قرآن مجید سے جو قرائن ملتے ہیں اور اسلام کی قطعی احادیث کی رو سے اور

۱۔ یہ تقریر ۲۸، ۱۲، ۴۸ مطابق ۱۰، محرم الحرام ۱۳۹۰ ہجری کو کی گئی۔

۲۔ سورہ توبہ آیت ۱۱۲۔

اس دلیل سے کہ یہ ہمارے اسلامی فقہ کے مسلمات میں سے ہے اور ہماری اسلامی تاریخ بھی گواہی دیتی ہے اور اس سے صرف لفظی امر اور نہی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے اسلامی مقاصد کے حصول کی خاطر ہر شرعی وسیلے سے کام لینا مراد ہے۔ چنانچہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روح کو اپنی زبان میں بیان کرنا چاہیں تو ہمیں کہنا چاہئے کہ اسلامی مقاصد کے حصول کی خاطر ہر شرعی وسیلے کا استعمال لازمی ہے۔

میں جو بات بطور خلاصہ کہنا چاہتا ہوں وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں ہمارا کارنامہ ہے جیسا کہ میں نے پچھلی مجلسوں میں عرض کیا ہے یہ اصول اسلامی تعلیمات کا ایک رکن ہے۔ یہ ایک ایسا رکن ہے جو اسلامی کتب اور پیغمبر اکرمؐ کے قول کا نص صریح ہے، اگر ختم ہو جائے تو تمام اسلامی تعلیمات ہی ختم ہو جائیں۔ اگر یہ اصول منسوخ ہو جائے تو اسلامی جامعہ کی وہ صورت نہیں رہ سکے گی جو ہونا چاہئے۔

اس بارے میں ہمارا کارنامہ کیا کارنامہ ہے؟ بد قسمتی سے ہم مسلمانوں کا کارنامہ اس سلسلے میں کچھ روشن نہیں ہے! اس لحاظ سے کارنامہ نمایاں نہیں ہے کہ ہم میں اوّل تو وہ احساس ہی نہیں ہے جتنا اس سلسلے میں اسلام سنجیدہ ہے، یعنی اسلام نے اس موضوع کو جتنی اہمیت دی ہے ہمیں اس کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ دوسرے جہاں تک ہم نے اپنے حساب اور خیال کے مطابق اس موضوع کی اہمیت کا سراغ لگا بھی لیا ہے تو ہم میں اس کی شرائط موجود نہیں ہیں۔ مطلب کیا ہے؟ مطلب یہ ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موضوع کو دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا ہے جب آپ نے یہ کہا: "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته" تم مسلمان سب کے سب دوسروں کے نگہبان اور چرواہے بھی ہو اور سبھی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کے مسئول اور ذمہ دار ہو۔ اس سے بہتر تشریح نہیں ہو سکتی۔ یعنی

اسلامی تعلیمات سے متعلق اسلامی معاشرے کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے تمام مسلمانوں کی ایک قسم کی مشترک ذمہ داری اور ضمانت۔ یہ بھاری فریضہ اوّل تو کافی آگاہی اور اطلاعات کا تقاضہ کرتا ہے یعنی ناواقف فرد یا جماعت یہ فریضہ اچھی طرح انجام نہیں دے سکتی دوسرے اس کے لئے طاقت بھی درکار ہے۔ اتنی بڑی ذمہ داری اور اتنے بڑے فریضے کے لئے قوت اور توانائی کی ضرورت ہے اور ہم اس موضوع کے لئے ضروری توانائی اور قوت حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔ قوت تو موجود ہے لیکن ہم اس قوت کو اکٹھا نہیں کرتے۔ صحیح اور قطعی اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد تقریباً سات سو ملین ہے۔(۱) یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ سات سو ملین افراد قدرت نہیں رکھتے۔ یہ دنیا میں ایک عظیم قدرت بن کر نہیں رہ سکتے؟ اگر یہ جماعت اپنی تشکیل کی فکر کرے، اسلامی مقاصد کے حصول کی کوشش کرے، اسلامی اتحاد مستحکم کرے، اسلامی ہمدردی کو تقویت بخشے، اسلامی تعلیمات قائم کرے تو ممکن نہیں کہ دنیا اس کو اہمیت نہ دے جس طرح اسے آج کل کسی شمار میں نہیں لا رہی ہے۔ ناممکن ہے کہ امریکا ایسی قوت کو گنتی ہی میں نہ لائے اور بار بار اس کی سرزمینوں پر بمباری کرتا رہے لیکن شرط یہ ہے کہ ایک منظم قوت کی شکل اختیار کر لے منتشر اکائیوں کی صورت میں نہ رہیں، یہی قوموں کی شکل میں نہ رہیں جن میں ہمیشہ اختلاف اور تفریق کے اسباب پھیلائے جائیں۔ ایسی قوموں کی شکل میں نہ رہیں جو یہ نہیں سوچتیں کہ یہی ان کی ایک حقیقی اور روحانی شخصیت ہے۔

اسلامی ارتباط، اتحاد، ہمدردی اور تعاون، اسلامی تعارف (قرآن کے مطابق) یعنی شناسائی کہ ایک دوسرے کو جانیں پہچانیں، ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوں اور ایک دوسرے کی تقدیروں سے تعلق رکھیں انتہائی افسوسناک ہے بلکہ باعث

۱۔ آج کل مسلمانوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔

شرم اور نہایت تاریک ہے۔

چونکہ میں اس موضوع پر اجمالی طور پر اور اشاروں میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس لئے اتنا ہی عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ سمجھنا چاہیں کہ اس سلسلے میں ہماری کیا کوشش رہی ہے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں اپنے کارناموں کی پڑتال کریں یعنی اپنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مظاہر کی جانچ کیجئے اور دیکھئے کہ کیسے ہیں ؟ ہم اسلام کی خدمت کے عنوان سے تبلیغ کرتے ہیں، تبلیغی مجالس منعقد کرتے ہیں۔ ان تبلیغی مجالس کی بھی جانچ کیجئے اور دیکھئے کہ وہ تمام تبلیغات جو ان مجالس میں ہوتی ہیں کن حدود میں، کس سطح پر اور کن مسائل کے متعلق ہوتی ہیں۔ ہماری اسلامی اتحاد، ہماری ہمدردی اور ہماری امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک اور مظاہرہ اسلامی کتابیں ہیں جو ہم نشر کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اب بھی زیادہ تر جو کتابیں چھپتی ہیں وہ اسلامی اور مذہبی ہیں لیکن ان کتابوں کو جانچ کر دیکھئے کہ ان کتابوں کی معنوی قدروقیمت کس قدر ہے ؟انکے مصنفین کا معیار دریافت کیجئے اور پتہ لگائیے کہ ان کتابوں کے مضامین اور اہداف کیا ہیں ؟یہ مسلمانوں کی کس سطح کیلئے چھپ رہی ہیں ؟یعنی یہ سمجھئے کہ ہمارا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کس سطح پر ہے، کس مرتبہ و مقام پر ہے ؟ دیکھئے کہ اسلام کے اجتماعی مسائل کے اندر دوسرے مسائل زیادہ ہمارے خیالات پر چھائے رہتے ہیں اور ہم دوسرے مسائل سے ان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان میں چمکاتے ہیں۔ زیادہ تر ہم کن مسائل کی خاطر بے چین ہوتے ہیں اور ان میں حساسیت کن کو دیتے ہیں اور کن مسائل سے غفلت برتتے ہیں، الگ رہتے ہیں، ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان باتوں کی ذرا چھان بین کیجئے جب ہم سماجی بلوغیت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پائیداری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا پتہ لگا سکیں گے۔

چودہ صدیوں میں سے پانچ چھ صدیاں تو ہمارے دور کی روشن ترین صدیاں رہی ہیں بہت عظیم تمدن کے مالک رہے ہیں کہ ہمارے بعض ماہر معاشرہ شناس مقررین نے اسی جلسے میں تقریر کی ہیں اسلامی تمدن کی اہمیت اور اصلیت کے بارے میں بحث کی ہے۔

کتاب و خاتم پیامبراں، کی دوسری جلد کے مقالے "کارنامہ اسلام" میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلامی تمدن کی اصلیت اور یہ کہ اس تمدن کو تمدن صرف اسلام نے پروان چڑھایا ہے اور یہ دنیا کے اہم ترین تمدنوں میں شامل ہے یعنی ان لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اگر پانچ یا تین تمدن درجہ اول کے تمدن ہوں تو ان میں سے ایک اسلامی تمدن ضرور ہے۔ ہم اس سلسلے میں کس قدر حساس ہیں؟ ہم اپنے تمدن اور گزشتہ کارناموں کی تبلیغ کیلئے کتنی کوشش کرتے ہیں؟ جو ہمارے جوان بنیادی طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام جب سے آیا ہے اس نے آج تک کوئی کام نہیں کیا ہے۔جب سے اسلام آیا ہے آج تک لوگ باربار اس پر عمل کر رہے ہیں اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج موجود ہیں! ہمیں اپنی کتابوں کی بھی خبر نہیں ہے۔ اگر لوگ ہم سے پوچھیں کہ مسلمانوں کا ریاضیات میں کس قدر ابتکار ہے تو ہم نہیں جانتے۔ آخر بعض فرنگیوں نے بھی تو اس سلسلے میں اپنے فائدے کی کچھ باتیں کی ہیں۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنے چند ایرانی دانشوروں کا پتہ ہے جنھوں نے اس سلسلے میں بہت خوب مطالعہ کیا ہے اور بہت اعلیٰ انکشافات کئے ہیں اور تحقیق سے ثابت کرتے ہیں کہ ایسے بہت سے نظریات جن کے پیش کرنے اور جن کے اختراع کا اہل یورپ دعویٰ کرتے ہیں ان کا اختراع دنیائے اسلام میں ہو چکا ہے ہم دوسرے شعبوں جیسے ہنر، فنون لطیفہ، فلسفہ، طبیعیات، کیمیا اور تاریخ میں بھی اپنے پچھلے ریکارڈ سے ناواقف ہیں۔ بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ ہم کیا تھے اور کیا ہیں۔ کل رات کو میں

ے ایک اخبار میں یہ خبر پڑھی جو ہماری ترقی کی صحیح صحیح معیار بتاتی ہے۔ جو لوگ مشہد مقدس کی زیارت کو تشریف لے گئے ہیں اگر انہیں اس قسم کے کاموں سے ذرا سی بھی دلچسپی رہی ہوگی امام رضا علیہ السلام کے آستانے میں گنجینہ قرآن ملاحظہ کیا ہوگا وہ جانتے ہوں گے کہ آستانے کے عجائب گھر کے ایک حصے میں گنجینہ قرآن کے نام سے دس گیارہ صدی پیشتر سے آج تک کے بہت نفیس خطوں کے قرآن موجود ہیں۔ ان قرآنوں میں سے بعض ہنرمندی اور فنون لطیفہ کے نقطۂ نظر سے اس قدر غیر معمولی ہیں کہ وہاں اس کام کے انچارج نے ان میں سے ایک کے بارے میں یہ بتایا کہ اس کی قیمت پانچ ملین تومان لگ چکی ہے۔

یہ کن لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں؟ ان کے لکھنے والوں میں یا ان لوگوں میں جنھوں نے ان میں کاریگری دکھائی ہے مثلاً ان کی سجاوٹ کی ہے ایرانی معلوم ہوتے ہیں، ترک نظر آتے ہیں، مغل نظر آتے ہیں، عرب نظر آتے ہیں، ہندوستانی نظر آتے ہیں لیکن اصلیت میں انھیں وجود میں لانے والا اسلام ہے یا مسلمانی۔ یعنی یہ اسلامی روح کی بدولت وجود میں آئے ہیں۔

کل رات کو میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایک قرآن کی آج تقریباً تین ملین تومان قیمت لگاتے ہیں۔ یہ کہاں سے آگیا؟ ردی کاغذوں کے صندوق میں سے۔ یعنی آخری دو تین صدیوں کے خطی قرآن اس لئے لے آتے تھے کہ لوگ ان کی تلاوت کریں۔ یہ بیچارے ان قرآنوں کی قیمت سے بے بروا تھے۔ اس لئے لائے تھے کہ لوگ ثواب کی خاطر قرآن پڑھیں۔ انہیں بچوں کے ہاتھ میں دے دیتے تھے۔ لوگوں کو بے روک ٹوک دے دیتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دھیرے دھیرے پرانے ہو جاتے تھے۔ بعد میں انہیں لے جاکر دروازے کے باہر زمیں میں گاڑ دیتے تھے۔

خوش قسمتی سے ایسے بہت سے قرآن جو ان کے خیال میں دفن کرنے کے

قابل تھے انہوں نے بوری یا صندوق میں بند کر دیئے تھے اور ایک طرف رکھے ہوئے تھے اور شاید انھوں نے یہ چاہا بھی ہو کہ ایک دن انہیں زمیں میں دفن کر دیں۔ بہر حال ایک شخص نے جسے کم سے کم دلچسپی ضرور رہی ہے جاکر انہیں الٹا پلٹا اور ان میں سے تقریباً گیارہ سو نفیس نسخے نکالے۔ انہیں میں ایک ایسا قرآن بھی ہے جس کی قیمت تقریباً تین ملین ریال ہے۔ ہم اپنے کلچر اور تمدن کے ورثے سے اس قدر واقفیت اور دلچسپی رکھتے ہیں! خدا کی قسم اگر انسان خون کے آنسو روئے تو بھی کم ہے اور بے شک کم ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ہماری قوم کی کوشش اس قدر گھٹیا اور کم کیوں ہے؟ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسے کہتے ہیں؟ یعنی ہمدردی، اتحاد، شرکت، ساتھ، تعارف (شناسائی) آگاہی، قدرت جس نے پہلے دن یہ اصول بنایا تھا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اس کا دین اجتماعی دین ہے انفرادی دین نہیں ہے۔ صومعہ اور دیر کا دین نہیں ہے۔ جو لوگ حضرت عمر بھر دیروں اور صومعوں میں رہے آج بے نظم اور منتشر ہو رہے ہیں، اتحاد اور ہمدردی دکھا رہے ہیں۔ اور ہمارا دین جو اجتماع، زندگی، وحدت اور اتحاد کا دین ہے تو ہم نے فرد، تنہائی، جدائی اور تفرقہ کی طرف مائل ہو گئے۔ ہمارا دین ایسا دستور دیتا ہے جس سے کہ ہم ایک آگاہ قوم بن جائیں بلکہ جو حوادث ابھی زمانے کے بطن میں چھپے ہوئے ہیں ہم اپنے آئندہ کے لئے پہلے سے ان کو بھانپ لیں۔ ہم نہ صرف آئندہ کی پیش بینی نہیں کرتے بلکہ اپنے زمانے کی حالت کو بھی نہیں سمجھ پاتے! امام صادقؑ نے تیرہ سو سال پہلے فرمایا تھا: "العالم بزمانه لا تهجم عليه اللوبس." (جو شخص اپنے زمانے کو سمجھتا ہے وہ اپنے زمانے کے لباس بھی پہچانتا ہے۔) جو واقعات زمانے کی سطح پر اور اس کے اندر جاری ہیں ان کو سمجھتا ہے۔ اپنے کام میں غلطی نہیں کرتا یعنی جو آدمی اپنے زمانے سے بے خبر ہیں، ان حالات سے بے خبر ہیں جو زمانے کے اندر یا سطح پر گزر

رہے ہیں ہمشہ غلطی کرتے ہیں۔ یعنی ہمشہ دوسرا ہی کام کرتے ہیں۔ دشمن کو کچلنے کی جگہ اپنے آپ کو کچلتے ہیں۔ دشمن کا سینہ سیاہ کرنے کی جگہ اپنا ہی آگا پیچھا کالا کر لیتے ہیں۔ برسوں جنگل میں رہیں۔ یہ ہے ہمارا کارنامہ۔

ہم نے پچھلی مجالس میں اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قدرو قیمت سمجھ لی اور یہ بات بھی سمجھ لی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نے حسینی تحریک کی قدرو قیمت بہت بہند کردی اور اس طرح حسینی تحریک نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قدرو قیمت، اعتبار اور آبرو بخشا۔

اب ہم کیا کام کریں جس سے ہماری قدرو قیمت ہو، ہم ایک قوم کی حیثیت سے منزلت پائیں۔ ایک معتبر اور باآبرو قوم کی حیثیت اختیار کریں؟ اس سوال کا قرآن مجید نے جواب دیا ہے۔

"کنتم خیر امة اخرجت للناس" تم بہترین امت ہوسکتے ہو، تم قابل قدر قوم بن سکتے ہو لیکن ایک شرط کے ساتھ: "تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر۔" کو اپناؤ، اس پر عمل کرو، اگر تم اپنی قدرومنزلت چاہتے ہو، اگر تم پیغمبر خداؐ کے نزدیک وقار چاہتے ہو تو اس اصول پر عمل کر کے خدا اور رسول کے نزدیک مقام پیدا کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا کی قوموں میں عزت پاؤ جس سے مشرقی بلاک بھی تمہیں اہمیت دے اور مغربی بلاک بھی تمہاری تقدیر کا مالک نہ بن سکے اور تمہارے بارے میں فیصلہ نہ کر سکے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ اتحاد اور ہمدردی رکھو، اسلامی اخوت اور برادری کو زندہ کرو۔ بے خبری سے بچو، صنعت سے پرہیز کرو، لاابالی پن دور کرو۔ ان بے خبری اور لاابالی پن کا کیا مطلب ہے؟ بے خبری کا پروگرام اس لئے ہے کہ تم واقف نہ ہو جاؤ، نہ سمجھ سکو، نہ جان سکو، بے پروائی کس لئے ہے؟ اس لئے کہ تم کمزور رہو، قوت حاصل نہ کر سکو۔

ہم یہیں بیٹھے رہیں اور یہ کہتے رہیں کہ حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنصر ایک بہت بڑا سبب ہے جس نے امام حسینؑ کو سفر پر مجبور کر دیا۔ ان کو اپنی جگہ سے ہلا دیا امر بالمعروف تھا۔ امام حسینؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اہمیت دی۔ اسلام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پہلے درجے کی اہمیت دیتا ہے یعنی اسے اپنی تعلیمات کا ایک رکن سمجھتا ہے۔ اگر یہ رکن نہ ہو تو باقی تعلیمات کارگر نہیں ہو سکتیں۔ یہ صحیح ہے لیکن ہم کیا کام کریں؟ کیا ہم ہمیشہ ماضی ہی کی بات کرتے رہیں؟ ماضی مستقبل کے لئے ہوتا ہے؟ ماضی اور مستقبل کو باہم مربوط اور متصل کر دینا چاہئے۔ اس سلسلے میں تحریک حسینی سے فائدہ حاصل کرنا چاہئے۔ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہئے۔ دیکھئے کیا کرتے ہیں؟ کس طرح تبلیغ کرتے ہیں؟ کس طرح کتاب لکھتے ہیں اور کس طرح انہیں لکھنا چاہئے؟ کن مسائل کے بارے میں فکر کریں اور کن مسائل کے بارے میں حساس بنیں؟

ہم دیکھتے ہیں امام علی بن ابی طالبؑ اور امام حسینؑ کن مسائل کے بارے میں سنجیدہ تھے۔ ہم بھی انہیں مسائل کی حساسی کی نشاندہی کریں۔ وہ کچھ مسائل کے بارے میں کیوں حساسی ظاہر کرتے ہیں اور ہم دوسرے مسائل کے بارے میں کیوں سنجیدگی دکھاتے ہیں؟ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ ہم اپنی رقم کس طرح خرچ کریں۔ کیا اس سلسلے میں ہماری ترقی ہوتی ہے؟ کیا ہم سمجھتے ہیں؟ ہم اپنے نزدیک خدا کی راہ میں جو انفاق کرتے ہیں وہ کیا خیرات ہے۔ خدا کی قسم! مجھے یہ ڈر ہے کہ ہم نے جاہلانہ طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے اسلام کو جو نقصان پہنچایا ہے یا اس طریقے سے اسلام کو جو صدمات پہنچائے ہیں وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کرنے سے کہیں زیادہ ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ اگر ہم ان تمام شائع کردہ اسلامی کتابوں کے نفع نقصان کا

حساب کریں تو ان کا فائدہ زیادہ ہے یا نقصان۔ اسی طرح اس وقت میں تحقیق سے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اگر ہم اس رقم کا بھی حساب کریں جو اسلام کی راہ میں حتیٰ کہ قربت کی نیت سے بھی خرچ کرتے ہیں تو اسلام کے لئے اس کا نفع زیادہ ہے یا نقصان؟ چونکہ قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ انفاق دو طرح کا ہوتا ہے اور اس کی ایک قسم کے بارے میں کہتا ہے : "مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مأته حبه" (۱)

خیرات کی ایک قسم کے لئے کہتا ہے کہ اس کی مثال گیہوں کی سی ہے جو مناسب زمیں میں بو دیا جاتا ہے تو اس میں سات بالیاں نکلتی ہیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ : "واللہ یضاعف لمن شاء" یعنی خدا کی راہ میں خیرات اس قدر خیر و برکت رکھتی ہے لیکن ایک اور خیرات کی بھی مثال دیتا ہے : "کمثل ریح فیھا صراصابت حرث قوم ظلموا انفسھم۔" (۲) اس خیرات کی مثال خطرناک تند ہوا کی سی ہے جو تیار فصل کی طرف چلتی ہے تو اسے اجاڑ دیتی ہے یعنی جو کچھ پیدا ہوتا ہے اسے بھی نیست و نابود کر دیتی ہے۔ اگر ہم اپنا مقام پیدا کرنا چاہیں اگر ہم اپنی قدر بڑھانا چاہیں اگر ہم چاہیں کہ ہم خدا اور پیغمبر خداؐ کے نزدیک عزت پائیں، دنیا کی قوموں میں محترم بن جائیں تو ہمیں چاہئے کہ اس اصول کو زندہ کریں۔ اگر پیغمبر اسلامؐ آج زندہ ہوتے تو وہ کیا کرتے؟ وہ کس مسئلے کے بارے میں سوچتے؟ واللہ وباللہ میں قسم کھاتا ہوں کہ پیغمبر اکرمؐ آج اپنی قبر مطہر میں یہودیوں سے لرز رہے ہیں یہ دو اور دو چار کا مسئلہ ہے۔ جو کوئی نہیں بولتا وہ گناہ کرتا ہے۔ اگر میں نہ کہوں تو خدا کی قسم میں گناہ کا ارتکاب کروں گا اور جو خطیب اور واعظ نہیں بولتا

۱۔ سورہ بقرہ آیت ۲۶۱
۲۔ سورہ آل عمران آیت ۱۱۷

وہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسلامی پہلو سے قطع نظر آخر اس کی کیا تاریخ ہے؟ فلسطین کا جھگڑا جو کسی اسلامی حکومت سے بھی تعلق نہیں رکھتا ایک قوم سے متعلق ہے ایک ایسی قوم سے جسے زبردستی اس کے گھر سے نکال دیا ہے۔ فلسطین کی تاریخ کیا ہے؟

ان کا دعویٰ ہے کہ تین ہزار سال پہلے ہمارے دو آدمیوں داؤد اور سلیمان نے کچھ وقت تک وہاں سلطنت کی ہے۔ تاریخ پڑھئے اس پوری دو تین ہزار سال کی مدت میں کون کہتا ہے کہ سرزمیں فلسطین کا یہودیوں سے تعلق رہا ہے؟ کون کہتا ہے کہ فلسطین کی زیادہ سرزمیں یہودی قوم کی ملکیت ہے۔ کیا فلسطین کی زیادہ سرزمیں یہودی قوم کی ملکیت ہے؟ اسلام سے پہلے بھی ان کی ملکیت نہیں تھی اسلام کے بعد بھی ان کی ملکیت نہیں تھی۔ جس روز مسلمانوں نے فتح کیا تھا فلسطین پر عیسائیوں کا قبضہ تھا، یہودیوں کا نہیں تھا اور اتفاق سے عیسائیوں نے مسلمانوں سے جو صلح کی تھی اس صلح نامے میں ایک شق یہ بھی رکھی تھی کہ تم یہودیوں کو یہاں جگہ نہیں دوگے۔ انہوں نے کہا تھا ہم تمہارے ساتھ رہیں گے لیکن یہودیوں کے ساتھ نہیں رہیں گے۔ پھر یہ کیسے ہو گیا کہ یکایک یہودی کے وطن کا نام پڑ گیا؟ ایک جھگڑا جو ہماری صدی سے کارنامے کو دھندلا رہا ہے (یہ صدی جس کا جھوٹا انسانی حقوق کا نام، آزادی کا نام، انسانیت کا نام رکھا ہے) یہی جھگڑا ہے۔ دنیا کے یہودی جب غیر مسلم قوموں کے ہاتھوں اذیت اور عقوبت سے دوچار رہے (روس، جرمنی اور دنیا کے بہت سے مقامات میں) تو ان کے بڑے بڑے لوگ مل بیٹھے اور کہا کہ ہم جب تک دنیا کے اطراف میں متفرق رہیں گے ہر جگہ اقلیت میں رہیں گے۔ ہمارا مقدر یہی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ایک مرکز کا انتخاب کریں اور وہاں ہم سب جمع ہو جائیں، یہودی مذہب کے ماننے والے وہاں جمع ہو جائیں۔ پہلے پہل جس جگہ کے بارے میں فکر بھی نہیں

کرتے وہ فلسطین ہے۔ دوسری جگہوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ پھر پہلی عالمگیر جنگ ہو جاتی ہے۔ (میں صرف خلاصہ عرض کرتا ہوں، آپ اس بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ پڑھ سکتے ہیں) اتحادی لوگ عثمانیوں سے لڑتے ہیں۔ میں عثمانیوں کا دفاع نہیں کرنا چاہتا، لیکن جو کچھ بھی تھا ایک حکومت تھی۔ اگر ظالم بھی تھی تو ایک تو تھی۔ سادہ لوح عرب عثمانیوں سے لڑ گئے۔ اتحادیوں کی سازش میں آ گئے۔ اندر سے حکومت عثمانیہ کے خلاف اس وعدے پر لڑے کہ عثمانیوں کے مقابلے میں خود ان کو آزادی دے دیں گے۔

انگریزوں نے ان سے پکا وعدہ کر لیا کہ ہم تمہیں آزادی بخش دیں گے بشرطیکہ ہماری طرف سے عثمانیوں کیخلاف لڑ جاؤ۔ یہ بیچارے لڑ گئے۔ اس بیچ میں کہ یہ بدبخت نادان ناواقف حکومت سے اپنی اسلامی حدود تک لڑتے رہتے تھے۔ انگلستان نے صیہونی گروہ سے جس کی نئی نئی تشکیل ہوئی تھی اپنا یہ قول و قرار پکا کر لیا کہ ہم اسلامی ملکوں کے عین قلب میں تمہیں فلسطین دے دیتے ہیں۔ انجمن اقوام وجود میں آئی ہے۔ (ذرا انصاف سے دیکھئے) اور تصدیق اور توثیق کر دی ہے کہ دنیا میں بہت سی قومیں ہیں (خصوصاً وہ قومیں جو سلطنت عثمانیہ سے الگ ہوئی تھیں) جن میں ترقی نہیں ہوئی ہے ہم کو ان کے سرپرست مقرر کرنا چاہئیں تاکہ ان کا انتظام کر سکیں۔ یعنی حقیقت میں وہ یہ چاہتے تھے کہ باقی ماندہ سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے کر دیں ان میں سے ایک حصہ فرانس کو دے دیا گیا۔ ایک حصہ انگلستان کو دیا گیا اور اسی طرح انگلستان کو جو جگہیں ملیں ان میں سے ایک فلسطین بھی تھا۔ اس نے کہا میں تمہارا سرپرست ہوں۔ رسمی طور پر کفیل بن گیا۔ پھر صیہونیوں سے وعدہ کیا (بالفور کا مشہور وعدہ) کہ میں یہ جگہ تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ صیہونی یعنی وہ یہودی جو دسیوں صدیوں سے دنیا کے مختلف گوشوں میں زندگی بسر کر رہے تھے اور کتنی ہی مختلف

نسلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ میں بھی سوچتا تھا کہ یہ یہودی کیا سب کے سب اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ تاریخ کے نزدیک یہ بات مشکوک ہے بلکہ غلط ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ جھوٹ بات ہے۔ ان میں سے بہت سے یہودی اسرائیل کی نسل سے نہیں ہیں۔ ان کی قدر مشترک صرف مذہب ہے اور بس۔! بلکہ ان کی تو نسل بھی خالص نہیں رہی ہے۔ جو یہودی دنیا کے اطراف میں رہتے تھے صرف اس وجہ سے کہ انگریزوں نے انہیں ستایا ہے اور یہ ایک مقام پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ وہاں جمع ہو جائیں اور چونکہ یہ بے ایمان لوگ ہیں اور ان کی مقدس کتاب نے انہیں اجازت دے دی ہے کہ جب تم وطن میں چلے جاؤ تو مطلق رحم نہ کرنا تم اپنے مقصد کے حصول کا کوئی وسیلہ نہ چھوڑنا۔ پھر جب انگلستان نے ان کے سفر کا وسیلہ فراہم کر دیا تو یہ لوگ اس سرزمیں کو ہجرت کر گئے اور وہاں انہوں نے زمینیں خرید لیں۔ حالانکہ فلسطین میں مقامی یہودی پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔ اور وہ بیچارے بھی آجکل غیر معمولی مصیبت میں رہ رہے ہیں۔ یعنی یورپی اور امریکی یہودی آ گئے۔ ایک بڑی بدبختی یہ ہے کہ جو اصلی یہودی ہیں انہیں وہاں رہنے کا حق ہے۔ عربوں میں کچھ روشن خیال تھے انہوں نے قیام کیا، انقلاب برپا کر دیا، ان لوگوں کو قتل کیا، ختم کر دیا، پھانسی دے دی، بار بار یہودی بھیجے گئے، جب تعداد زیادہ ہو گئی تو ان میں زیادہ ہتھیار بھی تقسیم کر دیئے گئے بعد میں یہ مقامی مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے۔ انہیں مارا پیٹا پھر نکال باہر کر دیا۔ یورپی ملکوں سے یکے بعد دیگرے ہجرتیں ہوتی رہیں۔ یہودی آتے رہے۔ آتے رہے۔ یہ یہودی جن کے آج آپ نام سن رہے ہیں موشے دایان، زلی اشکول، گولڈا مایر، زہرمار، وغیرہ۔ آخر دیکھئے تو یہ کس دنیا سے آئے ہیں۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سرزمیں ہماری سرزمیں ہے۔ یہ ہمارا وطن ہے۔ آج تقریباً تیس لاکھ مسلمان آوارۂ وطن اور بے خانماں ہیں۔ کیا ان یہودیوں کا نصب العین

صرف اتنا ہی ہے کہ وہاں ایک چھوٹی سی حکومت بن جائے؟ آپ کو بہت دھوکا ہوا ہے۔ ہم بہت غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہودی جانتا ہے کہ وہ آخرکار ایک چھوٹے سے ملک میں نہیں رہ سکتے۔ ان کے لئے ایک اتنا بڑا ملک اسرائیل چاہئے جس کی حد ہمارے ایران تک آپہنچے۔

عبد الرحمٰن فرامرزی کے قول کے بموجب یہ اسرائیل جسے میں جانتا ہوں کل شیراز پر بھی دعویٰ کرنے والا ہے۔ وہ کہے گا خود تمہارے شاعروں نے اپنے اشعار میں شیراز کا نام ملک سلیمان رکھا ہے۔ آپ چاہے جتنا کہتے رہئے گا کہ جناب یہ تشبیہ ہے۔ وہ پوچھے گا: کیا اس سے بھی اچھی سند آپ چاہتے ہیں؟ کیا وہ اس خیبر پر دعویٰ نہیں کرتے جو مدینہ کے نزدیک ہے؟ کیا روزولٹ نے سعودی عرب کے بادشاہ کو یہ تجویز پیش نہیں کی کہ تم اسے ان لوگوں کے ہاتھ بیچ ڈالو؟! کیا یہ لوگ عراق اور آپ کے مقدس مقامات پر دعویٰ نہیں رکھتے؟ واللہ باللہ ہم اس جھگڑے کے ذمہ دار ہیں۔ خدا کی قسم! ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ خدا کی قسم ہم لوگ غافل ہیں۔ واللہ جس جھگڑے نے پیغمبر اکرمؐ کے دل کو خون کیا ہوا ہے وہ یہی جھگڑا ہے۔ اگر کسی داستان نے حسینؑ کے دل کا خون کیا ہے تو یہی قضیہ ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو اہمیت دینا چاہتے ہیں اگر ہم امام حسینؑ کی عزاداری کی قدر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہئے کہ اگر آج امام حسینؑ ہوتے اور خود کہتے کہ میری عزاداری کرو! کہتے کیا شعار دے رہے ہو؟ کیا وہ یہ کہتے کہ کہو میرا نوجوان اکبر، یا کہتے کہو زینب مضطر الوداع۔ امام حسینؑ نے اپنی زندگی میں کبھی اس قسم کے گھٹیا پست اور توہین آمیز نعرے نہیں لگائے اور کبھی اس قسم کا کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ اگر امام حسینؑ ہوتے تو کہتے اگر تم میریؑ عزاداری کرنا چاہتے ہو میری خاطر سینہ زنی اور زنجیر کا ماتم کرنا چاہتے ہو تو تمہارا آج کا شعار فلسطین ہونا چاہئے۔ آج کا شمر موشے دایان ہے۔ شمر تو تیرہ سو

سال پہلے مرچکا، آج کے شمر کو پہچانو! آج اس شہر کے درودیوار کو فلسطین کے نعرے سے ہلا دینا چاہئے۔ ہمارے دماغ میں یہ جھوٹ بٹھا دیا گیا ہے کہ صاحب یہ داخلی مسئلہ ہے جس کا تعلق عرب اور اسرائیل سے ہے۔ پھر عبد الرحمٰن فرامرزی کے قول کے مطابق اگر یہ بات انہی کی ہے اور مذہبی نہیں ہے تو دنیا کے دوسرے یہودی ان کے لئے بار بار رقم کیوں بھیجتے رہتے ہیں؟

اسلام اور پیغمبر خداؐ کو ہم کیا جواب دیں؟ کیا کچھ دن پہلے آپ نے اخبار میں نہیں پڑھا تھا کہ پچھلے سال دنیا بھر کے یہودیوں نے، ان یہودیوں نے نہیں جن کے پاسپورٹ اسرائیلی ہیں، ان لوگوں کے لئے پانچ سو ملین ڈالر بھیجے تھے تاکہ ان سے فینٹم طیارے خریدیں اور مسلمانوں پر بم برسائیں۔

میں نے سنا ہے کہ ہمارے ایران کے یہودیوں نے گزشتہ سال دو فینٹم طیاروں کی قیمت کی رقم بھیجی تھی۔ ہمارے ایران کے یہودیوں کی طرف سے ان کیلئے بطور امداد ۳۶ ملین ڈالر بھیجے گئے تھے اور ہم ان یہودیوں کو اس وجہ سے کہ یہ یہودی ہیں برا نہیں کہتے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم اپنے آپ کو ملامت کریں۔ انہوں نے تو اپنے ہم مذہبوں کی مدد کی ہے۔ وہ نہایت فخر سے رقم بھیجتے ہیں۔ موشے دایان کی رسید بھی آجاتی ہے اور اسے بازار میں دکھاتے بھی ہیں کہ آؤ دیکھو! یہ رسید ہے۔ کیا دو تین رات پہلے یہ بات نہیں لکھی گئی (میرے پاس اس خبر کا تراشہ موجود ہے) کہ اب صرف امریکہ میں رہنے والے یہودی اسرائیل کو ایک دن میں ایک ملین ڈالر کی امداد بھیجتے ہیں۔ پھر اس سلسلے میں ہم مسلمانوں کی کیا کوشش رہی ہے! خدا کی قسم! ہمیں شرم آجاتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں، ہم اپنے آپ کو علی ابن ابی طالبؑ کے شیعہ کہتے ہیں، ہمیں ہرگز نہیں کہنا چاہئے۔ اس کے بعد ہم علی ابن ابی طالبؑ سے جو داستان نقل کرتے ہیں، حرام ہے جو پھر تقریر میں نقل کریں۔ ایک

دن حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے سُنا دشمن نے اسلامی ملک پر حملہ کر دیا ہے۔ "وھذا اخوغامد و قد وردت خیله الانبار" (۱) بعد میں فرمایا : میں نے سنا ہے کہ انہوں نے کسی مسلمان عورت کی یا کسی ایسی عورت کی جو مسلمانوں کی حمایت میں ہے آبرو لوٹی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ دشمن نے مسلمانوں کا ملک لوٹ لیا ہے، ان کے مردوں کو قتل کر دیا ہے، گرفتار کر لیا ہے، ان کی عورتوں کو چھیڑا ہے۔ عورتوں کے ہاتھوں کانوں کے زیور چھین لئے ہیں۔ پھر انہی علی ابن ابی طالبؑ نے ہم جن کی شیعیت کا اظہار کرتے ہیں اور جن سے جھوٹی اور بے معنی محبت جتاتے ہیں فرمایا: "فلو ان امرأ مسلما مات من بعد هذا اسفا ما كان به ملوما، بل كان به عندی جديراً۔" اگر کوئی ایک مسلمان بھی یہ خبر سن کر شدت غم سے مر جائے تو صحیح ہے اور قابل ملامت نہیں ہے۔ بلکہ میرے نزدیک یہی سزاوار ہے۔

کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم ان کی مالی مدد کریں؟ کیا یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں؟ ان کے رشتہ دار نہیں ہیں؟ کیا یہ لوگ انسان کے شرعی حق کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں؟ آج اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آوارۂ وطن فلسطینی اپنے وطن کی واپسی کا حق نہیں رکھتے؟ میں نے مکہ کے سفر میں کچھ فلسطینی دیکھے ہیں۔ کیا جوان ہیں! بس یہ کہتے تھے : "دماء الشهداء۔" ہماری امید صرف ہمارے شہیدوں کا خون ہے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو واللہ کپڑوں کے محتاج ہیں اور ننگے لڑتے ہیں۔ اگر دنیا کی ستر کروڑ مسلم آبادی میں سے ہر شخص روزانہ ایک ریال بھی دے تو سال بھر میں تقریباً تیس سو ملیارڈ (تین نیل) ڈالر ہو جائیں۔ اگر صرف ہم ایرانی لوگوں میں سے جو ڈھائی کروڑ ہیں اور ہم میں سے ۹۸ فیصد مسلمان ہیں ہر شخص روزانہ ایک ریال سے فلسطینیوں کی مدد کرے تو ایک سال میں تقریباً نوے ملین (۹ کروڑ) تومان ہو

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۷

جائیں۔ اگر مسلمانوں کا دسواں حصہ بھی روزانہ فی کس ایک ریال سے مدد کرے تو سال بھر میں ۹ ملین (نوے لاکھ) تومان ہو جائیں۔ "فضل الله المجاهدين باموالهم و انفسهم"(۱) "الذين آمنوا وهاجروا وجهدوا فی سبيل الله باموالهم و انفسهم" (۲)

ہم مال سے بھی مدد کر سکتے ہیں۔ واللہ یہ انفاق واجب ہے۔ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کی طرح واجب ہے۔ پہلا سوال جو مرنے کے بعد ہم سے کیا جائیگا یہی ہوگا کہ اسلامی اتحاد کے لئے تم نے کیا کیا؟ پیغمبرؐ نے فرمایا: "من سمع مسلماً ينادی يا للمسلمين و لم يجبه فليس بمسلم۔" جو کوئی کسی ایسے مسلمان کی آواز سنتا ہے جو فریاد کرتا ہے کے اے مسلمانو! میری فریاد سنو! میری فریاد کو پہنچو! اور وہ اس کی مدد نہیں کرتا تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا۔ ہمیں ان کا حساب کھولنے کے لئے کیا چیز روکتی ہے؟ اپنی آمدنی کی تھوڑی سی رقم ان کے لئے مخصوص کر دینے سے کون سی بات ہمیں باز رکھتی ہے؟

آخر دنیا کے یہودی یہاں تک کہ ایران کے یہودی بھی یہودیوں کی مدد کرتے ہیں اور دوسری قومیں ان کی تعریف کرتی ہیں، سبحان اللہ کہتی ہیں، انہیں زندہ قوم کہتی ہیں پھر ہم فلسطینیوں کی مدد کیوں نہ کریں؟ ان کے زندہ لوگ ایسے انسان ہیں جو وقت کو پہنچانتے ہیں، دکھ درد سمجھتے ہیں، حقائق سمجھتے ہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میرا فرض صرف کہنا تھا اور خدا جانتا ہے ضمیر کی آواز اور فرض شناسی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں اس مالی مدد کو آپ کا فرض سمجھتا ہوں اور اپنا اور ہر خطیب اور واعظ کا فرض یہ سمجھتا ہوں کہ وہ یہ کہے۔ میں ہر خطیب اور واعظ پر واجب سمجھتا

۱۔ سورۂ نساء آیت ۹۵

۲۔ سورۂ توبہ آیت ۲۰

ہوں کہ وہ یہ بات کہے۔ آیت اللہ حکیم اور دوسرے مرجع تقلید بزرگوں نے رسمی طور پر بھی فتویٰ دے دیا ہے کہ جو وہاں قتل ہو جائے گا چاہے اس نے نماز بھی نہ پڑھی ہو وہ خدا کی راہ میں شہید ہوگا۔ تو آیئے ہم خود اپنے آپ کو قدر بخشیں، اپنے قول اور فعل کو وقار (منزلت بخشیں) اپنی کتابوں کو قدر بخشیں، اپنی رقم کی قدر و قیمت پہچانیں۔ دنیا کی قوموں میں اپنے آپ کو آبرو مند بنائیں۔ دنیا کی بڑی بڑی قومیں جو ہمارے مقدر کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں یہ یقین ہے کہ مسلمانوں میں غیرت نہیں رہی، امریکہ کو صرف اسی بات نے جرأت دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں غیرت نہیں ہے، اتحاد اور ہمدردی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہودی پیسے کے لیے مرتا ہے۔ پیسے کے سوا اور کچھ نہیں پہچانتا، پیسہ اس کا خدا ہے، اس کی زندگی ہے، اس کی حیات اور ممات ہے لیکن جب ایسا جذباتی مسئلہ آجاتا ہے تو روزانہ دس لاکھ ڈالر سے اپنے ہم مذہبوں کی مدد بھی کر دیتا ہے لیکن دنیا کے ستر کروڑ مسلمان اپنے ہم مذہبوں کی کم سے کم مدد بھی نہیں کرتے۔

عاشور کا دن ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی معراج کا دن ہے۔ وہ دن ہے کہ ہم حسینؑ کی روح، حسینؑ کی غیرت، حسینؑ کے مقابلے، حسینؑ کی شجاعت اور دلیری، حسینؑ کی روشن بینی کی ایک جھلک حاصل کرلیں بلکہ ہم بھی ذرا آدمی بن جائیں، جاگ جائیں۔ ایک بہت مشہور مصنف عباس محمود عقاد کا لاعبداللہ کے بارے میں ایک جملہ ہے۔ وہ کہتا ہے عاشور کے دن ایسا لگتا تھا کہ حسینؑ کی صفات میں باہمی مقابلہ ہو رہا ہے یعنی حسینؑ کی خوبیاں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ حسینؑ کا صبر چاہتا تھا کہ دوسری صفات سے آگے بڑھ جائے۔ حسینؑ کی رضا جو خدا کی رضا تھی صبر سے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ حسینؑ کا اخلاص ان سب سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ حسینؑ کی شجاعت دوسری صفات سے سبقت لے جانا چاہتی

تھی۔ میں عرض کرتا ہوں (البتہ میں حسینؑ کے اخلاص کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں اس سے بھی کہیں چھوٹا ہوں) لیکن میں ایک ایسی بات بتاسکتا ہوں جو عاشورہ کے دن باقی ہر بات سے زیادہ روشن اور واضح ہے۔ حسینؑ کی طمانیت، حسینؑ کا اطمینان، حسینؑ کا سکون اور ثابت قدمی۔ یہ بات ایسی نہیں ہے جو میں آج ہی کہہ رہا ہوں۔ یہ وہ بات ہے جو ان دنوں میں بھی سمجھ لی گئی تھی۔ ایک شخص نے جو وہاں موجود تھا ایک جملہ کہا ہے۔ اس کا مطلب اپنے وقت، زمانے اور سمجھ کے مطابق بہت بلند ہے۔ وہ کہتا ہے! "واللہ ما رایت مکسوراً قط قدقتل ولدہ واھل بیتہ واصحابہ اربط جاشاًمنہ" یہ شخص اصل میں ایک خبر نگار (رپوٹر) تھا جس نے واقعات بیان کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے: خدا کی قسم میں نے کوئی ایسا دل شکستہ شخص، ایسا مصیبت زدہ آدمی نہیں پایا جس کی اولاد (جس کے اہلبیت) اس کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہوں، جس کے اصحاب کے سر اس کے دیکھتے دیکھتے ان کے بدنوں سے جدا ہو چکے ہوں اور پھر اس کے دل میں اتنی قوت باقی ہو۔ یہ بہت حیرت انگیز واقعہ ہے معمولی نہیں ہے وہ واقعہ جس پر مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی رہتی ہے: عاشور کے دن امام حسین علیہ السلام ایسے قدم اٹھاتے ہیں جیسے وہ روشن مستقبل کو یعنی اپنی تحریک کے نورانی آثار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ انہیں اس میں مطلق شک نہیں تھا کہ وہ اس شہید ہونے سے فتح یاب ہو جائیں گے۔ انہیں اس میں شک نہیں تھا کہ عاشور کا دن اس بات کا اخیر ہے کہ جو کچھ پاس ہو خدا کی راہ میں لٹا دیا جائے یعنی یہ کھیتی کا اخیر ہے۔ اس تحریک سے فائدہ اٹھانے کا آغاز روز عاشور ہی سے ہو جاتا ہے گویا کہ یہ اسی لئے ہوئی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی حسینؑ شہید ہوئے ویسے ہی بنی امیہ کی حکومت کے خلاف حرکتیں، ہمدردیاں، دوستیاں اور بغاوتیں شروع ہوگئیں۔

جس نے سب سے پہلے یہ کام کیا وہ ایک عورت تھی، کافروں کے لشکر کی ایک عورت۔ عاشور کے دن عصر کے وقت جب اس نے دیکھا کہ یزیدی لشکر حسینؑ کے حرم کے خیموں پر حملہ کرنے والا ہے دوڑ کر گئی، ایک خیمے کا کھونٹا اٹھایا اور خیموں کے سامنے کھڑی ہوگئی بکر بن وائل کے قبیلے کو پکارا: اے بنی بکر بن وائل! اے میرے قبیلے والو! اے میرے عزیزو! تم کہاں ہو، آؤ، حد یہ ہوگئی ہے کہ یہ لوگ پیغمبرؐ کے اہل حرم کے جسم کا لباس بھی اتار لینا چاہتے ہیں! میرے نزدیک جو منظر بہت شکوہ اور جلال والا ہے وہ یہ ہے ہم جانتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام اپنے اہلبیت سے رخصت ہونے کے لئے جس وقت تشریف لائے تھے اس وقت ان کا کوئی آدمی زندہ نہیں بچا تھا۔ وہ رخصت بھی بہت دردناک اور دل ہلادینے والی تھی لیکن امام حسین علیہ السلام ایک اور خاص وجہ سے دوبارہ رخصت کے لئے تشریف لائے تھے۔ لکھا ہے وہ وجہ یہ تھی کہ آپ نے جو حملے کئے تھے ان میں ایک بار لشکر کے پیچھے سے فرات کے گھاٹ پر پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ دشمن فکر مند ہوگیا کہ کہیں امام حسینؑ پانی نہ پی لیں کیوں کہ اگر وہ پانی پی لیں گے تو ان میں جان آجائے گی۔ اسی وقت کسی نے اس زور سے فریاد کی کہ پھر امام حسینؑ کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ یہ بات سنیں (چاہے یہ سچ ہو یا جھوٹ) اور پانی پیتے رہیں۔ جس وقت امام حسینؑ نے چلو بھرنے کے لئے پانی میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ کوئی پکارا حسینؑ! تم پانی پینا چاہتے ہو اور لشکر حرم کے خیموں پر دھاوا بول رہا ہے۔ آپؑ فوراً باہر آگئے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا کہنا صحیح تھا یا نہیں اور وہ لوگ واقعی حملہ کرنا بھی چاہتے تھے یا نہیں لیکن اس تیز حملے اور امام حسینؑ کے باہر آنے کے درمیان کوئی وقت ہی نہیں لگا۔ جس وقت آقا باہر آئے ہیں اس وقت تک خیام حرم پر حملہ نہیں ہو پایا تھا۔ اس مہلت کو غنیمت جان کر آپ نے دوبارہ عورتوں اور بچوں کو اکٹھا کیا۔ اس مقام پر امام حسین علیہ السلام

کی روح کا شکوہ و جلال نمایاں ہوتا ہے۔ آپ نے پہلے فرمایا اے میرے اہلبیت! "استعدو اللبلاء" اپنے آپ کو مصیبت کے لئے تیار کرلو۔ آپ چاہتے تھے کہ ان کی روحیں آمادہ ہوجائیں۔ اس سلسلے میں آپ نے اس سے زیادہ ایک جملہ بھی نہیں کہا البتہ فوراً یہ بات کہی: "واعلموا ان اللہ حافظکم و منجیکم من شر الاعداء و معذب اعادیکم بانواع البلاء۔"

اے میرے اہل بیت! یقین رکھو کہ تم پر اس گھڑی سخت مصیبت پڑے گی لیکن تم کو ذلت نہیں ہوگی۔ تم جان لو کہ خدا تمہارا حافظ ہے اور وہی تمہیں دشمنوں کے شر سے بچائے گا اور تمہیں عزت کے ساتھ تمہارے جد کے حرم کو واپس لے جائے گا۔ اس وقت کے بعد سے تمہارے دشمنوں کی بدبختی شروع ہو جائے گی۔ تم اطمینان رکھو کہ خدا تمہارے دشمنوں کو اسی دنیا میں طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کردے گا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے امام حسین علیہ السلام حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

عاشور کے دن امام حسین علیہ السلام نے ایک جگہ کو مرکز بنایا تھا۔ وہیں سے حملہ کرتے تھے۔ پہلے ایک ایک کی یعنی انفرادی جنگ ہوئی۔ جتھے کے جتھے آتے لیکن جیسے ہی آئے امام حسین علیہ السلام نے انہیں مہلت نہیں دی کہ بچ کر جاسکیں اس سے دشمن کے دل پر سخت رعب پڑگیا۔ پھر حضرت عمر ابن سعد پکارا: کیا کر رہے ہو؟ "واللہ...نفس ابیہ بین جنبیہ۔" تم ڈرتے ہو کہ لڑرہے ہو؟ یہ علی کے بیٹے ہیں۔ "ھذا ابن قتال العرب" یہ اسی شخص کا بیٹا ہے جو عرب کا زبردست قتل کرنے والا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حضرت کے خلاف عرب قومیت کا تعصب ابھارے۔ انہوں نے پوچھا کیا کریں؟ اس نے جواب دیا۔ یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ اگر ایک ایک کرکے جاؤ گے تو تم میں سے ایک بھی نہیں بچے گا اس لئے چاروں طرف سے

حملہ کرو!امام حسین علیہ السلام جس طرف جھپٹتے تھے دشمن بھاگ کھڑے ہوتے تھے لیکن آپ کو اس بات کا خیال تھا کہ خیموں سے دور نہ جائیں۔ حسینؑ میں غیرت بھی ہے، حسینؑ شجاع بھی ہیں، صابر بھی ہیں، خدا کی رضا پر راضی بھی ہیں، مخلص بھی ہیں، لیکن غیرت الٰہی بھی ہے۔ آپ کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ ان کے جیتے جی کوئی ان کے حرم کے خیموں کے نزدیک بھی آئے۔ ہرگز نہیں! آپ نے اہل بیت کو حکم دے رکھا تھا کہ تم ہرگز خیموں سے باہر نہ آنا۔ اگر آپ نے یہ سنا ہو کہ اہل بیت بار بار باہر آتے تھے اور پیاس پیاس کہتے تھے تو یہ بات بالکل غلط ہے۔ جھوٹ ہے، ہرگز نہیں! اہل بیت صرف ایک بار باہر آتے ہیں اور وہ صرف وہ وقت تھا جب ذوالجناح امام حسین علیہ السلام کے بغیر آیا ہے۔ اس وقت بھی جو باہر آئے تو پہلے تو انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ بات کیا ہے؟

انہوں نے جو گھوڑے کی آواز سنی تو یہی سمجھے کہ آقا تیری رخصت کے لئے آئے ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ گھوڑا سدھا ہوا تھا۔ صرف امام حسین علیہ السلام کا گھوڑا ہی تربیت یافتہ نہیں تھا بلکہ دشمنوں کے گھوڑے بھی ایسے سدھے ہوئے تھے کہ جس وقت کسی گھوڑے کا سوار گر پڑتا تھا تو یہ جانور احساس کر لیتا تھا۔

چنانچہ ذوالجناح نے جب دیکھا کہ آقا گر پڑے ہیں اور اپنی جگہ سے اٹھ نہیں سکتے، اپنے عیال امامؑ کے خون سے رنگین کی اور خیام حرم کی طرف آیا۔ واقعی یہ ہرکارہ تھا جو خبر دینا چاہتا تھا۔ یہ لوگ یہ سمجھ کر کہ آقا واپس آئے ہیں خیمے سے باہر آگئے لیکن جب انہیں حالات کا پتہ چلا تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں دیکھا کہ گھوڑے کو چاروں طرف سے گھیر لیں اور فریاد و ماتم کرنے لگیں۔ بہر حال آقا نے انہیں باہر آنے کی اجازت نہیں دی تھی بلکہ

خود ایک جگہ کو مرکز بنا لیا تھا جہاں سے وہ لوگ آپ کی آواز سن لیتے تھے۔ آقا چاہتے تھے کہ اس طرح سے انہیں اطمینان دلاتے رہیں۔

جس وقت واپس آتے تھے تو اسی مرکز پر پہنچ جاتے تھے اور اونچی آواز سے (میں نہیں جانتا کہ اسے میں اونچی آواز کہوں۔ وہ خشک زبان منہ میں کس طرح حرکت کرتی ہوگی) جتنی بھی طاقت تھی کہتے تھے: لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اے خدا! حسینؑ میں جتنی بھی روحانی یا جسمانی طاقت ہے وہ تجھی سے ہے، اہل بیت خوش ہو جاتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام زندہ ہیں۔ کچھ دیر کے لئے ٹھہر جاتے تھے، ڈھارس ہو جاتی، لشکر پھر پلٹتا تھا، گھیرا تنگ کرتا تھا، تیر برساتا تھا، پتھر مارتا تھا، پھر آقا دوبارہ حملہ کرتے تھے، یہی صورت حال جاری رہی اور یہی کرو فر باقی رہا۔

آپ نے سنا ہوگا کہ ابن سعد نے عاشور کے دن لڑائی کس طرح شروع کی تھی اور پھر یہ بھی سنا ہوگا کہ امام حسینؑ نے اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ اپنی یا اپنے اصحاب کی طرف سے لڑائی کی ابتدا کی جائے۔ یہ ایک سنت ہے جو لڑائیوں میں بظاہر ایک فریق اس کا لحاظ رکھتا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام بھی یہ خیال رکھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ میں لڑائی میں ہرگز پہل نہیں کروں گا۔ انہیں پہلے لڑائی شروع کرنے دیں ہم بعد میں ماریں گے۔

آقا نے بھی لڑائی کی ابتدا نہیں کی۔ عمر ابن سعد نے عبید اللہ ابن زیاد کی خوشنودی کی خاطر لڑائی اس طرح شروع کی کہ تیر اور کمان طلب کی۔ مشہور ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس کا باپ بہت ماہر تیر انداز گزرا ہے اور شاید عمر ابن سعد خود بھی تیر انداز رہا ہو۔ اس نے کمان میں تیر جوڑا اور حرم حسینی کے خیام کی طرف پھینکا۔

پھر بلند اواز سے مخاطب ہوا۔ اے لوگو! امیر کے سامنے گواہی دینا کہ وہ پہلا شخص جس نے حسینؑ کے خیموں کی طرف تیر چھوڑا میں خود تھا۔ یہ جنگ عاشور کے دن ایک تیر سے شروع ہوئی اور چاہئے کہ عرض کرتا چلوں کہ ایک اور تیر ہی پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ تیر زہر آلود تھا جو امام حسینؑ کے سینہء مبارک میں پیوست ہوا۔ "فعطاه سهم محدد سموم" زہر آلود بھی تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے سینے میں اس قدر گہرا اتر گیا تھا کہ آقا نے دبا کر سامنے کی طرف سے نکالنا چاہا لیکن نہیں نکلا۔ لکھا ہے کہ پیچھے سے باہر نکالا۔ اس کے بعد ہی حسین علیہ السلام گھوڑے سے زمین پر گرے۔ اس واقعے کے بعد آپ کی تاب و توانائی جاتی رہی اور پھر لبا عبداللہ کی قوت جواب دے گئی۔

لکھا ہے کہ امام حسنؑ کے کئی بیٹے تھے جو آپ کے ہمراہ آئے تھے۔ ان میں سے ایک جناب قاسم تھے۔ امام حسنؑ کا ایک آخری بیٹا تھا جو دس سال کا تھا۔ اس بچے کو شاید اپنے والد یاد بھی نہ ہوں گے کیوں کہ جس وقت اس کے والد دنیا سے رخصت ہوئے وہ چند ماہ کا رہا ہوگا۔ امام حسینؑ کے گھر میں پلا بڑھا تھا۔ امام حسنؑ کے بیٹوں پر لبا عبداللہ بہت شفقت فرماتے تھے، شاید اس سے بھی زیادہ جتنی اپنے بیٹوں کے ساتھ کرتے تھے اس لئے کہ وہ یتیم تھے۔ اس بیٹے کا نام عبداللہ تھا اور امام حسین علیہ السلام سے بہت مانوس ہے اور امام حسین علیہ السلام نے اسے جناب زینبؑ کے سپرد کردیا کہ تم بچوں کا دھیان رکھنا اور جناب زینب برابر ان کا دھیان رکھے ہوئے ہیں۔ یکایک جناب زینب کو معلوم ہوا کہ عبد اللہ خیمے سے نکل گیا ہے اور اپنے عم امام حسینؑ کے پاس جانا چاہتا ہے۔ جناب زینبؑ اسے پکڑنے کو دوڑیں تو وہ زور سے چلایا: "واللّٰه لا افارق عمی" خدا کی قسم میں اپنے عم جان سے الگ نہ ہوں گا۔ وہ بچہ دوڑ رہا ہے اور جناب زینبؑ اس کے پیچھے دوڑ رہی ہیں۔ "السلام علیك یا ابا عبداللّٰه اشهدانك

قد امرت بالمعروف ونهيت عن المنكر وجاهدت فی اللّٰه حق جهاده۔"

جناب زینب دوڑتے دوڑتے امام حسینؑ کے قریب جا پہنچیں۔ آقاؑ نے فرمایا نہیں! تم واپس جاؤ! چھوڑ دو یہ بچہ میرے پاس رہے۔ بچے نے اپنے آپ کو امام حسینؑ کی گود میں گرا دیا۔ حسین ہیں ان کا اپنا ایک اور ہی عالم ہے۔ اتنے میں ایک دشمن امام حسینؑ پر ایک وار کرنے آیا۔ جیسے ہی اس نے تلوار اٹھائی یہ بچہ چلایا: "یابن الزانیته اتر ید ان تقتل عمی؟" اے زنا زادے! کیا تو میرے چچا کو قتل کرنا چاہتا ہے؟ جب تک وہ تلوار لگائے اس بچے نے اپنے ہاتھ آگے کردیئے اور اس کے ہاتھ کٹ گئے۔ وہ پکارا: یا عماہ! دیکھئے اس نے میرے ساتھ کیا کیا؟

ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم

وصلی اللّٰه علی محمد و آله الظاهرین۔

ساتویں مجلس

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (۱)

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ۔ التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللّٰہ و بشر المؤمنین۔"(۲)

میری آج رات کی گفتگو پچھلی چھ گفتگوؤں کا تتمہ ہے۔ جو کچھ پچھلی مجالس میں بیان ہوا اس سے معلوم ہوا کہ ہمیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کو اور اس اصول کی مدد سے اپنے آپ کو زندہ کرنا لازم ہے۔ تقویٰ کے بارے میں جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کا ایک قول ہے جسے منطق کی اصطلاح میں شبہ دور کہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: "الا تصونوھا و تصونوا بھا۔" اے لوگو! تقویٰ کی صیانت اور حفاظت کرو اور تقوے کی مدد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ یہ نظر آتا ہے کہ دور ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم تقویٰ کی حفاظت کریں یا تقویٰ ہماری حفاظت کرے؟ جواب یہ ہے: دونوں باتیں لازم ہیں۔ یہ دور ہے لیکن دور محال نہیں ہے۔

۱۔ یہ تقریر ۱۴۰۱ھ، ۱۳۵۰ مطابق ۲۶، محرم کو کی گئی

۲۔ سورۂ توبہ آیت ۱۱۲

کسی نے کہا ہے:

"سلسلہ این قوم جعد مشک بار
مسئلہ دور است ، اما دور یار"

ہم تقویٰ کی حفاظت کریں تو یہ ایک صورت ہے اور تقویٰ ہماری حفاظت کرے یہ دوسری شکل ہے۔ ہم کو تقویٰ کی حفاظت کرنا چاہئے اور تقویٰ کو چاہئے ہماری حفاظت کرنا اور وہ کر بھی سکتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا احیاء کریں اور اس کے مقابلہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چاہئے کہ وہ ہمیں زندہ کرے اور کرے گا۔

ہم نے حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنصر کے متعلق صرف اس کے اس پہلو سے گفتگو کی ہے کہ اس عنصر کا کتنا اثر ہوا ہے، یہ کتنا محرک اور سبب بنا ہے کتنا حسینی پیغام کو تحریک بخشا ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے اور وہ یہ کہ اس تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نے کتنی عملی صورت اختیار کی؟ امام حسین علیہ السلام کی پاکیزہ ہستی اور ان سے بھی زیادہ آپ کی شہادت کے بعد آپ کے اہل بیت، روز عاشور کے بعد سے، اس گیارہویں یا کم سے کم بارہویں تاریخ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک گروہ بن گئے اور اس قصے کے اختتام تک جہاں جہاں رہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہے۔ انہوں نے ایک جماعت کی حیثیت سے کبھی بھی شکست نہیں کھائی، کبھی شکست خوردہ جماعت نظر نہیں آئے۔ امام حسین علیہ السلام کی طرح یہ لوگ بھی خود زندہ رہنے یا مر جانے کو انجام کار نہیں سمجھتے تھے جو یہ کہتے کہ مطلب یہ تھا کہ امام حسین علیہ السلام زندہ رہیں اور خلافت پر پہنچیں یا کم سے کم ایک گوشے میں جا کر زندگی بسر کریں۔ اب جو امام حسینؑ مارے گئے تو بات ہی ختم ہوگئی۔ نہیں! یہ سب لوگ اسی حسینی

ہدف کے لئے کاربند رہے۔

امام حسین علیہ السلام کا مارا جانا، ایک لحاظ سے ان کے لئے کام کی ابتدا تھی، کام کا انجام نہیں تھا۔ اہل بیت پیغمبرؐ کا طریقہ کس قدر زیبا اور جاذب توجہ ہے اور واقعی جس وقت انسان اس کا تجزیہ اور تحلیل کرتا ہے تو اس عظمت اور زیبائی کے سامنے، اس قوت کے سامنے، اس روحانی قدرت کے سامنے، اس پورے یقین اور ایمان کے سامنے، اس تمام روحانی شجاعت کے سامنے حیرت میں ڈوب جاتا ہے، دنگ رہ جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ ان کے سامنے تعظیم سے سر خم کردے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ ان لوگوں نے آخری لمحے تک اسلام کے پیغام کی تبلیغ کی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا، اسلام کی طرف بلایا۔ حضرت علیؑ اور پیغمبرؐ کے اہل بیت کی محبت بلکہ معرفت بھی شام میں سرے سے تھی ہی نہیں، یعنی کوئی ان لوگوں کو نہیں پہچانتا تھا اور جو لوگ انہیں پہچانتے بھی تھے تو صحیح شناخت نہیں رکھتے تھے لیکن دیکھئے کہ اہل بیت پیغمبرؐ نے کیا کیا؟! اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں اور پھر دوسری بات کی طرف آتا ہوں۔

ہم جانتے ہیں کہ عاشور کے دن کیا حالات تھے اور اہل بیت پیغمبرؐ نے گیارہویں رات کس طرح گزاری۔

گیارہویں تاریخ کو ابن زیاد کے جلاد آتے ہیں۔ اہل بیتؑ کو بے کجاوہ اونٹوں پر بٹھاتے ہیں اور ایک دم روانہ کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ بارہویں کی ساری رات کو شاید صبح تک برابر کمال روحانی اور جسمانی اذیت میں راستہ طے کرتے ہیں۔ اگلی صبح کو کوفہ کے دروازے کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں۔ دشمن مہلت نہیں دیتا۔ اسی دن ظہر سے قبل اہلبیت پیغمبرؐ شہر کوفہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ابن زیاد اپنے دار الامارۃ میں بیٹھا ہوا ہے۔ مٹھی بھر قیدی، ان میں بھی عورتیں اور ایک مرد جو اس وقت بیمار تھا۔ حضرت

سجادؑ کے لئے بیمار کا لقب صرف ہم ایرانیوں میں پیدا ہوگیا ہے۔ معلوم نہیں یہ کیسے ہوا کہ صرف ہم یہ لقب استعمال کرتے ہیں: امام زین العابدینؑ بیمار۔ ورنہ عربی زبان میں کبھی نہیں کہتے علی ابن الحسین المریض یا المراض۔ یہ لقب ہم نے دیا ہے۔ اس کی اصل صرف اتنی ہے کہ عاشور کے حادثے کے زمانے میں امام زین العابدینؑ سخت بیمار تھے اور ہر شخص اپنی عمر میں کبھی نہ کبھی بیمار ہوتا ہی ہے۔ کون ہے جو اپنی زندگی میں کبھی بیمار نہیں پڑتا؟ آپ صاحب فراش تھے۔ مشکل سے حرکت کرسکتے تھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکتے تھے۔ لاٹھی کے سہارے بستر سے اٹھ پاتے تھے۔ اسی حالت میں امام کو قیدی بنا کر روانہ کردیا تھا۔ امام کو ایسے اونٹ پر سوار کیا تھا جس پر لکڑی کی ایک کاٹھی تھی لیکن اس پر کوئی نمدہ بھی نہیں تھا۔ جب انہیں یہ احساس ہوا کہ امامؑ بیمار ہیں اور ممکن ہے اپنے آپ کو نہ سنبھال سکیں ان لوگوں نے آپ کے پاؤں مضبوطی سے باندھ دئے تھے۔ گردن میں زنجیر ڈال دی تھی۔ ان کو اس حالت میں کوفہ لے گئے۔ پھر کوفت، جھڑکیاں اور ایذا رسانی بہت زیادہ ہے۔ جب چاہتے ہیں ایک شخص سے زبردستی اقرار کرا لیتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں اس کے اعصاب پر دباؤ ڈالتے ہیں، اس کا ارادہ درہم کردیتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے اور اڑتالیس گھنٹے اسے کھانا نہیں دیتے، سونے نہیں دیتے، اسے سخت سست کہتے ہیں۔ ان حالات میں اکثر لوگ ٹوٹ جاتے ہیں، مضمحل ہوجاتے ہیں، کہنے لگتے ہیں جو چاہو پوچھو میں بتا دیتا ہوں۔ اس وقت آپ دیکھئے۔ یہ لوگ جب ابن زیاد کے دربار میں داخل ہوئے ہیں تو روحانی اور جسمانی اذیتوں کے بعد ان کی کیا حالت ہوگئی ہوگی۔ جناب زینب سلام اللہ علیہا ابن زیاد کے دربار میں آتی ہیں۔ جناب زینبؑ بلند قد کی خاتون ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا: "وحفت بها اماۂها" یعنی ان کی کنیزوں نے آپ کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔

یہاں کنیز کے اصطلاحی معنی مراد نہیں ہیں کیوں کہ اصحاب کی تمام عورتیں شریک تھیں۔ جناب زینبؑ کو سردار اور بزرگ مانتی تھیں اور اپنے آپ کو ان کی خادمہ سمجھتی تھیں۔ انہوں نے جناب زینبؑ کو گھیر رکھا تھا۔ ان کے گھیرے میں جناب زینب ابن زیاد کے دربار میں داخل ہوئیں۔ لیکن نہ آپ نے سلام کیا نہ اس کی طرف رخ کیا۔ ابن زیاد کو اس وجہ سے کہ اس کو مخالفت کا احساس ہوا تو ناگوار گزرا۔ جناب زینبؑ کے سلام نہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ابھی ہمارا ارادہ زندہ ہے۔ ہم اب بھی تمہاری پرواہ نہیں کرتے۔ اب بھی امام حسینؑ کی روح جناب زینبؑ کے قالب میں بولتی ہے: ہیہات....الذلہ، اب بھی کہہ رہی ہے: "لا اعطیکم بیدی اعطاء الذلیل ولا افر فرار العبید او لا اقر اقرار العبید۔"

ابن زیاد کو یہ بے اعتنائی بہت ناگوار گذری۔ وہ سمجھتا تو تھا کہ یہ کون ہیں؟ تمام باتیں اس تک پہنچ چکی تھیں۔ جب اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ سب سے زیادہ محترم خاتون ہیں اور دوسری عورتوں نے خصوصی احترام کے ساتھ ان کو حلقے میں لے رکھا ہے تو اس نے لازمی طور پر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کون ہیں؟ کیوں کہ اسے خبر تھی کہ کون ہیں کون نہیں ہیں؟ پھر بھی کہنے لگا: "من هذه المتكبره؟" "من هذه المتنكره؟" (دونوں طرح لکھا ہے) یہ مغرور عورت کون ہے یا یہ نہ پہچاننے والی عورت کون ہے؟ کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے دوبارہ سوال کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ انہیں میں سے کوئی جواب دے۔ دوسری بار اور تیسری بار۔ آخر کار ایک عورت نے جواب دیا:

"هذه زينب بنت علی ابن ابی طالب" یہ علی ابن ابی طالب کی بیٹی زینبؑ ہیں۔ یہ کمینہ، گھٹیا، ملعون آدمی ذرا سی بھی شرافت نہیں رکھتا تھا (ویسے بھی

کوئی مرد یا عورت سخت مصیبت اٹھائے ہوئے ہو تو کوئی شریف آدمی اس کے زخم پر نمک نہیں چھڑکتا، نہ کہ عورت سے جسے اصطلاحاً جنس لطیف کہتے ہیں کسی جنگی قانون میں جو مرد ذرہ برابر شرافت رکھتے ہیں عورت سے تعرض نہیں کرتے۔ اسے زبان کا زخم نہیں لگاتے، اسے صدمہ نہیں پہنچاتے، عورت کو قیدی بنالیتے ہیں۔ اس حال میں بھی اس کا احترام کرتے ہیں) اس نے زبان سے سخت زخم لگانے شروع کر دئے۔ بولا: "الحمد لله الذی فضحکم واکذب احدوثکم" میں خدا کا شکر کرتا ہوں جس نے تم کو رسوا اور تمہارا جھوٹ ظاہر کردیا۔ جناب زینبؑ نے کمال جرات و شہامت سے جواب دیا: "الحمد لله الذی اکرمنا بالشهاده۔" ہم خدا کا شکر کرتے ہیں جس نے ہمیں شہادت کا افتخار بخشا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے فخر کا یہ تاج میرے بھائی کے سر پر رکھا۔ ہم خدا کا شکر کرتے ہیں کہ ہم کو نبوت اور طہارت کے خاندان سے قرار دیا۔ پھر آخر میں فرمایا: "انما یفتضح الفاسق و یکذب الفاجر وهو غیرنا۔"

رسوائی فاسق کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی عمر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اور کوئی جھوٹا حادثہ بھی پیدا نہیں کیا۔ جھوٹ بھی فاجر کا حصہ ہے۔ ہم فاسق و فاجر بھی نہیں ہیں۔ ہمارا غیر فاسق اور فاجر ہے، یعنی تو۔ تو ہی رسوا ہوا، خود تو ہی جھوٹا بھی ہے۔ اس قدر شہامت اور شجاعت اور عملی ایمان! یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ ایک درجہ اور ایک مرحلہ ہے جو میں نے عرض کیا اور یہ خود ایک لمبی داستان ہے، امام زین العابدینؑ نے کیا کہا، امام حسین علیہ السلام کی ایک بیٹی نے کیا کہا، کوفہ کے بازار میں جناب زینب نے کیا تقریر کی، امام زین العابدینؑ نے وہاں کیا تقریر کی، راستے میں انہوں نے کیا کیا۔ قید خانہ میں یا کوچہ و بازار میں جب

لوگوں کا سامنا ہوتا تھا تو کیا کہتے تھے اور میری نظر میں تو یزید بن معاویہ کے دربار میں جناب زینب سلام اللہ علیہا کی وہ فصیح و بلیغ تقریر ان سب سے بہت اعلیٰ تھی۔

وہاں کوئی چوبیس گھنٹے اور اڑتالیس گھنٹے کی گفتگو نہیں ہے۔ ایک ماہ کے قریب گزرا ہے کہ جناب زینبؑ ان کی قید میں ہیں اور ایک قیدی کو جو زیادہ سے زیادہ ایذا دیتے ہیں وہ آپ کو دے چکے ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ یزید کے دربار میں آپ نے کیا کہا ہے؟ چنانچہ حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنصر پر اس وجہ اور اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے کہ یہ تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک تحریک تھی اور اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اثرات کی بھی پورے پورے طور پر جانچ کرنا چاہئے خصوصاً خود شام میں کہ شام کو کس طرح تہہ وبالا کر دیا۔

دوسری بات جو میں آپ سے عرض کرنا چاہتا تھا یہ ہے: ہمارے فقہاء نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں دو باتیں کہی ہیں جن کی میں وضاحت کر دوں۔ ایک یہ ہے: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مقام وہ ہے جہاں انسان کو اس کے اثر کا احتمال ہو۔ اس جملے کے کیا معنی ہوئے ہیں؟ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نماز یا روزے کی طرح کا عبادتی قانون نہیں ہے جس میں حکمت، فلسفہ اور اثر ہوتا تو ہے لیکن یہ بات ہم سے متعلق نہیں ہے کہ ہم دیکھیں اگر اس کا اثر ہوتا ہے تو اسے انجام دیں اور اثر نہیں کرتا تو انجام نہ دیں۔ ہم سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہیں ہر حال میں نماز پڑھنا چاہئے۔ اس کا تمہیں اختیار نہیں ہے یہ حساب تم نہیں لگا سکتے کہ یہ نماز اثر کرتی ہے یا نہیں کرتی ہے تم کو تو اس فارمولے اور قاعدے کے تحت پڑھنا چاہئے۔ اس کام کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے یا نہیں یہ بات انسان کی منطق کے دائرے سے باہر ہے، لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انسان اپنی منطق سے جاری کرے یعنی ہمیشہ کاموں میں اس سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس کا حساب ضرور لگانا چاہئے۔ آپ

طاقت لگاتے ہیں، سرمایہ لگاتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں لیکن یہ حساب بھی تو کیجئے کہ اس کام میں آپ کو کیا نتیجہ ملتا اور کتنا مقصد حاصل ہوتا ہے؟ آپ اس سوداگر کی طرح رہئے کہ جس وقت وہ اپنا سرمایہ لگاتا ہے تو حساب کے مطابق (کم سے کم امکانات کا حساب) وہ اس کام سے اتنا فائدہ چاہتا ہے جو لگائے جانے والے سرمائے سے زیادہ ہو، اور یہ بالکل منطقی بات ہے، یعنی جب ہم کسی جگہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں تو ہم ہر مال یا جان یا کم سے کم وقت اور زمانے کا سرمایہ لگاتے ہیں، لیکن جب ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ اس کا کم سے کم بھی اثر نہیں ہوتا یا الٹا اثر ہوتا ہے تو کیا پھر بھی ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہیں؟ نہیں! یہ بالکل معقول اور صحیح بات ہے۔ یہ خارجیوں کی منطق کے بالکل خلاف ہے۔

خوارج کی فقہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف ایک کورانہ عبادت ہے یعنی انسان کو اس میں حساب اور منطق سے کام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ بے دلیل اور آنکھیں بند کر کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہے اگرچہ اسے اس بات کا یقین ہی کیوں نہ ہو کہ اس مقام پر وہ سرمایہ بھی لگا رہا ہے اور اسے فائدہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ خارجی کہتا ہے اس بات کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا نے کہہ دیا ہے کہ تو ہر حال میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا رہ۔ ہمارے اماموں نے ہم سے یہ کہا ہے کہ یہ غلطی ہے! خدا نے اس قسم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم نہیں دیا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں حساب، تدبیر، سوچ بچار اور عقل سے بالکل کام لینا چاہئے۔ جن عالموں نے سماجی مسائل کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ خوارج کے ختم ہو جانے کا سبب یہی تھا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں

منطق اور دلیل کے قائل نہیں تھے مثلاً جب کوئی خارجی کسی ایسے مغرور ظالم کے سامنے بھی آتا تھا جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار بھی ہوتی تھی اور اسے اس بات کا یقین بھی ہوتا تھا کہ اس وقت کسی بات کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوگا لیکن وہ کہہ دیتا تھا اور اسے فوراً مار دیا جاتا تھا۔ اصطلاحاً ان لوگوں کو مصلحت نہیں آتی تھی۔ عقل اور منطق سے کام نہیں لیتے تھے۔ بے دیکھے چھلانگ لگا دیتے تھے آخر ختم ہوگئے۔ لیکن ہمارے آئمہ علیہ السلام نے کہا ہے کہ یہ کام غلط ہے۔ آپ نے تقیہ کا لفظ بھی سنا ہوگا جس کے معنی ہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصلحت سے کام لینا اور جو مادۂ "وقی" سے بنا ہے جس کے معنی نگہداری کے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک جنگ ہے۔

جنگ میں انسان بچاؤ کے وسیلے بھی کام میں لاتا ہے یعنی ضرب لگاؤ لیکن کوشش کرو کہ تم خود ضرب نہ کھاؤ۔ لیکن تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ مجھ پر تو جہاد واجب ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ پھر میں ہتھیار کیوں لگاؤں، زرہ کیوں پہنوں۔ اگر میں قتل ہو جاؤں گا تو کیا میں بہشت میں نہیں جاؤں گا؟ تو میں اسی طرح لشکر کے درمیانی حصے پر حملہ کرتا ہوں تاکہ مارا جاؤں اور بہشت میں چلا جاؤں۔ اسلام کہتا ہے یہ کام نہ کرو! تم اسلام کی طاقت خرچ کرتے ہو۔ تم خود اسلام کی بنیاد کی ایک اینٹ ہو۔ اسلام کی طاقتوں میں سے ایک طاقت ہو۔ جاؤ اور مارو! لیکن کوشش کرو کہ جہاں تک ہو سکے کم ضرب کھاؤ۔ اگر تم اسی خیال سے جاتے ہو، ہتھیار نہیں لگاتے اور ہتھیار نہ لگانے سے مارے جاتے ہو تو گویا تم نے اسلام کی قوت ضائع کر دی۔ جاؤ مارو! اور جہاں تک ہو سکے اپنے مخالف کو ختم کر دو لیکن اپنے آپ کو بچاؤ۔ یہ مطلب ہے جو ہمارے اماموں نے بیان کیا ہے اور یہ بہت معقول بات ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں ہماری ایک اور بات بھی ہے۔ اور یہ بھی ہماری روایتوں اور حدیثوں میں

موجود ہے۔ یہ حدیث کی عبارت ہے جو فقہ میں بھی نقل کی گئی ہے: "انما یجب علی القوی المطاع۔" امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس شخص پر واجب ہے جو طاقت رکھتا ہے یعنی کمزور انسان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بھی اسی بات سے ملی ہوئی بات ہے۔ یعنی حساب یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسی نتیجے پر پہنچنے یا کوئی نتیجہ حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ: قوت کو بچاؤ اور نتیجہ حاصل کرو! لیکن جہاں تم کمزور ہو یعنی طاقت تو خرچ کرتے ہو لیکن نتیجہ حاصل نہیں کرپاتے تو ایسا نہ کرو۔ اب یہاں بعضوں کے لئے ایک بہت بڑا شبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کوئی یہ کہے مجھ میں فلاں کام کرنے کی طاقت نہیں ہے اور اسلام نے بھی کہا ہے کہ اگر تم میں طاقت نہیں ہے تو نہ کرو تو پھر میں تو چین سے ہوں۔ دوسرا کہتا ہے۔ اسلام نے کہہ دیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس وقت ہوتا ہے جب اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کا امکان ہو۔ اچھا۔! مجھے نتیجہ کی امید نہیں ہے تو پھر میں چین سے بیٹھ جاؤں۔ یہ غلطی ہے۔ یہ گمان اس قسم کا سا شک نہیں ہے جو تم طہارت اور نجاست کے سلسلے میں کرتے ہو۔ معلوم نہیں فلاں چیز پاک ہے یا نجس؟ اسلام کہتا ہے کیا تمہیں یہ گمان ہے کہ یہ پاک ہے؟ ہاں مجھے گمان ہے۔ اچھا کہو پاک ہے۔ اس گمان کے معنی وہی ذہنی گمان کے ہیں یعنی تمہیں جہاں شک ہو کہ پاک ہے یا نجس مثلاً جو دوا باہر سے درآمد ہوئی ہے تمہیں سو فیصدی یقین نہیں ہے کہ یہ نجس ہے ننانوے فیصدی تمہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ نجس ہوگی لیکن ایک فیصدی یہ گمان بھی ہے کہ پاک ہوگی تو تمہارے لئے یہی ذہنی گمان اس بات کے لئے کافی ہے کہ تم یہ کہو کہ یہ دوا پاک ہے۔ کیا یہ میرا فرض ہے کہ میں جاکر تحقیق کروں کہ یہ پاک ہے یا نجس؟ ہرگز نہیں تمہارا کوئی ایسا فرض نہیں ہے۔ وہی گمان یعنی وہی ذہنی کیفیت جسے علم موضوعی کی اصطلاح میں احتمال

موضوعی کہتے ہیں یہی احتمال تمہارے لئے حکم ہے۔ اس سے زیادہ تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

لیکن یہاں جسے احتمال کہتے ہیں اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جاؤ اور اپنے گھر میں بیٹھے رہو پھر کہو مجھے اثر کا شک ہے مجھے اثر کا شک نہیں ہے۔ یہ طہارت اور نجاست کی بات نہیں ہے۔ اس معاملے میں جاکر کوشش کرو، زیادہ سے زیادہ تحقیق کرو، دیکھو اور سمجھو کہ تم کو کوئی نتیجہ حاصل ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ جو شخص بے خبر ہے اور پھر وہ تحقیق نہیں کرتا جو یہ سمجھ سکے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اسے کوئی فائدہ بھی ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اس کی طرف سے ایسا عذر ناقابل قبول ہے۔ یا ایک اور شخص کہتا ہے۔ صاحب! مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ اسلام بھی کہتا ہے کہ۔ بہت خوب! لیکن جاؤ! طاقت حاصل کرو یہ شرط موجودگی کی ہے واجب ہونے کی شرط نہیں ہے، یعنی یہ کہا ہے کہ جب تک تم کمزور ہو تو کسی کام میں ہاتھ نہ ڈالو جس سے تمہیں کوئی، فائدہ نہ ہو یا تم جس سے کوئی نتیجہ حاصل نہ کرسکو لیکن جاکر قدرت حاصل کرو تاکہ تم کوئی نتیجہ حاصل کرسکو، کوئی فائدہ اٹھا سکو، اب میں آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں: فقہ میں ایک مسئلہ ہے جسے ولایت از قبل جائر کہتے ہیں۔ آئمہ کے زمانے میں خاص طور پر یہ مسئلہ زیادہ پوچھا جاتا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے یابن رسول اللہ! یہ خلیفہ ظالم اور جابر خلیفہ ہیں ہم ان کی حکومت کی کوئی آسامی یا عہدہ قبول کریں یا نہ کریں اسلام کا حکم یہ ہے کہ قبول نہ کریں۔ ان کا کوئی عہدہ قبول نہ کریں۔ لیکن پھر فرماتے تھے اگر تم ان سے کوئی آسامی لے لو جس کی بدولت تمہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی قوت مل جائے تو قطعی طور پر تم ایسا کرسکتے ہو۔ تمہیں اجازت ہے۔ ہماری فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ موجود ہے۔

محقق "شرائع" میں لکھتے ہیں بعض منتہی بھی کہتے ہیں استحبت یعنی مستحب ہے

اور بعض کہتے ہیں "وجبت" یعنی واجب ہے۔ کہتے ہیں یہ کام جو ظالم کی مدد کرتا ہے مثلاً جناب علی بن یقطین چاہتے ہیں کہ ظالم اور غاصب ہارون رشید کے وزیر بن جائیں اس لئے کہ واجب ہے یعنی یہ کام جو اپنی جگہ حرام ہے اگر ایسی طاقت حاصل کرنے کا وسیلہ بن جائے جسے آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے استعمال کرسکیں تو نہ صرف یہ کہ یہ کام آپ کے لئے حرام نہیں ہوگا بلکہ واجب ہے۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ دو شیعوں محمد بن اسماعیل بن یضیع اور علی بن یقطین کے متعلق جو ظالم خلفاء کی حکومت میں اس لئے چلے گئے تھے کہ خدا کے مقاصد پورے کرنے کی کوشش کریں، فرماتے ہیں: تم زمین پر خدا کے ستارے ہو۔ تم وہاں اس لئے نہیں گئے کہ فائدہ کماؤ، جاہ و منصب کا لالچ کرو، دولت جمع کرو، تم وہاں اس لئے گئے ہو کہ اسلام کا نصب العین اپنے سامنے رکھو۔ دیکھو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خاطر قوت حاصل کرنے کا کام اتنا اہم ہے، اتنا واجب ہے کہ اسلام کہتا ہے کہ تم اس کی خاطر سو فیصدی حرام کام کا بھی ارتکاب کرسکتے ہو یعنی یہ عمل جو اپنی جگہ اس صورت میں حرام ہے جب تم اسے صرف اس لئے انجام دو کہ اس حکومت کے جلال کا ایک حصہ بن جاؤ اور اس سے تمہارا کوئی مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی خدمت اسلام کا نہ ہو، اسلام کی ایسی خدمت کی خاطر جو واقعی تم کرنا چاہو حرام واجب میں تبدیل ہوجاتا ہے اور بعض فقہاء کے نزدیک مستحب ہوجاتا ہے جیسا کہ محقق نے شرائع میں لکھا ہے۔ کم سے کم حرام مستحب میں تبدیل ضرور ہوجاتا ہے۔ اسی سے آپ سمجھ لیجئے کہ طاقت کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اگر اتفاقاً پیدا ہوگئی تو امر بالمعروف کر لیجئے اور جو اتفاقاً پیدا نہیں ہوئی تو نہ کیجئے۔

لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر طاقت اتفاقاً پیدا ہوگئی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہوجاتا ہے اور اگر پیدا نہیں ہوئی تو واجب نہیں ہوتا اس لئے قدرت

حاصل کرنا واجب نہیں ہے۔ اس قول کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھیں اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کیا قدر ومنزلت مقرر کی ہے۔ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو قدر و قیمت رکھی ہے۔ اس کے پیش نظر کیا اس کا یہ کہنا ممکن ہے کہ جب مسلمانوں کو اتفاقاً قوت حاصل ہوجائے تو یہ فرض ادا کردیں اور جو قوت حاصل نہ ہو تو پھر ان کا یہ فرض نہیں ہے کہ جاکر قدرت حاصل کریں تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام دے سکیں۔ اگر آپ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کیا مقام ہے؟ تو اس روایت کا مطالعہ کیجئے جو کافی میں موجود ہے اور ہماری بہت مشہور، قطعی اور مستند روایت ہے اور فقہ اور حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں ملتی ہے اور اس بارے میں سب سے زیادہ مفصل حدیث ہے۔ میں آپ کو اس کے کچھ ٹکڑے سناتا ہوں اس لئے کہ یہ بہت مفصل ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا جو حدیث کی ابتدا بھی ہے یہ ہے کہ آخری زمانے میں ریاکار لوگ پیدا ہوں گے جو قرآنی آیات اور دعائیں پڑھا کریں گے۔ "و یتنسکون" تقدس کا اظہار کیا کریں گے۔ "حدثاء سفہاء" یہ احمق بھی ہوں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مطلق پروا نہیں کریں گے۔ "لا یوجبون امراً بالمعروف ولا نہیاً عن منکر الا اذا آمنوا الضرر۔" جب تک یہ لوگ بالکل مطمئن نہیں ہوجائیں گے کہ انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچے گا اس وقت تک اس پر عمل نہیں کریں گے۔ "یطلبون لانفسھم الرخص والمعاذیر۔" برابر اس بات کے خواہش مند رہیں گے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے بچنے کی کوئی راہ نکالیں، کوئی عذر تراشیں کہ اب نہیں ہوسکتا اب ممکن نہیں ہے۔

"یقبلون علی الصلوٰۃ والصیام و ما لا یکلفھم فی نفس ولا مال۔"

ان عبادتوں کو قبول کریں گے جو ان کی جان، مال اور حیثیت کو ضرر نہ پہنچائیں گی۔ جیسے نماز اور روزہ اور اگر انہیں کوئی فریضہ نقصان پہنچائے گا تو اسے قبول نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ آپ فرماتے ہیں: اگر نماز بھی ان کے کام، ان کی حیثیت اور ان کی جان کو نقصان پہنچائے گی تو اسے بھی ترک کردیں گے۔ "کما رفضوا اسم الفرائض واشر فھا" جس طرح انہوں نے سب سے اچھے اور اشرف فرائض بھی ترک کردئے ہیں، نماز کو بھی ترک کردیں گے۔ وہ سب سے عالی اور سب سے اشرف فریضے کون سے ہیں؟ "ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فریضۃ عظمیۃ، بھا تقام الفرائض۔" یہ ایک ایسا بڑا فریضہ ہے جس کے وسیلے سے باقی تمام فرائض ادا ہوتے ہیں۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے جس کے وسیلے سے نماز، زکوٰۃ، حج، خمس، معاملات، قانون اور اخلاق کے تمام فریضے ادا ہو سکتے ہیں۔ اس حدیث کا تھوڑا سا حصہ پھر چھوڑے دیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: "ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر، سبیل الانبیاء" یقیناً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" تمام پیغمبروں کا طریقہ ہے۔ "منھاج الصلحاء بھا تقام الفرائض و تأمن المذاھب" خدا کے واجبات اس کے وسیلے سے ادا ہوتے ہیں اور اسی سے خدا کی راہیں پر امن ہوتی ہیں۔ پیشے اس کے وسیلے سے حلال اور مظالم اس کے وسیلے سے بے حجاب ہو جاتے ہیں۔ زمین اس کے وسیلے سے آباد ہوتی ہے۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے، زمین کی آبادی کی حدود تک۔ خدا جانتا ہے کہ انسان جب کسی وقت ایک چیز کو دیکھتا ہے اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرتا ہے تو بہت حیران ہوتا ہے کہ ہم کیا تھے اور کیا ہوگئے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ ماوردی کی اس کتاب "الاحکام السلطانیہ" کا مطالعہ کریں جو اسلام کی ایک معتبر ترین کتاب ہے جسے خاص طور پر یورپی عالم اور مستشرقین بہت اہمیت دیتے ہیں۔

اس کتاب نے تقریباً ایک ہزار سال پہلے کے اسلام کے سماجی نظام بیان کئے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ دنیائے اسلام میں کیسے کیسے نظامات رہے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دراصل کیا معنی رکھتے ہیں اور اس نے کیا کیا ہے؟ اس سے بھی زیادہ ایک اور اہم کتاب جس کا نام ہے "معالم القربه فی احکام الحسبه۔" خوش قسمتی سے اس کتاب کو بظاہر ایک فرنگی مستشرق نے (خوش قسمتی سے کہنا چاہئے۔ پھر خدا ان فرنگیوں کے باپ کے گناہ بخش دے کہ جو کم سے کم جاتے ہیں اور ہماری ایسی اچھی لکھی ہوئی کتابیں کتاب خانوں سے نکال لاتے ہیں اور چھاپ دیتے ہیں۔ ہم میں تو اتنی بھی لیاقت نہیں ہے) ترکی کے ایک کتب خانے سے نکال کر چھاپ دیا ہے۔

یہ کتاب نویں صدی میں لکھی گئی ہے۔ حسبہ میں وہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے یہ ایک اصطلاح رہی ہے کہ دوسری صدی ہجری سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو حسبہ کہتے چلے آرہے ہیں۔ محتسب جسے آپ دیکھیں گے کہ ہمارے اشعار میں آیا ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ جو محکمے اسلامی ملکوں میں حسبہ کے یا احتسابی اداروں کے نام سے رہے ہیں ان کے افراد یعنی آمرین بالمعروف اور ناہین عن المنکر کو محتسب کہتے ہیں جو ہمارے شاعروں کی اصطلاح میں زیادہ آیا ہے، مولوی، حافظ اور سعدی نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ سعدی کہتے ہیں: ہر چند کہ مجھ سے شیخ اجل شمس الدین ابوالفرج بن الجوزی میں جو کہ جوان تھا میرے استاد ابوالفرج بن الجوزی مجھ سے کہتے تھے۔ ان محفلوں میں نہ جا، یہاں نہ جا، وہاں مت جا اور میں ان شیخ اور استاد کی بات نہیں سنتا تھا کیوں کہ جوان تھا۔ کبھی کبھی ان سے مذاق کرتا تھا۔ میں کہتا تھا:

"قاضی ارہا ما نشینہ بر فشاند دست را
محتسب گرے خورد، معذور دار دست را"

بہر حال اس کتاب کا نام "معالم القربه فی احکام الحسبه" ہے۔ جس وقت آدمی اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے کہ اصل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کیا مفہوم ہے تو یہ دیکھتا ہے کہ یہ پوری زندگی پر محیط ہے۔ وہ تمام کام جو آج کل کی میونسپل کمیٹیاں انجام دیتی ہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہیں۔ وہ تمام کام بھی جو شہر کا کوتوال انجام دیتا ہے احتساب کے دائرے میں ہوتے ہیں۔

اسی کتاب "معالم القربه" میں لکھا ہے کہ محتسب کا یہ فرض ہے کہ جس دم بقال کی دکان پر جاتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ دہی کے برتنوں کے منہ کھلے ہیں اور مکھی بیٹھی ہوئی ہے تو بقال کو خبردار کرے کہ اپنے دہی کے برتن کا منہ ڈھانک کر رکھے۔ اس بقال کے کپڑوں پر نظر ڈالے کہ گندے تو نہیں ہیں۔ جو کپڑا وہ آگے باندھتا ہے چند دن میں ایک بار یا روزانہ ایک بار بدلے، دھوئے۔ غسل خانوں میں کیا کرتے ہیں؟ مسجدوں میں کیا کرتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ جس وقت انسان یہ باتیں دیکھتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے اے خدا! یہ ہم تھے اور یہ ایک وقت ہمارا تھا اور اب ہم یہ ہیں کہ ایسی حالت میں گرفتار ہیں؟ اے خدا! یہ ہم ہیں جو ہماری کافی کی اور ہماری تمام فقہی کتابوں کی روایتوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ امر بالمعروف وہ ہے جس سے زمین آباد ہوتی ہے۔ "و یعمر الارض وینتصف من الاعداء" امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مدد سے دشمن سے بدلہ لے سکتے ہیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو زندہ کرو تاکہ تم اسرائیل کے مقابلے میں کھڑے ہو سکو۔ اگر اسرائیل کے مقابلے میں کمزور ہو تو اس کی جڑ چند سو سال پہلے تلاش کرو کہ تم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ختم کر دیا اور جس وقت ختم کر دیا تو دشمن تم پر غالب آگیا۔ "ولیستقیم الامر" اسی وسیلے سے تمام کام اپنی بنیادوں پر مضبوطی سے قائم ہوتے ہیں۔

"فانکروا بقلوبکم۔ والنفظوا بالسنتکم و صکوا بها جباههم ولا

تخافوا فی اللّٰہ لومتہ لائم فان اتعظوا والی الحق رجعوا فلا سبیل علیھم انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق، اولئك لھم عذاب الیم۔" اب اس ٹکڑے کے ترجمے اور دوسرے ٹکڑوں کے بیان کا وقت نہیں ہے۔

جو فریضہ اسلام میں ایسا مقام اور قدر و قیمت رکھتا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ اگر کسی دن اتفاق سے تمہیں قوت اور طاقت حاصل ہو جائے تو کر لو اور جو طاقت نہ ہو تو پھر یہ فریضہ ساقط ہے، یعنی اسلام ساقط ہے۔ چونکہ امر بالمعروف جو اسلام ہمیں بتاتا ہے اسلام کے خیمے کا کھونٹا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ خود اسلام ہی یہ کہے کہ اگر اتفاق سے تم یہ دیکھو کہ اسلام کی حفاظت کر سکتے ہو تو کر لو اور اگر تم اتفاق سے یہ دیکھو کہ نہیں کر سکتے تو نہ کرو۔ چین سے رہو۔ آرام سے بیٹھو۔

اثر کے امکان کے بارے میں بھی یہی بات ہے۔ میں جاکر کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ مجھے تو اثر کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا۔ تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اثر کا امکان بتاؤ یا نہیں بتاؤ۔ تمہارا کوئی مطالعہ نہیں ہے۔ تمہیں حالات کی اطلاع نہیں ہے۔ تم واقعات سے واقف نہیں۔ تم نہیں جانتے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ کون سی ہے۔ تم نفسیات نہیں جانتے کہ انسان پر اثر کرنے کے لئے اس کی روح کا کس طریقے سے سامنا کیا جائے، تم عمرانیات نہیں جانتے، تم کچھ نہیں جانتے، اس لئے تمہیں کوئی حق نہیں جو یہ کہو کہ مجھے اثر کا احتمال ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اس بنیادی اصول کے دو پائے یہ ہیں۔ قدرت اور آگاہی۔ دونوں کو حاصل کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

آپ اپنے اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ امریکہ میں اسرائیل کے لئے مدد جمع

کرنے والی تین سو اسی سے زیادہ کمیٹیاں قائم ہیں۔ میں اس لحاظ سے ان کی قدر کرتا ہوں کہ یہ بیدار قوم ہیں۔ اپنے لئے کام کر رہی ہیں۔ یہ قوم سمجھتی ہے کہ اس کا راستہ یہی ہے۔ ہر شخص ہر محلے میں، ہر گوشے میں ہے، خود بیٹھیں، سوچیں، کام کریں، معلومات حاصل کریں، انجام کا اندازہ لگائیں۔ یہ واقفیت اور اس واقفیت کا حاصل کرنا واجب ہے یہ قدرت ہے اور قدرت کا حاصل کرنا واجب ہے۔

اب میں پھر اسی بات پر واپس آتا ہوں جو میں نے ابتدا میں عرض کی تھی یعنی حسینی تحریک میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنصر کا مطالعہ۔ اس لحاظ سے، اس وجہ سے کہ پیغمبر کے اہل بیتؑ نے اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کس طرح اٹھایا۔ خدابخشے مرحوم آیتی رضوان اللہ علیہ کو کیا بزرگ تھے۔ کیسے متقی عالم تھے جو ہم سے جدا ہو گئے۔ ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام "بررسی تاریخ عاشورا" (عاشور کی تاریخ کا مطالعہ)۔ ممکن ہے آپ میں سے بہت سے افراد نے دیکھی ہو۔ جنہوں نے نہیں دیکھی ہے وہ اسے دیکھیں اور پڑھیں۔ یہ ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو مرحوم نے ریڈیو پر کی تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد یہ تقریریں چھاپ دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں فارسی میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اسے اگر بہترین نہ کہوں تو بہترین میں سے یقیناً ایک ہے۔ اب اگر تجزیہ اور تحلیل کے اعتبار سے اسے درجہ اول کی کتاب نہ کہوں تو استناد کے پہلو سے یعنی اس پہلو سے کہ اس کا مواد معتبر تواریخ کی رو سے مستند ہے یہ یقینی طور پر بے مثال کتاب ہے۔ اس کتاب میں ان بزرگ نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ کربلا کی تاریخ کو دراصل اسیروں نے زندہ رکھا ہے۔ یعنی اسیروں نے تاریخ کی حفاظت کی ہے اور اموی حکومت نے جو سب سے بڑی غلطی کی وہ اہل بیت کو قید کرنا اور انہیں کوفہ اور بعد میں شام تک پھرانا تھا۔ اگر یہ لوگ یہ کام نہیں کرتے تو شاید یہ تاریخ بھلادی جاتی۔ یا کم سے کم اس کے اثر

اور قوت کو کچھ کم کر دیتے، لیکن انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں ایسا کام کیا کہ اہل بیت پیغمبرؐ کو موقع دے دیا اور انہوں نے دنیا میں تاریخ کربلا مسجل کر دی۔ ان لوگوں کو یہ یقین نہیں تھا کہ یہ تھوڑی سی عورتیں اور بچے جو حد درجہ خراب و خستہ، مصیبت زدہ ہیں اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لیں گے۔ کسے یقین تھا انہوں نے کس طرح تبلیغ کی؟ شام میں جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ہے۔ مجبوراً خود یزید کو شرکت کرنا ہے بلکہ شاید نماز کی امامت بھی اسی کو کرنا تھی۔ اس کا مجھے اب اس وقت یقین نہیں ہے۔

نماز جمعہ میں خطیب پہلے دو خطبے جو بہت مفید اور گرانقدر ہوتے ہیں پڑھتا ہے۔ اس کے بعد نماز شروع ہو جاتی ہے۔ اصولاً یہ دونوں خطبے ان دو رکعتوں کی جگہ ہوتے ہیں جو جمعہ کے دن ظہر کی نماز سے ساقط ہو جاتی ہیں اور جمعہ کی نماز دو رکعت میں بدل جاتی ہے۔ پہلے وہ خطیب جو اصطلاح میں دستوری یعنی حکمیہ تھا منبر پر گیا اور جو کچھ پہلے سے اس سے کہا گیا تھا وہی اس نے دوہرا دیا۔ اس نے یزید اور معاویہ کی تعریف کی اور دنیا میں جو صفت اور جو خوبی ہو سکتی تھی وہ ان سے منسوب کی اور پھر حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کو اس طرح برا بھلا کہنا شروع کیا کہ یہ خدا کے دین سے خارج ہو گئے۔ (نعوذ باللہ) انہوں نے یہ کیا اور وہ کیا۔ امام زین العابدینؑ نے پایۂ منبر نیچے سے ڈانٹا۔ "ایها الخطیب! اشتریت مرضات المخلوق بسخط الخالق۔" اے خطیب! تو نے ایک مخلوق کی خوشنودی کے لئے خالق کا غضب خرید لیا۔ پھر آپ نے یزید سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا تو مجھے اجازت دیتا ہے کہ میں ان لکڑیوں کے اوپر جاؤں؟ آپ نے منبر نہیں کہا۔ عجیب بات ہے! پیغمبرؐ کے اہل بیتؑ ان باتوں کا کتنا دھیان رکھتے تھے مثلاً یزید کے دربار میں یا امیر المؤمنین: "یا ایها الخلیفه!" نہیں کہتے بلکہ کنیت سے بھی مخاطب نہیں کرتے کہ یا ابا خالد! صرف اتنا کہتے ہیں اے

یزید! امام زین العابدین بھی اور جناب زینب سلام اللہ علیہا نے بھی۔ اس وقت بھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے اس منبر پر جانے کی اجازت دے یعنی یہ کہ یہ منبر نہیں ہے۔ یہ جو تین سیڑھیوں کی لکڑیاں یہاں ہیں ان پر ایسا ہی خطیب چڑھتا ہے اور ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ ہم اسے منبر نہیں سمجھتے! یہ چار لکڑیاں ہیں کیا تو مجھے ان لکڑیوں پر چڑھنے کی اجازت دیتا ہے تاکہ میں دو باتیں کر سکوں؟

یزید نے اجازت نہیں دی۔ جو لوگ چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے اس وجہ سے کہ علی بن الحسینؑ حجازی ہیں، اہل حجاز ہیں اور حجاز کے لوگوں کی گفتگو شیریں اور لطیف ہوتی ہے اور اس وجہ سے کہ آپ کا انداز خطاب دیکھیں، کہا کہ اجازت دے دو منع نہ کرو، لیکن یزید نے منع کر دیا۔ اس کا بیٹا آگیا۔ بابا! اجازت دے دیجئے ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس حجازی جوان کا انداز خطاب کیسا ہے۔ اس نے جواب دیا مجھے ان لوگوں سے ڈر ہے۔ سب نے اس قدر دباؤ ڈالا کہ وہ مجبور ہو گیا یعنی جب اس نے دیکھا کہ اس سے زیادہ اپنی عاجزی اور خوف کا اظہار ہوتا ہے تو اجازت دے دی۔

دیکھئے کہ یہ امام زین العابدین علیہ السلام اس وقت بیمار تھے۔ (اس کے بعد وہ بیمار نہیں رہے تھے۔ ان میں اور دوسرے اماموں میں کوئی فرق نہیں رہا تھا)۔ پھر قیدی بھی تھے اور ذاکروں کے مشہور قول کے مطابق طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے چالیس منزلیں طے کر کے شام تک آئے تھے۔ جس وقت منبر پر تشریف لے گئے تو آپ نے کیا کیا؟ کس قدر ولولہ پیدا کیا؟ یزید گھبرا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کہنے لگا ابھی لوگ ٹوٹ پڑیں گے اور مجھے مار ڈالیں گے۔ اس نے ایک چال چلائی، ظہر کا وقت تھا اچانک موذن سے کہا اذان دے نماز کو دیر ہوتی ہے۔ موذن کی آواز بلند ہوئی، زین العابدین علیہ السلام خاموش ہو گئے۔ موذن نے کہا: اللہ اکبر،

اللہ اکبر، امام نے دوہرایا: اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ موذن نے کہا: اشھد ان لا الہ الا اللہ، اشھد ان لا الہ الا اللہ پھر امام نے دوہرایا۔ یہاں تک کہ پیغمبرؐ کی رسالت کی شہادت پر پہنچا۔ یہاں تک موذن پہنچا ہی تھا کہ امام زین العابدینؑ نے آواز دی: موذن! خاموش ہو جا۔ آپ نے یزید کی طرف رخ کیا۔ اے یزید! اس جگہ جس کا نام لیا جارہا ہے اور جس کی رسالت کی گواہی دی جارہی ہے کون ہے؟ اے لوگو! ہم کون ہیں جنہیں تم نے قید کیا ہے؟ اور میرے پدر جنہیں تم نے شہید کر دیا کون تھے؟ اور یہ کون ہیں جن کی رسالت کی تم گواہی دے رہے ہو؟ اس وقت تک لوگوں کو صحیح واقعہ معلوم نہ تھا کہ انہوں نے کیا کر ڈالا ہے۔ اس وقت آپ سنتے ہیں کہ یزید نے بعد میں اہل بیت پیغمبرؐ کو اس قید خانے سے رہا کیا اور پھر حکم دیا کہ انہیں عزت و احترام کے ساتھ لے جائیں۔

نعمان بن بشیر کو جو نرم دل اور ملائم آدمی تھا اس کام پر مقرر کیا اور حکم دیا کہ ان لوگوں کو بے حد مہربانی اور آرام کے ساتھ شام سے مدینہ تک لے جاؤ۔ ! یہ کس لئے تھا؟ کیا یزید شریف بن گیا تھا؟ اس کی ذہنیت بدل گئی تھی؟ ہرگز نہیں! دنیا اور یزید کا ماحول بدل گیا تھا۔ آپ سنتے ہیں کہ یزید بعد میں ابن زیاد پر لعنت بھیجا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تمام گناہ اس کا تھا۔ وہ اس سے بالکل انکار کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں نے ایسا حکم نہیں دیا تھا۔ ابن زیاد نے اپنے آپ ہی یہ کام کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ امام زین العابدینؑ اور جناب زینب سلام اللہ علیہا نے حالات کا رخ پلٹ دیا تھا۔

ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

وصلی اللہ علی محمد و آلہ الطاہرین

۵ عاشور کے شعار

ہماری گفتگو کا عنوان شعار عاشور☆ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دو مطالب کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بات کروں۔ ایک وہ شعار جو ابا عبداللہ حسینؑ اور آپ کے اہلبیت اطہار نے روز عاشورا اظہار کیا ہے۔ دوسرا خود عاشورا ہم شیعوں کے لئے شعار ہے۔ پہلے کلمہ شعار کے معنی اور اس کی وضاحت کروں گا۔ کلمہ شعار اصل لغت میں وہ اشعار یا وہ نثر ہے جو جنگوں میں بولی جاتی ہے۔ ایک جانباز میدان جنگ میں جب نبرد کے لئے بھیجا جاتا تھا تو وہ ایک شعار بلند کرتا تھا۔ جنگوں میں عام طور پر تن بہ تن مقابلہ ہوتا تھا۔ دو دستے ایک دوسرے سے جنگ لڑتے تھے تو افراد مسلح ہوتے تھے۔ خود، زرہ، چکمہ، تلوار، سپر سے پوشیدہ ہوتے تھے، پیر سے لے کر جنگ باز کا سارا چہرہ سوا آنکھ کے پوشیدہ ہوتا تھا۔ ایک عسکری دوسرے کی صرف آنکھ کو دیکھ سکتا تھا۔ لہذا میدان جنگ میں ایک دوسرے کی پہچان نہیں ہوتی۔ میدان جنگ سے باہر سب کے سر اور گردن کھلے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر ایک کا لباس مختلف، ایک دوسرے کو دور سے پہچان لیتا تھا لیکن جنگوں میں سب ایک ہی روپ دھارے ہوتے تھے۔ تنہا ایک لشکر کے سپاہی سے اپنا ساتھی پہچانا نہیں جاتا بلکہ اپنے مخالف بھی اپنوں کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ یہ امکان تھا کہ اشتباہ ہو جائے اور کوئی اپنے ہی ساتھی کو مار دے۔ لہذا ہر قوم اور ہر لشکر اپنا ایک مخصوص شعار رکھتا تھا۔ ایک جملہ کا انتخاب کرتا تھا اور اسے

☆ (شعار کے معنی وہ نشان یا لفظ جس سے فوج والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔)

باربار تکرار کرتا رہتا تھا تاکہ پہچانا جائے کہ یہ سپاہی لشکر "الف" کا تھا اور دوسرا جو شعار دیتا تھا وہ لشکر "ب" کا تھا۔ اس عمل کا کمترین فائدہ یہ تھا کہ لشکری کا آپس میں اشتباہ نہیں ہوتا تھا، لہذا خود اپنا ساتھی دوسرے ساتھی کو نہیں مارتا تھا۔ کبھی شعار دینے والے اس سطح سے بھی زیادہ واضح اور روشن شعار دیتے تھے۔ جب سپاہی میدان جنگ میں پہنچتا تھا تو اپنے گروہ کا شعار دیتا تھا، اپنا شخصی تعارف بھی کرواتا تھا، عرب چونکہ شعر گوئی میں قوی تھے اور ان کے لئے شعر گوئی آسان تھی اور شعر گوئی عربی زبان کی خصوصیات میں سے رہی ہے۔ لہذا عرب اکثر و بیشتر جب میدان جنگ میں وارد ہوتا تو اپنی ایک رباعی یا ایک رجز سے تعارف کراتا۔ مثلاً جو مبارزہ طلب کرتے تھے اپنی مبارزہ طلبی کو شعر کے ذریعے کرتے تھے۔ دوسرا آدمی شعر ہی میں اسے جواب دیتا کہ وہ بھی آمادۂ جنگ ہے۔ آپ نے سنا ہے کہ جنگ خندق میں پیغمبر اکرمؐ نے دستور دیا کہ مدینہ کے گرد جہاں سے دشمن کے داخل ہونے کا خطرہ ہو خندق کھودیں تاکہ دشمن مدینہ میں داخل نہ ہوسکے لیکن دشمن کے کچھ افراد ایک جگہ سے اپنے گھوڑے کے ذریعے خندق پار کر کے مدینہ آنے میں کامیاب ہوگئے ان میں سے ایک عمرو بن عبدود تھا جو کہ معروف شجاع تھا۔ فارسی اصطلاح میں اسے "یل یل" کہ اس کی ضرب المثل شجاعت تھی۔ مسلمانوں کے مقابلے میں آکر اس نے للکارا "الا رجل الا رجل" ہے کوئی مرد؟ کسی نے جواب نہ دیا کیونکہ سب اسے جانتے تھے۔ کسی ایک آدمی نے بھی جرأت نہ کی کیونکہ سب جانتے تھے کہ اس سے مقابلہ محض موت ہے۔ صرف ایک بیس (۲۰) اور چند سالہ نوجوان نے کہا کہ یارسول اللہؐ! مجھے اجازت دیں میں جاؤں گا، وہ علیؑ تھے۔ پیغمبرؐ نے کہا بیٹھ جاؤ۔ عمرو بن عبدود نے دوبارہ للکارا: کہ ہے کوئی مرد؟ تو علیؑ کے علاوہ کسی نے جواب نہ دیا۔ تیسری دفعہ علیؑ جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے کہ مسلمانوں کی آبرو ریزی ہو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے

مسلمانوں کی طرف سے عذر پیش کرنے کے لئے پیغمبرؐ سے کہا کہ اگر کوئی نہیں اٹھ سکتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ میرا خود تجربہ ہے کہ ایک دفعہ میں اس کے ساتھ قافلے میں جارہا تھا کہ بہت سے رہزنوں نے ہم پر حملہ کردیا، یہ شخص تن تنہا ان کے مقابل ہوگیا اور بطور سپر اونٹ کے بچے کو اٹھالیا، بھلا ایسے شخص کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟ جب عمرو بن عبدود نے دیکھا کہ کوئی جواب نہیں آرہا تو مسلمانوں کی تحقیر کی خاطر یہ شعر کہا:

ولقد بهت من النداء بجمعكم هل من مبارز

و وقفت اذ وقف المشيع موقف القرن المناجز

ترجمہ: میں تمہیں پکار پکار کے تھک گیا، میرا گلا درد کرنے لگا هل من مبارز کہتے، تمہارے درمیان ایک بھی مرد نہیں ہے؟

اس وقت پیغمبرؐ نے علیؑ کو اجازت دی۔ علیؑ اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا:

ولقد اتاك مجيب صوتك غير عاجز .....

تمہاری آواز کا جواب دینے والا آگیا اور اسی شعر کے انداز میں جواب دیا۔ آپ نے سنا ہے کس طرح علیؑ کامیاب ہوئے۔ اس مقابلے کی صورت کچھ ایسی تھی کہ پیغمبرؐ نے کہا: آج تمام اسلام کا تمام کفر سے مقابلہ ہو رہا ہے، یعنی یہ جنگ ہماری تقدیر کا فیصلہ کرنے والی ہے۔

جو چیز ہمیں عاشورا میں زیادہ دیکھنے میں آتی ہے وہ مسئلہ شعار ہے۔ لباعبداللہ کا شعار، اصحاب لباعبداللہ کا شعار اور خاندان لباعبداللہ کا شعار۔ ان شعار میں خصوصاً خود لباعبداللہ کے شعار۔ ہر ایک نے اپنا تعارف ایک رجز، ایک رباعی سے کیا۔ کبھی کبھی اس معارفی کے دوران اپنے ہدف کی بھی معارفی کرتے تھے۔ اہم مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ میں بہت سی چیزیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ کبھی کبھی لوگ جمع ہوتے ہیں ایک

مقصد اور ایک ہدف کے لئے، لیکن بعد میں ایک اور مقصد کو نظر میں رکھتے ہوئے منتشر اور پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ ایران میں مشروطیت کے دوران ایسے واقعات کا بہت اتفاق ہوا۔ ابتداء میں لوگوں کو مشروطیت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ لوگ مختلف ناموں سے جمع ہوتے تھے جب منتشر ہوتے تو کوئی نیا مطلب لے کر نکلتے تھے۔ کہتے تھے کہ لوگ اس مسئلہ کے لئے جمع ہوئے۔ یہ باتیں کیں، یہ کہا، یہ کہا، چونکہ لوگوں کی سمجھ پختہ نہ تھی، لوگ کہتے تھے کہ ہمارا جمع ہونا کس مقصد کے لئے ہے۔

لاعبداللہ حسینؑ نے بھی عاشورا کے دن بہت سے شعار دیئے۔ آپ نے اپنی نہضت کی روح کو مشخص کیا کہ میں کیوں جنگ کررہا ہوں، ہم تسلیم کیوں نہیں ہوتے، ہم یہاں کیوں آئے ہیں کہ آخری قطرۂ خون تک بہادیں گے؟ افسوس کی بات ہے کہ شیعہ یہ شعار فراموش کر بیٹھے ہیں اور اس کی جگہ نیا اور دوسرا شعار لائے ہیں جن میں حسینؑ کی نہضت کی روح منعکس نہیں ہوتی۔

ہمارے ائمہ ایک دوسرے کے بعد آئے اور حکم دیا کہ عاشورا کو زندہ رکھیں، حسینؑ کی مصیبت کو فراموش نہ ہونے دیں، اس مکتب کو زندہ رکھیں، ہر سال محرم کا عاشورا ہوتا ہے، شیعہ ہے جو اسے زندہ رکھتا ہے۔ عاشورا شیعوں کا شعار ہے۔ شیعوں کو چاہئے کہ وہ جواب دے سکیں۔

شیعہ جب غیر شیعہ کے مقابلے میں، ایک مسیحی یا ایک یہودی یا ایک لامذہب کے مقابلے میں اگر کھڑا ہوتا ہے اور لوگ پوچھتے ہیں کہ تاسوعا اور عاشورا کے دن تمام کام ترک کر کے مسجدوں، امام بارگاہوں میں جمع ہوتے ہو، جلوس نکالتے ہو، سینہ زنی کرتے ہو، زنجیر زنی کرتے ہو، چیخ و پکار کرتے ہو تو تمہارا کیا مطالبہ ہے؟ اگر کوئی ایسا سوال کرے تو شیعوں کے پاس جواب ہونا چاہئے کہ ہمارا مطالبہ ہے کہ لاعبداللہ فقط جنگ کے لئے نہیں آئے تھے کہ لڑیں اور مرجائیں۔ حسینؑ نے اپنے

مطالب کو واضح کیا ہے اپنے ہدف اور مقصد کو مشخص کیا ہے۔

ہمیں دیکھنا چاہئے کہ عاشورا کے دن حسینؑ کا کیا شعار تھا۔ یہ حسینؑ کا شعار ہی تھا جس نے اسلام کو زندہ رکھا، تشیع کو زندہ کیا، خلافت بنوامیہ کے پائے متزلزل کئے۔ اگر حسینؑ کا قیام نہ ہوتا تو بنو عباس جنہوں نے پانچ سو سال حکومت کی اور مزید پانچ سو سال کرتے ان سب کا ہدف اسلام کو ختم کرنا تھا۔ اسلام کے پردے میں فروغ دے کر جاہلیت کو پھر سے زندہ کریں۔

لاعبداللہ الحسینؑ کا شعار تھا جس نے ان کے پردے چاک کردیئے اور درمیان سے ہٹادیا۔

ہم عاشورا میں دو نوعیت کے شعار دیکھتے ہیں۔ ایک تو خود شخصی تعارف ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں لیکن دوسرا شعار فکر کی پہچان، احساس کی پہچان، نظر کی پہچان، روز عاشورا یہ دونوں شعار بہت زیادہ نظر آتے ہیں۔ لاعبداللہ کا شعار خود ایک مفصل داستان ہے۔ انہیں ہم اس مجلس میں بیان نہیں کرسکیں گے۔

لاعبداللہ الحسینؑ عاشورا کے دن علیؑ مرتضیٰ پر زیادہ افتخار کرتے ہیں۔ البتہ نواسۂ رسول ہونے پر بھی افتخار کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ سامنے سب دشمنان علیؑ ہیں اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ امت پیغمبرؐ ہیں۔

حسینؑ کی کوشش تھی کہ برملا کہیں کہ مجھے علیؑ کا بیٹا ہونے پر فخر ہے۔ جو شعار حسینؑ نے عاشورا کے دن ارشاد کیا ہے بعضے خود حسینؑ کے ہیں اور بعض دوسروں کے۔ مثلاً وہ معروف اشعار جو سروت ابن مسیک نے کہے ہیں جو کہ پورا حماسہ ہے۔ لاعبداللہ نے دوز عاشورا شعاروں میں سے ایک خود فرمایا ہے۔ (خصوصاً ایک مصرعہ):

الموت اولی من رکوب العار
والعار اولی من دخول النار

ترجمہ : میرے پاس موت ذلت و پستی سے کئی گنا بہتر اور عزیز ہے، محبوب اور پسند ہے۔

اس شعار کا نام شعار آزادی، شعار عزت، شعار شرافت ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کے لئے ذلت و خواری کی زندگی سے بہتر ہے کہ وہ مر جائے۔ دنیا جان لے کہ اگر حسینؑ حاضر ہے تو اپنا اور اپنے جوانوں کے خون کا آخری قطرہ بہادوں گا۔ وہ حسینؑ جو دامن رسولؐ کا پروردہ ہے، علیؑ کا فرزند ہے اور زہرا کا شیر خوردہ ہے۔

جب ظاہری طور پر ساری امیدیں ختم ہوگئی تھیں تو حسینؑ نے یہ خطبہ فرمایا جو اتنا پر از شور اور کہیں گے دہکتی آگ ہے جو حسینؑ کے دہن سے باہر آرہی ہے :

آیا یہ کلمات معمول میں مذاق ہیں جو حسینؑ نے فرمایا :

الا وان الدعی بن الدعی قدر کز بین اثنتین بین السلة والذلة وهيهات منا الذلة.

پسر زیاد کی تلوار سے خون ٹپک رہا ہے۔ اس کے سفاک باپ نے بیس (۲۰) سال پہلے کوفہ والوں کو قتل کیا ہے۔ کوفہ پر حکومت کی ہے، ہر ایک اس سے ڈرتا ہے چونکہ کوفہ والے اس کو اور اس کے باپ کو جانتے ہیں کہ یہ سفاک اور خونخوار ہیں۔ یہ پسر زیاد جب کوفہ آیا اور وہاں کا امیر ہوا، چونکہ اس کے باپ کا رعب اہل کوفہ کے دل میں تھا سب مسلم بن عقیل سے دور ہوگئے، لوگ خوفزدہ ہوگئے۔ اس عبیداللہ زیاد کے بارے میں حسینؑ اہل کوفہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ یہ زنازادہ پسر زنازادہ، یہ تمہارا امیر، یہ تمہارے لشکر کا سالار مجھے تجویز دیتا ہے کہ میں خوار و ذلیل ہو جاؤں، یا تلوار نیام سے نکال کر مقابلہ کروں۔ تم اپنے امیر سے کہہ دو کہ حسینؑ کہتا ہے هيهات منا الذلة (ذلت ہم سے دور ہے) ہم ذلیل ہو کر تسلیم نہیں کریں گے۔ (شہید مطہری یہ جملہ کہہ کر روپڑے) آیا وہ خیال کرتا ہے کہ میں خود

بھی ان جیسا ہوں "یاب اللّٰه ذالك لنا ورسوله و المؤمنون و حجور طابت وطهرت (گریہ استاد) خدا چاہتا کہ حسینؑ اس طرح ہو۔ مگر تمہیں پتا نہیں، وہ زنازادہ ابن زیاد نہیں جانتا کہ میں کس دامن میں پل کر بڑا ہوا ہوں۔ میں دامن پیغمبرؐ میں بڑا ہوا ہوں، میں دامن علیؑ مرتضیٰ کا پروردہ ہوں، میں نے شیر فاطمہ پیا ہے۔ (استاد گریہ کرتے ہیں)۔ کیا جس نے فاطمہ زہرا کا دودھ پیا ہے وہ خود کو پسر زیاد کی ذلت اور اسیری میں دے گا؟ ناممکن! "هيهات منا الذلة" کہاں میں اور کہاں ذلت؟ حسینؑ کا شعار عاشورا کے دن اسی طریقہ ہے۔

برادران! تم لوگ جو دستوں میں شعار بناتے ہو آیا یہ حسینؑ کے موقف سے موافقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ لباعبداللہ، ان کے اہل خاندان اور اصحاب حسین کی تشنگی کوئی مذاق نہیں کیونکہ ہوا بہت گرم تھی، (اس وقت کا عاشورا ظاہراً اواخر خرداد تھا۔ عراق کی ہوا سردیوں میں ہی گرم ہوتی ہے چہ جائیکہ گرمیوں میں) تین دن سے اہلبیت پیغمبر پر پانی بند کیا ہوا ہے۔ شب عاشور تھوڑا پانی خیمہ میں لایا گیا۔ حضرت نے فرمایا : یہ پانی پیو، یہ تمہارا آخری توشہ ہے۔ پانی نہ ہونے کے علاوہ ایک طبیعی قاعدہ ہے کہ جس کے بدن سے خون زیادہ نکلے اور جس کے بدن میں خون کم ہو، تازہ خون کی احتیاج پیاس بڑھاتی ہے۔ خداوند متعال نے بدن کو ایسا بنایا ہے کہ جس وقت کسی چیز کی احتیاج ہوتی ہے وہ احتیاج خود فوراً ظاہر ہوتی ہے۔

وہ افراد جن کے جسم پر زخم لگتا ہے ان پر تشنگی جلدی غالب آتی ہے کیونکہ ان کے جسم سے خون زیادہ نکل گیا ہوتا ہے۔ جسم خون بنانا چاہتا ہے جس کے لئے پانی درکار ہوتا ہے۔ يحول بينه وبين السماء العطش۔ لباعبداللہ اتنے زیادہ پیاسے تھے کہ اپنے اوپر آسمان نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن میں نے مقاتل میں بہت کوشش کی کہ یہ معروف جملہ تلاش کروں جو لوگ کہتے ہیں کہ حسینؑ نے کہا : اسقونی شربة

من الماء۔ (مجھے ایک گھونٹ پانی پلادو)۔ ہرگز نہیں! حسینؑ ان میں سے نہ تھے کہ پانی طلب کرتے بلکہ حسین جب حملہ کرتے کوشش میں تھے کہ خود فرات جاکر پانی پئیں۔ یہ نہیں کہ لوگوں (اشقیاء) سے طلب کریں۔ لاعبداللہ کی تشنگی معمولی بات نہ تھی۔ تاہم امامؑ نے لوگوں سے پانی طلب نہیں کیا۔ عظمت لاعبداللہ کوئی اور چیز ہے۔ ہم کوئی اور۔ ہم جو شعار سینہ زنی، نوحہ سرائی میں دیتے ہیں جسے شعار حسینی کہتے ہیں وہ اپنی جگہ بہتر ہے کہ نوحہ خوانی کریں۔ ائمہ نے بھی کہا ہے کہ شعائر حسینی ہو جائیں ان پر گریہ کریں۔ ہم ان تمام شعائر کا دفاع کرتے ہیں لیکن یہ التماس کرتے ہیں کہ ان تمام شعائر کو شعائر حسینی ہونا چاہئے۔ نہ خود خواہی، من گھڑت، نہ اپنی ذہنی خود ساختہ ہوں۔ مثلاً جب کہتے ہیں "نوجوان اکبر من .....) یہ حسینؑ کا شعار نہیں ہے۔ حسینؑ نے اس طرح کا شعار نہیں دیا۔

حسینؑ فرماتے تھے: کیا حق کی طرف نہیں دیکھ رہے، باطل سے باز نہیں آتے، ایسے حالت میں مؤمن کو لقاء اللہ کی تمنا کرنی چاہئے۔ امامؑ نے فرمایا: میں ایسی حالت میں موت کو جز سعادت کچھ نہیں سمجھتا اور زندگی کو جز ہلاکت کچھ نہیں سمجھتا۔ حسینؑ کا ہر جملہ سزاوار ہے کہ سنہری حروف سے لکھا جائے اور ساری دنیا میں نشر کیا جائے تب بھی کم ہے۔ یہ کہنا کہ موت کو خوش بختی سمجھتا ہوں اور ظالموں کے درمیان رہنے کو بدبختی اور ہلاکت سمجھتا ہوں۔

مرا عار آید ازیں زندگی
کہ سالار باشم کنم بندگی

ترجمہ: مجھے عار ہے یہ زندگی کہ سالار ہوتے ہوئے بندگی کروں۔

امام حسینؑ کا شعار حیات بخش ہے۔ یاایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم۔ لاعبداللہ ایک مصلح ہیں۔ یہ آپ کے خود کے

مستقبل کی تعبیر ہے:

انی لم اخرج اشراً ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً وانما خرجت لطلب لاصلاح فی امة جدی، اریدان آمر بالمعروف و انھی عن المنکر و اسیر بسیرة جدی وابی۔

ترجمہ میں طغیان، سرکشی، فساد پھیلانے اور ظلم کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے جد کی امت کی اصلاح کے لئے نکل رہا ہوں اور اپنے اب وجد کی سیرت پر چل رہا ہوں۔

حضرت نے یہ جملہ اس خط میں لکھا جو آپ نے وصیت نامہ اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو لکھا تھا جو کہ معذور تھے، ہاتھ مفلوج تھے۔ حسین کے ساتھ نہیں چل سکتے، ان میں حسین کے رکاب میں رہنے کی قدرت نہیں تھی، امامؑ نے یہ وصیت نامہ ان کے سپرد کیا تاکہ دنیا ان کے نہضت قیام سے آگاہ ہو۔

حسینؑ نے فرمایا: اے دنیا والو! میں دوسروں جیسا نہیں ہوں۔ میرا انقلاب اس لئے نہیں کہ خود کسی امتیاز کو پہنچوں، کوئی مال و دولت ہاتھ آئے۔ آج سے پوری دنیا یہ جان لے کہ (یہ خط مدینہ میں لکھا) میں امت جد کی اصلاح چاہتا۔ میں امربالمعروف نہی عن المنکر چاہتا ہوں، میں سیرت زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں سیرت علی زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ اطہار نے کیوں اتنی تاکید کی کہ عاشورا زندہ رہے، کیوں اتنا اجر و ثواب عزاداری کے لئے بیان کیا۔ آیا یہ اجر و ثواب اسی عزاداری کے لئے ہے جس نوعیت کی ہم اپنے ماں، باپ کے مرنے پر کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارے مرنے کی کوئی اہمیت نہیں، نہ کوئی فکر، نہ کوئی ہدف ہے۔ ائمہ نے اس جہت سے عاشورا زندہ رکھنے کو کہا ہے تاکہ عاشورا سے صرف حسینؑ نہیں بلکہ مکتب زندہ رکھ سکیں۔ اس مکتب کا نمونہ (ماڈل) حسینؑ ہیں۔ حسینؑ ایک فکر

کی صورت زندہ ہیں۔ شخصیت حسینؑ کی ہر سال محرم کا چاند دیکھتے ہی تمام فضا میں یہ آواز سنی چاہئے :

الا ترون ان الحق لا یعمل به والباطل لا یتناهی عنه لیرغب المؤمن فی لقاء اللّٰه محقا۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہورہا اور باطل سے اجتناب نہیں کیا جاتا؟ ان حالات میں ہر مؤمن کا فرض ہے کہ شہادت کے لئے تیار ہو جائے تاکہ لوگوں میں حق اور حقیقت کے ذریعے حیات کے بارے میں، امربالمعروف کے بارے میں، نہی عن المنکر کے بارے میں اور اسلامی معاشرے کے مسائل کے بارے میں شعور پیدا ہوجائے۔

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ روز عاشورا تم حسینؑ، حسینؑ کرتے ہو، اپنے سر پر مارتے ہو۔ بولو! تم کیا چاہتے ہو؟ ہم جلدی سے، آسانی سے کہہ سکیں ہم وہی چاہتے ہیں جو ہمارے آقا چاہتے ہیں، ہم ہر سال اس آیت کے تحت تجدید حیات کرتے ہیں: "یاایها الذین آمنوا استجیبوا للّٰه وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم۔" ہم یہ کہہ سکیں کہ عاشورا ہمارے تجدید حیات کا دن ہے، آج کا دن کوثر حسینی کی نہر میں اپنے آپ کو اپنی روح کو دھونے کا دن ہے۔ اپنے اندر روح اسلام کو پھونکنے کا دن ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر، احساس شہادت، احساس جہاد، راہ حق میں فداکاری کو فراموش کردیں، ہم نہیں چاہتے کہ روح فداکاری ہم میں سے نکل جائے۔ فلسفہ عاشورا یہ نہیں کہ پہلے گناہ کرے پھر حسینؑ کے نام سے بخشش طلب کرے، پہلے گناہ کریں پھر مجلس میں جائیں پھر کہہ دیں کہ ہماری بخشش ہوگئی۔ ہمارے گناہوں کی بخشش اس وقت ہوتی ہے جب ہماری روح کا روح حسینؑ سے وصل ہو جائے۔ گناہوں سے بخشش کی علامت یہ ہے کہ ایک بار گناہ کرنے کے

بعد ادھر نہ جائے۔ اگر گناہ کرنے کے بعد مجلس میں جائیں اور وہاں سے نکلنے کے بعد دوبارہ گناہ کا ارتکاب کریں تو یہ علامت ہے کہ ہماری روح، روح حسین سے وصل نہیں کرپائی۔ شعار حسینؑ شعار اسلام ہے۔

حسینؑ فرماتے ہیں مسلمانوں کے بیت المال کیونکر ایک گروہ سے مختص ہوگیا ہے؟ کیوں حلال خدا حرام اور حرام خدا حلال ہوگیا ہے؟ کیوں لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔ فقیر فقر میں مبتلا ہے، دردمند درد میں مبتلا ہے۔ جو پیٹ بھر کے کھاتا ہے وہ اٹھ نہیں پاتا۔

حسینؑ نے راہ میں حر کے ایک ہزار لشکر سے خطاب میں وہ معروف خطبہ ارشاد فرمایا جس میں پیغمبرؐ کی اس حدیث سے استفادہ کیا کہ پیغمبرؐ نے ایسا فرمایا ہے کہ اگر ایسا زمانہ آجائے اور حالات ایسے ہو جائیں کہ بیت المال مسلمین کا حشر یہ ہو کہ حلال خدا حرام اور حرام خدا حلال ہو جائے اور مسلمان اس کو جان لیں اور خاموشی اختیار کرلیں تو خدا پر واجب ہے کہ ایسے مسلمان کو وہاں پہنچا دیں جہاں ظالمین کا ٹھکانا ہے۔ ایسے حالات میں مجھے میری ذمہ داری کا احساس ہے۔ "الا و انی احق من غیر" کہ میں اس منصب کے لئے دوسروں سے زیادہ سزاوار ہوں۔ یہ ہے مکتب حسینؑ، یہ ہے روح شعار حسینؑ، یہ ہے شعار عاشورا۔

ہماری مجالس، امام بارگاہ، جلوس میں جو شعار بلند ہوتا ہے وہ جاندار ہونا چاہئے نہ کہ سلانے والا، جان بخشنے والا ہونا چاہئے، نہ کہ بے حس کرنے والا۔ اگر بے حس کرنے والا ہے تو ہم کو حسینؑ سے دور کرنے والا ہے۔

یہ آنسو جو حسینؑ کے لئے بہاتے ہیں اس کا بہت اجر ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ حسینؑ ہمارے دلوں میں ہماری روحوں میں جاگزیں ہوں۔ چنانچہ روایات میں ہے: "ان اللحسین محبة مکنونة فی قلوب المؤمنین" مؤمنین کے دلوں میں

حسینؑ کی محبت چھپی ہوئی ہے۔ ممکن نہیں انسان ایمان رکھے اور حسینؑ سے محبت نہ رکھتا ہو کیونکہ نام حسینؑ ایمان ہے۔

اسی طرح اصحاب حسینؑ کا شعار دیکھیں کہ عجیب ہے۔ واقعہ کربلا اس طریقہ سے وجود میں آیا کہ سوچنے والے سوچتے ہیں کہ اس کی ترتیب و تنظیم اور ساخت اس طرح کی گئی ہے کہ کبھی بھلائی جانے والی نہیں۔ یہ بھی عجیب ہے کہ لاعبداللہ کبھی اپنا تعارف یوں کراتے ہیں:

انا الحسین بن علی آلیت ان لا ننثنی
احمی عیالات ابی امضی علی دین النبیؐ

ترجمہ: میں حسینؑ ابن علیؑ ہوں، بخدا میں ہرگز منہ نہ موڑوں گا، اپنے اہل وعیال کی حمایت کروں گا اور دین نبیؐ پر قائم رہوں گا۔

آپ کا شعار مختلف آہنگ کے ساتھ ہے، کبھی میدان میں تنہا کھڑے ہوئے شعار بلند کرتے ہیں۔ ایک شعار میں فرماتے ہیں جو کہ طولانی وزن کا ہے:

انا بن علی الطهر من آل هاشم کفانی بهذا مفخراً حین افخر

ترجمہ: میں علیؑ کا بیٹا ہوں جو کہ ہاشم کی پاک نسل سے ہیں، میرے لئے یہی فخر کافی ہے کہ میں فرزند علیؑ ہوں۔

جب امام حملہ آور ہوتے تھے، حملہ کا شعار الگ دیتے تھے جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے۔ مثلاً الموت، اولی من رکوب العار یا وہ شعر قبلاً پڑھے۔

روز عاشورا حسینؑ کی شجاعت اور اطمینان قلبی اس بات کی نشانی ہے کہ حسینؑ ہر چیز فراموش کر چکے تھے۔ چنانچہ دشمن کے راوی حسینؑ کے اس منظر کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کی قسم کسی شکستہ انسان جس کے اہلبیت، اولاد اور اصحاب سب قتل ہوگئے ہیں اور اس کا دل اتنا مطمئن ہو۔ خدا کی قسم مجھے تعجب ہے کہ یہ کونسا دل

تھا کہ ایک طرف سے شکستہ ہو، اس کے اولاد و اصحاب کے اعضاء قلم قلم ہوئے ہوں لیکن اس کا قلب اتنا قوی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ (واللہ مارایت مکسوراً قط، قد قتل اهل بیته و ولده واصحابه اربط جاشاً منه)

روز عاشورا امام حسینؑ نے اپنے لئے ایک مرکز کا انتخاب کیا تھا۔ وہاں جاکر قیام کرتے اور وہیں سے حملہ کرتے تھے۔ واپس اس مقام پر تشریف لے جاتے تھے۔ بطور قطع اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور تمام تواریخ نے ثبت کیا ہے کہ کوئی شخص تنہا امام سے جنگ کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ جو بھی آتا تھا وہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہ صورت حال دیکھ کر پسر سعد نے بآواز بلند چیخ کر کہا: "اس کے باپ کی روح اس کی جان میں ہے۔ یہ سمجھ لو کس کے ساتھ جنگ کر رہے ہو، یہ علی کا پسر ہے اس کے قالب میں علی کی روح ہے ایک ایک کر کے اس کے مقابلے میں نہ لڑو۔" عمر سعد کے اس اعلان کے بعد تن بہ تن جنگ ختم ہوگئی۔ نامردوں کی جنگ شروع ہوگئی۔ ہر طرف سے پتھر، تیر کا حملہ شروع ہوگیا۔ سوچیں تو سہی! تیس ہزار کے لشکر نے ایک آدمی کو قتل کرنے کے لئے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اتنے اجتماع کے باوجود امامؑ ان پر حملہ آور ہوتے تو جیسے گلہ گوسفند بھیڑیئے کو دیکھ کر فرار کرتے ہیں بھگدڑ مچ جاتی۔ امامؑ ان کا زیادہ دور تک پیچھا نہیں کرتے تھے کیونکہ آپؑ نہیں چاہتے تھے کہ خیمہ سے زیادہ دور ہوں۔ غیرت حسینؑ اس کی متحمل نہ تھی کہ جب تک زندہ ہیں خیمہ سے دور ہوں مبادا کوئی اہانت نہ کرے۔ حملہ کر کے دور بھگاتے اور مرکز پر واپس آجاتے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے خیمہ تک آپ کی آواز آسانی سے پہنچتی تھی۔ گرچہ حسینؑ کو اہلبیت دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن آواز سن سکتے تھے۔ اس لئے حسینؑ آواز دیتے تھے تاکہ زینب مطمئن ہوں، سکینہ مطمئن ہو، تاکہ

آپؑ کے بچے مطمئن ہوں کہ حسینؑ ابھی زندہ ہیں۔ اسی جگہ آکر قیام کرتے، اپنی خشک زبان و خشک دہن میں حرکت دے کر کہتے: "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم" یہ طاقت حسینؑ کی نہیں بلکہ خدا نے یہ قوت عطا فرمائی ہے جو حسینؑ کو استقامت دیتی ہے۔ ایک طرف شعار توحید بلند کرتے تھے دوسری طرف زینب کو خبر دیتے تھے کہ زینب جان! حسینؑ ابھی زندہ ہے۔ اپنے خاندان کو یہ دستور دیتے تھے کہ جب تک میں زندہ ہوں خیمہ سے باہر نہ آنا۔ امام حسینؑ دو دفعہ وداع کے لئے آئے۔ ایک دفعہ وداع کر کے گئے۔ دوسری دفعہ اس طریقہ سے آئے کہ آپ نہر فرات کی طرف گئے، خود کو فرات تک پہنچایا تو کسی نے آواز دی: حسینؑ! آپ پانی چاہتے ہیں؟ یہ کہہ کر سب نے خیمہ کی طرف ہجوم کیا۔ یہ دیکھ کر حسینؑ فرات سے پلٹے اور دوسری دفعہ خیمہ میں گئے۔ یہاں ایک نورانی جملہ کہتے ہیں:

میرے اہلبیت! مطمئن رہو۔ میرے بعد اسیر ہو جاؤ لیکن کوشش کرنا کہ اسارت میں اپنے وظیفہ سے ذرہ برابر کوتاہی نہ کرنا۔ اپنی زبان سے ایک کلمہ بھی جاری نہ کرنا جو آپ کے اجر کو کم کرے۔ مطمئن رہنا۔ دشمن کا یہ کام آخر ختم ہو کر رہے گا۔ دشمن کا یہی کام، یہی عمل اسے ذلیل کرے گا۔ واعلموا ان اللہ منجیکم خدا آپ کو نجات دے گا۔ اپنے حفظ میں رکھے گا۔ یہ بہت بڑا جملہ حسینؑ نے فرمایا کہ آپ لوگ اسیر ہوں گے لیکن آپ ذلیل و حقیر نہ ہوں گے۔ یعنی اسارت آپ کے کے لئے ذلت نہیں عزت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کوفہ میں جب لوگوں نے اسیروں کو صدقہ دیا تو جناب زینب نے صدقہ لینے سے روکا۔ کبھی خواری یا ذلت برداشت نہیں کیا۔ یعنی شیر اگر زنجیر میں بندھا تو بھی شیر ہے، لومڑی اگر آزاد ہے پھر بھی لومڑی ہے۔ اس دفعہ جب امامؑ تشریف لائے تو اہلبیت خوش حال ہوگئے۔ حسینؑ نے خدا حافظ کہا۔ خیمہ سے باہر

آئے، لباعبداللہ کے حکم کے بعد اہلبیت باہر نہیں نکلے۔

کچھ دیر بعد حسینؑ کی سواری کی صدائے شیھہ سنی تو اہلبیت سمجھے کہ امامؑ تیسری بار رخصت کو آئے ہیں۔ (گریۂ استاد) لیکن جب باہر آئے تو دیکھا کہ سواری بغیر حسینؑ آئی ہے۔ (استاد کا گریۂ شدید) سب نے اس سواری کے گرد حلقہ بنایا۔ ہر ایک نے سواری سے مخاطب ہو کر کہا۔ ایک نے کہا: اے ذوالجناح! ھل سقی ابی اوقتل عطشانا؟ آیا میرے بابا کو پانی پلایا یا پیاسا شہید کیا؟ یعنی میرا باپ پیاسا گیا تھا آیا ایک گھونٹ پانی دیا یا پیاسا شہید کیا؟ (گریۂ استاد)

یہاں ایک منظر پیش کروں جو قلب امام زمانؑ میں آگ لگا دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا: واسرع فرسك شارداً مهمهماً باكيا فلما راين النساء جوادك ورايـن ـ خرجن من الخدور لاطمات ـ على الخدود ـ

(آپ کی سواری دوڑتے ہوئے، آواز نکالتے ہوئے خیمہ کی طرف آئی۔ جب اہل حرم نے اس گھوڑے کی زین کو الٹا دیکھا تو خیمہ سے منہ پر تمانچے مارتے ہوئے اہلبیت نکلے) امام زمان فرماتے ہیں: "اے جد بزرگوار! آپ کے اہلبیت آپ کے حکم کے مطابق خیمہ سے نہیں نکلے۔ جب آپ کی سواری کو بے صاحب دیکھا تو پریشان سب آپ کے مقتل کی طرف دوڑے۔ (استاد بزرگوار چند لحہ اس مصیبت عظمیٰ پر رونے کے بعد) ان فقرات دعا کو پڑھا اور اپنی زبان میں بھی یہ دعا کی: خداوندا! ہمیں صحیح معنوں میں حسینی بنادے، ہمیں روح نہضت حسینی سے آشنا فرما، اس نور کی کرن سے ہمارے دلوں کو تابانی بخش، حسینی روح سے ہمیں زندہ رکھ، اپنی معرفت سے ہمارے دلوں کو روشن کر، ہمارے دلوں کو اپنی محبت کا مرکز بنادے، ہمارے دلوں کو دامن علی اور اولاد علی سے کوتاہ نہ کر، قلب مقدس امام زمان کو ہم سب سے راضی فرما۔

۶ عاشور کے سانحے کا تجزیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین باریء الخلائق اجمعین ، والصلوۃ والسلام علی عبد اللہ و رسولہ و حبیبہ و صفیہ و حافظ سرہ مبلغ رسالاتہ، سیدنا و نبینا ومولانا ابی القاسم محمد و علی آلہ الطیبین الطاھرین المعصومین۔

عاشور کا حادثہ اس دنیا کے بہت سے حقائق کی طرح ہے جو اپنے زمانے میں صحیح طور پر پہچان میں نہیں آتے بلکہ فلاسفۂ تاریخ تو اس حد تک دعوی کرتے ہیں کہ کسی تاریخی حادثہ کا بھی صحیح صحیح اندازہ خود اس کے زمانے میں نہیں ہو پاتا۔ حادثہ کے رونما ہونے کے بعد جب کافی وقت گزر جائے اور اس سے متعلق تمام رد عمل اور واقعات سامنے آجائیں تب وہ حادثہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی بات شخصیتوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ بڑی بڑی شخصیتیں غالبًا اپنے زمانے میں اپنی ہستی کے شایان شان بلندی نہیں پاتیں۔ ان کی موت کے بعد رفتہ رفتہ ان کی شناخت بہتر طور پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی موت کے دسیوں سال بعد رفتہ رفتہ شناخت پاتے ہیں اور عموماً یوں ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے زمانے میں بہت نمایاں ہوتے ہیں وہ ان کی موت کے بعد فراموش کر دیئے جاتے ہیں اور بہت سے لوگ جو اپنے زمانے میں اتنے

نمایاں نہیں ہوتے لیکن ان کے مرنے کے بعد بتدریج ان کی شخصیت وسعت پیدا کرتی ہے اور بہتر طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

اگر ہم دو عالموں پر نظر کریں جو ایک ہی وقت میں زندگی گزار رہے ہیں چاہے ان میں سے ایک کی علمی شہرت دوسرے بزرگ کی شہرت کا دسواں حصہ ہی ہو، بعد میں تاریخ سے روشن ہوتا ہے کہ یہی جو دوسرے بزرگ سے چھوٹے نظر آتے تھے سے بڑے عالم ہیں۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ ہم خود حضرت علیؑ کی مثال لیں اور خود انہی کی زبان سے۔

حضرت نے ضربت کھانے اور شہادت پانے کے درمیان زندگی کے آخری چوالیس پینتالیس گھنٹے کے عرصے میں جو کلمات فرمائے ہیں نہج البلاغہ میں ان میں سے دو تین جملے ایسے موجود ہیں جن کا مطلب بہت عجیب ہے۔ آپ فرماتے ہیں: "غداً ترون ایامی تنی۔ و یکشف لکم سرائری ۔" تمہیں کل میری شناخت ہوگی یعنی تم نے مجھے آج نہیں پہچانا۔ میرے زمانے نے مجھے آج نہیں پہچانا۔ وہ مجھے آئندہ پہچانے گا۔ "و یکشف لکم سرائری" جن چھپی ہوئی باتوں کو جن بھیدوں کو آج آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اس خزانے کی طرح جو زمیں میں دفن ہے۔ میری ہستی کی مخفی باتیں تمہیں کل معلوم ہوں گی اور یہی ہوا۔ لوگوں نے حضرت علیؑ کو ان کے زمانے کے بعد انکے زمانے سے بہتر طور پر پہچانا۔ حضرت علیؑ کو ان کے زمانے میں کس نے پہچانا؟ بہت تھوڑے سے آدمیوں نے۔ ان لوگوں کی تعداد جو حضرت علیؑ کو ان کے زمانے میں واقعی پہچانتے تھے شاید انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اپنے کلمات کے متعلق جو حجتہ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا یہ تھا (دیکھئے کتنی بڑی باتیں ہیں!): "نضر(نصر) اللہ عبداً سمع مقالتی

فوعاها و بلغها من لم یسمعها فرب حامل فقه غیر فقیه و رب حامل فقه الی من هوا فقه منه۔" خدا اس کا چہرہ مبارک کرے (خدا اس کا دوست ہو) جو میری بات سنے اور یاد کرے اور لکھ لے اور ان لوگوں تک جنہوں نے میری بات نہیں سنی ہے، ان لوگوں تک جو میرے زمانے میں ہیں لیکن یہاں موجود نہیں ہیں یا ان لوگوں تک جو میرے بعد آئیں گے پہنچادے۔ یعنی تم جو میری بات سن رہے ہو یاد رکھو اور دوسروں تک پہنچاؤ۔ !" فرب حامل فقه غیر فقیه۔ "بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس حکمت اور حقیقت ہے حالانکہ وہ خود اس حقیقت کے اہل نہیں ہیں یعنی اس حقیقت کی گہرائی اور معنی نہیں سمجھتے ہیں۔ "و رب حامل فقه الی من هوا فقه منه" اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو فقہ کو، حکمت کو، حقیقت کو اٹھائے پھرتے ہیں، اس کی حفاظت کرتے ہیں اور بعد میں ان لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ دانا ہوتے ہیں۔

اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں حفظ کرو اور دوسروں تک پہنچاؤ! تم میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو میری بات کا عمق درک نہیں کرتے لیکن دوسرا سنتا ہے، سمجھ لیتا ہے۔ تم تو صرف نقل کرنے والے ہو، نقل کرتے ہو اور پھر تم میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں کہ جو کچھ سمجھتے ہیں لیکن وہ شخص جس نے تم بعد میں نقل کروگے ہوسکتا ہے تم سے بہتر سمجھے گا۔ مطلب یہ ہے کہ میری باتیں آئندہ نسلوں تک پہنچانا جو میری باتوں کو تم سے بہتر سمجھیں گے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: آئندہ نسل مجھے بہتر طور پر پہچانے گی۔ پیغمبرؐ نے بھی فرمایا ہے کہ آنے والے زمانے میں لوگ موجودہ لوگوں سے بہتر طور پر میری باتوں کو درک کریں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کی قدر و قیمت اس کے زمانے میں جیسی درک کرنی چاہئے نہیں کی جاتی۔ زمانہ گزر جائے پھر آنے والے رفتہ رفتہ ایک شخص، کتاب یا کسی شخص

کی بات یا کسی کے عمل کی قدر و قیمت بہتر طور پر سمجھ لیتے ہیں۔

اقبال کا ایک شعر ہے، گویا مولا علیؑ کے جملے کا ترجمہ ہے۔ حضرت فرماتے ہیں: "غداً تعرفوننی" تم مجھے کل پہچانو گے۔ (جس دن دنیا سے جاتے ہیں اسے آج کہتے ہیں)، تم میری موت کے بعد مجھے پہچانو گے۔ اقبال کہتا ہے: "اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد" شاعر سے مراد ہر وہ آدمی نہیں ہے جو چند کلمات کہہ دیتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ شاعر ہے جو کوئی پیام رکھتا ہے جیسے خود اقبال جو ایسا شاعر ہے کہ فکر رکھتا ہے، سوچ رکھتا ہے، پیام رکھتا ہے، یا مولوی اور حافظ ایسے شاعر ہیں جو فکر اور پیام رکھتے ہیں اگرچہ ان میں سے بعض کا پیام پانچ سو سال کے بعد بھی لوگ اب تک صحیح نہیں سمجھ پا رہے ہیں جیسے حافظ جس کا مطلب اب بھی لوگ لکھتے ہیں تو ادھر ادھر کی ہزار قسم کی باتیں لکھتے ہیں لیکن وہ پیام جو حافظ دیتا ہے ہاتھ نہیں آتا۔ "اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد" بہت سے مفکر مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں یعنی اس قسم کے لوگ ابھی اس کے اپنے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے ہیں۔

جبران خلیل جبران عربی زبان کا اعلیٰ درجے کا مصنف ہے لیکن وہ عیسائی عرب ہے جو لبنان میں پیدا ہوا ہے اور اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت امریکہ میں ہوئی ہے۔ وہ عربی اور انگریزی لکھتا ہے اور مصور بھی ہے۔ وہ خاص طور پر عربی کا درجہ اول کا شیریں قلم مصنف ہے حالانکہ عیسائی ہے، حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے چاہنے والوں میں سے ہے۔ عیسائی عربوں میں حضرت علیؑ کے عاشق کئی افراد ہیں۔ ایک میکائیل نعیمہ ہے۔ ایک اور جارج جرداق ہے جس نے چند سال پہلے ایک کتاب علی ابن ابی طالب "صوت العدالته الانسانیه" کے نام سے لکھی ہے جو پہلے پہل ایک جلد میں تھی پھر خود اسی نے اسے تفصیل دی اور وہ پانچ چھ جلدوں میں چھپی۔ یہ بہترین کتاب ہے جو جناب امیرؑ کے متعلق لکھی گئی ہے۔

جبران خلیل کہتا ہے میں نہیں جانتا کہ کیا راز ہے کہ کچھ لوگ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں اور حضرت علیؑ انہیں لوگوں میں سے ہیں جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ حضرت علیؑ اپنے زمانے کے لئے بہت زیادہ تھے۔ وہ زمانہ حضرت علی کا زمانہ نہیں تھا۔ لیکن بہتر حقیقت وہی ہے جو خود حضرت علیؑ نے بیان فرمائی ہے کہ درحقیقت اس قسم کے لوگ جس زمانے میں بھی پیدا ہوں اپنے وقت سے پہلے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت علیؑ اگر آج پیدا ہوتے تو بھی اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہوتے یعنی اتنے بڑے ہیں کہ ان کا زمانہ جو بھی زمانہ ہو گنجائش ہی نہیں رکھتا کہ انہیں پہچان سکے یا پہچان کروا سکے ان کا مزید تعارف کروا سکے۔ جب مدتیں گزر جاتی ہیں تب وہ اپنی موت کے بعد دوبارہ دریافت ہوتے اور پہچانے جاتے ہیں۔ آج کل کے الفاظ میں ان کی نئی ولادت ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس موضوع سے متعلق مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ انسانوں کے تمام طبقوں میں یہی صورت حال ہے۔ یہی حافظ جس کی مثال میں نے پیش کی کیا اپنے زمانے میں یہی شہرت رکھتا تھا جو آج ہمارے زمانے میں رکھتا ہے؟ نہیں! اس کے زمانے میں تو کسی نے اس کا دیوان بھی جمع نہیں کیا تھا۔ اسے خود بھی شونکہ دل میں عرفانی روح رکھتے تھے اپنے صوفیانہ خیالات کی خاطر لوگ اس سے کہتے بھی رہتے تھے، اپنا دیوان جمع کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

حافظ ایک عالم شخص ہے یعنی پہلے عالم ہے پھر شاعر اور یہی اس میں سعدی یا فردوسی میں فرق ہے۔ یہ لوگ شاعر ہیں اور انہوں نے تیس چالیس ہزار بیت کہے ہیں۔ ان کا کام شاعری تھا۔ حافظ کا کام شاعری نہیں تھا وہ ایک مرد عالم، مدرس اور محقق تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے جس دوست نے اس کا دیوان جمع کیا ان خاص خاص کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے جو وہ پڑھا کرتا

تھا۔ وہ قرآن کا مفسر اور حافظ تھا، اس نے قرآن کی تفسیر بیان کی ہے۔ یہ اس کا کام تھا۔ وہ خود بھی ایک مقام پر کہتا ہے:

"زحافظان جہاں کس چو بندہ جمع نہ کرد
لطائف حکمی با نکات قرآنی"

دوسری جگہ کہتا ہے:

"ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ
بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری"

ایک اور مقام پر کہتا ہے:

"عشقت رسد بہ فریاد گر خود بہ سان حافظ
قرآن زبر بخوانی با چاردہ روایت"

یعنی نہ صرف قرآن سے واقف تھا اور اسے حفظ کیا تھا بلکہ اسے ساتوں قسم کی قرأتوں سے پڑھتا تھا اور اس طرح حفظ کر چکا تھا کہ اس آیت کی بندے نے یوں قرأت کی ہے اور لوگوں نے اس طرح قرأت کی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ملا صدرائے شیرازی جو آج نئے سرے سے پہچانے جا رہے ہیں جبکہ ان کی موت کو تقریباً تین سو پچاس سال گزر چکے ہیں (ان کی وفات ۱۰۵۰ ہجری میں ہوئی تھی)(۱) ان کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد تک ان کی کتابیں علمی اداروں میں نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کے صرف تھوڑے سے شاگرد تھے۔ رفتہ رفتہ جو حکماء ان

۱۔ جبکہ اب اس سے زیادہ برس ہو چکے ہیں

کے بعد آتے رہے انہوں نے ان کے خیالات کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا اور پھر ان کے خیالات بتدریج بو علی جیسوں کے خیالات و افکار کو پیچھے چھوڑ گئے۔

مغربی دنیا بھی ابھی نئی نئی اس شخص کے خیالات سے آشنا ہو رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت بڑے آدمی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دور میں کوئی ایسی لہر یا ایسا ہنگامہ پیدا نہیں کرتے جو ان کے شایان شان ہو لیکن آنے والے زمانوں میں دھیرے دھیرے اس خزانے کی طرح باہر آتے اور پہچانے جاتے ہیں جو زمیں سے کھود کر نکالا جاتا ہے۔

دوسری مثال سید جمال الدین اسد آبادی کی ہے جن کے بارے میں دنیا میں کم سے کم فی ہفتہ ایک مقالہ لکھا جاتا ہے۔ مسلمان ممالک میں بھی ان پر فخر کرتے ہیں۔ ایرانی کہتے ہیں سید جمال ہمارے ہیں۔ افغانی کہتے ہیں ہمارے ہیں۔ ترک کہتے ہیں ہمارے ہیں۔ کیوں کہ ان کا انتقال ترکی میں ہوا ہے۔ آخر کار افغانی کامیاب ہوگئے وہ گئے اور ترکی سے سید جمال کی ہڈیاں افغانستان میں لے آئے حالانکہ سید جمال اپنے آپ کو نہ ایران سے مخصوص کرتے تھے، نہ افغانستان سے، نہ ترکی سے، نہ عرب سے (البتہ بظاہر وہ ایرانی تھے)، نہ مصر سے اور نہ کسی اور مقام سے۔

مصری فخر کرتے ہیں کہ ہاں سید جمال ہمارے ملک میں آئے تھے اور لوگوں نے ان کی قدر شناسی کی تھی۔ یہیں محمد عبدہ جیسے علماء ان کی طرف مائل ہوئے تھے اور یہی مقام تھا جہاں وہ ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کر سکے اور دراصل سید جمال کو بلندی اور اوج یہیں نصیب ہوا۔ اس لئے ہم دوسروں کے مقابلے میں سید جمال سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن وہ اپنے زمانے میں جہاں جہاں جاتے تھے لوگ انہیں مسترد کر دیتے تھے۔ خود ہمارے ایران میں جب وہ آئے تھے تو انہیں کسی بری حالت سے نکالا گیا تھا۔ وہ مدتوں حضرت عبد العظیم میں پناہ گزیں رہے۔ جاڑوں کی سخت سردی میں

جب بہت زیادہ برف گر رہی تھی لوگ دوڑ پڑے اور انہوں نے انہیں پناہ گاہ سے نکال باہر کیا خچر پر بٹھا دیا، ان کے دادا امام زین العابدینؑ کی طرح ان کے پاؤں خچر کے پیٹ سے باندھ دیئے اور اس سخت ٹھنڈی ہوا میں انہیں مغربی ایران (ہمدان اور کرمان شاہ) کے راستے سے ملک سے نکال دیا۔ کسی ایک آدمی نے بھی تو کچھ نہیں کہا۔

اب ہر شخص فخر کرتا ہے کہ میں نے سید جمال کے بارے میں ایک مقالہ پڑھا ہے۔ سید جمال کو ان کے زمانے میں نہیں پہچانا گیا البتہ مصر میں کچھ دانشور ان کے گرد جمع ہو گئے تھے لیکن انہیں انگریزوں نے ملک بدر کر دیا۔ وہ مدتوں ہندوستان اور نجف میں رہے۔ اس شخص کی علمی زندگی کے ابتدائی چار سال دراصل نجف میں گزرے ہیں۔ سید جمال کی تعلیم اسلامی تعلیم ہے۔ (اور اس کی یہی اہمیت ہے) یعنی ان کی اعلی تعلیمات اسلام کی اعلی تعلیمات ہیں۔ نجف میں وہ استاد الفقہا شیخ مرتضی انصاری کے درس میں شریک رہے جو زہد، تقوی، علم اور تحقیق میں غیر معمولی آدمی تھے اور انہوں نے اخلاق، فلسفہ اور عرفان ایک اور بزرگ آخوند ملا حسین قلی ہمدانی سے پڑھا ہے۔ وہ اصل میں اس دائرے کو جو اس وقت سلطنت عثمانی سے تعلق رکھتا تھا برداشت نہیں کر پاتے تھے اس لئے ان کے استاد ان سے کہتے تھے کہ بہتر یہ ہے کہ تم ہجرت کر جاؤ اور تم جو نظریات رکھتے ہو ان کو پروان چڑھاؤ۔

اب جو ہم غور کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں جو پے در پے تحریکیں پیدا ہوئیں وہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ (اس بات کے بعض حصے ابھی ٹھیک ٹھیک مکمل نہیں ہو پائے ہیں) یعنی انہوں نے جو تخم لگائے تھے ان میں سے ایک بھی ان کے زمانے میں بار آور نہیں ہوا البتہ ان کے مرنے کے بعد سبھی میں پھل آگئے۔ ان کے بعد جو تحریکیں مصر میں چلیں، جو تحریکیں ہندوستان میں چلیں، ایران میں مشروطیت کی تحریک بلکہ تمباکو کی تحریک بھی انہیں کی کوششوں کے ثمر

ہیں۔ ان کے حالات میں جو باتیں نہیں لکھی گئیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ عراق کی آزادی کی تحریک جو مشروطیت کے بعد شروع ہوئی تھی انہیں کی مرہوں منت ہے۔ جب ہم تاریخ سے پردہ اٹھاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے جو لوگ اس تحریک کی رہبری کرتے رہے ہیں وہ سید جمال کے دوست تھے۔ یہ وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ بہت بڑے آدمی اپنے زمانے میں چاہے جتنے بھی پہچانے جائیں پہچانے نہیں جاتے۔ بعد کے زمانوں میں بہتر طور پر ان کی شناخت ہوتی ہے اور ان کی قدر و قیمت کا بہتر اندازہ لگایا جاتا ہے۔

حادثات اور واقعات کا بھی یہی طور ہے۔ حادثات اور واقعات کے حدود کی ان کے زمانے میں صحیح صحیح تشخیص نہیں ہوپاتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک حادثہ چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن کچھ مدت کے بعد رفتہ رفتہ اس حادثے کی وسعت، گہرائی تہہ، عظمت اور اہمیت کی بہتر طور پر شناخت ہوتی ہے۔ عاشور کا حادثہ بھی ایسا ہی حادثہ ہے اس لحاظ سے کہ ایک شخص مر جاتا ہے اور اپنے مرنے کے بعد پہچانا جاتا ہے یا اس کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ برسوں کے بعد اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو پاتا ہے۔ کوئی سماجی حادثہ بھی رونما ہوتا ہے بعد میں اس کی اصلیت کا پتہ لگتا ہے اور اس کی قدر و قیمت اور اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ بعض حادثات پر ہزار سال گزرنے کی ضرورت ہوتی ہے تب جاکر ان کی صحیح صحیح اور اصلی و واقعی ماہیت پہچان میں آتی ہے۔ عاشور کا حادثہ اسی قسم کے حادثات میں سے ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے ایک جملہ فرمایا ہے۔ اگر چہ میں نے یہ جملہ خود اکثر دہرایا ہے لیکن اس کے معنی اور گہرائی پر میں نے بہت غور نہیں کیا تھا۔ یہ جملہ اس مشہور وصیت نامے میں موجود ہے جو امام حسین علیہ السلام اپنے بھائی محمد ابن حنفیہ کو لکھے ہیں۔ جناب محمد بن حنفیہ بیمار تھے۔ ان کا ہاتھ شل ہوگیا تھا اس لئے جہاد

میں شرکت سے معذور تھے۔ بظاہر جس وقت امام مدینہ سے نکلنا چاہتے تھے اس وقت آپ نے یہ وصیت نامہ لکھا تھا اور محمد ابن حنفیہ کو دے دیا تھا۔ البتہ یہ وصیت نامہ ان معنوں میں وصیت نامہ نہیں ہے جن میں ہم کہتے ہیں بلکہ سفارش نامہ کے معنوں میں ہے۔ ان معنوں میں ہے کہ آپ کا طور طریق بتاتا ہے کہ آپ کی روانگی اور قیام کیا ہے اور ان کا ہدف کیا ہے۔ ابتدا میں آپ نے فرمایا ہے: "انی لم اخرج اشراًولا بطراًولا مفسداًولا ظالماً و انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی۔" آپ نے ان اتہامات کی تردید کی جو آپ جانتے تھے کہ بعد میں ان پر لگائے جائیں گے۔ لوگ کہیں گے کہ حسینؑ کا دل مقام و منصب چاہتا تھا۔ ان کا دل دنیا کی نعمتیں چاہتا تھا۔ حسینؑ ایک فسادی اور تخریب کار انسان تھے۔ حسینؑ ایک ظالم شخص تھے۔ دنیا جان لے کہ حسین علیہ السلام کا مقصد امت کی درستی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں ایک اصلاح کرنے والا ہوں۔ پھر فرمایا: "ارید ان امر بالمعروف والنهی عن المنکر و اسیر بسیرة جدی وابی" میرا ہدف ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور دوسرا یہ کہ میں سیر کروں اپنے نانا اور والد کی سیرۃ کو اپنی سیرت بناؤں۔ اس دوسرے جملے کی زیادہ تشریح ہونا چاہئے۔ اس تاریخ میں اس جملے کا خاص مفہوم رہا ہے۔ امام حسینؑ نے یہ فرمانے کے بعد کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں یہ جملہ کیوں بڑھایا کہ میں اپنے نانا اور والد کی سیرت کے مطابق سیر کرنا چاہتا ہوں۔؟ ممکن ہے کوئی کہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہہ دینا ہی کافی تھا۔ کیا نانا اور والد کی سیرت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے الگ کوئی چیز تھی؟ جواب یہ ہے کہ اتفاق سے، ہاں! میں پہلے ایک تاریخ کی طرف اشارہ کرتا ہوں بعد میں اس بات کی تشریح کروں گا۔

ہم جانتے ہیں کہ جس وقت حضرت عمر کو ضربت لگی اور خود یہ احساس کر

لیا کہ جانے کا وقت آپہنچا ہے تو اپنے بعد کے لئے حقیقت میں ایک بدعت کی داغ بیل ڈال دی یعنی ایسا کام کیا جو نہ پیغمبرؐ نے کیا تھا نہ حضرت ابوبکر نے، نہ ہم شیعوں کے عقیدے کے مطابق جس پر اہل تسنن کی مستند کتابیں بھی گواہ ہیں (اب جو عملاً نہیں مانتے تو بات دوسری ہے) خلافت کو ایک معین شخص یعنی حضرت علیؑ کے لئے چھوڑا جن کا پیغمبر خداؐ نے اپنے زمانے میں تعارف کرادیا اور تعین کر دیا تھا۔ اور نہ اس کے مطابق ہی عمل کیا جو آج اہل تسنن کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے کسی کو مقرر نہیں کیا تھا بلکہ امت خود ہی کسی کا انتخاب کر لے اور پیغمبرؐ نے یہ کام امت کے انتخاب اور امت کے مشورے کے لئے چھوڑ دیا تھا اور یوں نہ حضرت عمر نے وہ کام کیا جو حضرت ابوبکر نے کیا تھا اس لئے کہ جس وقت حضرت ابوبکر مرنے والے تھے تو انہوں نے اپنے بعد کے لئے ایک شخص کا تعین کر دیا جو خود حضرت عمر تھے۔

حضرت ابوبکر کا کام نہ شیعوں کے عقیدے کے مطابق ہے نہ اہل تسنن کے عقیدے کے مطابق۔ حضرت عمر کا کام نہ شیعوں کے عقیدے سے مطابقت رکھتا ہے نہ اہل تسنن کے عقیدے سے اور نہ حضرت ابوبکر کے کام سے میل کھاتا ہے۔ انہوں نے ایک نیا ہی کام کر ڈالا اور وہ یہ تھا کہ درجہ اول کے صحابہ میں سے چھ شخصوں پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ نامزد کردی لیکن یہ شوریٰ ڈیمو کریسی (جمہوریہ) کی صورت کی نہیں تھی بلکہ اریسٹوکریسی (اشرافیہ) کی طرح کی تھی۔ جس کے اشراف کو بھی میں خود ہی نامزد کرتا ہوں۔ حضرت علیؑ (چونکہ حضرت علیؑ نہیں ہوسکتے تھے اس لئے انہیں ایک طرف ہٹا دیا)، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد ابن وقاص اور عبد الرحمٰن بن عوف۔ اس وقت پیغمبرؐ کے صحابہ میں ان سے بڑی شخصیت کے لوگ نہیں تھے۔ بعد میں خود کہا۔ اس شوریٰ کے ارکان کی تعداد جفت ہے۔ (عموماً آپ دیکھتے ہیں کہ شوریٰ کے ارکان کی تعداد طاق رکھتے ہیں تاکہ رائے شماری کے وقت جس طرف کی

تعداد میں نصف تعداد سے ایک زیادہ ہو وہ جیت جائے) اگر تین اشخاص ایک رائے پر قائم ہو جائیں اور تین دوسری پر تو جس طرف حضرت عثمان ہوں وہ جماعت جیتنے والی ہوگی۔ خوب! اگر شوریٰ ہی ہے تو پھر لوگوں کا فرض کیوں مقرر کرتے ہو؟ مجلس شوریٰ اس طریقے سے ترتیب دی گئی تھی کہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ آخر کار خلافت حضرت عثمان کو مل جائے گی کیوں کہ حضرت علیؑ کی قطعی طور پر ایک کے سوا تین رائیں نہیں تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ حضرت علیؑ کے ساتھ تین اشخاص ہو جائیں جن میں یقیناً حضرت عثمان شامل نہیں ہوں گے کیوں کہ حضرت عثمان ان کے رقیب اور حریف تھے۔ پس حضرت عثمان یقینی طور پر جیتنے والے ہیں۔ اس وقت حضرت عمر کے خیال میں حضرت علیؑ کے ساتھ یا دو نفر تھے یعنی خود اور زبیر (کیوں کہ زبیر اس وقت حضرت علیؑ کے ساتھ تھے) یا اگر عبدالرحمٰن بن عوف حضرت علیؑ کا ساتھ دیتے تو حضرت علیؑ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تین آدمی ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے جو حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: "فصغی رجل منهم لزقنه ومال الاخرلصهره" (نہج البلاغہ۔ خطبۂ شقشقیہ) فلاں شخص اس دشمنی کے باعث جو وہ مجھ سے رکھتا تھا حق سے پھر گیا اور فلاں دوسرے شخص نے اپنی نسل، رشتہ داری اور ازدواجی تعلق کی وجہ سے اپنی رائے اس طرف دی۔ خود حضرت عمر بھی یہ باتیں پہلے سے دیکھ رہے تھے۔ بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ زبیر نے کہا میں نے اپنی رائے حضرت علیؑ کو دی۔ طلحہ نے کہا میں نے اپنی رائے حضرت عثمان کو دی۔ سعد بھی ایک طرف ہٹ گیا۔ اب بات عبد الرحمٰن بن عوف کے ہاتھ آگئی۔ وہ جس طرف رائے دیتا تھا وہی منتخب ہوا جاتا تھا۔ عبد الرحمٰن اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھنا چاہتا تھا۔ حضرت عمر نے کہا تھا یہ لوگ تین دن تک ایک کمرے میں بند رہیں اور بیٹھے رہیں اور ایک بات پر اتفاق کریں۔ نماز اور حوائج ضروری کے علاوہ اور کسی وجہ

سے باہر نہ آئیں۔(یہ بھی ایک فریب تھا جو حضرت عمر نے کیا) پھر کچھ ہتھیار بند لوگ بھیجو کہ اگر یہ کوئی فیصلہ نہ کریں تو تمہیں ان کے مار ڈالنے کا حق ہے۔ نہایت عجیب بات ہے! یہ لوگ تین دن کے بعد باہر آئے۔ سب لوگ منتظر ہیں کہ دیکھیں کیا نتیجہ نکلا۔ بنی امیہ حضرت عثمان کی طرف تھے اور بنی ہاشم اور پیغمبرؐ کے نیک صحابی جیسے جناب ابوذرؓ اور جناب عمارؓ حضرت علیؑ کے طرفدار تھے۔ ان لوگوں نے شورو غل مچایا تاکہ حضرت علیؑ کے حق میں طے ہو جائے لیکن حضرت اس سے قبل خود ہی خاص طور پر لوگوں سے کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں اس بات کا انجام کیا ہے۔ لیکن میں اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتا اور نہ میں خود کنارہ کشی کروں گا جس سے لوگ یہ کہیں کہ وہ خود نہیں چاہتے تھے۔ اگر وہ آجاتے تو سبھی میں یقیناً اتفاق رائے ہو جاتا۔

عبدالرحمٰن پہلے حضرت علیؑ کے پاس آیا اور بولا۔ اے علی! کیا تم میری بیعت کرنے کو آمادہ ہو اس شرط پر کہ خلافت کا عہدہ قبول کرو اور کتاب خدا (قرآن)، سنت پیغمبرؐ اور سیرت شیخین پر عمل کرو؟ یعنی کتاب اللہ اور سنت کے علاوہ ایک بات کا اور اضافہ ہو گیا۔ سیرۃ یعنی روش، تمہاری حکومت اور رہبری کی روش وہی شیخین (حضرت ابوبکر اور حضرت عمر) کی روش ہو۔ دیکھئے حضرت علیؑ کس طرح یہاں تاریخ کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اس وقت ہر شخص از خود حضرت علیؑ سے کہتا ہے۔ یہ خلافت لے لینے کا وقت ہے۔ تاریخ کا دوراہا ہے۔ یا خلافت بنی امیہ لے لیں یا تم لے لو۔ مصلحت آمیز جھوٹ بول دو لیکن حضرت علیؑ نے کہا میں یہ بات ماننے کو تیار ہوں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر اور اس طریقے پر جو میں نے خود منتخب کیا ہے، عمل کروں۔

عبدالرحمٰن بن عوف حضرت عثمان کے پاس گیا اور وہی سوال دوہرایا۔

حضرت عثمان نے کہا میں تیار ہوں، جبکہ انہوں نے نہ کتاب اللہ پر عمل کیا، نہ سنت رسول اللہ پر اور نہ شیخین کے سیرت پر۔ یہ بات تین بار دہرائی گئی۔ عبدالرحمٰن جانتا تھا کہ حضرت علیؑ اپنی بات سے نہیں پھریں گے اور نہ اس وقت شیخین کی رہبری کے طریقے کی تائید کر کے پھر اپنا کہا ہوا واپس لیں گے۔ اس صورت میں حضرت علیؑ نے اپنے آپ کو خلافت پر قربان کر دیا تھا۔ تینوں بار حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ کتاب اللہ، سنت رسولؐ اللہ اور اس طریقے پر جو میں نے منتخب کیا ہے اور اپنے اجتہاد پر عمل کروں گا۔ عبدالرحمٰن نے کہا۔ تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ تم ان دونوں شخصوں کے طریقے پر عمل کرنا نہیں چاہتے۔ تم خارج ہو گئے۔ اس نے حضرت عثمان سے بیعت کر لی۔ اس طرح حضرت عثمان خلیفہ ہو گئے لیکن انہی حضرت عثمان نے نہ صرف جناب عمار اور جناب ابوذر جیسے صحابہ کو قید میں ڈالا، دیس سے نکال دیا، کوڑے لگوائے اور جناب عمارؓ کو اس قدر مارا کہ اس نیک شخص کو فتق کی بیماری پیدا ہو گئی بلکہ جب عثمان حکومت سنبھال لی تو رفتہ رفتہ عبدالرحمٰن سے بھی بے اعتنائی کرنے لگے اس حد تک کہ عبدالرحمٰن اپنی عمر کے آخری پانچ چھ سال میں حضرت عثمان سے سخت ناراض ہو گیا تھا اور کہتا تھا کہ جب میں مر جاؤں تو حضرت عثمان میرے جنازے کی نماز میں شریک نہ ہو۔

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ حضرت علیؑ نے اس قسم کا جواب کیوں دیا؟ وہ یہ کہہ دیتے کہ میں بیعت کرتا ہوں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر اور پھر یہ نہ کہتے کہ اس طریقے پر جو میں منتخب کروں گا۔ صرف دونوں خلفاء کے طریقے کو رد کر دیتے۔ کہہ دیتے کہ میرے پاس کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے سوا اور کوئی تیسری شے نہیں ہے، لیکن حضرت علیؑ نے تیسری شے مان لی البتہ اس شکل میں نہیں مانی جیسی وہ لوگ چاہتے تھے۔ یہ تیسری بات اس شکل میں جس میں حضرت

ابوبکر اور حضرت عمر عمل کرتے تھے غلط تھی لیکن اس کی ایک اور شکل وہ ہے جس شکل میں اس پر پیغمبرؐ نے عمل کیا اور حضرت علیؑ بھی چاہتے تھے کہ اس شکل میں عمل کریں۔ یہ بات رہبری کا مسئلہ تھی۔

کتاب اور سنت قانون ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اس قوم کا رہبر جو ایک مکتب کا پیرو ہے وہ پہلی چیز جس کا اسے پابند ہونا چاہئے اس مکتب کے قوانین ہیں۔ اسے ان کا احترام کرنا چاہئے۔ مکتب کے قوانین کہاں بیان ہوتے ہیں؟ کتاب اور سنت میں۔ لیکن کتاب اور سنت قانون ہے جس کے جاری ہونے اور عمل میں لانے کا ایک طریقہ درکار ہوتا ہے۔ لوگوں کو کتاب اور سنت کی بنیاد پر چلانے کے طریقے کو "سیرۃ" کہتے ہیں۔ "سیرۃ" کا لفظ عربی زبان کے علمائے ادب کی اصطلاح میں فعلہ کے وزن پر ہے۔ عربی زبان میں ایک فَعلہ (ف پر زبر) ہے اور ایک فِعلہ (ف کی زیر) ہے۔ ابن مالک کے الفیہ میں لکھا ہے: "و فعلة لمرة كجلسه و فعلة لهيئته كجلسه." عرب کے لئے جب ایک بات فَعلہ (ف پر زبر) کے وزن پر کہی گئی یعنی کسی عمل کو ایک بار انجام دینا اور جب فِعلہ (ف کی زیر) کے وزن پر کہی گئی یعنی عمل کو کسی خاص طریقے سے انجام دینا یعنی لفظ فعلہ میں ایک خاص طریقہ پوشیدہ ہے۔ لفظ سیرہ کا مادہ سیر ہے سیر یعنی حرکت لیکن سیرہ یعنی خاص وضع کی حرکت، خاص قاعدہ کی حرکت۔

رہبر وہ شخص ہوتا ہے جو لوگوں کو اپنے پیچھے حرکت میں لاتا ہے۔ اب ممکن ہے کہ کوئی ایسا رہبر بھی پیدا ہو جائے جو ٹھہرے ہوئے یعنی ساکن لوگوں کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ وہ پھر رہبر نہیں ہو سکتا۔ تمام رہبر قوموں کو حرکت دیتے ہیں لیکن بات سفر کے طور طریقے، مشکل اور مصلحت کی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ خدا کی طرف سے مختلف حیثیتیں اور مقامات رکھتے ہیں (اس بارے میں مزید مطالعے کے لئے استاد

شہید کی کتاب "ولائها و و لایتها" دیکھئے) وہ نبی اور رسول ہیں یعنی خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ پیغمبرؐ اس اعتبار سے کہ خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں پیغام رساں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔ یعنی صرف پیغام رساں ہیں۔ آپ کے قلب پر قرآنی آیت نازل ہوتی ہے اور آپ لوگوں کے سامنے تلاوت فرماتے ہیں: "هوا الذی بعث فی الا میین رسولا منهم یتلوا علیهم آیاته" (سورۂ جمعہ، آیت ۲) پیغمبرؐ کی ایک حیثیت مبلغ کی اور ایک معلم کی حیثیت ہے۔ وہ خدا کے احکام بندوں کو پہنچاتا ہے اور انہیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے جو وہ نہیں جانتے۔ امت کے فقیہہ اور مبلغ پیغمبر کی اس حیثیت کے وارث ہوتے ہیں یعنی اگر فقیہ خود کو پیغمبرؐ کا جانشین سمجھتا ہے تو صرف اسی ایک خصوصیت میں۔ وہ کہتا ہے پیغمبرؐ خدا کے پاس سے احکام لائے ہیں اور میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا ہیں تاکہ ان لوگوں کے سامنے بیان کردوں جو کچھ نہیں جانتے۔ پیغمبر کی دوسری شان کہ وہ شان الٰہی بھی ہے اور خدا ہی معین کرتا ہے یہ ہے: لوگوں میں حقوق کے مسئلوں میں باہم اختلاف پیدا ہو جاتا ہے یا جرم اور سزا کے مسئلوں میں لوگوں میں جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے اور فیصلہ کی نوبت آجاتی ہے تو قانون کے علاوہ بھی کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو لوگوں کا جھگڑا چکائیں یعنی اختلافات کا فیصلہ کریں۔ اس حیثیت کو قضاء کہتے ہیں جسے ہم عموماً قضاوت کہتے ہیں۔ قضا کی حیثیت یعنی قاضی ہونا سب سے زیادہ پاک و پاکیزہ حیثیت ہوتی ہے۔ اسلام کی رو سے قاضی کو فقیہ، مجتہد اور ایسا عادل بھی ہونا چاہئے جس کی عدالت اور انصاف کو سب تسلیم کرتے ہوں۔ ایک سب سے زیادہ حرام کام یہ ہے کہ انسان قضا کا پیشہ انجام دیتا ہو لیکن اس میں اس بات کی شرعی صلاحیت نہ ہو۔

پیغمبرؐ یا امامؑ نے فرمایا ہے: قضاء ایک ایسی جگہ ہے جہاں وصی بیٹھتا ہے یعنی امام یا وہ شخص جس کو امام نے مقرر کیا ہے۔ یہ بھی پیغمبرؐ کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔

پیغمبرؐ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والے ہی نہیں تھے بلکہ ایک ایسے شخص بھی تھے جن کو خدا نے یہ حق دے دیا تھا کہ وہ اختلافات اور خصومات میں قضا کے اصولوں کی رو سے لوگوں کے فیصلے کیا کریں: "فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا فى انفسهم حرجاً مما قضيت و يسلموا تسليما" (۱)

پیغمبر کی تیسری شان امت کی رہبری ہے۔ پیغمبر جہاں پیغمبر ہیں، امام بھی ہیں۔ امام پیغمبر نہیں ہیں، البتہ پیغمبر امام ہیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبری ہمیشہ امامت سے الگ ہوتی ہے۔ امامت یعنی رہبری اور امام یعنی رہبر۔ پیغمبروں کی جب حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے تو وہ پیغمبر بھی ہوتے ہیں اور امام بھی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں حضرت علی علیہ السلام بھی تھے۔ امت کی رہبری اور امامت کون کرتا تھا؟ خود پیغمبر اکرمؐ۔

خدا نے امام اور رہبر کو اس اعتبار سے کہ وہ امام اور رہبر ہے اختیارات دے دیئے ہیں۔ بلا تشبیہ (اور تشبیہ میں بھی کوئی حرج نہیں ہے) جس طرح بعض ملکوں میں عوام کا سردار کانگریس سے اختیارات حاصل کرتا ہے خدا نے بھی امت کی رہبری کے لئے امت کے رہبر کو بہت سے اختیارات دے دیئے ہیں۔ (کیوں کہ مختلف شرائط میں قانون جاری کرنا اور اسے عمل میں لانا ہر ایک کا کام نہیں ہوتا)۔ پھر جب پیغمبرؐ کسی کو نامزد کرنا چاہتا ہے مثلاً مکہ کی فتح کے بعد وہاں کا حاکم مقرر کرنا یا فلاں لشکر کے لئے امیر یعنی کمانڈر مقرر کرنا، تو یہ ضروری نہیں کہ جبرئیلؑ ہی کہیں کہ اے رسولؐ! آپ فلاں شخص کو نامزد کردیں۔ یہ بھی خود پیغمبرؐ کے اختیار میں ہے کہ وہ ان امتیازی اختیارات کی رو سے جو رہبر کے پاس ہوتے ہیں یہ کام بھی انجام دیں۔ البتہ یہ کام قانون کی حدود سے باہر نہ ہو۔ یہ بات بھی زیادہ تر ان حکمت عملی اور

۱۔ سورۂ نساء آیت ۶۵

مصلحتوں کی طرح ہوتی ہے جن پر فوجوں کے کمانڈر عمل کرتے ہیں کیونکہ ان کی ابتدا بھی خود انہیں سے وابستہ ہوتی ہے۔ مثلاً جس وقت اتحادی ملک مصر (اسکندریہ اور العلمین) میں دشمنوں کی فوجوں سے لڑ رہے تھے اور آئزنہاور اتحادیوں کا کمانڈر تھا ایسے ضوابط و شرائط موجود تھے جن سے اسے تجاوز نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن اس نے بہت سے نظری مسائل یا فرضیئے ایجاد کر لئے تھے جو فتح حاصل کرنے کی غرض سے ضروری تھے۔ دشمن کی بھی بالکل یہی حالت تھی۔

اب ہم دیکھیں کہ عبد الرحمٰن بن عوف کا جملہ اور اس پر حضرت علیؑ کا جواب۔ عبدالرحمٰن نے حضرت علیؑ سے کہا: آپ عہد کیجئے کہ قانون کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہوگا لیکن رہبری کا طریقہ وہی شیخین کی رہبری کا طریقہ ہوگا۔ اگر حضرت علیؑ شیخین کا طریقہ قبول کر لیتے تو اس صورت میں مثلاً حضرت عمر نے جس متعہ کو حرام کردیا تھا حالانکہ رسولؐ نے حلال رکھا تھا، حضرت علیؑ بھی یہ کہتے کہ میں بھی حرام قرار دیتا ہوں یا بیت المال کے معاملے میں جسے حضرت عمر نے رفتہ رفتہ پیغمبرؐ کے زمانے کی مساوی تقسیم سے خارج کردیا تھا اور جانب داری یا تبعیض روا رکھی تھی، حضرت علیؑ بھی یہ عہد کرتے کہ آئندہ اسی ترتیب پر عمل ہوگا اور ان بدعتوں کو بھی قبول کر لیتے جو حضرت عمر نے اپنے زمانے میں اس لحاظ سے شروع کی تھیں کہ میں رہبر ہوں اور رہبر کو یہ حق ہے کہ وہ ایسا کرے اور ویسا کرے۔ عبدالرحمٰن بن عوف یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی رہبری کے ڈھانچے میں محدود کردیں اور یہ بات حضرت علیؑ کے لئے ممکن نہیں تھی کیوں کہ اس صورت میں وہ بھی نعوذباللہ حضرت عثمان کی طرح اپنے لئے ایک طرز طے کر لیتے اور پھر جو کام چاہتے اپنے دل کے مطابق کرتے اور جو کوئی بھی اعتراض کرتا اسے مارتے پیٹتے اور اسے فتق کا بیمار بنا دیتے۔ حضرت علیؑ جو کتاب اللہ اور سنت پیغمبرؐ پر عمل کرنا

چاہتے ہیں ان دونوں اشخاص کی رہبری کا طریقہ قبول نہیں کر سکتے، اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ میں ان دونوں کی رہبری کا طریقہ قبول نہیں کرتا۔ اسی ایک لفظ کے باعث آپ عبد الرحمٰن بن عوف کی بیعت کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔

پس معلوم ہوا کہ رہبری کے طریقے کا مسئلہ کتاب و سنت کے مسئلے سے مختلف ہے۔ کتاب اور سنت تو خود قانون ہے لیکن رہبری کا طریقہ اصل قانون سے ربط نہیں رکھتا، لوگوں کی رہبری کی حالت سے مربوط ہے جو رہبر کو حاصل ہوتے ہیں اور ان فیصلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ جو رہبر کرتا ہے۔

اب امام حسینؑ کے اس جملے" ارید ان امر بالمعروف وانهی عن المنکر واسیر بسیرة جدی و ابی" کا جو انہوں نے محمد بن حنفیہ کے نام اپنے وصیت نامے میں لکھا تھا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ اس وقت دنیائے اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے قطع نظر ایک اور بھی مسئلہ موجود تھا اور وہ یہ کہ : اب سن ۶۰ ہجری ہے۔ سن ۱۱ ہجری سے اب تک پیغمبرؐ کو دنیا سے گئے ہوئے تقریباً پچاس سال ہو چکے ہیں۔ ان کے چھتیسویں اور اکتالیسویں سال کے دوران حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے رہبری کی ہے۔ اس عرصے میں رہبری پیغمبرؐ کے چلن پر پلٹ گئی تھی۔ نئی بات یہ ہوئی تھی کہ چونکہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت عثمان نے اپنے اپنے طریقے ایجاد اور رائج کردئے تھے۔ بہت سے معاملات میں حضرت علیؑ میں مطلق یہ قوت پیدا نہیں ہو سکی کہ وہ سنت پیغمبرؐ جاری کرتے۔ جب سنت پیغمبرؐ جاری کرنے کا وقت آیا خود لوگوں نے ان کے خلاف بغاوت کردی۔ آپؑ نے فرمایا کہ فلاں نماز جو تم اس شکل میں پڑھتے ہو (ماہ رمضان کی رات کی نماز جو باجماعت پڑھتے تھے) بدعت ہے۔ نہ پڑھا کرو۔ انہوں نے کہا یہ حضرت عمر کے زمانے سے تیس سال ہو گئے کہ رائج ہے اور واحضرت عمر، واحضرت عمر، حضرت عمر کی جگہ خالی ہے، حضرت عمر

کہاں ہیں جس کی سنت ختم ہو رہی ہے۔ حضرت علیؑ نے قاضی شریح کو بر طرف کرنا چاہا۔ لوگوں نے کہا تم اس شخص کو بر طرف کرنا چاہتے ہو جو بیس سال پہلے سے حضرت عمر کے زمانے سے کوفہ کا محترم قاضی رہا ہے؟ چنانچہ امت اسلام کے پچاس سال گزر چکے ہیں کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے علاوہ رہبری کا طریقہ بھی بدل چکا ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا: "اسیر بسیرة جدی و ابی" میں چاہتا ہوں کہ اپنے جد اور والد کی سیرۃ پر چلوں یعنی نہ حضرت ابوبکر کی سیرت پر، نہ حضرت عمر کی سیرت پر، نہ حضرت عثمان کی سیرت پر اور نہ کسی اور شخص کی سیرت پر۔ یہ وجہ ہے جو عاشور کے حادثے میں ہم امام حسینؑ میں ایسے جلوے دیکھتے ہیں جو نشان دیتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مسئلہ، بیعت سے انکار کا مسئلہ اور کوفیوں کی دعوت کو قبول کرنے کا مسئلہ اور دوسرے کام بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ آپ اپنے جد کی سیرت کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔

آپ نے یہ قصہ سنا ہوگا : مامون نے اصرار کیا کہ حضرت امام رضاؑ ولی عہدی قبول فرمالیں۔ حضرت قبول نہیں فرماتے تھے۔ آخر اس نے جبر کو طرح دی تو قبول کر لیا لیکن اس طریقے سے قبول کیا جو بالکل قبول نہ کرنے کے برابر تھا اور زیادہ تر مامون کی بدنامی کا سبب بنا۔ سالہا سال سے عید اور بقر عید کی نمازیں خلفاء پڑھاتے آرہے تھے۔ پیغمبرؐ عیدالفطر و عید قربان کی نماز پڑھاتے تھے۔ یہ بھی عید اور بقر عید کی نماز پڑھتے تھے لیکن نماز پڑھنے کا طریقہ دھیرے دھیرے بدل گیا تھا۔ سیرت بدل گئی تھی (بہت اچھی مثال ہے : عید کی نماز پڑھنا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے لیکن کس طریقہ سے نماز پڑھنا سیرت ہے)۔ رفتہ رفتہ خلفاء کے دربار ساسانی ایرانیوں اور رومی قیصروں کے دربار ہوگئے تھے۔ بہت پر شکوہ دربار، خلیفہ اور فوجی افسران کا لباس طرح طرح کے سنہری اور روپہلی تمغوں سے سجا ہوتا تھا۔ جب خلیفہ

نماز عید میں آنا چاہتا تھا تو خاص جلال و شکوہ کے ساتھ اور سلطنت کے کروفر کے ساتھ آتا تھا۔ آپ ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہوتا تھا جس کے گلے میں سنہری یا روپہلی گلوبند ہوتا تھا اور ہاتھ میں سنہری تلوار لئے ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے فوج بھی آتی تھی بالکل اس طرح جیسے فوجی کروفر دکھانا چاہتے تھے۔ پھر مصلے پر جاتے تھے۔ دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور واپس ہو جاتے تھے۔

مامون نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے اصرار کیا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ عید فطر کی نماز پڑھائیں۔ امامؑ نے فرمایا: میں نے تم سے پہلے ہی یہ اقرار کر لیا تھا کہ میرا صرف نام ہوگا اور میں کوئی کام نہیں کروں گا۔

نہیں آقا! میں چاہتا ہوں۔ کیا آپ نماز سے بھی انکار کر رہے ہیں۔ یہ بات لوگوں سے متعلق تو نہیں ہے جو آپ یہ فرمائیں کہ اس کام میں ظلم کا دخل ہوتا ہے۔ آپ کم سے کم یہی ایک نماز پڑھا دیجئے۔ اس مقام پر حضرت ایک جملہ فرماتے ہیں جیسا جملہ امام حسینؑ نے اور جیسا جملہ حضرت علیؑ نے حضرت عمر کے بعد بیعت کے سلسلے میں فرمایا تھا۔ میں ایک شرط پر تیار ہوں کہ میں اپنے جد اور باپ کی سیرت پر نماز پڑھاؤں گا، تمہاری سیرت پر نہیں پڑھاؤں گا۔ مامون اپنی زیرکی کے باوجود (جو وہ اپنی نظر میں رکھتا تھا) احمق ہو گیا۔ بولا بہت خوب! آپ جس سیرت پر بھی چاہیں پڑھائیے۔ وہ سوچتا تھا کہ مقصد تو یہ ہے کہ یہ کام حضرت رضاؑ کے ذمے لگا دیا جائے تاکہ لوگ کہہ سکیں کہ آخر امام رضاؑ نے عملی طور پر بھی قبول کر لیا۔

عید فطر کے دن امام رضاؑ نے اپنے ساتھ والوں سے کہا۔ معمول کا لباس پہنو۔ برہنہ پا ہو جاؤ۔ عبا کے دامن اور اپنی آستینیں چڑھا لو اور جو تسبیح میں پڑھتا رہوں تم بھی پڑھتے رہو۔ تمہاری حالت خضوع اور خشوع کی حالت ہونا چاہئے۔ ہم جیسے خدا کے سامنے جا رہے ہیں۔ تمہاری توجہ خدا کی طرف ہونا چاہئے۔ تسبیح پڑھنے

میں خدا پر دھیان جمائے رکھو۔ امامؑ نے (جو مرد حقیقت ہے، مرد خدا ہے، مرد عبادت ہے، میں نے پچھلے جلسے میں عرض کیا تھا کہ خدا کی عبادت اور محبت اسلام کا ایک بنیادی رکن ہے جس کے لئے عمر بھر جنگ کی تھی) عمامہ اس طرح باندھا جس طرح پیغمبرؐ باندھا کرتے تھے، لباس اس طرح پہنا جس طرح پیغمبرؐ پہنا کرتے تھے، ہاتھ میں عصا پیغمبرؐ کی طرح لیا ہے، برہنہ پا ہو گئے ہیں۔ ایک خضوع اور خشوع کی حالت میں جس در سے باہر آ رہے تھے وہیں سے آپ نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا: "اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر علی ماھدانا وله الشکر علی ماولانا۔" سال بیت چکے ہیں لوگوں نے اس طرح ذکر صحیح طور نہیں سنا ہے۔ جو لوگ حضرت کے ساتھ تھے انہوں نے جس وقت حضرت کا وہ خدائی حال دیکھا کہ آپ بالکل بدل چکے ہیں، اپنے آپ کو خدا کے سامنے لے جا رہے ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں خضوع اور خشوع کی حالت میں، پوری روحانیت کے ساتھ بہتے آنسوؤں کے ساتھ زور زور سے کہنے لگے: "اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر علی ماھدانا و له الشکر علی ما اولانا۔" امام بولتے جاتے تھے اور یہ لوگ دہراتے جاتے تھے یہاں تک کہ مکان کے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ آواز اونچی ہوتی جاتی تھی۔ مامون نے فوجی کمانڈروں اور قبیلوں کے سرداروں کو بھیجا کہ امام علی ابن موسی الرضا علیہ السلام کے پیچھے پیچھے جا کر عید الفطر کی نماز پڑھو۔ انہوں نے خلفاء کے عہد کی سیرت کے مطابق اپنے آپ کو سجایا اور فاخرہ لباس پہنے تھے۔ بہت عمدہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اور سنہری تلواریں کمر میں لگا کر دروازے پر کھڑے ہو گئے تھے تاکہ حضرت امام رضا علیہ السلام دنیاوی اور سلطنتی رعب اور جلال کے ساتھ باہر تشریف لائیں۔ یکایک امامؑ اس حال میں باہر تشریف لائے تو لشکریوں میں ولولہ پیدا ہو گیا، وہ بے اختیار گھوڑوں سے کود پڑے اور انہوں نے سواری چھوڑ دی۔ تاریخ لکھتی ہے کہ جیسا کہ

ہونا چاہئے تھا وہ ننگے پاؤں ہوگئے اور جن کے پاؤں میں تسمہ تھا اور فوجی چکمہ جلدی سے اتر نہیں سکتا تھا اس کے لئے ہر شخص چاقو کی تلاش میں چلا کہ جلدی سے تسمہ کاٹ کر پاؤں سے الگ کرلیں۔ یہ لوگ بھی حضرت کے پیچھے پیچھے چلے۔ یکایک اللہ اکبر کی صدائے دلکش سے شہر مرو گونج اٹھا۔ لوگ کوٹھوں کی چھتوں پر دوڑ کر پہنچے اور رفتہ رفتہ سب مل گئے۔

لوگوں میں بھی روحانیت جوش مار رہی تھی۔ حضرت فرماتے تھے اللہ اکبر۔ پورا شہر ایک زبان ہوکر چلاتا تھا اللہ اکبر۔ ابھی شہر پناہ سے باہر نہیں گئے تھے کہ جاسوسوں نے مامون کو اطلاع دی کہ اگر یہ معاملہ زیادہ بڑھا تو تو سلطنت کا مالک نہیں رہیگا۔ سپاہی دوڑ پڑے کہ نہیں نہیں آقا! ہم آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہے۔ اب ہماری درخواست ہے کہ واپس چلئے۔ یہ ہیں روش کے معنی۔ مامون بھی اس معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرتا تھا۔ عید فطر کی نماز کتاب اللہ کا ایک حصہ ہے لیکن اسی نماز کو چلن ملا تھا جو کھوکھلی اور بے حقیقت ہو چکی تھی۔ امام رضاؑ نے فرمایا میں نماز پڑھانے کو تیار ہوں لیکن تیرے باپ دادا کے طریقے سے نہیں اپنے باپ دادا کے طریقے سے۔

امام حسینؑ کے زمانے میں رہبری کی روش بہت بدل چکی تھی۔ زمین سے آسمان تک تبدیلی آچکی تھی۔ ایک خط جو دوسرے خط کے متوازی بڑھنا چاہتا ہے جب بھی موازات سے ذرا سا بھی باہر ہو جائے گا تو شروع شروع میں تو فاصلہ تھوڑا رکھے گا لیکن جیسے جیسے آگے بڑھتا جائے گا دوسرے خط سے اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا جائے گا۔ ساٹھ سال پہلے پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں جب لوگ دنیائے اسلام کا مرکز رکھنا چاہتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں؟ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے زمانے میں بھی یہی حال تھا، لیکن حضرت عثمان کے زمانے میں بدل گیا اور دوسری شکل پیدا ہوگئی۔ اس سے پہلے

مسلمانوں کے خلیفہ سے اختلاف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے میں نہیں تھا بلکہ خلیفہ کی روش میں تھا۔ حضرت ابوذر اور معاویہ کا اختلاف بھی زیادہ تر روش ہی کا تھا۔

اب (امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں) جب مسلمانوں کے خلیفہ کو دیکھنا چاہتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں؟ بوڑھے بوڑھے آدمی جنہوں نے پیغمبرؐ کو درک کیا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو درک کیا ہے اور خاص طور پر وہ لوگ جنہوں نے حضرت علیؑ کو آپ کی خلافت کے زمانے میں دیکھا ہے اب جس وقت دنیائے اسلام کے مرکز میں آتے ہیں تو ایک جوان کو دیکھتے ہیں جس کی عمر ۳۲ سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ بہت دراز قد جوان جس کو کہتے ہیں کہ خوش شکل تھا لیکن اس کی صورت میں سیاہ داغ ہیں۔ شاعری پیشہ ایک جوان جو بہت اعلیٰ شعر کہتا ہے لیکن جس کے تمام اشعار شراب اور معشوق کی تعریف میں ہوتے ہیں یا کتے، گھوڑے اور بندر کی تعریف میں ہوتے ہیں۔ اس کی جگہ تک پہنچنے کے لئے سات دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو اس کی ملاقات کو جانا چاہتا ہے پہلے دربان آکر اس کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پوچھ گچھ کے بعد اگر وہ یہاں سے گزر سکتا ہے تو پھر اسے کچھ اور دوسرے دروازوں اور دربانوں سے گزرنا پڑتا ہے تب جاکر وہ اس خلیفہ تک پہنچ پاتا ہے۔ جب وہ وہاں پہنچتا ہے تو ایک ایسے شخص کو دیکھتا ہے جو ایک شاندار دائرے میں سنہری تخت پر بیٹھا ہے اور اس کے گرد سونے چاندی کے پایوں کی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے لوگ، امراء، رؤساء اور غیر ملکی سفیر آتے ہیں اور ان کرسیوں پر بیٹھتے ہیں۔ ان تمام بڑے لوگوں، امراء، شرفاء سے بلند اپنے پہلو میں ایک بندر بٹھا رکھا ہے جسے زربفت کا لباس پہنا رکھا ہے۔ ایسا شخص کہتا ہے کہ میں پیغمبرؐ کا خلیفہ ہوں۔ وہ خدائی احکام جاری کرنا چاہتا ہے۔ جمعہ کی نماز بھی

پڑھاتا ہے۔ یا جمعہ کی امامت بھی کرتا ہے، لوگوں کو خطبہ سناتا ہے اور لوگوں کو وعظ بھی دیتا ہے۔ اسی سے انسان سمجھ لیتا ہے کہ حسینی تحریک اسلامی دنیا کے لئے کس قدر مفید تھی اور اس نے یہ پردے کس طرح چاک کر ڈالے۔

اس زمانے میں رابطوں کے وسیلے نہ ہونے کے برابر تھے۔ مثلاً مدینہ کے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ شام میں کیا ہو رہا ہے؟ آمد و رفت بہت کم تھی۔ وہ لوگ بھی کبھی اتفاق سے مدینہ سے شام جاتے تھے۔ یزیدی حکومت سے بالکل بے خبر ہی رہتے تھے۔ امام حسینؑ کے قضیہ کے بعد مدینہ کے لوگوں کو اس بات پر بہت تعجب ہوا کہ پیغمبرؐ کے فرزند کو قتل کر ڈالا۔ لوگوں کی ایک جماعت اس بات کی تحقیق کرنے کے لئے شام بھیجی گئی کہ امام حسینؑ کس لئے قتل کئے گئے۔ اس جماعت کی واپسی پر لوگوں نے پوچھا کہ کیا واقعہ گزرا؟ وہ بولے بس ایک جملے میں ہم اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ ہم جب تک وہاں رہے برابر یہی کہتے رہے۔ اے خدا! ایسا نہ ہو کہ آسمان سے پتھر برسیں اور ہم اس حال میں ہلاک ہو جائیں اور ہم تمہیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم ایک ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں جس کا شغل شراب پینا اور کتوں، شکاری کتوں اور بندروں سے کھیلنا ہے۔ اس کا شغل گانا بجانا اور لہو ولعب ہے۔ اس کا کام زنا کرنا ہے محرموں سے بھی۔ باقی حال آپ خود سمجھ لیجئے۔

یہ وجہ تھی جو مدینہ نے بغاوت کر دی۔ خونی بغاوت۔ کربلا کے حادثہ کے بعد کیسے کیسے لوگوں نے شور مچایا "اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد" امام حسینؑ جب تک زندہ رہے یہی باتیں کرتے رہے: "و علی الا سلام السلام اذ قدبلیت الامة براع مثل یزید۔" جب ایسا شخص اسلام کا نگہبان ہو تو پھر اسلام پر فاتحہ پڑھ دو! لیکن اس وقت کوئی نہیں سمجھتا تھا البتہ جب شہید ہو گئے اس وقت ان کی شہادت نے دنیائے اسلام کو جھنجھوڑ ڈالا۔ نئے نئے افراد جاتے رہے اور نزدیک سے دیکھتے رہے

اور سمجھتے رہے کہ جو کچھ وہ آئینے میں نہیں دیکھ پاتے تھے وہ امام حسینؑ نے کچی اینٹ میں دیکھ لیا تھا۔ اس وقت انہوں نے امام حسینؑ کی بات کی تصدیق کی اور کہا وہ اس دن صحیح کہتے تھے۔

"وصلی اللّٰہ علی محمد وآلہ الطاھرین نسئلك اللّٰھم وندعوك باسمك العظیم الاعظم الاعز الاجل الاکرم یااللّٰہ"....

اے پروردگار! ہمارے دلوں کو نور ایمان سے منور کر۔! ہم کو اسلام کے معارف اور حقائق سے آگاہ کر۔! اے خدا! ہم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔! اے پروردگار! ہم کو توفیق عطا فرما کہ ہماری سیرت، ہماری روش، پیغمبرؐ کے طریقے اور علیؑ اور آل علیؑ کے طریقے کے مطابق ہو۔ اے پروردگار! ہماری نیتوں کو، ہماری روحوں کو، ہمارے دلوں کو پاک اور خالص بنا دے، مسلمانوں کو بیداری عنایت فرما۔ اے پروردگار! ہمارے اموات کو اپنی عنایت اور مغفرت میں شامل فرما۔

رحم اللّٰہ من قرء الفاتحہ مع الصلوٰۃ

۷ امام حسینؑ کی تحریک کی ماہیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام حسینؑ کی تحریک کے متعلق ایک سوال یہ ہے کہ اس تحریک کی ماہیت کیا تھی؟ کیونکہ تحریکیں بھی قدرتی مظاہر کی طرح مختلف ماہیتیں رکھتی ہیں۔ چیزوں اور قدرتی مظاہر کی، معدنیات سے لیکر نباتات اور طرح طرح کے حیوانات کی، الگ الگ قدرتی ماہیت اور خصوصی حالت ہوتی ہے۔ تحریکوں اور اجتماعی بغاوتوں کا بھی یہی حال ہے۔

اگر ہم کسی شے کو پہچاننا چاہیں تو یا تو اس کے علل فاعلی سے پہچانیں گے یا اس کے علل غائی سے (آج کل علل غائی سے پہچاننے کو نہیں مانتے) یا اس کے علل مادی سے یعنی اس کو تشکیل دینے والے اجزا اور عناصر سے یا اس کی ظاہری شکل و صورت سے یعنی مجموعی طور پر اس نے جو حالت، شکل اور خصوصیت اختیار کر لی ہے۔ اگر ہم کسی تحریک کی شناخت کرنا چاہیں تو اس کی ماہیت کا پتہ لگائیں۔ ان علل و وجوہات کو پہچانیں جن کے نتیجے میں یہ تحریک وجود میں آئی ہے۔ جب تک ہم ان کو نہیں پہچانیں گے اس تحریک کی ماہیت نہیں پہچان سکیں گے (علل فاعلی کی پہچان) پھر اس کے آخری علل فاعلی کو پہچانیں یعنی اس تحریک کا ہدف کیا ہے؟ پہلے تو یہ کہ

اس کا کوئی ہدف بھی ہے یا نہیں اور اگر ہدف ہے تو کیا ہے؟ تیسرے ہم اس تحریک کے عناصر اور مشمولات کو پہچانیں کہ اس تحریک میں کون کون سے کام اور کون کون سے عمل انجام پذیر ہوئے ہیں۔ چوتھے ہم یہ دیکھیں کہ ان عملیات نے جو انجام پذیر ہوئے ہیں مجموعی طور پر کون سی شکل اختیار کی ہے؟ امام حسینؑ کی تحریک کے متعلق ایک مسئلہ درپیش ہے کہ کیا یہ قیام اور تحریک ایک قسم کا انفجار تھی؟ ایک قسم کا اچانک اور غیر متوقع عمل جیسے کسی دیگ کو گرمی پہنچاتے ہیں تو اس کے اندر کا پانی بھاپ بن جاتا ہے اور نکاس بند ہوتے ہیں تو آخر میں وہ دیگ پھٹ جاتی ہے جیسے وہ انفجار جو بعض انسانوں کے لئے ہوتے ہیں۔ جب انسان کچھ ایسے حالات میں پھنس جاتا ہے (اب یا تو اس سبب سے جو اسی وقت پیدا ہو جاتا ہے یا پچھلے علل سے دل میں گھٹن اور بیزاری پیدا ہو جاتی ہے) کہ وہ باوجود یکہ ایک بات کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن اچانک یہ دیکھتا ہے کہ وہ آگ بگولہ ہو گیا ہے اور جس بات کو اس کا دل بھی نہیں چاہتا کہ اس کے منہ سے نکلے بے تحاشہ منہ سے نکل جاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں انفجار یعنی پھٹ پڑنا۔ بہت سی بغاوتیں انفجار ہوتی ہیں۔

ایک وہ مقام جہاں مکتب اسلام کی راہ آج کل کے مکاتب مادّی کی راہ سے مختلف ہو جاتی ہے یہ ہے کہ آج کل کے مادّی مکاتب مخصوص جد لیاتی اصول کے مطابق یہ کہتے ہیں کہ اختلافات پر اصرار کرو، تکلیفوں میں اضافہ کرو، جس طرح ہو سکے شگافوں کو گہرا کرو بلکہ صحیح اصلاحات کی بھی مخالفت کرو تاکہ سماج کو (سمجھے بوجھے انقلاب نہیں) انفجار والے اچانک انقلاب کی طرف دھکیل سکو۔ اسلام انفجار کے انقلاب کا بالکل قائل نہیں ہے۔ اسلام کا انقلاب سو فیصدی جانا بوجھا ہوتا ہے اور مصمم ارادے، پوری پوری واقفیت اور انتخاب سے عمل میں آتا ہے۔

کیا امام حسینؑ کا واقعہ انفجاری انقلاب اور ایک انفجار تھا؟ کیا یہ کوئی کام تھا جس

کا علم نہ تھا؟ کیا اس کی یہ صورت تھی کہ اس بہت زیادہ فشار کے باعث جو معاویہ کے زمانے سے بلکہ اس سے پہلے سے عوام پر اور امامؑ کے خاندان پر ڈالا جارہا تھا کہ یزید کا زمانہ آیا تو پھر امام حسینؑ کی برداشت جواب دے گئی اور انہوں نے فرمایا کہ ہر چہ باداباد، جو کچھ وہ چاہتا ہے ہو جائے؟ نعوذ باللہ۔ خود امام حسینؑ کی وہ باتیں جو نہ صرف اس تحریک کی ابتدا سے بلکہ معاویہ کی موت کے بعد سے شروع ہو جاتی ہے، وہ خط و کتابت جو آپ کے اور معاویہ کے درمیان ہوئی ہے، وہ تقریریں جو آپ نے مختلف موقعوں پر کی ہیں، ان میں سے وہ مشہور خطاب جو منیٰ میں صحابہ پیغمبرؐ کو جمع کر کے کیا جس کا بیان تحف العقول میں ہے اور بہت مفصل ہے اور نہایت فصیح و بلیغ خطبے ہیں۔ یہ سب چیزیں بتاتی ہیں کہ یہ تحریک جو پورے پورے علم کے ساتھ شروع ہوئی تھی انقلاب ہے انفجار نہیں ہے۔ انقلاب ہے لیکن اسلامی انقلاب ہے، انفجار نہیں ہے۔

جملہ خصوصیات میں سے امام حسینؑ کی ایک خوبی یہ ہے کہ آپ اپنے اصحاب میں سے ہر فرد کے سلسلے میں اپنے قیام کو انفجار والی شکل اختیار کرنے نہیں دیتے۔ امام حسینؑ ہر موقع پر اپنے اصحاب کو کسی نہ کسی بہانے سے رخصت کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ ان سے کہتے ہیں۔ جان لو کہ یہاں کوئی ضیافت نہیں ہے۔ معاملہ خطرناک ہے۔ عاشور کی رات آتی ہے تب بھی آپ ایک خاص انداز میں ان سے گفتگو کرتے ہیں:

میں اپنے اصحاب سے بہتر اصحاب اور اپنے اہل بیت سے بہتر اہل بیت نہیں پاتا۔ میں تم سب کا شکر گزار ہوں۔ تم سب کا ممنون ہوں۔ ان لوگوں کو میرے علاوہ تم میں سے کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔ وہ لوگ جب جان لیں گے کہ تم اپنے آپ کو اس معرکے سے الگ کر رہے ہو تو وہ تم میں سے کسی سے

بھی تعرض نہیں کریں گے۔ میرے اہل بیت اس بیابان میں کسی سے واقف نہیں ہیں۔ اس علاقے سے بھی ناواقف ہیں۔ تم میں سے ہر شخص میرے اہل بیت میں سے ایک ایک فرد کو کے کر دور نکل جائے۔ میں خود اس جگہ اکیلا رہوں گا۔ کیوں؟ لوگوں کی تکلیف اور ناخوشی سے فائدہ اٹھانے کا خواہاں رہبر ایسی باتیں نہیں کرتا۔ وہ تو شرعی فریضہ کی بات کرتا ہے۔ بے شک شرعی فریضہ بھی تھا اور امام حسینؑ نے اس کے بیان کرنے میں بھی کوئی غفلت نہیں کی، لیکن وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ لوگ اس شرعی فریضہ کو نہایت آزادی اور مکمل آگاہی کے ساتھ انجام دیں۔ وہ ان سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ دشمن نے تمہیں محصور نہیں کیا ہے۔ تم پر دشمن کی طرف سے کوئی جبر یا دباؤ نہیں ہے۔ اگر تم رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھانا چاہو اور چلے جاؤ تو کوئی مزاحم نہ ہوگا۔ دوست بھی تم کو مجبور نہیں کر رہا۔ میں نے تم سے اپنی بیعت اٹھالی۔ اگر تم کو یہ خیال ہے کہ تمہارے لئے بیعت کے مسئلے نے عہد اور جبر پیدا کر دیا ہے تو میں نے وہ بیعت بھی اٹھالی یعنی اب تم اپنی راہ منتخب کرنے کے لئے بالکل آزاد ہو۔

تم کو پوری پوری واقفیت اور آزادی کے ساتھ اور دشمن یا دوست کی طرف سے ذرا سا بھی دباؤ کے احساس کے بغیر میرا انتخاب کرنا چاہئے۔

یہ ہے وہ بات جو شہدائے کربلا کو قدر و منزلت بخشتی ہے ورنہ طارق بن زیاد نے اسپین کی لڑائی میں جس وقت اسپین فتح کیا اور اپنی کشتیاں اس آبنائے سے پار کرلیں اور جیسے ہی پار کیں حکم دے دیا کہ چوبیس گھنٹے کے لائق رسد رکھ لو اور اس سے زیادہ جو کچھ ہے اسے پھونک دو اور کشتیوں کو بھی جلادو۔ اس کے بعد سپاہیوں اور افسروں کو جمع کیا۔ اس سمندر کی طرف اشارہ کیا جس سے گزر کر آئے تھے اور کہا: اے لوگو! دشمن تمہارے سامنے اور سمندر تمہارے پیچھے ہے اگر بھاگنا بھی چاہو گے تو

سمندر میں ڈوبنے کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔ کوئی اور کشتی بھی نہیں ہے۔ اگر تم کاہلی کروگے تو غذا بھی چوبیس گھنٹے سے زیادہ کی نہیں ہے اس کے بعد مرجاؤ گے۔ اس لئے تمہاری نجات اسی میں ہے کہ دشمن کو مار دو اور ہلاک کردو۔ تمہاری غذا دشمن کے چنگل میں ہے۔ اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے یعنی ان لوگوں پر دباؤ ڈالو۔ یہ سپاہی اپنے خون کے آخری قطرے تک نہیں لڑیں گے تو کیا کریں گے ؟ لیکن امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کے ساتھ طارق بن زیاد کے برعکس عمل کیا۔ یہ نہیں کہا کہ یہاں دشمن موجود ہے اگر اس طرف سے جاؤ گے تو وہ تمہیں فنا کردے گا۔ اس طرف سے جاؤ گے تو تمہیں نابود کردے گا۔ اس طرف سے تمہیں لولو کھا جائے گا۔ اس طرف سے تمہیں لولو کھا جائے گا۔ اس لئے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ چراغ سے گرے ہوئے تیل کو امام زادے کی نذر کردو۔ تمہیں بہر حال مارا جانا ہے۔ اب جو تم مارے ہی جاؤگے تو آؤ میرے ہی ساتھ مارے جاؤ۔ اس قسم کی شہادت کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ سیاست دان اسی قسم کا عمل کرتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ نہ سمندر تمہارے پیچھے ہے نہ دشمن تمہارے سامنے۔ نہ دوست نے تمہیں مجبور کیا ہے نہ دشمن نے۔ جس کسی کو چاہو پوری پوری آزادی سے منتخب کرلو۔

پس انقلاب حسینؑ درجہ اول کا ہے۔ ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ انقلاب حسینؑ کی طرف سے بھی، اپنے اہلبیتؑ کی طرف سے بھی اور اپنے اصحاب کی طرف سے بھی آگاہانہ ہے، پوری واقفیت اور جانکاری سے آیا ہے۔ یہ انفجار نہیں ہے۔

آگاہانہ انقلاب کی مختلف ماہیتیں ہوسکتی ہیں۔ اتفاق سے امام حسینؑ کے معاملات میں زیادہ عوامل کار فرما ہیں جن سے امام حسینؑ کی تحریک ایک ماہیت والی نہیں بلکہ کئی ماہیت کی تحریک ہوگئی ہے۔ سماجی اور قدرتی مظاہر میں ایک فرق یہ ہے کہ قدرتی مظاہر صرف ایک ماہیت کے ہوتے ہیں، کئی ماہیتوں کے نہیں ہوسکتے۔ یہ

نہیں ہوسکتا کہ ایک دھات میں بیک وقت سونے کی بھی ماہیت ہو اور تانبے کی بھی البتہ سماجی مظاہر کی بیک وقت کئی کئی ماہیتیں ہوسکتی ہیں۔

انسان خود ایک ایسا عجوبہ ہے جس کی بیک وقت کئی ماہیتیں ہوسکتی ہیں۔ سارٹر اور دوسروں نے کہا ہے کہ انسان کا وجود اس کی ماہیت پر مقدم ہے۔ یہاں تک بات درست ہے ۔ اس کا وجود ماہیت پر تقدم رکھتا ہے لیکن اس طرح نہیں یعنی ان معنوں میں نہیں جن میں یہ کہتے ہیں کہ درست ہے۔ یہاں ایک بات اور بھی ہے کہ انسان کی ایک وقت میں کئی کئی ماہیتیں ہوسکتی ہیں۔ فرشتے کی ماہیت ہوسکتی ہے اور اسی وقت سور کی بھی ماہیت ہوسکتی ہے۔ اسی وقت چیتے کی ماہیت بھی ہوسکتی ہے اور یہ اسلامی تعلیم و تربیت کی ایک بڑی داستان ہے۔

سماجی مظاہر میں کئی ماہیتیں ہوسکتی ہیں۔ اتفاق سے امام حسینؑ کا قیام کئی ماہیتوں والا ایسا ہی مظہر ہے کیوں کہ اس میں مختلف عوامل اثرانداز ہیں۔ مثلاً کسی تحریک میں رد عمل کی ماہیت ہوسکتی ہے یعنی صرف رد عمل ہو۔ ابتدا کرنے کی ماہیت ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی تحریک رد عمل کی ماہیت رکھتی ہو تو ہوسکتا ہے کہ کسی واقعے کے مقابلے میں اس کا یہ رد عمل منفی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرے واقعے کے مقابلے میں یہ رد عمل مثبت ہو۔ یہ سب باتیں امام حسینؑ کی تحریک میں ملتی ہیں ۔ یہ وجہ ہے کہ ایک ہی تحریک کی کئی ماہیتیں ہیں۔ کس طرح؟

ایک عامل جو وقت کے لحاظ سے پہلا عامل ہے بیعت کا مطالبہ ہے۔ امام حسینؑ مدینہ میں ہیں۔ معاویہ جس نے اپنے مرنے سے پہلے یزید کی جانشینی اپنے لئے واجب کر لی ہے اور جسے وہ پکا کرنا چاہتا ہے مدینہ آتا ہے۔ امامؑ سے بیعت لینا چاہتا ہے۔ اس وقت کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کے مرنے کے بعد یزید بیعت لینا چاہتا ہے۔ بیعت کرنا یعنی مہر لگانا اور تصدیق و توثیق کرنا نہ صرف خلافت پر یزید کی ذات کو بلکہ

اس رواج کی رو سے جس کی بنیاد معاویہ نے ڈال دی ہے کہ جانے والا خلیفہ بعد کے خلیفہ کا تعیین کیا کرے یہ نہیں کہ ایک خلیفہ مر جائے بعد میں لوگ اگلا خلیفہ مقرر کریں یا اگر شیعہ ہوں تو پیغمبرؐ کی نص کے مطابق عمل کریں۔ نہیں! ایک ایسی بات جو نہ شیعہ کہتے ہیں نہ سنی؛ ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کو یعنی اپنے بیٹے کو مسلمانوں کے لئے ولی عہد مقرر کرے۔

اس لئے یہ تنہا یزید جیسے قبیح اور رسوا انسان کی خلافت پر مہر تصدیق لگانا ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی سنت رائج کر کے مہر ثبت کرنا تھا جس کی پہلی بار معاویہ کے ذریعے بنیاد ڈالی جانی ہے۔

وہ لوگ امام حسینؑ سے اس لئے بیعت چاہتے ہیں یعنی ان کی طرف سے ایک مطالبہ پیدا ہوا ہے۔ امام حسینؑ رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ منفی رد عمل۔ تم بیعت چاہتے ہو؟ میں نہیں کرتا۔ یہاں امام حسینؑ کا عمل منفی عمل ہے۔ یہ تقویٰ کا تقاضہ ہے۔ یہ ایسا تقاضہ ہے جس کا ہر انسان کو اپنے معاشرے میں ایسے مطالبوں کے ساتھ سامنا ہو جاتا ہے جو اس سے مختلف شکلوں، شہوت کی صورت میں، مقام کی صورت میں، خوف اور رعب کی صورت میں کئے جاتے ہیں اور اسے ان کے مقابلے میں کہنا پڑتا ہے نہیں! یعنی تقوی۔

وہ لوگ کہتے ہیں بیعت، امام حسینؑ کہتے ہیں: نہیں! وہ ڈراتے دھمکاتے ہیں، آپ کہتے ہیں: "میں قتل ہونے کو تیار ہوں لیکن بیعت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

یہاں تک یہ تحریک ایک غیر شرعی مطالبے کے جواب میں رد عمل کی ماہیت بلکہ منفی رد عمل کی ماہیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی ماہیت تقویٰ کی ماہیت ہے۔ لا الہ الا اللہ کے پہلے ٹکڑے یعنی لا الہ کی ماہیت ہے۔ غیر شرعی

مطالبے کے جواب میں "نہ" کہنا ہے (تقویٰ)۔

لیکن تحریک حسینی میں جس عامل (سبب) کا دخل تھا وہ صرف یہی تھا جھگڑا نہیں تھا۔ یہاں ایک اور عامل بھی موجود تھا جس کی رو سے تحریک حسینی کی ماہیت پھر رد عمل کی ماہیت ہے لیکن یہ رد عمل نہ مثبت ہے نہ منفی۔

معاویہ دنیا سے چلا جاتا ہے۔ کوفہ والوں نے اس حادثے سے بیس سال پہلے کم سے کم پانچ سال تک حضرت علیؑ کے ساتھ اس شہر میں زندگی بسر کی ہے۔ اور ابھی تک حضرت علیؑ کی تعلیم و تربیت کے آثار پورے طور پر نہیں مٹ پائے ہیں۔ (البتہ بہت کچھ چھن کر صاف ہو چکے ہیں ان کے بہت سے بزرگ اور مرد حجر بن عدی، عمرو بن حمق خزاعی، رشید حجری، میثم تمار جیسے مارے جا چکے ہیں تاکہ اس شہر کو حضرت علیؑ کے خیالات سے اور حضرت علیؑ کے طرفدار جذبات سے خالی کر سکیں پھر بھی ابھی تک ان تعلیمات کا اثر باقی ہے) یہاں تک کہ معاویہ مر جاتا ہے، چونکتے ہیں، ایک دوسرے کے گرد جمع ہوتے ہیں، اکٹھے ہوتے ہیں کہ اس وقت موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ موقع اس کے بیٹے یزید کو مل جائے، ہمارے ساتھ امام حسینؑ ہیں، ہمارے سچے امام حسینؑ ابن علی ہیں، ہم اس وقت تیار ہو جائیں اور ان کو بلائیں کہ کوفہ آئیے۔ ان کی مدد کریں اور کم سے کم ابتداء میں اس جگہ ایک قطب قائم کر دیں بعد میں خلافت کو بھی اسلامی خلافت بنا لیں گے۔ یہاں ان لوگوں کی طرف سے بلاوا ہے جو دعوے دار ہیں کہ ہم دل و جان سے تیار ہیں۔ ہمارے درختوں میں پھل آگئے ہیں۔ اس جملے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بہار کا موسم ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ درخت سر سبز ہو گئے ہیں اور ان میں پھل لگ آئے ہیں یعنی آقا! اس وقت یہاں پھلوں کا موسم ہے۔ یہاں آیئے اور پیٹ بھر کر پھل کھایئے! نہیں یہ مثل ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسانوں کے درخت ہرے بھرے ہیں اور یہ اجتماعی

باغ اس بات کے لئے تیار ہے کہ آپ اس میں قدم رکھیں۔

کوفہ اصل میں فوجی چھاؤنی رہا ہے۔ شروع ہی سے اس کی بنیاد چھاؤنی کے طور پر رکھی گئی تھی۔ یہ شہر خلیفہ حضرت عمر بن خطاب کے زمانے میں بسایا گیا تھا۔ اس سے پہلے اس کا نام "حیرہ" تھا۔ یہ شہر سعد ابن وقاص نے آباد کیا تھا۔ جو مسلمان سپاہی تھے انہوں نے اسی چھاؤنی میں اپنے لئے گھر بنائے تھے اس لئے ایک لحاظ سے یہ دنیا کا نہایت قوی ترین شہر تھا۔

اس شہر کے لوگ امام حسین علیہ السلام کو بلاتے ہیں۔ ایک شخص نہیں، دو نہیں، ہزار نہیں، پانچ ہزار نہیں، دس ہزار آدمی نہیں بلکہ تقریباً اٹھارہ ہزار خطوط پہنچتے ہیں، جن میں سے بعض خطوط پر چند لوگوں نے اور کچھ اور خطوط پر سو سو آدمیوں نے بھی دستخط کئے تھے۔ اگر ہم اوسط بھی نکالیں تو شاید ایک لاکھ آدمیوں نے امام حسین علیہ السلام کو خط لکھے تھے۔

یہاں امام حسینؑ کا رد عمل کیا ہونا چاہئے؟ ان پر حجت تمام ہو چکی ہے۔ یہاں رد عمل مثبت ہے۔ اور آپ کے عمل کی ماہیت تعاون کی ماہیت ہے۔ یعنی مسلمانوں نے قیام کیا ہے۔ امام کو چاہئے کہ ان کی مدد کو دوڑیں۔ یہاں منفی اور تقویٰ کی ماہیت نہیں ہے، مثبت ماہیت ہے، جو کام دوسروں سے شروع ہوا ہے امام حسینؑ کو چاہئے کہ ان کی دعوت پر مثبت جواب دیں۔ یہاں ذمہ داری کیا ہے؟ اس مقام پر ذمہ داری انکار کرنا تھا؟ "نہ" کہنا تھا؟ بیعت کے لحاظ سے امام حسین علیہ السلام کو صرف یہ کہنا چاہئے: نہیں! اپنے آپ کو پاک رکھیں اور گناہ سے آلودہ نہ کریں۔ لہذا اگر امام حسینؑ ابن عباس کی تجویز پر عمل کرتے اور چلے جاتے، کوہستان یمن میں رہتے جہاں یزید کے لشکری ان تک نہ پہنچ پاتے تو وہ اپنے پہلے فریضے سے ضرور عہدہ برآ ہو جاتے۔ وہ چونکہ بیعت چاہتے تھے اور یہ بیعت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے

کہ بیعت کیجئے اور یہ کہتے تھے نہیں! بیعت کے مطالبے کے لحاظ سے اور امام حسین علیہ السلام تقویٰ کے احساس کے لحاظ سے اور اس لحاظ سے کہ منفی جواب دینا چاہئے یمن کے پہاڑوں میں جاکر جیسا کہ ابن عباس اور دوسروں نے تجویز کیا تھا وہ (امام حسینؑ) اپنا فرض ادا کر چکے ہوتے لیکن یہاں مسئلہ دعوت کا ہے۔ یہ نیا فریضہ ہے۔ مسلمانوں نے تقریباً بیس ہزار خطوط تقریباً ایک لاکھ دستخطوں سے بھیجے ہیں۔ یہ اتمام حجت ہے۔

امام حسین علیہ السلام کی پہلی حرکت سے ظاہر تھا کہ وہ اہل کوفہ کو آمادہ نہیں سمجھتے۔ وہ ان کو سست اور مرعوب شدہ سمجھتے ہیں۔ عین اس حال میں تاریخ کو کیا جواب دیں؟ اگر امام حسینؑ کوفیوں کی طرف بالکل توجہ نہ کرتے تو ہم ہی لوگ جو آج یہاں بیٹھے ہیں یہ کہتے کہ امام حسینؑ نے مثبت جواب کیوں نہیں دیا؟

ابو سلمہ خلال ایک شخص تھا جسے بنی عباس کے دور میں وزیر آل محمد کہتے تھے۔ جس وقت اس کے تعلقات خلیفہ عباس سے خراب ہوگئے تو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ مارا گیا۔ اس نے فوراً دو خط لکھے۔ ایک امام جعفر صادقؑ کو اور ایک عبد اللہ محض کو اور دونوں کو بیک وقت دعوت دی اور کہا کہ میں اور ابو مسلم ابھی تک ان لوگوں کے لئے کام کرتے تھے اب اس گھڑی سے ہم آپ کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔ آیئے اور ہمارا ساتھ دیجئے۔ ہم انہیں نابود کر دیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس وقت وہ دو شخصوں کے لئے خط لکھتا ہے تو علامت یہ ہے کہ اس میں خلوص نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب خلیفہ عباسی سے اس کے تعلقات بگڑ گئے اس کے بعد اس نے یہ خط لکھا ہے۔ جب امام جعفر صادقؑ کے پاس خط پہنچا تو آپ نے پڑھا۔ پھر خط لانے والے کی آنکھوں کے سامنے خط آگ میں جلا دیا۔ اس شخص نے پوچھا خط کا کیا جواب ہے؟ آپ نے فرمایا۔ خط کا جواب یہی ہے۔ ابھی وہ واپس بھی نہیں پہنچا تھا

کہ ابو سلمہ قتل ہو گیا اور اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابو سلمہ خلال کو جس نے انہیں دعوت دی تھی مثبت جواب کیوں نہیں دیا؟ منفی جواب کیوں دیا۔ حالانکہ ابو سلمہ خلال صرف ایک شخص تھا دوسرے اس کی نیت خالص نہیں تھی اور تیسرے جب اس نے خط لکھا تھا اس وقت پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ خلیفہ عباسی بھی سمجھ گیا تھا کہ یہ شخص اس کے ساتھ سچا نہیں ہے اس لئے چند دن بعد اسے مروا ڈالا۔

اگر کوفیوں کے اٹھارہ ہزار خطوط مکہ اور مدینہ (خصوصاً مکہ) امام حسینؑ کے پاس جاتے اور امام حسینؑ مثبت جواب نہ دیتے تو تاریخ امام حسینؑ کو برا بھلا کہتی کہ اگر وہ کوفہ چلے جاتے تو یزید اور یزیدیت کی جڑ قلم ہو جاتی، کوفہ مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی تھی۔ کوفہ میں حضرت علیؑ نے پانچ سال تک زندگی بسر کی تھی اور وہاں ابھی تک حضرت علیؑ کی تعلیمات کے آثار باقی تھے۔ وہ یتیم جنہیں حضرت علیؑ نے بڑا کیا تھا اور وہ بیوائیں جن کی حضرت علیؑ نے سرپرستی کی تھی ابھی زندہ ہیں اور حضرت علیؑ کی آواز اس شہر کے لوگوں کے کانوں میں گونج رہی ہے۔ امام حسینؑ نے بزدلی دکھائی اور ڈر گئے جو اس جگہ نہیں گئے۔ اگر چلے گئے ہوتے تو دنیائے اسلام میں انقلاب آجاتا۔

یہ وجہ ہے جو اس مقام پر فرض اس قسم کا جواب دیتا ہے کہ وہ کہتے ہیں تو ہم آمادہ ہیں۔ امام فرماتے ہیں میں آمادہ ہوں۔ اس اعتبار سے امام حسینؑ کا فرض کیا ہے؟

کوفہ کے لوگوں نے مجھے بلایا ہے۔ میں کوفہ جا رہا ہوں۔ کوفہ والوں نے مسلم سے اپنی بیعت توڑ دی ہے۔ میں واپس جاتا ہوں۔ میں اپنے مقام کو جاتا ہوں۔ مدینہ یا کسی اور جگہ چلا جاتا ہوں تاکہ وہاں وہ لوگ جو چاہیں کریں یعنی اس سبب کے

پیش نظر کہ ایک دعوت کے جواب میں ایک مثبت رد عمل ہے امام حسینؑ کا فریضہ مثبت جواب دینا ہے جب تک کہ دعوت دینے والے اپنی جگہ ثابت قدم رہیں۔ جس وقت وہ بدل گئے پھر اس لحاظ سے امام حسینؑ کا کوئی فریضہ نہیں ہے اور نہ تھا۔

ان دونوں عامل میں سے کون سا دوسرے پر تقدم رکھتا تھا؟ کیا یہ پہلا عامل کہ امام حسینؑ نے بیعت سے انکار کر دیا اور چونکہ بیعت سے انکار کر دیا اس لئے اہل کوفہ نے انہیں بلایا یا کم سے کم وقت کے لحاظ سے ایسا ہوا یعنی بیعت سے انکار کئے ایک مہینے سے زیادہ گزر جانے کے بعد اہل کوفہ کا دعوت نامہ پہنچا؟ یا معاملہ اس کے برعکس تھا؟ پہلے اہل کوفہ نے آپ کو بلایا تو امام حسینؑ نے دیکھا کہ اچھا انہوں نے اس وقت دعوت دی ہے تو مجھے بھی مثبت جواب دینا چاہئے۔ معلوم ہے کہ جو شخص اتنے بڑے کام کے لئے امیدوار ہوتا ہے پھر اس کے لئے بیعت کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ انہوں نے اس لئے بیعت نہیں کی کہ اہل کوفہ کے مطالبے پر مثبت جواب دے چکے تھے۔ تاریخ کے مطابق ان دونوں عوامل میں سے کون سا پہلا ہے اور کیوں؟ اس لئے کہ پہلے ہی دن جب معاویہ مرا ہے امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ ہو چکا تھا۔ بلکہ معاویہ مرنے سے پہلے مدینہ آچکا تھا اور اس نے چاہا تھا کہ جس حیلے اور مکاری سے ہو اپنی زندگی میں ہی امام حسینؑ اور دو تین اور لوگوں سے بیعت لے لے لیکن ان لوگوں نے یہ بات نہیں مانی۔ بیعت کے مطالبے کا مسئلہ اور اس سے انکار وقت کے اعتبار سے پہلا واقعہ ہے۔ خود یزید نے بھی جس وقت معاویہ مر گیا ہے اس خبر کے ساتھ ایک خط بھیجا تھا جو ایک تیز رفتار ہرکارے کی معرفت چند دن کے اندر اندر اونٹوں پر مدینہ پہنچ گیا تھا اور جس شخص نے والی مدینہ کو معاویہ کے مرنے کی خبر پہنچائی اسی نے وہ خط بھی اسے دیا تھا کہ: "خذ بالبیعته اخذا شدیدا۔" امام حسینؑ اور ان دو تین دوسرے آدمیوں سے سختی سے جس طرح سے بھی ہو بیعت لے

لے۔ ابھی تک شاید کوفہ میں خبر نہیں پہنچی تھی کہ معاویہ مر گیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ امام حسینؑ سے بیعت کا تقاضہ کیا تھا۔ امام حسینؑ نے منع کر دیا تھا۔ وہ رضامند نہیں ہوئے۔ دو تین دن بعد پھر یہی گفتگو ہوئی۔ وہ لوگ آتے تھے کبھی نرم لہجے میں اور کبھی درشتی سے بات کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت نے مدینہ ہی چھوڑ دیا۔ امام حسینؑ ۲۷ رجب کو مدینہ سے روانہ ہوئے اور ۳ شعبان کو مکہ پہنچ گئے۔ اہل کوفہ کا دعوت نامہ ۱۵ رمضان کو امام حسینؑ کو ملا۔ یعنی بیعت کے مطالبے اور امام کے انکار کو ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا اور مکہ میں امام کے قیام کو چالیس دن سے زیادہ گزر چکے تھے۔

اس لئے مسئلہ یہ نہیں ہے کہ پہلے انہوں نے دعوت دی بعد میں امام نے انہیں سازگار جواب دیا اور چونکہ مثبت جواب دے دیا تھا اور ان کی طرف سے امیدوار بن چکے تھے پھر بیعت کرنا بے معنی تھا یعنی آپ نے اس لئے بیعت نہیں کی کہ اہل کوفہ کو مثبت جواب دے چکے تھے۔ نہیں! اہل کوفہ کی دعوت درمیان میں آنے سے پہلے آپ بیعت سے انکار کر چکے تھے اور فرما چکے تھے: میں بیعت نہیں کروں گا چاہے روئے زمیں پر میرے لئے کوئی ٹھکانہ باقی نہ رہے۔

یعنی اگر زمین کی تمام وسعتیں میرے لئے اس طرح تنگ کر دی جائیں کہ میرے رہنے کے لئے ایک نقطہ بھی موجود نہ رہے پھر بھی میں بیعت نہیں کروں گا۔

تیسرا عامل جسے دوسرے دو اسباب کی طرح تاریخ بیان کرتی ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا جس کے نعرے کے ساتھ امام حسینؑ نے مدینہ سے سفر شروع کیا تھا اس لحاظ سے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ چونکہ وہ مجھ سے بیعت چاہتے ہیں اور میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں اس لئے قیام کرتا ہوں بلکہ یہ تھا کہ وہ بیعت نہ بھی چاہیں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کے مطابق قیام کرتا ہوں اور

یہ بھی مسئلہ نہیں تھا کہ چونکہ اہل کوفہ نے مجھے دعوت دی ہے اس لئے میں قیام کرتا ہوں۔ ابھی اہل کوفہ کی دعوت کو تقریباً دو مہینے باقی تھے۔ یہ ابتدائی دن تھے جن کا اہل کوفہ کی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دنیائے اسلام کو منکرات نے گھیر رکھا ہے اس لئے میں دینی فریضے کے مطابق، شرعی اور خدائی ذمہ داری کے مطابق خود قیام کرتا ہوں۔

پہلے عامل میں امام حسینؑ مدافعت کرتے ہیں۔ لوگ ان سے کہتے ہیں کہ بیعت کیجئے! آپ فرماتے ہیں میں نہیں کرتا۔ وہ اپنا دفاع کرتے ہیں۔ دوسرے عامل میں امام حسینؑ سے تعاون کیا جاتا ہے ان کو مل کر کام کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آپ نے مثبت جواب دے دیا ہے۔ تیسرے سبب میں امام حسینؑ حملہ آور ہیں۔ یہاں انہوں نے حکومت وقت پر حملہ کر دیا ہے۔ اس سبب کے مطابق امام حسینؑ ایک انقلابی انسان ہیں۔ وہ انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔

ان عوامل میں سے ہر عامل امام حسینؑ کے لئے ایک قسم کا فرض واجب قرار دیتا ہے۔ یہ جو میں کہتا ہوں کہ اس تحریک کی کئی ماہیتیں ہیں وہ اسی لئے ہیں ہوں۔ بیعت کے عامل کے لحاظ سے امام حسینؑ کا سوائے بیعت نہ کرنے کے اور کوئی فریضہ نہیں ہے۔ اگر ابن عباس کی تجویز پر بھی عمل کرتے اور پہاڑوں میں چلے جاتے تو وہ اس فریضے پر عمل کر چکے ہوتے۔ اس فریضے کے انجام کے لحاظ سے امام حسینؑ کا یہ فرض نہیں تھا کہ کسی اور آدمی کو بھی اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دیں۔ انہوں نے مجھ سے بیعت چاہی میں بیعت نہیں کرتا۔ انہوں نے میری شرافت کا دامن آلودہ کرنا چاہا ہے میں نہیں کرتا۔ اہل کوفہ کی دعوت کے عامل کے لحاظ سے آپ کا فرض یہ ہے کہ انہیں مثبت جواب دیں اس لئے حجت تمام ہوئی ہے۔ ایک صاحب نے یہ سوال کیا کہ یہ اتمام حجت کس شکل میں ہوتی ہے۔ پھر مسئلہ امامت کیا ہوتا ہے؟

نہیں ! مسئلہ امامت اس معنی میں نہیں ہے کہ امام کا کوئی شرعی فریضہ ہی نہ ہو۔ اتمام حجت اس بارے میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حضرت علیؑ خطبہ شقشقیہ میں فرماتے ہیں :" لولا حضور الحاضر و قیام الحجة بوجودالناصر وما اخذ اللّٰہ علی العلما ان لا یقاروا علی کظة ظالم ولا سغب مظلوم لا لقیت جهلها علی غار بها و لسقیت آخرها بکاس اولها۔"

اپنے زمانۂ خلافت کے بارے میں کہتے ہیں : اگر لوگ حاضر نہ ہوتے اور لوگوں کے سامنے مجھ پر حجت تمام نہ ہوتی اور اگر خدا نے علماء اور داناؤں سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ جب لوگ اس طرح تقسیم ہوجائیں کہ پیٹ بھروں نے زیادہ سیر ہوکر کھا لیا ہو اور بھوکے بھوکے ہی رہ گئے ہوں تو اس قابل اعتراض حالت کے خلاف بھوکوں کی حمایت میں اور زیادہ کھانے والوں کے خلاف قیام کرو، میں عہدۂ خلافت قبول نہیں کرتا۔ میں ذاتی لحاظ سے اس کام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا لیکن یہ فریضے اور ذمہ داریاں میرے عہدے کی ذمے لگادی گئی تھیں۔

امام حسینؑ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اصولاً امام چونکہ امام ہوتا ہے، قابل تقلید ہوتا ہے، نمونہ ہوتا ہے، پیشوا ہوتا ہے، ہم امام کے عمل سے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ فرائض کی تشخیص کس طرح کرنا چاہئے اور کس طرح عمل کرنا چاہئے۔ اہل کوفہ کی دعوت کے عامل کے لحاظ سے امام حسینؑ کا یہ فرض ہے کہ وہ کوفہ آئیں جب تک کہ وہ اپنے قول پر قائم ہیں۔ جس گھڑی سے انہوں نے اپنی پوزیشن بدل لی، اپنے قول سے پھر گئے، ہار گئے اور چلے گئے۔ پھر امام حسینؑ کا اس لحاظ سے کوئی فرض نہیں رہ جاتا۔ جس وقت زمام حکومت ہاتھ میں لینے کا مسئلہ ان کی طرف سے ختم ہوجاتا ہے تو پھر امام حسینؑ کا کوئی فرض نہیں رہتا۔ لیکن امام حسینؑ کا وہ کام جو اس پر منحصر نہیں تھا یعنی اہل کوفہ کی دعوت ایک وقتی عامل تھا۔ یعنی ایک ایسا عامل تھا جو

۱۵ رمضان سے شروع ہوا، بار بار خطوط آتے جاتے رہے، اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ امام حسینؑ کوفہ کے نزدیک یعنی عراق اور سعودی عرب کی سرحد تک نہیں پہنچ گئے۔ حر بن یزید ریاحی نے ملاقات کی۔ دوسری خبروں کے ساتھ قتل مسلم کی خبر بھی پہنچی پھر اہل کوفہ کی دعوت کا وجود ختم ہوگیا۔ اس نقطۂ نظر سے امام کا کوئی فریضہ نہیں رہتا۔ اس لئے جب آپ اہل کوفہ سے بات کرتے ہیں آپ کے مخاطب اہل کوفہ ہیں۔ یزید اور حکومت وقت نہیں ہے۔ ان ست شیعوں سے کہتے ہیں : تم نے مجھے بلایا میں آگیا، تم نہیں چاہتے میں پلٹا جاتا ہوں، تم نے مجھے دعوت دی تھی۔ تمہارے بلاوے نے میرے لئے ایک فریضہ واجب کردیا، لیکن اب جو تم پشیمان ہوگئے ہو تو میں واپس جاتا ہوں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بیعت بھی کروں گا۔ ہرگز نہیں! وہ عامل اور مسئلہ ہی دوسرا ہے۔ جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے : چاہے تمام روئے زمین پر مجھے ایک نقطے کی بھی جگہ نہ ملے جہاں میں پناہ لے سکوں (نہ تنہا تم مجھے جگہ نہیں دیتے) میں پھر بھی بیعت نہیں کروں گا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عامل کے لحاظ سے کہ امام حسینؑ کی نظر میں کوئی اور مدافع نہیں، نہ انہیں کسی کا تعاون حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ ایک ہجوم ہے، ایک انقلاب ہے۔ کس طرح؟ نہیں! ان کے حساب سے یہ انہی کے سر ہے۔

کتاب شہید جاوید کے مصنف نے اس مقام پر جو ایک غلطی کی ہے وہ میرے خیال سے یہ ہے کہ اس نے اہل کوفہ کی دعوت کے عامل کو حد سے زیادہ اہمیت دے دی ہے، جیسے اس نے سمجھ لیا ہو کہ اصلی اور بنیادی سبب یہی ہے۔ بے شک یہ اجتہادی اور استنباط کے نتائج ہیں، ٹھیک جو کوئی نتیجہ نکالتا ہے وہ غلطی بھی کرتا ہے۔ اس نے غلطی کی ہے۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہنا چاہتا، یہ اجتہادی غلطی بری ہے۔ ان اسباب میں سب سے چھوٹا سبب اثر کے اعتبار سے اہل کوفہ کی

دعوت ہے۔ ورنہ اگر یہ بنیادی عامل ہوتا تو جس وقت امامؑ کو خبر پہنچی کہ کوفہ کی فضا بدل گئی ہے تو امامؑ کو دوسری باتوں سے ہاتھ اٹھا لینا چاہئے تھا اور یہ کہنا چاہئے تھا بہت اچھا۔ اب جو ایسا ہو گیا ہے تو ہم بیعت کئے لیتے ہیں۔ اب ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بات نہیں کریں گے۔ اتفاق کی بات ہے کہ معاملہ بالکل الٹا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا سب سے زیادہ شور انگیز اور پر ہیجان خطبہ، کوفہ کی شکست کے بعد ہے۔

یہ مقام ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ امام حسینؑ کس قدر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عامل پر زور دیتے ہیں اور کس حد تک اس فاسد حکومت پر حملہ کرتے ہیں۔ اس عامل کے لحاظ سے امام حسینؑ اس وقت کی فاسد حکومت پر ہجوم آور ہیں، انقلابی ہیں، راستے میں آپ کی نظر دو آدمیوں پر پڑتی ہے جو کوفہ سے آرہے ہیں، آپ ٹھہر جاتے ہیں، تاکہ ان سے بات چیت کریں۔ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ امام حسینؑ ہیں، اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ امام حسینؑ بھی سمجھ جاتے ہیں کہ وہ بات کرنا نہیں چاہتے، اس لئے اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ بعد میں آپ کے ایک صحابی نے جو پیچھے پیچھے آرہا تھا ان لوگوں کو دیکھ لیا، ان سے گفتگو کی، ان لوگوں نے مسلم اور ہانی کی شہادت سے متعلق کوفہ کے تکلیف دہ واقعات اسے سنائے اور بولے خدا کی قسم ہمیں امام حسینؑ کو یہ خبر سنانے سے شرم آرہی تھی۔ وہ شخص جب بعد میں امام حسینؑ سے آ ملا اور جس مقام پر امامؑ بیٹھے ہوئے تھے پہنچا تو بولا۔ میرے پاس ایک خبر ہے۔ آپ جس طرح اجازت دیں گے عرض کردونگا۔ اگر آپ اجازت دیتے ہیں تو یہیں عرض کئے دیتا ہوں ورنہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں تخلیہ میں عرض کروں تو بطور خصوصی عرض کئے دیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہو! میں اپنے اصحاب سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ ہم اسی طرح آپس میں یک رنگ ہیں، اس نے واقعہ سنایا کہ آپ جن دو

لوگوں سے کل ملاقات کرنا چاہتے تھے لیکن جنہوں نے اپنی راہ بدل لی تھی میں نے ان سے بات چیت کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ کوفہ سقوط کر گیا، مسلم اور ہانی قتل ہو گئے۔ آپ نے اس جملے تک سنا، پہلے آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اب دیکھئے کیا جملہ فرماتے ہیں: "من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا"(۱)۔ سبحان اللہ! دراصل قرآن میں اس موقع کے لئے زیادہ مناسب آیت آپ پیش نہیں کر سکتے۔ بعض مومنوں نے خدا سے جو عہد کیا وہ پورا کیا۔ انہیں میں سے جو اپنا وعدہ وفا کرنے والے ہیں بعض گزر گئے اور چلے گئے، شہید ہو گئے اور کچھ انتظار کر رہے ہیں کہ ان کی باری آئے یعنی ہم صرف کوفہ کیلئے نہیں آئے ہیں۔ کوفہ سقوط کر چکا تو کر چکا۔ ہمارا سفر اہل کوفہ کی دعوت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی ایک عامل تھا جس نے ہمارے لئے یہ فریضہ لازم کر دیا کہ ہم جلدی جلدی مکہ سے کوفہ کی جانب آئیں۔ ہمارا فرض اس سے بھی بڑا اور اہم ہے۔ مسلم نے اپنا عہد نبھایا اور ان کا کام ختم ہو گیا۔ انجام کو پہنچ گئے۔ وہ شہید ہو گئے۔ مسلم کا وہ مقدر ہم بھی اپنائیں۔

اس لحاظ سے کہ امامؑ ہجوم کرنے والے اور انقلابی تھے آپ کی منطق میں اور دفاع و تعاون کی منطق میں فرق ہے۔ دفاع کی منطق ایک ایسے آدمی کی منطق ہے جو بیش قیمت چیز رکھتا ہے۔ چور اسے چرانا چاہتا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ڈھینگا مشتی کرے اور چور کو زمین پر دے مارے لیکن اس بات کی فکر نہیں کرتا کہ اسے مضبوطی سے پکڑ کر اندر چلا جائے تاکہ چور اسے نہ چھینے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ اس وقت اس کی طاقت کم ہے یا زیادہ۔ بات یہ ہے کہ وہ اسے چور سے بچانا چاہتا ہے۔ لیکن ایک حملہ آور شخص یہ نہیں چاہتا کہ وہ فقط اپنی ہی حفاظت کرے۔ وہ اسے اچک لے جانا

۱۔ سورۂ احزاب آیت ۲۳

چاہتا ہے اگرچہ اپنی شہادت کی قیمت پر ہی ہو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی منطق نے امام حسینؑ کی منطق کو شہید کی منطق بنا دیا۔ شہید کی منطق ان منطقوں سے الگ تھلگ ہوتی ہے۔

شہید کی منطق یعنی ایسے شخص کی منطق جو اپنے جامعہ کے لئے ایک پیغام رکھتا ہے اور یہ پیغام وہ اپنے خون کے سوا اور کسی چیز سے نہیں لکھنا چاہتا۔ دنیا میں بہت سے لوگوں کے پاس کہنے کی باتیں تھیں، پیام تھا، ان کھدائیوں میں جو دنیا میں چاروں طرف برابر جاری رہتی ہیں یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں بادشاہ یا عوامی صدر کا سنگی کتبہ اس مضمون کا ملتا ہے: میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ میں وہ ہوں جس نے فلاں مقام کو فتح کیا تھا۔ میں نے دنیا میں کتنی عمر پائی، کتنی شادیاں کیں، کتنا عیش کیا، کتنا کھایا پیا، کتنا ظلم و ستم کیا، پتھر پر لکھوا دیتے ہیں تاکہ مٹ نہ جائے، لیکن انہیں پتھروں پر یہ بات بھی رہ جاتی ہے، لوگ بھول جاتے ہیں، زمین میں دفن ہو جاتا ہے ہزاروں سال کے بعد زمین میں سے نکلتا ہے اور نیا نیا عجائب گھروں میں رکھ دیا جاتا ہے۔

امام حسینؑ نے اپنا خونی پیغام لرزتی ہوا کے صفحہ پر لکھ دیا لیکن چونکہ خون اور سرخ رنگ سے ملا ہوا تھا دلوں پر کندہ ہو گیا۔ آج آپ عرب اور عجم کے لاکھوں کروڑوں افراد دیکھتے ہیں جو امام حسینؑ کے پیغام سے واقف ہیں: "انی لاری الموت الا سعادة ولا الحیوة مع الظالمین الا برما۔"

جب آدمی شرمناک زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، جب آدمی ظالم اور ستمگر کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے جب آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی صرف روٹی کھانے، پانی پینے، سونے اور ذلت اٹھانے کے لئے ہو تو ایسی زندگی سے ہزار بار موت بہتر ہے۔ یہ شہید کا پیغام ہے۔

امام حسین علیہ السلام جو حملہ آور ہیں اور جن کی منطق شہید کی منطق ہے

جس دن اپنا پیغام کربلا کی زمین پر ثبت کر رہے تھے نہ وہاں کاغذ تھا نہ قلم تھا۔ ہوا کا یہی لرزتا ہوا صفحہ تھا لیکن ان کا یہ پیغام ہوا کے لرزاں صفحے پر کیوں باقی رہ گیا؟ اس لئے کہ دلوں کے صفحے پر فوراً منتقل ہو گیا۔ دلوں کے صفحے پر ایسا کندہ ہوا کہ پھر مٹنے والا نہیں ہے۔

ہر سال جب محرم آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ پھر سے ابھرتے ہیں، ازسرنو زندہ ہوتے ہیں، پھر کہتے ہیں: "خط الموت علی ولد آدم مخط القلادة علی جید الفتاة وما اولهنی الی اسلافی کاشتیاق یعقوب الی یوسف۔" ہم پھر دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کا یہ پیغام ہے: "الاوان الدعی ابن الدعی قدر کز بین اثنتین بین السلة والذلة و هیهات منا الذلة یأبی الله ذلك لنا ورسوله والمؤمنون و حجور طابت و طهرت۔"

تیس ہزار آدمیوں کے مقابلے میں جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہے ہیں جن میں سے ہر ایک کندھے پر تلوار رکھے اور ہاتھ میں نیزہ لئے ہے، باوجودیکہ آپ کے تمام اصحاب قتل ہو چکے ہیں اور آپ اکیلے رہ گئے ہیں آپ چلا چلا کر کہہ رہے ہیں: یہ نالائق کا بیٹا نالائق، یہ حرام زادے کا بیٹا حرام زادہ یعنی یہ تمہارا امیر اور حاکم نے، اس عبیداللہ بن زیاد نے مجھے پیغام بھیجا ہے کہ حسینؑ دو کاموں میں سے ایک کام کا اختیار رکھتے ہیں یا تلوار یا ذلت۔ حسینؑ اور ذلت اٹھانا! "هیهات من الذلته" ہم کہاں اور ذلت کہاں!" میرا خدا میرے لئے ذلت پسند نہیں کرتا۔ یہ شہید کا پیغام ہے۔ میرا خدا میرے لئے ذلت پسند نہیں کرتا۔ دنیا کے مومن، پاک نسلیں اور ذاتیں (لوگ قیامت کے دن تک آتے رہیں گے اور اس موضوع پر بات کرتے رہیں گے) اور جو مومن بعد میں آنے والے ہیں کوئی ایک بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ ان کا حسینؑ ذلت اختیار کرے۔ میں اور ذلت اختیار کروں؟ میں حضرت علیؑ کی گود میں

پل کر بڑا ہوا ہوں۔ میں جناب زہرا کی گود میں بڑا ہوا ہوں۔ میں نے جناب زہراؑ کا دودھ پیا ہے۔ میں اور ذلت اختیار کروں؟

آپ نے جس دن مدینہ سے سفر شروع کیا آپ مہاجم (حملہ آور) تھے۔ آپ اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو جو وصیت نامہ لکھتے ہیں اس میں کہتے ہیں: "انی لم اخرج اشراً ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً، انما خرجت لطلب الاصلاح فی امة جدی ارید ان امر بالمعروف و انهی عن المنکر و اسیر بسیرة جدی وابی۔" دنیا والے جان لیں کہ میں کسی جاہ اور منصب کا خواہاں، تخریب کار، مفسد اور ظالم نہیں ہوں۔ میرے اہداف یہ نہیں ہیں۔ میرا قیام اصلاح کرنے والا قیام ہے۔ میں نے قیام کیا ہے۔ میں نے خروج کیا ہے اس لئے کہ میں اپنے جد کی امت کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں۔ محمد ابن حنفیہ کے نام خط میں نہ بیعت مانگنے کا نام ہے، نہ اہل کوفہ کی دعوت کا تذکرہ ہے کیوں کہ اصل میں ابھی تک اہل کوفہ کا مسئلہ ہی سامنے نہیں آیا تھا۔

اس منطق میں یعنی ہجوم (حملے) کی منطق، شہید کی منطق، امام حسین علیہ السلام کے انقلاب کو وسعت دینے اور پھیلانے کی منطق نے ایسے کام کئے ہیں جن کی توجیہ اس منطق کے سوا کسی اور منطق سے نہیں ہوسکتی۔ کس طرح؟ اگر امام حسینؑ کی منطق صرف دفاع (بچاؤ) کی منطق ہوتی، تو عاشور کی رات کو جب اپنے اصحاب کو رخصت کرتے ہیں (اس دلیل سے جو میں عرض کر چکا ہوں)، بیعت اٹھا لیتے تاکہ وہ لوگ آگاہی کے ساتھ اپنا کام منتخب کرلیں۔ پھر جب وہ اپنے کام کا انتخاب کرلیتے ہیں تو انہیں اپنے ساتھ رہنے کی اجازت نہ دیتے اور کہہ دیتے کہ شرعاً یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم یہاں قتل کئے جاؤ۔ یہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں، مجھ سے بیعت چاہتے ہیں میرا فرض یہ ہے کہ میں بیعت نہ کروں مارا گیا تو مارا

گیا یہ لوگ تمہیں نہیں مارنا چاہتے تو تم کیوں یہاں ٹھہرو؟ نہیں شرعاً یہ بات جائز نہیں ہے تم لوگ چلے جاؤ۔

نہیں! ایسا نہیں ہے، تاثر اور انقلابی منطق میں۔ اس شخص کی منطق میں جو مہاجم (قیام) کر رہا ہے اور اپنا پیغام اپنے خون سے لکھنا چاہتا ہے اس موج (انقلاب) میں جتنی وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہو بہتر ہے۔ چنانچہ جب آپ کے دوست اور خاندان والے اپنی آمادگی کا اعلان کرتے ہیں تو آپ ان کے لئے دعا کرتے ہیں کہ خدا تمہیں خیر دے، خدا تم سب کو اجر عطا فرمائے۔

عاشور کی رات میں حبیب ابن مظاہر اسدی کو کیوں بھیجتے ہیں کہ بنی اسد کے پاس جاؤ اور ہو سکے تو کچھ آدمی میرے پاس لے آؤ؟ مگر بنی اسد کل کتنے تھے؟ اب میں فرض کرتا ہوں کہ حبیب ابن مظاہر گئے اور بنی اسد کے سو آدمی لے آئے تو یہ لوگ ان تیس ہزار کے مقابلے میں کیا کار نمایاں کر سکتے تھے؟ کیا حالات کو پلٹ سکتے تھے؟ ہرگز نہیں! امام حسینؑ چاہتے تھے کہ اس منطق میں جو ہجوم (حملے) کی منطق، شہید کی منطق اور انقلاب کی منطق ہے اس کے دامن میں وسعت پیدا ہو۔ اپنے خاندان کو جو ساتھ لائے تھے تو اسی لئے لائے تھے کہ ان کے پیام کا ایک حصہ ان کا خاندان بھی لوگوں تک پہنچائے۔ خود امام حسینؑ نے کوشش کی کہ جب یہ قضیہ یہاں تک بڑھ گیا ہے تو جتنا زیادہ پر سوز ہو سکے ہو جائے۔ بچ اس لئے ہوئے کہ دنیا میں ہمیشہ پھل اور میوہ دیتا رہے۔ کربلا میں کیسے کیسے مناظر اور کیسے کیسے واقعات دیکھنے میں آئے جو واقعی نہایت حیرت انگیز ہیں! اب ہم دیکھیں کہ ان تینوں عامل میں یعنی اہل کوفہ کی دعوت کا عامل جو اس تحریک کو تعاون کی ماہیت دیتا تھا، تقاضائے بیعت کا عامل جو اس تحریک کو دفاعی ماہیت دیتا تھا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عامل جو اس تحریک کو ہجوم (حملے) کی ماہیت دیتا تھا۔ کون سے عامل کی

اہمیت دوسروں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ان اسباب کی اہمیت ایک ہی درجہ کے نہیں۔ ہر عامل ایک مقررہ درجے کی اہمیت رکھتا ہے اور اس تحریک کو اسی درجے کی اہمیت بخشتا ہے۔ اہل کوفہ کی دعوت کا عامل اس لئے کہ لوگوں نے اس شخص کے لئے آمادگی ظاہر کردی ہے جو اس کام کے لئے نامزد ہو چکا ہے اور اس نے بھی بلا کسی تاخیر اپنی آمادگی کا اعلان کردیا، بہت اہمیت کا حامل ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ تقاضائے بیعت اور امام حسینؑ کا انکار، قتل ہو جانے پر آمادہ مگر بیعت سے انکار کا عامل اہمیت رکھتا ہے۔ تیسرا عامل جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس بناء پر تیسرے عامل نے تحریک حسینی کو سب سے زیادہ اہمیت بخشی ہے۔ اس اہمیت کے متعلق جو کوئی عامل کسی تحریک کو عطا کرتا ہے اور اس اہمیت کے متعلق جو اس تحریک کا بانی اس عامل کو بخشتا ہے میں ایک بات آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں:

بہت سی چیزیں چاہے وہ روحانیت کی ہوں چاہے مادّی امور میں سے ہوں انسان کے لئے اہم ہوتی ہیں، افتخار ہوتی ہیں، زینت ہوتی ہیں، زیور ہوتی ہیں، علم بے شبہ انسان کے لئے زینت ہے۔ عہدے اور مقامات خصوصاً خدائی عہدے اور مقامات انسان کے لئے فخر کا موجب ہوتے ہیں، اہمیت رکھتے ہیں، انسان کو وقار و منزلت بخشتے ہیں۔ وہ ظاہری چیز جو ان اہمیتوں کی نمائندہ ہے انسان کو اہمیت عطا کرتی ہے مثلاً کوئی شخص روحانیت کا لباس پہنتا ہے۔ بے شک روحانیت کا لباس صرف روحانی ہونے یعنی اسلامی معارف کا علم اور اسلامی تقوی رکھنے کی دلیل نہیں ہے۔ روحانی یعنی معارف اسلامی کا عالم اور اسلامی احکام پر عامل۔ یہ لباس اس کی علامت ہے کہ میں روحانی ہوں۔ اب اگر کوئی شخص حقیقت کے مطابق پہنے ہوئے ہے تو علامت صحیح ہے ورنہ صحیح نہیں ہے۔ بہر حال یہ لباس اس وجہ سے کہ اسے ایسے

لوگوں نے زیادہ پہنا ہے جن میں روحانیت کی معنویت اور حقیقت رہی ہے اس شخص کے لئے بھی جو اسے پہن لیتا ہے لازمی طور پر وجہ افتخار بن جاتا ہے۔ میں بھی جو اس لباس کے پہننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور تم جو مجھے نہیں پہچانتے کسی جلسے میں جب میرے سامنے آؤ گے تو اسی لباس کی بدولت جو تم مجھے پہنے دیکھو گے تو اسی ناواقفیت کے عالم میں بڑا احترام کرنے لگو گے۔ تو یہ لباس اس کے لئے افتخار ہے جو اسے پہن لیتا ہے۔ یونیورسٹی کے استاد کا لباس یونیورسٹی کے استاد کیلئے افتخار ہے۔ وہ جس وقت یہ لباس پہن لیتا ہے تو اس پر فخر کرتا ہے۔ عورت کیلئے زیور سجاوٹ کا ذریعہ ہیں۔

تحریکوں میں بھی بہت سے عامل ایک تحریک کو اہمیت بخشتے ہیں۔ تحریکوں میں باہم بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر اس میں عصبیت کی روح ہو تو وہ تحریک کو ایک قسم کی اہمیت دیتی ہے اور اگر اس میں معنوی، انسانی اور خدائی روحیں ہوں تو اسے دوسری قسم کی اہمیت مل جاتی ہے۔ تحریک حسینی میں کار فرما تینوں عامل نے اس تحریک کو اہمیت عطا کی بالخصوص تیسرے عامل نے، لیکن کبھی کبھی وہ شخص جس سے اس قدر و قیمت کا تعلق ہوتا ہے ایک ایسی حالت پیدا کردیتا ہے جو اس قدر و قیمت کو اور اہمیت بخشتی ہے۔ جس طرح وہ قدر و قیمت اس شخص کو منزلت عطا کرتی ہے اسی طرح وہ شخص بھی اس قدر و قیمت کی شان بڑھا دیتا ہے۔ جس طرح ایک روحانی شخص جب روحانیت کا لباس پہن لیتا ہے تو واقعی وہ لباس اس کے لئے باعث افتخار ہو جاتا ہے۔ اسے اس بات پر فخر کرنا چاہئے کہ یہ لباس اس کو پہنا دیا گیا ہے اور حقیقی روحانیوں نے بھی اسے مان لیا ہے، لیکن ایک شخص اپنے کام کو روحانیت کے فرائض کی انجام دہی میں، علم، تقوی اور عمل میں ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے کہ وہ اس لباس کے لئے باعث افتخار بن جاتا ہے۔ ہم کہنے لگتے ہیں کہ روحانیت کا لباس وہ لباس ہے جو فلاں شخص بھی پہنتا ہے ایسا لباس ہے کہ اس نے بھی پہن رکھا ہے۔ اب ہم تاریخی مثالیں

پیش کر سکتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ یہ کہیں کہ جناب! یہ عبا اور عمامہ کیا چیز ہے؟ تو ہم کیا کہیں گے؟ ہم کہیں گے کہ بو علی سینا نے بھی یہی لباس پہنا ہے جس پر تمام اسلامی ممالک فخر کرتے ہیں۔ عرب کہتا ہے کہ بو علی سینا میرا ہے کیونکہ کہ اس کی کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ ایرانی کہتا ہے کہ وہ میرا ہے کیوں کہ وہ بلخی ہے اور بلخ قدیم سے ایرانی سرزمین چلی آرہی ہے۔ روسی کہتے ہیں کہ وہ ہمارا ہے اس لئے بلخ اس وقت ہمارے ملک میں شامل ہے۔ ہر گروہ کہتا ہے کہ وہ ہمارا ہے اور تمام قومیں اس پر فخر کرتی ہیں۔ ابو ریحان البیرونی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ تو بو علی اور ابو ریحان اس لباس کے لئے باعث افتخار گزرے ہیں۔ شیخ انصاری، خواجہ نصیر الدین طوسی نے بھی لباس روحانیت سے افتخار پایا ہے اور لباس روحانیت کو خود بھی افتخار بخشتا ہے۔ یونیورسٹی کے ایک استاد کے لئے بھی یہی بات ہے۔ کچھ لوگوں کے لئے استادی کا لباس باعث افتخار ہوتا ہے، لیکن اس بات کا بھی امکان ہے کہ کسی استاد کی شان کو استادی کے کام، علم، تخصص اور تحقیق میں اتنی بلندی مل جائے کہ وہ استادی کے لباس کے لئے باعث افتخار بن جائے۔ عورت کے لئے زیور زینت کا سبب ہوتا ہے، لیکن کسی عورت کے سلسلے میں یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ سچ مچ یہ کہیں کہ اس کا چہرہ زیورات کو زینت بخشتا ہے۔ امیر المؤمنینؑ کے ایک صحابی صعصعہ ابن سوحان عبدی کا ایک جملہ بہت موزوں اور اچھا ہے۔ جناب صعصعہ حضرت علیؑ کے خاص صحابی ہیں۔ حضرت علیؑ سے حساب میں تربیت پائے ہوئے خطیب بھی ہیں۔ عرب کا اول درجے کا ادیب حافظ کہتا ہے کہ صعصعہ ایک خطیب تھے اور ان کے خطیب ہونے کی بہترین دلیل یہ ہے کہ کبھی کبھی حضرت علی ابن ابی طالبؑ ان سے کہہ دیتے تھے کہ کھڑے ہو کر کچھ کلمے کہہ دو۔ یہ صعصعہ وہی ہیں جنہوں نے حضرت علیؑ کی قبر پر بھی نہایت اعلی اور پر سوز تقریر کی ہے۔ اس شخص نے امیر المؤمنینؑ کو آپ کی خلافت پر تین چار دلکش جملوں میں

مبارک باد دی تھی۔ جس وقت امیر المؤمنینؑ خلیفہ ہوئے تو لوگ مبارک باد دینے آئے تھے۔ ایک مبارک باد جناب صعصعہ نے بھی کہی تھی۔ آپ نے کھڑے ہو کر امیر المؤمنینؑ کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"زینت الخلافة وما زانتك و رفعتك وما رفعتك وهی الیك احوج منك الیها۔" ان تین چار جملوں کی قدر و قیمت دس ورق کے ایک مقالے کے برابر ہے۔ انہوں نے کہا اے علیؑ! آپ خلیفہ ہوگئے تو خلافت نے آپ کو کوئی زینت نہیں بخشی بلکہ آپ نے خلافت کو چار چاند لگا دئے۔ خلافت نے تم کو اونچا نہیں کیا جو آپ خلیفہ ہوئے بلکہ آپ نے خلافت کے مقام کو بلند کردیا۔ اے علیؑ! آپ خلافت کے محتاج نہیں تھے بلکہ خلافت کو آپ کی ضرورت تھی یعنی اے علیؑ! میں خلافت کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آج اس کا نام آپ پر رکھا گیا ہے۔ میں آپ کو مبارک باد نہیں دیتا کہ آپ خلیفہ ہوگئے۔ میں خلافت کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ خلیفہ ہوگئے آپ کو مبارک باد نہیں دیتا کہ آپ خلیفہ ہوگئے۔ اس سے بہتر نہیں کہا جاسکتا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے عنصر نے حسینی تحریک کو قدر و قیمت بخشی لیکن امام حسینؑ نے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو منزلت بخشی۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر تحریک حسینی کو بلندی پر لے گیا لیکن امام حسینؑ نے اس اصول کو اس شکل میں اور اس طریقے سے جاری کیا کہ اس اصول کی شان بلند ہوگئی۔ آپ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اصول کے سر پر فخر کا تاج رکھدیا۔ (بہت سے کہتے ہیں کہ ہم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ امام حسینؑ نے بھی دوسروں کی طرح پہلے صرف ایک ہی جملہ کہا تھا: "ارید ان امر بالمعروف و انهی عن المنکر و اسیر بسیرة جدی و ابی" خود اسلام کی بھی یہی بات ہے۔ اسلام ہر مسلمان کے لئے افتخار کا باعث ہے لیکن ایسے مسلمان بھی ہیں جو اس لفظ کے حقیقی معنوں میں اسلام کا

فخر ہیں، دین کی عزت ہیں، دین کا شرف ہیں، اسلام کا شرف ہیں۔ ہم لوگوں کا تعارف کراتے وقت اکثر ان میں یہ القاب دیتے ہیں لیکن سب لوگ تو ایسے نہیں ہیں۔ ایک بندہ کسی کے بارے میں ایسی بات کہے تو وہ محض جھوٹ ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں فخر اسلام ہوں اسلام کیلئے میرا وجود باعث افتخار ہے تو میں کون ہوں؟ مجھے یاد ہے کہ سات آٹھ سال پہلے مجھے شیراز دانش گاہ میں تقریر کرنے کیلئے بلایا گیا تھا (وہاں کی دینی انجمن نے بلایا تھا)۔ وہاں استاد حتیٰ رئیس بھی موجود تھے۔ وہاں کے ایک استاد کو میرا تعارف کرانے پر مامور کیا گیا جو پہلے وہاں طالب علم تھے، پھر انہوں نے امریکہ جاکر تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹر ہو کر واپس آئے اور واقعی وہ ایک فاضل شخص بھی ہیں۔ وہ آئے اور منصۂ خطاب (روسٹرم) کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ (وہ جلسہ بھی اس جلسے کی طرح بہت بھرا ہوا اور باعظمت تھا) کچھ تعارف کرایا: میں فلاں شخص کو جانتا ہوں، حوزۂ قم ایسا، ویسا وغیرہ۔ اپنی باتوں کے آخر میں یہ جملہ بھی کہا:

میں یہ جملہ کمال جرأت سے کہتا ہوں: اگر دوسروں کے لئے روحانیت کا لباس باعث فخر ہے تو فلاں شخص لباس روحانیت کے لئے باعث افتخار ہے۔ اس بات سے میں جل گیا۔ میں کھڑے ہو کر تقریر کر رہا تھا۔ میں نے اپنی عبا پہلے ہی لپیٹ کر منصۂ خطاب (روسٹرم) پر رکھ دی تھی۔ میں نے کچھ باتیں کیں۔ ان صاحب کی طرف رخ کیا اور کہنے لگا: جناب والا! یہ کیا بات تھی جو آپ کی زبان سے ادا ہوئی؟ آپ سمجھتے بھی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں کیا چیز ہوں جو آپ کہتے ہیں کہ یہ شخص اس لباس کے لئے فخر کا باعث ہے! باوجودیکہ میں اس وقت دانش گاہ کا بھی تھا اور ایک اصطلاح سے دو زندگیوں والا تھا۔ میں نے کہا جناب! عمر بھر میں مجھے ایک ہی فخر نصیب ہوا ہے اور وہ یہی عمامہ اور عبا ہے۔ میں کیا چیز ہوں جو افتخار بن سکوں؟ یہ لغو قسم کا تعارف کیسا جو ہم آپس میں کراتے ہیں؟ جناب ابوذر غفاری کو کہنا چاہئے کہ

اسلام کا افتخار ہیں، یہ اسلام وہ ہے جسے جناب ابوذر نے پالا ہے، عمار یاسرؓ اسلام کا افتخار ہیں، یہ اسلام وہ ہے جس کی پرورش عمار یاسر نے کی ہے، بو علی سینا اسلام کا افتخار ہیں، یہ اسلام وہ ہے جسے بو علی سینا کی ذہانت نے شگفتہ کیا ہے، خواجہ نصیر الدین اسلام کا افتخار ہیں، صدر المتالہین شیرازی اسلام کا افتخار ہیں، شیخ مرتضیٰ انصاری اسلام کا افتخار ہیں، میر داماد اسلام کا افتخار ہیں، شیخ بہائی اسلام کا افتخار ہیں، اسلام بے شک افتخار رکھتا ہے، یعنی اس نے ایسے ایسے فرزندوں کی تربیت کی ہے جنہیں دنیا شمار میں لاتی ہے اور شمار میں لانا بھی چاہئے کیوں کہ یہ دنیا کے فرہنگ میں موثر نقش چھوڑ گئے ہیں۔ دنیا یہ نہیں کر سکتی کہ چاند کے کرہ کے ایک حصے کو خواجہ نصیر الدین کے نام سے مخصوص کرے اور چاند کے کرہ کے ایک حصے کا نام اس کے نام پر رکھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ چاند کے کرہ کے متعلق بعض انکشافات میں اس کا بھی دخل ہے۔ اسے کہنا چاہئے افتخار اسلام۔ ہم کون ہوتے ہیں؟ ہماری کیا اہمیت ہے؟ اگر ہمیں اسلام قبول کرے تو اسلام ہمارا افتخار ہوگا۔ اگر اسلام یہ مان لے کہ وہ ہمارے سینے پر تمغے کی شکل میں آویزاں رہے تو ہم بہت ممنون بھی ہوں گے۔ کیا ہم اسلام کے سینے پر تمغہ بن گئے ہیں! ہم عالم اسلام کے لئے باعث شرم ہیں۔ ہم مسلمانون کی اکثریت عالم اسلام کے لئے باعث شرم ہیں، تو دوسرے تعارفوں کو چھوڑیئے اصلی تعارف یہ ہے۔

امام حسینؑ کے بارے میں حق ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول کو قدر و قیمت دیا، اعتبار بخشا، آبرو عطا کی، یہ اصول جو مسلمانوں کی آبرو ہے۔ یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ یہ اصول مسلمانوں کی آبرو ہے اور مسلمانون کو وقار و منزلت عطا کرتا ہے یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں یہ قرآنی آیت کی عین تفسیر ہے: "کنتم خیر امته اخرجت للناس تأمرون

بالمعروف و تنهون عن المنکر۔" دیکھئے قرآن کیسی تعریف کرتا ہے! خدا آدمی کو قرآن کی ان تعریفوں پر حیرت ہوتی ہے۔ "کنتم خیر امة اخرجت للناس۔" تم ایسے رہے ہو ("رہے ہو" قرآن میں ایسے موقعوں پر یعنی تم ہو) تم سب سے اہم اور باوقار قوم ہو جو انسانوں کے لئے وجود میں آئی ہے، لیکن وہ کون سی چیز ہے جس نے تمہیں اتنی منزلت بخشی ہے اور بخش رہی ہے کہ اگر وہ تمہارے پاس ہے تو تم اہم ترین قوم ہو؟ "تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر۔" اگر تمہارے پاس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو تو یہ اصول تم مسلمان قوم کو منزلت عطا کریگا۔ تم اس وجہ سے اہم ترین امت ہو کہ تمہارے پاس یہ اصول موجود ہے (ابتدائے اسلام میں بھی ایسا ہی تھا)۔ تمہیں اسی اصول نے اہمیت بخشی ہے۔ تو کیا جس دن یہ اصول ہمارے پاس نہیں رہیگا ہم بے وقار قوم بن جائیں گے؟ ہاں! یہی ہے لیکن امام حسینؑ نے اس اصول کو مقام و منزلت اور اہمیت عطا کی۔

بعض اوقات ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں لیکن ہم اس اصول کو نہ صرف اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس کے مقام کو سو درجہ نیچے لے آتے ہیں۔ اس وقت عوام کے خیال میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کسے کہتے ہیں؟ بہت چھوٹے چھوٹے جزوی مسائل کو جنہیں میں نادرست مسائل نہیں کہتا (اگرچہ ان میں سے بعض نادرست بھی ہوتے ہیں) لیکن یہ جس وقت اپنے کل میں واقع ہوں تو مناسب ہیں مثلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اگر کسی شخص کے لئے یہی ہو کہ جناب! آپ اپنی انگلی سے یہ سونے کی انگوٹھی اتار لیجئے۔ یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ صحیح بات ہے لیکن یہ نہیں ہونا چاہئے کہ آدمی اور کوئی منکر ہی نہ دیکھے بجز اس ایک کے، بجز داڑھی کے مسئلے کے، بجز کوٹ شلوار سے متعلق مسائل کے۔ ایک صاحب کہتے تھے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو ایک اور شخص کے بارے میں بہت بڑبڑا رہا تھا اور غصے میں اسے

کافر اور فاسق تک کہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیا کیا ہے جو تم اسے اس قدر برا سمجھ رہے ہو (برا آدمی کھلا جہنمی)؟ اس نے جواب دیا: وہ مڑی ہوئی قمیص کا آدمی ہے یعنی اس کی قمیص کالر دار ہے (مضحکہ انگیز، نقل مجلس) اب جبکہ ہمارا نہی عن المنکر اس حد تک تنزل کر جائے تو ہم نے گویا اس اصول کو گرا دیا ہے، حقیر اور چھوٹا بنا دیا ہے۔ جو آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر سعودی ملک میں موجود ہیں انہوں نے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آبرو ہی ختم کر دی ہے۔ بس ایک کوڑا ہاتھ میں لئے پھرتے ہیں کہ کوئی کسی کا بوسہ نہ لے۔ یہ اور نہی عن المنکر ہوا۔

لیکن امام حسینؑ کو دیکھئے! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا کام تھا جڑ بنیاد سے۔ وہ اسلام کی تمام نیکیوں پر نظر رکھتے تھے اور ان کی فہرست بتاتے تھے اور دنیائے اسلام کی تمام برائیوں پر بھی ان کی نظر تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ دنیائے اسلام کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی برائی (منکر) خود یزید ہے۔ "فلعمری الا العامل بالکتاب القائم بالقسط والدائن بدین اللّٰہ۔" امام اور رہبر وہ شخص ہوتا ہے جو خود کتاب پر عامل ہو، خود عدالت قائم کرے اور خدا کے دین کا ماننے والا ہو۔ ان (امام حسینؑ) کے پاس جو کچھ تھا اس اصول کی خاطر اخلاص کے مطابق لگا دیا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ کو موت سے سجایا۔ اس موت کو شکوہ اور جلال بخشا۔ جس دن گھر سے نکلے ہیں اسی دن سے اچھی موت کی باتیں کرتے ہیں۔ کتنی اچھی باتیں ہیں! ہر موت کو اچھا نہیں کہتے تھے۔ حق اور حقیقت کی خاطر موت کو اچھا سمجھتے تھے۔ "خط الموت علی ولد آدم مخط القلادة علی جید الفتاة۔" ایسی موت انسان کی ایسی ہی زینت ہوتی ہے جیسی زینت گلوبند کسی عورت کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ صاف وہ اشعار ہیں جو آپ کربلا کی طرف آتے ہوئے راستے میں پڑھتے تھے جو غالباً خود انہیں کے ہیں یا ہو سکتا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے ہوں:

و ان تکن الدنیا تعد نفیسةً

فدار ثواب اللّٰہ اعلی و انبل

اگر چہ دنیا خوشنما، نفیس اور اچھی ہے لیکن دنیا جتنی حسین ہے وہ اتنا ہی زیادہ حسین اور نفیس اور خوشنما خدا کا قید خانہ ہے۔

و ان تکن الاموال للترک جمعها

فما بال متروك به المرأ یبخل

آخر جب مال دنیا چھوڑ کر چلا ہی جاتا ہے تو انسان کیوں نہ اسے بخشش کرے، انسان کیوں نہ دوسروں کی مدد کرے، انسان کیوں نہ خیرات کرے۔

و ان تکن الابدان للموت انشأت

فقتل امرء بالسیف فی اللّٰہ افضل

آخر کار جب اس بدن کو موت آنا ہی ہے تو خواہ بستر پر مریں، جنگ میں مریں، کسی بیماری سے مریں یا کسی جرثومے سے مریں، پھر انسان کیوں نہ اچھی موت مرے۔ پس انسان کا خدا کی راہ میں تلوار سے قتل ہونا بہت اچھا بلکہ سب سے اچھا ہے۔

اب میں یہیں دعا کرتا ہوں اور آپ سب کو خدا کے سپرد کرتا ہوں:

اے خدا! ہم تجھے قسم دیتے ہیں بحق۔ اے پروردگار! اسلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمارے سینے کھول دے۔ اے پروردگار! ہمیں ان فریضوں اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کی توفیق دے جو تو نے ہمارے عہدوں کے لئے عائد کی ہیں۔

اے پروردگار! اسلام کے دشمنوں کو ذلیل کر۔ ہمیں دنیا اور آخرت کی بھلائیاں عطا فرما۔ ہمارے اموات کی مغفرت فرما اور ان پر اپنی رحمت نازل کر۔

رحم اللّٰہ من قرء الفاتحه مع الصلواة

اغلاط نامۂ حماسۂ حسینی (۱-۲)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۲	۵	'بعدٌ.....یلا"عظیم	"بعدٌ.....یلاء عظیم"
۴۰	۹	ہوجائے۔	ہوجائے؟
۴۱	۱۰	الاقرون	الاترون
۴۴	۹	آپ	اس
۴۴	۹	پوچھا اپنے	پوچھا آپ اپنے
۴۴	۹	بڑھاتی	بڑھاتے
۴۴	۹	وہ بولی	فرمایا
۴۵	۱۴	مومن خوش	مومن کو خوش
۶۶	۱۱	کردیتا ہے	کردے
۷۳	۸	ان	یزید
۷۵	۶	ہوا	ہو
۷۵	۷	برباد یہو	بربادی ہو۔ ہم
۷۶	۱۴	درفع	ارفع
۱۱۷	۱۶	قدرو محبت	قدرو قیمت
۱۲۳	۵	خل	مل
۱۴۶	۱۵	الٹے	کٹے
۱۵۶	۱۱	رخ پہلو	رخ
۱۸۹	۲۰	ہوتے تھے	ہوتے
۱۸۹	۲۱	ہے	ہیں۔
۲۰۳	۱۰	بہت	جت
۲۰۳	۱۳	جھجھک	جھجک
۲۰۵	۱۰	خیو خواہکو	خیر خواہ
۲۰۵	۱۱	رکھے	رکھتے ہیں۔
۲۲۲	۱۸	ہوتے	ہوئے
۲۲۳	۴	گیا	گئی
۲۲۸	۱۱	مکہ	مدینہ
۲۳۸	۱۰	کہو	بتاؤ
۲۴۸	۱۴	مالی	مولیٰ
۲۴۹	۱	مولا عباس	مولیٰ عابس
۲۴۹	۱	عابس غلام	عابس کے غلام
۲۵۲	۱	ل ا	انی لا
۲۵۶	۱۴	کی	کہ
۲۶۶	۱۸	معہ	معا
۲۶۹	۱۴	تاریخ کی ایک	تاریخ کی ایک
۲۷۲	۱۷	سلام	اسلام
۲۷۳	۱۷	مؤنث	مذنث
۲۷۵	۹	قدیسات	قدسیات
۳۰۶	۲۰	بگولہ	بگولا
۳۱۷	۸	جس نے	جس سے
۳۲۲	ف	(عمدالمام حسن)	(عمدالمام حسین)
۳۳۳	۱۵	ہے	تھی
۳۳۶	۱۲	خرام	حرام
۳۳۷	۷	آیتیں	آیات میں
۳۵۸	۳	ضربته	ضربة
۳۵۸	۱۰	اس کا	خود ان کا
۳۷۲	۹	کردے	کردیئے
۳۹۶	۵-۴	کے دل	میں
۳۹۷	۲۰	کرے	کریں

صفحہ	سطر	غلط	تصحیح
۴۱۸	۸	ٹکڑے توڑیئے	ٹکڑے توڑنے
۴۲۰	۵	وہ	×
۴۲۳	۸	ہوگی	لے گی
۴۲۹	۳	الراکنون	الراکعون
۴۳۱	۳	تقاضہ	تقاضا
۴۳۱	۱۵	یہی	ایسی
۴۳۲	۵	جانچ	جانچ پڑتال
۴۳۳	۵	کتاب و	کتاب
۴۳۴	۶	کو تدن صرف	کو صرف
۴۳۴	۵	پیشتر	پیشتر
۴۳۴	۱۴	ایک قرآن	ایک قرآن ملا ہے جس
۴۳۴	۱۷	بے بروا	بے پروا
۴۳۵	۱۱	حضرت عمر	عمر
۴۳۵	۱۳	تو ہم نے	لیکن ہم
۴۳۵	۱۸	اللوبس	اللوابس
۴۳۶	۱۸	صنعت	ضعف
۴۴۲	۱۷	کہ کہو	کہ، کہو
۴۴۲	۱۷	کہتے کہو	کہتے، کہو
۴۴۹	۱۶	حضرت عمر ابن سعد	عمر ابن سعد

سطر	غلط	تصحیح
۱۱	لیا تھا	لیا
۱۳	لیا تھا	لیا
۱	کرتا	کرنا
۱۵	مجھ سے شیخ اجل۔۔جوان تھا	×
شعر	ارہا نشینہ	ارہا نشید
شعر	دست	مست
۲۱	النفظوا	انقطوا
۲۱	صکوا	سکنوا
۲۱	جباھھم	جوار حکم
۱۶	نیچے	×
۱۷	خسین	حسین
۹	اپنے اہل	اپنے پدر کے اہل
۱۴	شونکہ	چونکہ
۲۰	کسی	کس
۶	شاخت	شناخت
۳	فرد کو کے	فرد کو لے
۱۶	من	ھنا
۲	میں	کو
۱۸	عائدوی	عائد کی

کتاب کے پہلے ایڈیشن میں اب تک جن غلطیوں کی نشان دہی ہو سکی ہے انکی تصحیح پیش خدمت ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ آئندہ ایڈیشن تمام اغلاط سے مبرا ہو۔ انشاء اللہ